

www.pdfbooksfree.pk

سیاستی عالم نمبر

خانی

PDFBOOKSFREE.PK

aanchalpk.com aanchalnovel.com

قیمت - 50 روپے
www.pdfbooksfree.pk

ناے افق

وزیر آئل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
 لندن کنونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایسوسی ایشن
 پاکستان جیسٹس آف پاکستان



پاکستان (فی پرچہ) 50 روپے

پاکستان (سالانہ) 500 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات

0300-8264242

aanchalpk.com

aanchalnovel.com

naeyufaqonlinemagazine

aanchal.com.pk/blog

onlinemagazinepk.com/recipes

editorufaq@aanchal.com.pk



مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال

مکتبہ اچال



جلد 39

شماره 04

مئی 2015



ابتدائیہ

10	مشتاق احمد قریشی	ہستک
12	عمران احمد	گفتگو
19	طاہر قریشی	اقراء
تفریق کمانیاں		
21	نوشاد عادل	ہف
71	شہناز نسیم	دیپستان
73	فیض الرحمن قادری	نمبر پلس
75	راہیلہ خانم	غلام نبی
129	انور ریو ال	ان بخش
133	عماد فہر روق ارشد	نکس و من
139	نہالہ میہاں	یار

یہ کتاب مشتاق احمد قریشی کی تصانیف پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں 139 تصانیف شامل ہیں۔
 یہ کتاب 7 حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر حصہ میں 20 سے 25 تصانیف شامل ہیں۔

165	زمریں قمر	لارنس آف افغانستان
187	آلشہ مخدوم	سیاست کی کوکھ
197	نور شہید بیگم زادہ	غیر سیاسی انٹرویو
211	علی اختر	تجربہ
229	انجم نورق سہیل	کالے پتھر
		سے لے کر
81	امجد جاوید	قلمند ذات
255	شہید جاوید	بہت سنگم
		مستقل سے
249	حافظ شہیر احمد	رومانی مساجد
251	عثمان احمد	ذوق آگاہی
253	قمر اسرار	خوشبو بخشن

اہمیت سے دیئے گئے ہیں۔ آپ کی کتاب کی قیمت 75 روپے ہے۔ آپ کی 24300 روپے 021-35620771/2
 فیس 021-35620773 کے ذریعہ آپ کے لئے آگے بھجوں گے۔ آپ کی کتاب کی قیمت 75 روپے ہے۔ آپ کی 24300 روپے 021-35620771/2
 info@nawabshah.com.pk

مذاہب

مشتاق احمد قریشی

ماہی رسول اللہ ﷺ پر حملے کی ایک اور مذہب کو شش؟

گزشتہ دنوں ماہی رسول اللہ ﷺ پر ایک حملوں کے خلاف ہونے والی احتجاجی ریلیوں، جلوس و جلسوں میں تمام مسلمانوں کے جذبات بے قابو ہو گئے تھے اور ہر اہل ایمان نے مقدور بھر اپنے غم و غصے کا اپنے طور پر اظہار کیا تھا جس میں مغربی دنیا خصوصاً یورپی یونین، اسکیٹینڈینیوین ممالک کے خلاف اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ محسن انسانیت نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالی خا کے شائع کر کے عالمی سطح پر مسلمان عالم کی شدید دل آزاری کی اور ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی جس میں وہ سو فی صد کامیاب رہے۔ دراصل یہ دشمنان ایمان اور دشمنان اسلام کا براہ راست عاشقان رسالت مآب پر توہین آمیز حملہ ہے اگر اس حملے کی وجوہات پر غور کیا جائے تو اس کی کڑیاں ان ہی سازشی عناصر سے جا ملیں گی جنہوں نے ماروے اور یورپی ممالک کے اخبارات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خا کے شائع کئے تھے۔ درحقیقت اس طرح سازشوں نے ایک بار پھر سرعام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دردناک عظیم گستاخی کا ارتکاب بھی کیا ہے۔ تمام دنیا کی غیر مسلم قومیں چاہے وہ ہندو ہوں عیسائی ہوں کہ یہودی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں کہ مسلمانوں کو کس طرح بے چین و بے آرام کیا جائے کہ وہ سراپا احتجاج بن کر ٹلک آمد بجٹک آمد کسی طرح سے دہشت گردی پر اثر آئیں یقیناً یہ ان کا خیال درست ہے کہ مسلمان اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر والہانہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں کہ ان کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دینا تو بہت معمولی بات ہے۔

مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی سازش امریکہ کے یہودیوں کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے یہودی جو روز اول سے اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر کمر بستہ ہیں اب نئے رنگ ڈھنگ سے میدان ٹل میں اترے ہیں۔ اب وہ پس پردہ رہ کر امریکی عیسائیوں اور دیگر اقوام کو اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اپنی اس مہم پر وہ بے دریغ سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ امریکی تحقیقاتی ادارے کی رپورٹس کے مطابق 9/11 کا سانحہ بھی ان کا ہی پیدا کردہ تھا۔ اس کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف کارروائی کا جواز جو پیدا کرنا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر خالص اسلامی ریاست افغانستان کی امن سے امن بھاوی۔ یہودیوں کے متعلق تو اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ کسی کے دوست نہیں ہو سکتے یہ قوم تو ہمیشہ سے اپنے نبیوں کا قتل کرتی رہی ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں آنے والے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ

اسلام تک کو انہوں نے اپنے طور پر تو ماری ڈالا ہے۔ یہ قوم اٹلیس ہے جیسا کہ انٹلس نے حق رسالت اور احترام نبوت کے آگے حکم الہی کے باوجود سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ویر سے حضرات انبیاء السلام سے عداوت و دشمنی کا سلسلہ چلا آ رہا ہے جواب تک جاری ہے۔ شعائر اللہ کی توہین و تعظیم کا سلسلہ جاری ہے۔ حالیہ دنوں میں اشتعال انگیز کارٹون کی اشاعت کے چھپے بھی توہین انبیاء کا نظریہ ہی کارفرما ہے۔ اس سلسلے میں یہودی منصوبہ سازوں کو متعصب عیسائیوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ ایک امریکی رسالے میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق گزشتہ دنوں ڈنمارک کے اخبار جیلڈز پوسٹن کا ثقافتی مدیر فیلینگ روز جس نے مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے وہ اشتعال انگیز کارٹون شائع کئے تھے گزشتہ سال اسے امریکہ کے اسلام دشمن مہم چلانے والی تنظیم کے سرغنہ اور یہودی مصنف ڈینیل پاپس نے خصوصی دعوت دے کر امریکہ مدعو کیا تھا یہ وہی ڈینیل پاپس ہے جس نے اسلام دشمنی پر جتنی متعدد کتب لکھی ہیں اور مسلمانوں کے خلاف کھلے عام زہر اگلتا ہے۔ اس ہی شیطانی ذہن کے مالک نے بڑی کثیر رقم خرچ کر کے یہ اشتعال انگیز کارٹون بنوائے تھے تاکہ مسلمانوں کی دل آزاری ہو سکے اور اس سلسلے میں اس نے ایک کارٹون بنانے کا مقابلہ بھی منعقد کرایا تھا۔ جس میں پہلے مرحلے میں چالیس افراد نے اپنے نام لکھوائے تھے لیکن جب انہیں اصل منصوبے سے آگاہ کیا گیا تو پھر مقابلے کے میدان میں صرف بارہ تیرہ ہی کارٹون ساز رہ گئے جنہوں نے مختلف کارٹون بنائے اور ان میں سے منتخب کارٹون ڈنمارک کے اخبار نے شائع کر دیے۔ اس طرح یہودی منصوبہ کا سیلاب ہو گیا مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے عالمی سطح پر اپنی ناراضگی و اشتعال کا برملا اظہار کیا۔ جس سے ڈنمارک کا ربوں ڈالر کا نقصان بھی ہو اور بیشتر اسلامی ممالک نے ڈنمارک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا اس طرح منصوبہ ساز یہودی تنظیم نے وہ طر افائد حاصل کیا مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے اپنے مقابلے میں ان کے نقصان پہنچایا۔ دوسری طرف اپنے صیغہ اور مذہبی حریف عیسائیوں کو معاشی نقصان پہنچ کر اپنی اہمیت واضح کر دی اور یہودی مصنوعات کے لیے مارکیٹ پیدا کرنی۔ دشمن اسلام ہمیشہ یہ بتوں بولتا ہے کہ مسلمان اپنے آقا اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و عزت پر ہر قسم کی آجی آنے سے پہلے اپنی جائیں نذر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ہر نابکار ابلہ سی قوت کے سامنے سیسہ پانی دیوار کے مانند جبر جاتے ہیں ایک ہو جاتے ہیں تمام مذہبی و مسلکی اختلافات بحول جاتے ہیں ایک اللہ اور آخری رسول کی ایک امت بن کر سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں انشاء اللہ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا اور دشمن ایمان دشمن اسلام کو منہ کی کھانا پڑے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔



گفتگو

عمران احمد

”اٹھارے اعرابوں کی آغوش رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید میں مسلمانوں کی مثال پر ہمہ جہت کرنے آپس میں رحم دل ہونے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کہ جب اس کے کسی ایک ٹکڑے کو کاٹ لیا جاتا ہے تو باقی سارا جسم بھی بیدار رہتا ہے اور پھر رشتہ اس کے ساتھ ٹکڑے کو نہ بھارتیہ ہے۔“ (مشفق ص ۱۲)

عزیزان محترم! سلامت باشد!

مارچ کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے تمام اہل وطن کو یوم قرار داد پاکستان مبارک ہو، وہ قرار داد پاکستان جس کی برودور میں ہم نے دھجیاں بھیریں جس پر ہمارے کبھی غلٹ ہی نہیں کیا لگتا ہے نہ اس پر غلٹ کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں اگر ہم نے اس قرار داد پر غلٹ کیا ہوتا یا اس کو دل سے قبول کیا ہوتا تو آج ملک کے یہ حالات نہ ہوتے۔ ہاں ہم ایک دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگ کر دشمن پر اثر انداز نہ دھرتے بہر حال اس پر بات بہت ہی ہو سکتی ہے لیکن دل اتنا زخمی ہے کہ جس... سو آئیں گے افق کی بات کریں، اس ماہ کا یہ چہ سیاہی کراٹھ یا جراثیم فہر ہے ویسے آج کل جو جتنا بڑا سیاست دان ہے وہ اتنا ہی بڑا مجرم ہے، ہم نے کوشش کی ہے کہ اس موضوع پر تجاریر جمع کر کے آپ قارئین تک پہنچی میں اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں اس بارے میں اپنی آراء سے ضرور آگاہ دیتے گا۔ گزشتہ ماہ غلطی سے محترم غلام میہراں کے مادیلہ یا رب کے پہلے صفحے پر ”آخری حصہ“ لکھ دیا تھا یہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا اس شمارے میں اس کی تیسری قسط شامل ہے آئندہ ماہ اس کی آخری قسط ہوگی۔ اب آئیے اپنے محبت ناموں کی طرف۔

عمر فاروقی ارشد... فورت عباس... السلام علیکم!

نہ سہ مروں جب تک خواجہ یثرب کی حرمت پر

خدا شاہد ہے کامل میرا ایمان ہو نہیں سکتا

فرانس کے گستاخ میگزین نے جو تے کھانے کے بعد بھی گزشتہ دنوں گستاخانہ خاکے پھر سے شائع کر دیے۔ جب اس کے دفتر پر چلنے کے نتیجے میں ایڈیٹر سمیت 15 سے زائد افراد ہلاک ہوئے تو گویا کبرا منجی گیا۔ وہ اس لیے کیونکہ مرنے والے مسلمان نہیں تھے۔ مسلمانوں کا لہو تو ہر روز پانی کی طرح بہتا ہے اور یہ امن کے نام نہاد ممبر دار تب نہیں بولتے فرانس کے صدر کی قیادت میں اس واقعہ کے خلاف لیکن مارچ کیا گیا جس میں عالم کفر کے تقریباً ہر فرعون نے شرکت کی اور دواویا میچیا کہ یہ حکم کھانا دہشت گردی ہے۔ اس اسلام کا سوال ہے کہ کیا ہمارے

نبی محترم کی توہین کرنا، دہشت گردی نہیں۔ ہمیں دہشت گرد کہنے والوں کو، ہم اس دین کے پیروکار ہیں جو ہمیں تمام انبیاء کرام کی عزت و احترام کرنے کی تعلیم دیتا ہے ہمارے دلوں میں کسی ایک بھی پیغمبر کے بارے میں ذرہ برابر بھی بغض نہیں۔ تم اس اسلام کے ماننے والوں کو دہشت گرد کہتے ہو جو حضرت عیسیٰ کا نام لیتے ہوئے علیہ السلام پڑھتے ہیں جو انبیاء پر درود و سلام بھیجتے ہیں دہشت گرد وہ ہوتا ہے جو کسی کے مذہبی و معاشی نظام میں اپنے بغض و عناد کے دھماکے کرے اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو، ہمیشہ تم نے دین اسلام اور پیغمبر اسلام کی توہین کے ناپاک منصوبے بنائے اور ان پر عمل کیا۔ تاریخ چچ کر بتائے گی کہ آج تک اس دھرتی پر اسلام کے ماننے والوں نے کسی بھی پیغمبر کی توہین کرنا تو دور کی بات اس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھا ہے تم ہمارے دین کی عصمت پر ڈاکہ ڈال کر ہم سے یہ تو فیغ رکھتے ہو کہ ہم خاموش تماشا بنے رہیں تم ہمارے نبی اکرم کا مذاق اڑا کر (نعوذ باللہ) ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہو کہ ہم آنکھیں بند کر لیں تم ہماری عزیز از جان ہستی کی عفت پر فقرے اچھال کر ہمیں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہو۔ تو پھر یہ بات جان لو، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی اور اپنے گھناؤنے آزادوں کی اظہار رائے جیسے نظریات کی آڑ میں پیغمبر اسلام کو نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری رکھا تو وہ وقت دور نہیں جب امت مسلمہ کے ہاتھ تمہارے گریبانوں سے ہوتے ہوئے تمہارے ایوانوں تک پہنچ جائیں گے نبی اکرم ﷺ کی حرمت پر کٹ مرنا اگر دہشت گردی سے تو مسلمان بڑے شوق سے یہ دہشت گردی کرنے کو تیار ہیں۔ دنیا میں تم سے بڑا کوئی دہشت گرد نہیں جس نے عالم اسلام کی کسی چیز کو بھی نہیں بخشا۔ ہماری معیشت سے بے کر سیاست ہماری آزادی، ہمارا مذہب ہمارے معصوم بچے ہماری خواتین ہماری نوجوان نسل تم نے ان سب کو اپنے نظیظ عزائم کے ذریعے نشانہ بنا رکھا ہے اور پھر جب مظلومیت کی اس راہ میں سے کوئی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے تو تم دہشت گردی کا راگ لاتے ہوئے چچ و پکار شروع کر دیتے ہو اے اہل مغرب، امن چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے امت مسلمہ سے نا انصافیاں بند کرو اور جو نا انصافیاں کر چکے ہو ان کا ازالہ کرو اسلام کو ایک حقیقی طاقت سمجھتے ہوئے کھینچے دل سے تسلیم کرو، تو جو اب عالم اسلام تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ زمین امن و امان کا ہوا رہے گی۔ بصورت دیگر

اسلام کو قدرت نے اتنی چمک دی ہے

اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اب بڑھتے ہیں پرچے کی جانب، عمران بھیا کیسے احوال ہیں۔ امید برحق ہے کہ ایڈیٹری کی پوشاک زیب تن کر کے سیاسی جرنل نمبر کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ ان شاء اللہ یہ خاص نمبر کامیابیوں کی نئی نوبت کے برائے گا۔ فردری کا شمار دو حوالہ دھار بارش کے دوران ملا۔ واللہ یہ بات تسلیم نہ کرنا بڑی مضر فی ہوں کہ سرورق کے معاملے میں سننے افق بڑی تیزی سے معیار

کی بلند یوں پر جا رہا ہے۔ اب ہمیں تعریف کے لیے الفاظ اس طرح ڈھونڈنا پڑتے ہیں جیسے پچھلے دنوں پیٹروں ڈھونڈنا پڑا تھا اللہ اللہ شہر کے ہر پیٹروں پر گویا محفل پیٹروں منعقد تھے ایکشن کے دنوں میں ہمارے ڈرائنگ روم میں سارا سارا دن بیٹھے رہنے والا ایم این اے بحران کے پہلے دن ہی پہلی دستیاب فلائٹ سے اڑان بھر کر لندن پہنچ گیا اور آج تک وہاں کسی نہایت اہم قومی مسئلے پر ملکہ الزبتھ کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہے۔ (باہا با) اے رب العالمین ان نام نہاد عوامی نمائندوں کو گردن سے دیوچ کر اپنے پاس بلا لے عمران بھائی آپ کی گفتگو سے میں بالکل متفق ہوں ویلنٹائن ڈے کی صبح کو اچھ کر اگر ہر نو جوان ایک بار یہ تصور کر لے کہ آج اس کی بہن بھی کسی کے ساتھ ویلنٹائن ڈے منانے جا رہی ہے تو امید ہے کہ یہ لعنت ختم ہو جائے گی۔ اس بار بھی کم سا بھی محفل میں حاضر ہوئے۔ ادیب سمیع صاحب، آپ ہمارے لیے نہایت محترم ہیں۔ ہم آپ کے جذبات سمجھتے ہیں لیکن بڑے احترام سے عرض کروں گا کہ کوشش کیا کریں۔ تبصرہ صد سے زیادہ طویل نہ ہو آپ جذبات میں بہہ کر اختصار کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں اس طرح دوسرے ساتھیوں کی حق تلفی ہوئی ہے اس کے علاوہ ماضی کی یادوں اور افسانوں کی بجائے اگر تبصرہ نئے افق کی کہانیوں اور پالیسی پر ہو تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔ ریحانہ سعید، ہم اگر تبصرہ دہی کرتی تو کیا تھا ہمارا بھی کرسی صدارت کا شوق پورا ہو جاتا۔ بہر حال اچھا لکھا تم نے دعاؤں میں یاد رکھا کرو، مشتاق احمد قریشی صاحب نے بیش قیمت معلومات سے نوازا۔ یقین کریں صرف دستک کی وجہ سے میں نے اس دفعہ نئے افق کو جھک کر دیکھ لیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی ہمارے درمیان موجودگی کسی نعمت سے کم نہیں۔ اگر کوئی سمجھے تو کہانیوں کی بات کی جائے تو ”یارب“ کا آخری حصہ متاثر کرنے میں کامیاب رہا دیگر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ سلسلے وار ناول قلندر ذات جمود کا شکار ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ امجد جاوید صاحب کوئی خاص تبدیلی نہیں لے کر آئے۔ دوسری طرف جلت سنگھ مسلسل مثبت تبدیلیوں کی طرف گامزن ہے جبکہ اکثر تاریخی ناولوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ مصنف مرحوم کے فن کا نقطہ عروج ہے۔ اب آتے ہیں خوشبو خن کی طرف عمران بھیا ایمان کی بات ہے اس دفعہ اپنی غزل دیکھ کر اتنی جیسی آئی کہ افغانستان کے ہاتھوں روسی فوج کی درگت پر بھی نہیں آئی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ عمر اسرار بھائی نے صد ہی کر دی۔ ڈیڑھ سال قبل نے افق میں شائع ہونے والی میری غزل دوبارہ اٹھا کر چھاپ دی وہ بھی کمپوزنگ کی بے شمار غلطیوں کے ساتھ جبکہ تین چار نئی غزلیں ارسال کر چکا ہوں ان کا کوئی نام و نشان نہیں مل سکا۔ اب خدا ہی جانے اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے جسے ہماری ناقص عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بہتری کی ضرورت ہے۔ خیر اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ نئے افق یونہی ترقی کی منازل طے کرتا رہے اور اللہ تمام مسلمان بھائی بہنوں کی مشکلات اپنی رحمت سے ختم

کرے، آمین۔

مہر پرویز احمد..... میاں جنوں۔ سلام مسنون گفتگو میں حاضر ہوں خوش آمدید کا منتظر ہوں۔ سرورقی لا جواب ہے اتنا خوب صورت منظر تو صرف خوابوں میں دیکھا جاسکتا ہے اتنے خوب صورت گھنے جنگل میں تنہا یہ لڑکی کیا کر رہی ہے اس کو ڈر نہیں لگتا۔ دستک میں مفکرانہ تحریر پڑھ کر حب الوطنی اور ایمان تازہ ہو گیا آخری حصہ غلام میراں کا پڑھا آخری لائن تک پتا نہیں چلا طے کو کس نے معاف کیا امجد جاویدی کی تحریر حب الوطنی کی منہ بستی تھی یہ ہے کاش عملی طور پر بھی ایسے ہی جاں نثار لوگ وطن عزیز کی باگ و بار سنبھالیں۔ سلیم اختر کی نیا جہنم لا زوال تحریر ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مشرقی عورت کی قربانی کا کیا کہنا اور مشرقی مرد کے ظلم و ستم کو بھی مات دینے کا کیا کہنا۔ طاہرہ جہیں تارا کی تحریر ہوس زدہ حاسد لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ میل جبار کی ندامت کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں عارف رمضان جتوئی انتقام کے لبو میں قوی تحریر لائے۔ ریاض ہٹ کوہ نور خوب تلاش کرتے ہیں۔ کاش دو صفحات اشعار کے بھی ہوتے مجھ جیسے بہت سے لوگ نئے افق میں شمولیت کا شکار ہو جاتے۔

ریاض ہٹ..... حسن ابدال۔ السلام علیکم اباہم فروری کا شمار ایک سرد اور خشک شام کو ملا انتظار کی گھنٹیاں ختم ہوئیں سرورقی کے متعلق بار بار کیا لکھوں؟ اتنا منفرد اور سندر ہوتا ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔ اس بار میری کہانی موجود ہے یہ میری کہانی کچھ وقت کے بعد شائع ہوئی خیر و برآید درست آید کے مصداق میں ادارے کا شکر گزار ہوں کہ میری سعی کو پذیرائی بخشتے ہیں اور قارئین پسند کرتے ہیں مشتاق احمد قریشی کی تحریر قیام پاکستان میں علماء کرام کا کردار ایک جامع مفصل اور حقیقت پر مبنی تحریر ہے۔ اس بات سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا کہ قیام پاکستان میں علماء کرام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہماری نئی پود جو انڈیا کے ڈراموں اور گانوں کی رسیا ہے اور جن کے ذریعے انڈیا ہماری نئی پود کے اخلاق اور کردار کو تباہ کر رہا ہے نئی پود اس سے یا تو بے بہرہ ہے یا پھر جان بوجھ کر اس زہر کو اپنے اندر اتار رہی ہے خدا را مستفضل جانیے۔ اب بڑھتے ہیں گفتگوئی طرف سب سے پہلا خط مبین رہا نہ سعید و (لاہور) کا ہے آپ نے بھائی کو بالکل فراموش کر دیا آپ کا تبصرہ خوب ہے۔ ہمیشہ کی طرح کافی عرصہ بعد بھائی مرفاروق ارشد (نورسٹ عباس) تشریف لائے ہیں۔ بھائی اب بالکل ٹھیک ہوں اور دوبارہ کہانیاں لکھ رہا ہوں اس بار دوبارہ بھائی پرچے میں موجود ہے اس پر تبصرہ ضرور کیجیے گا بھائی میں نے تو آپ کو یاد کیا تھا اور دل سے یاد کرتا رہا ہوں۔ پھر بھی اگر آپ نے محسوس کیا ہے تو معذرت چاہتا ہوں محمد اسلم جاوید بھائی سانحہ پشاور ہمارے برداشت سے باہر ہے۔ یقین کریں زمین چار دن میں مسموم رہا۔ نہ تو اخبار کا مطالعہ کیا اور نہ فی وی کے نزدیک گیا۔ ریاض حسین شمر بھائی شکر یہ کا شکر یہ۔ آپ کو کامیاب اپریشن پر مبارکباد۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ

باری تعالیٰ آپ کو ہر دکھ، بیماری اور پریشانی سے محفوظ رکھے، آمین۔ جب آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو جائیں تو میری دونوں کہانیاں اعتراف جرم اور کوہ نور پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ ادیب سید چمن (حیدر آباد) آپ کا خط کیا ہے آپ کی آپ جی جی سے آپ نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ آپ بہت واسلے ہیں آپ کے خط سے جہاں دکھ ٹپک رہا ہے۔ وہاں آپ کے جذبے، جواں مردی اور حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنا بھی ظاہر ہو رہا ہے بھائی تم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔

خزاں رکھے گی درختوں کو بے شرم کب تک

گزر رہی جائے گی یہ رات بھی تم حوصلہ رکھنا

کہانیوں میں سب سے پہلے قلندر ذات اور جگت سنگھ پڑھیں جگت سنگھ کے متعلق تو پہلے اپنے کسی خط میں لکھ چکا ہوں کہ یہ کہانی میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں لیکن اپنے من پسند رسالے میں پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے قلندر ذات کی یہ قسط بھی جاندار سے ظاہر نہیں تارا کی کہانی عشق لا حاصل، ایک خوب صورت اور سبق آموز کہانی ہے۔ بہن آپ کی تحریریں دن بدن خوب سے خوب ہوتی جا رہی ہیں۔ ظلیل جبار کی کہانی مدامت حسب معمول اپنے اندر ایک سبق لیے ہوئے تھی جو لوگ اپنی بیویوں کے ہوتے ہوئے نرگس جیسی لڑکیوں کی طرف راغب ہو کر ان کے چال میں پھنس جاتے ہیں ان کا انجام شہزاد جیسا بنتی ہوتا ہے جاوید احمد صدیقی کی کہانی پراسرار ہونے لگی بھی ایک اچھی کہانی ہے بہت خوب، باقی کہانیاں بھی اچھی اور خوب صورت ہیں خوشبو جتن میں عمر اسرار، ظاہر و چھپا، تارا، ریحانہ سعید، قدیر رانا، عمر فاروق ارشد بازی لے گئے۔ رانا حفیظ، ناطر، محمد اسلم جاوید نے بھی اچھا لکھا۔ بلکہ خوب لکھا گئی ہے بھائی کتنی بھی پر پے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی **داؤد پندی** السلام علیکم اکتی رنگوں سے سجا منظر اور انتخابی جاذب نظر ناٹک والے افق ملا اور پچھلے کہانی نمبر بھی بہار دکھا رہا تھا دستک لازوال اور اتر اول میں اترنے والی گفتگو میں بھی زبردست روش۔ محفل قارئین میں حدیث شریف تو ہر مسلمان کے لیے ایک اصول سبق سے بشرطیکہ مسلمان کچھ ذرا بھی احساس کریں تو قسمت ہی بدل جائے۔ گفتگو میں ساحل دعا بخاری کی وضاحت کرنا بھی خوب رہا دعا سے یہ لوگ جندہ رو کیوں نہ سمجھ گئے میں نے افق کے قارئین کو اتنا بھی کندہ نہیں سمجھتا ہوں آپ کے تبصرہ کو ذرا تفصیل میں ہونا چاہیے نا، ریاض بٹ جی یاد کرنے کا شکر یہ۔ مگر اس دفعہ آپ کی غیر حاضری لگ گئی۔ آپ کا تبصرہ ایک درد دل رکھنے والا ہی کر سکتا ہے دعا ہے کہ اللہ سب واسلے امان میں رکھے۔ محمد اسلم جاوید صاحب کا تبصرہ بھی اچھا تھا ضرور آتے رہیں جناب ادیب سید چمن اللہ کریم آپ کی گھریلو اور معاشی مجبوریاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے

صدقے دور کر دے آئین۔ پڑھائی اور اسکولوں کے متعلق بھی آپ کا تبصرہ زبردست تھا۔ ماریہ، اقرا وسیم آپ کی خاموشی شکر ہے کہ نوٹی۔ آپ کی مبارک سب کو قبول ہے لیکن یہ کیا صرف 5 تبصرے، بھئی سب لوگ گفتگو میں حاضری جلدی دیں ہم لوگ پر اصرار احتجاج کرتے ہیں۔ اس دفعہ 12 کہانیاں دی گئی ہیں پہلے تو عرض ہے کہ دل چسپ کہانی نمبر میں تین کہانیاں مثلاً مار گزیدہ (اسد علی) ایک رات (شبناز بانو) اور دوسری دنیا (حسب جو اعلیٰ) تو پوری پوری ماورائی اور پراسرار شخص کسی بھی پہلو سے اس نمبر کے لیے موزوں نہ تھیں اب ایسی کہانیوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ایک اور ظلم یہ ہوا کہ اس کہانی نمبر کے لیے سفر نامہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دلچسپ ہے بزاز بردست اور پھر مذہبی موضوعات پر مبنی بڑی اچھی رہی مگر اس شمارہ کے لیے بالکل نامناسب اور انجمن فاروق ساحلی کی مسر دلچسپ بھی ایسی ہی کہانی رہی کہ انتہائی عملیین موضوع پر یہ تین نکتوں پر مبنی کہانیاں کہاں سے ہمارے لیے دلچسپ ہوئی؟ جی ہاں سسپنس سے بھرپور مذہب کی تفصیل کے لیے انتہائی دلچسپ اور صاف ستھری کہانی مگر ہی پڑھنے کو ملتی ہے غلام میراں صاحب ضرور لکھا کریں اور اس کہانی کو تو آگے ضرور لے کر چلیں۔ ہاں ڈیڑھ کا پھاڑہ بھی آپ نے خوب فٹ کیا ہے، زبردست جناب۔ بہترین رہی کھلاڑی انارٹی (محمد اعظم خان) رہی دلچسپ اور خوشگوار کہانی اور تریاق اور آتش انتقام بھی زبردست تھیں اور مزہ آ گیا پڑھ کر عزت نفس اچھی رہی صرف واقعات کو اور بھی پھیلا یا جاسکتا تھا بہر حال خوب تھی۔ دونوں سلسلے بے حد دلچسپ اور پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ دونوں مصنف کو مبارک باد۔ ہاں آپ کا شکر یہ کہ پراسرار لکھی ویٹیشن صفحہ 87 پر شائع کی گئی اور دونوں ہماری کہانیوں میں اسرار احمد صاحب کی نوآ موز قاری کے لیے بے حد دلچسپ رہی نایافت تو راحیلہ نے پہلی دفعہ لے کر آئی ہیں اچھی رہی ذوق آجی اور خوشبوخن دونوں ہی بڑے سادہ سادہ رہے۔ تمام قارئین سلام اور دعا میں۔

ادیب سمیع چمن۔ حیدر آباد۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ دعا ہے کہ سب تقابلی آپ کو برآفت بر مصیبت پر پریشانی سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے۔ آپ کا سایہ تادیر سلامت رہے۔ آپ اور آپ کے اہلخانہ سدا خوش اور ہنستے مسکراتے رہیں نیز آپ کے ادارہ کے تمام ساتھی تمام اسٹاف اور ادارت کے صاحبان کراچی کے بر مصیبت پریشانیوں سے محفوظ رہ کر نئے نئے افق کے نئے نئے ولولے اور چیلوے سے نجات رہیں آئین۔ بہر کیف نئے افق کا مطالعہ جاری ہے تمام اہل قلم جن میں طاہر قریشی، بہمن راحیلہ ناز صاحب، جناب اسرار احمد، اسد علی، محمد اعظم صاحب، سلیم اختر صاحب، جناب خلیل جبار، بہمن شبناز بانو، انجمن فاروق ساحلی، امجد جاوید، شمیم نوید، عفاف احمد، عمر اسرار صاحب، ساحل دعا بخاری، محترم ریاض بٹ، محمد اسلم جاوید، قدیر رانا، ریاض حسین قمر صاحب، یہ سب نئے افق کے گلستان کے وہ پھول ہیں جن سے نئے افق کا گلستان مہک رہا ہے ان میں کئی

تحریریں بلکہ جتنے بھی لکھنے والے ہیں سب کا اپنا اپنا انداز ہے اور یقین جانئے سب ہی نئے افق پر ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں۔ میری سب سے محترم بہن شاعرہ ریحانہ سعید صاحبہ کی ہر غزل جو سب سے پہلے نمبر پر ہوتی ہے ان کی بھی خدمات کو سلام پیش کرتا ہوں خدا یہ گلشن ہمیشہ سجائے رکھے۔ نواز شریف صاحب سے گزارش ہے کہ محترم وزیراعظم صاحب یہ کیسا پیڑول سستا کیے جا رہے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ گوشت، چاول، دالیں، گھی، دودھ غرض سوائے پیاز اور آلوؤں کے ہر اشیا آپ کا منہ چڑا رہی ہے اور جناب وزیراعظم صاحب پاکستان میں پیسہ کہاں چلتا ہے بلکہ زرداری صاحبہ اور آپ کی جاو و گری سے تاجر، دکاندار، چھاپڑی والا، ہر دکان والا بڑے مزے سے خوف خدا سے عاری ہو کر ساڑھے آٹھ کی جگہ نو روپے، ساڑھے نو کی جگہ 10 روپے وصول کر کے جہنم کی آگ کی طرف بڑھے جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں ذرے ذرے کا حساب ہے حلال میں حرام کس حکومت کردار رہی ہے ابھی غور کیا ہے اس بات پر دکانداروں کو ذرا خدا کا خوف نہیں کہ خدا کو کیا مند و کھائیں گے۔ وہ پچاس پیسے زیادہ نہیں تو پچاس پیسے کا مال بھی ملے گا۔ آج پورا پاکستان مصیبتوں اور آفات کی زد میں لھرتا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے توبہ کریں ناپ تول میں ہی نہ کیا کریں ملاوٹ نہ کیا کریں اور وزیراعظم صاحب سب سے زیادہ پیڑ اللہ کے ہاں آپ کی حکومت کی ہوگی۔ اللہ پاکستان پر اور پاکستان کے تمام لوگوں پر رحم کرے اپنی حق صداقت اور ایمانداری کی راہ نصیب فرمائے آمین

۹۱۱

مستندوں سے گزارش
 ۱۔ مسودہ صاف اور خوشخط نہیں۔
 ۲۔ خطے کے دائیں جانب محاذ مذکور ہونی چاہئے۔
 ۳۔ خطے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر باقی صرف نیلی یا سیاہ درشتی کا ہی استعمال کریں۔
 ۴۔ خوشبو لگنے کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور درج ہو کر رہے۔
 ۵۔ مذاق ہی سے لے کر لکھی جانے والی تمام خبروں میں کتابی حوالے ضرور درج ہو کر رہیں۔
 ۶۔ نوٹوں اسٹیت کہانی قابل قبول نہیں ہوتی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور نوٹوں اسٹیت کو الگ کرنا اپنے پاس محفوظ رکھیں۔
 ۷۔ کیونکہ ادارہ نے قابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سہارا نہ دیا ہے۔
 ۸۔ مسودہ کے آخری صفحہ پر دو میں اپنے طعن، مزاح اور مبالغہ آمیز فقرہ درج کرنا تو بے گہری ہے۔
 ۹۔ لکھنؤ کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو موصول کی 3 تاریخ تک یہ یاد دہانی کیے۔
 ۱۰۔ اپنی کہانیاں دفتر کے پانچ ورکشاپ کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 تقریریں پیسہ راجہ اللہ ہارون روڈ کراچی۔

مارچ ۲۰۱۵ء

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

مشتاق احمد قریشی

اللہ

اللہ

تفسیر: آیت مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے تمام سوالات کا جو ذاتِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں ملحد اور منکرین کرتے رہتے ہیں سب کا مفصل جواب ہی نہیں دیا بلکہ یہ بات بھی خوب اچھی طرح بتادی کہ اللہ کا نبی جسے شرفِ کلام الہی بھی حاصل ہوا ہو جبکہ حضرت موسیٰ سے پہلے نہ بعد کسی نبی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا کہ وہ براہِ راست ربِّ کائنات سے ہم کلام ہوا ہو۔ ایسے جلیل القدر نبی کے ساتھ جو واقع جس طرح پیش آیا وہ اللہ نے اس آیت مبارکہ میں ارشاد فرما دیا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے اور وہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان سے براہِ راست گفتگو فرمائی تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے اپنے شوق کا اظہار ”رب ارنی“ کہہ کر کیا جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ”لن ترانی“ فرما کر دیا۔ ”یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا“ اس سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچی اور ثابت ہوا کہ دنیا میں کوئی انسانی آنکھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ عالی کو دیکھنے پر نسی طرح بھی قادر نہیں ہے لیکن روزِ آخرت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جب نئی زندگی عطا فرمائے گا اور سب کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا تو ان آنکھوں میں اتنی قوت بصارت عطا فرمائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کو برداشت کر سکیں یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا صرف اہل ایمان متقی لوگوں کو ہی یہ سعادت میسر ہو یا آیت مبارکہ میں ربِّ ذوالجلال نے واضح فرما دیا ہے اس نے اپنے نبی کی خواہش کو پورا کرنے اور اسے سندو آئے والی تمام امتوں اور انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اپنی تجلی پہاڑ طور پر فرمائی تو وہ پہاڑ رب کی تجلی برداشت نہ کر سکا اور نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام برداشت کر سکتے وہ بھی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہیں معلوم ہوا کہ انسانی قوتِ ادراک کی حدود کیا ہیں انہیں عملاً معلوم ہو گیا کہ انہوں نے یہ سوال دیدار الہی کا کر سکتے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے تب ہی انہوں نے فوراً ہی اعتراف کیا کہ اے مالکِ دو جہاں تیری ذات پاک ہے میں تو بہ کرتا ہوں میں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا میں پہلا مسلمان ہوں کیونکہ رسول تو پہلا مسلمان ہی ہوا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہے سب سے پہلے وہ اپنی رسالت اور اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام الہی پر ایمان لاتا ہے کیونکہ جبرہوں کو یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان کا اعلان کریں۔ نبی کا سب سے پہلے ایمان لانے کا اعلان قرآن کریم میں کافی مقامات پر

آیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ تحلیلی الہی کیسی تھی! یقیناً کوئی انسان اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بیان کر سکتے نہ اس کا ادراک کر سکتا ہے۔ یقیناً وہ ایک بڑا ہی حیران کن اور خوفناک منظر رہا ہوگا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کلمات الہی سن رہے ہوں گے اور ربّ کا کلمات سے ہم کلامی کے شوق میں ان کی روح سمیت الہی بلند ہو رہی ہوگی۔ ایسی حالت میں وہ یقیناً بھول گئے ہوں گے وہ رشوق الہی ان پر حاوی ہو گیا ہوگا ایسے میں انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر فرمائش کر دی ہوگی۔ ان کی یہ فرمائش یا مطالبہ جو اس گزہ بشریت کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی امر سمجھانے کے لئے کہ اسے اگر ممکن بنا دیا جائے تو بھی کسی انسان میں وہ طاقت ہی نہیں ہے جو وہ الہی کو برداشت کر سکے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی جنیل القدر رستی کی فرمائش دیدار الہی جو ان کی حب الہی اور شوق و امید کا مظہر ہے کہ وہ عالم شہود میں ذات باری کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دو ٹوک دیا۔ ”کیونکہ مجھے نہیں دیکھ سکتا۔“

لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ان کے ساتھ خصوصی شفقت و محبت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سمجھا دیا کہ تم میں وہ طاقت ہی نہیں ہے اس بات کو ہی دلیل سے اس طرح سمجھایا اور فرمایا۔ ”ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر وہ اپنی جد قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔“ کیونکہ پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ جتنے والا ہے اور زیادہ متاثر ہونے والا بھی نہیں ہے اور پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ قبولیت کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ لیکن جب ”ان کے ربّ نے پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) غش کھا کر گر پڑے۔“

اس سارے واقعے کو اگر سمجھا جائے اور سوچا جائے تو یہ ایسی حقیقت ہے جو قرآن کریم کچھ اگلے سے ربّ کا کلمات نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے تمام عالم انسانیت کو سمجھائی ہے۔ اس کے علاوہ ہر انسانی کوشش اس سب سے بے معنی اور صرف لفظوں کے ذریعے ذہن انسانی کو ابھاتا ہی ہوگا۔ جس طرح ہم یہ نہیں سمجھ سکتے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس طرح ہم کلام ہوتے تھے وہ کن ذرائع اور ادراک سے ہدایات اخذ کرتے تھے کلمات کس طرح کے تھے؟ یہ سب تصورات ہم عاجز بندوں کی محدود قوت فکر و فہم کے لئے ناقابل تصور ہیں۔ اس لئے کہ ہماری قوت ہدیر کہ محدود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور ربّ کا کلمات کا تعلق خاص کیا تھا؟ کیسے تھا یہ تعلق ہماری محدود سوچ و ادراک میں نہیں سما سکتا اس لئے اس سلسلے میں خاموشی ہی سب سے بہتر ہے۔

(جاری ہے)



حصہ اول مقدمہ

نوشتہ عادل

انسان کی زندگی کی اہمیت اب ہمارے پاس سیکھ سے بھی کم رہ گئی ہے اور اس کی وجہ اگر حکمران ہیں جو اپنی حکومت بچانے اور پیسہ بنانے کے لیے معصوم جانوں سے کھیل کر عوام کو اس طرف الجھا دیتے ہیں اور خود بہت خاموشی سے اپنی جال چل جاتے ہیں۔ مگر ان کی یہی حرکات کئی مروجعات کو جنم دے کر انہیں پھسا دیتے ہیں۔

نوشتہ عادل نے معاشرے میں ہونے والی سرگرمیوں اور دہشت گردی پر بہت غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ سیاسی جرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک جٹم کشا تحریر جسے آپ نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔
”ایک ساتھ سو لوگوں کو ہارٹ ایک۔“ ڈی ایس پی گھبرا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور چہرے سے پریشانی پسینہ بن کر ٹپک رہی تھی۔
”ہاں سر اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر ان میں سے کوئی بھی دل کا مریض نہیں تھا۔“
”ضرور کھانے میں کچھ ملایا گیا ہوگا۔“ ڈی ایس پی نے اپنا خیال پیش کیا۔
”نہیں سر! ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ کسی کی بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اس کے باوجود میں نے احتیاطاً وہاں موجود کھانے پینے کی چیزوں کے سیمپل حاصل کر کے لیبارٹری میں بھیج دیئے ہیں۔“
”جتنے بھی شیف یا دیگر تھے ان پر بھی تو شک کیا جاسکتا ہے؟“ ڈی ایس پی نے ایک اور خیال پیش کیا۔
”ان پر شک کرنا بالکل بیکار ہے سر۔“
”کیوں کیا تم ان سے تفتیش کر چکے ہو؟“ ڈی ایس پی نے سوالیہ نظروں سے کریم خان کی طرف دیکھا۔
”وہ سب بھی اپنے اپنے کمروں میں مردہ پائے گئے ہیں۔“

”یہ کراچی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ لاشیں ہی لاشیں..... ہر طرف چیخ و پکار اور رونا سنائی دے رہا ہے۔ میڈیا نے الگ طوفان کھڑا کر رکھا ہے۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟“ ڈی ایس پی زاہد علی نے پریشان لہجے میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انسپکٹر کریم خان سے کہا۔
”سر! کل رات رئیس علی نواز کے فارم ہاؤس پر پارٹی تھی۔ پارٹی میں سو کے قریب لوگ شریک تھے۔ رات گئے تک پارٹی چلتی رہی اور ساڑھے بارہ بجے تک خوب دھوم دھڑکا ہوتا رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کو ٹھکانا شروع کیا۔ لیکن لگ بھگ بیس افراد ایسے تھے جو ابھی بھی پارٹی میں مست تھے۔ باقی سب اپنے اپنے گھروں کو پہنچ چکے تھے۔ ڈیزھ بجے تک سب خیریت رہی مگر ڈیزھ بجے کے بعد پارٹی میں شریک لوگ ہارٹ ایک سے مرنے لگے اور دو بجے تک سب ہی موت کی آغوش میں جا چکے تھے۔ شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر بھی حیران ہیں۔ کسی ایکے دی کو بھی بچایا نہیں جاسکا ان سب کو ایک ساتھ ہارٹ ایک کیسے ہوا اس کی توجیہ کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔“ کریم خان نے

”کیا کہہ رہے ہو کریم خان۔“ ذی ایس پی بالکل بوکھلا گیا۔ کچھ دیر میں بوکھلاہٹ مہم ہوئی تو بولا۔ ”اور رئیس علی نواز کے خاندان والے۔“

”ان کے دو بیٹے۔ ایک بیٹی اور ایک اکلوتی بیوی۔ سب ختم۔ کسی بیماری کی وجہ سے رئیس علی نواز خود پارٹی میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اب یا تو انہیں خوش نصیب بہہ سکتے ہیں یا.....“ کریم خان نے اپنی بات اصروری چھوڑ دی۔

”اب رئیس علی نواز کہاں ہے؟“ ذی ایس پی نے پوچھا۔
”وہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے۔“

”مطلب؟“
”آغا خان اسپتال میں ہیں۔ سنا ہے کہ ان کی حالت بہت مازک ہے۔“ یہ کہہ کر کریم خان کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ ”شک کی سوئی بار بار ایک ہی آدمی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔“

”کیا رئیس علی نواز کی طرف؟“
”نہیں۔“ کریم خان نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔
”تو اور کس پر؟“

”پارٹی میں جتنے بھی لوگ شریک تھے ان سب کی لاشیں منہ ہود ہیں۔ صرف ایک آدمی ہے جس کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ کہاں ہے اور زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔“ کریم خان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”تو وہ صاحب کون ہیں جن کی طرف تمہارے شک کی سوئی اشارہ کر رہی ہے۔“ ذی ایس پی نے جھس سے پوچھا۔

”طارق محمود۔“ کریم خان کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ کریم خان نے اجازت طلب نظروں سے ذی ایس پی کی طرف دیکھا انہوں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ کریم کالی ریسو کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بولو۔“

دوسری طرف سے ہاتھ کہا گیا جسے سن کر وہ ٹک بٹک

چلا اٹھا۔ ”کیا۔ کیا کہہ رہے ہو۔“ اور جڑ بڑا کر کرسی سے اٹھ گیا۔ ذی ایس پی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”او کے میں تھوڑی دیر میں وہیں پہنچتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر کریم خان نے فون ڈس کنیکٹ کر دیا اور تھکا تھکا سا کرسی پر گر گیا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بچے کا پسندیدہ کھلونا اس کے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی لوٹ گیا ہو۔

ذی ایس پی جو کافی دیر سے اس کے چہرے پر الجھنے والے تاثرات کو دیکھ رہا تھا زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا۔ ”کیا ہوا۔ کس کا فون تھا اور یہ تم استے پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟“ انہوں نے ایک ہی سانس میں تین سوال کر ڈالے۔

کریم خان کچھ دیر تک ذی ایس پی کا چہرہ دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”طارق محمود بھی ختم۔“

”اوہ۔ یعنی اب اس پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔“ ذی ایس پی کے چہرے پر بھی پریشانی کے بادل چھانے لگے۔

”شک تو کرتا ہی پڑے گا سراسر اس پر یا کسی اور پر کیونکہ وہ ہمارے ایک سے نہیں مرا۔“
”تو پھر وہ کیسے مرا؟“

”کسی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔“ کریم خان انتہائی مایوسی سے بولا۔
”اوہ مائی گاڈ۔ کوئی کس نے ماری۔ کچھ پتا چلا۔“
”نہیں۔“

اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے اور ذی ایس پی کے کیمن میں خاموشی رائج کرنے لگی۔ دونوں ہی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر ذی ایس پی نے ہی کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیس بہت الجھ گیا ہے۔ تم بغیر کسی دباؤ کے اس کیس پر برکا م کر سکتے ہو۔ مگر یہ کیس جلد سے جلد سلجھانے کی کوشش کرنا اور ہاں ہی بھی مدد یا تعاون کی ضرورت ہو تو باخوبی بہہ سکتے ہو۔“

”جو بھی مانگوں گا آپ دیں گے۔“ کریم خان نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ماں خوشی سے۔“

”مجھے اعیان چاہئے۔“

کریم خان کی بات سن کر ڈی ایس پی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کریم خان سے پوچھا۔ ”تم نے ابھی کیا کہا؟“

”سر! مجھے اعیان چاہئے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ ایک افسر ہے بلکہ ہم سب میں بہترین۔“

”تمہیں پتہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ ڈی ایس پی نے کریم خان کی بات سچ میں کانٹتے ہوئے کہا۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کریم خان کوئی ایسا مطالبہ کرے گا جسے وہ چاہتے ہوئے بھی پورا نہیں کر سکتے تھے۔ ”ہاں سر! انسپکٹر اعیان کے ساتھ مل کر میں یہ کیس آسانی سے سلجھا سکتا ہوں۔“ کریم خان ابھی تک امید کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

”تم جانتے ہو کہ وہ کتنا جنونی اور بدتمیز انسان ہے۔ وہ ہمیشہ قانون کو پاؤں کی جوتی پر رکھ کر کام کرتا ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ سینڈ کیٹ کیس میں اس نے کیا قیامت ڈھائی تھی۔ خون کی ندیاں بہا دی تھیں اس نے۔ سینڈ کیٹ کے ممبرز کو متنی بے دردی اور بے رحمی سے مارا تھا اس نے۔ اس طرح تو کوئی پاگل بھی نہیں مارے گا کسی کو یاد سے تاسیڈ یا نے کتنا وہال بچایا تھا۔ وہ تو کسی طرح اسے معطل کر کے حالات قابو میں کیے تھے۔ ورنہ ہمارے محکمے کو اپنی عزت بچانا مشکل ہو گیا تھا۔“ ڈی ایس پی نے ایک بار اور اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سر! آپ کو بھی یاد ہونا چاہئے کہ پچھلے چند سالوں سے سینڈ کیٹ نامی گینگ نے شہر میں مافی دہشت پھیلا رکھی تھی اور ہم لاکھ کوشش کے باوجود ان تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ وہ اتنا طاقتور گینگ تھا کہ قانون اس کے سامنے بے بس نظر آتا تھا۔ مگر اعیان نے صرف تین مہینوں کی محنت کے بعد وہ کیس ہمیشہ کے لیے حل کر دیا

تھا اور ان کو ختم کرنے کا واحد راستہ وہی تھا جو اعیان نے اختیار کیا تھا۔“ کریم خان نے ایک اور کام کو شش کرتے ہوئے کہا۔

”سوری کریم خان! فی الحال تم کو اعیان کے بغیر ہی کام کرنا ہوگا۔ اعیان کا سسپینشن ابھی ختم نہیں ہو سکتا۔“ ڈی ایس پی نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

کریم خان مایوسانہ انداز میں باہر نکل آیا اور سیاہی آصف سے بولا۔ ”گجڑی نکالو۔“ اور اسے اس جگہ چلنے کو کہا جہاں طارق محمود کا قتل ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خان وہاں پہنچ کر سب انسپکٹر جبران دین بوزسرفراز سے تفصیل معلوم کر رہا تھا۔ سید وٹوں سب انسپکٹر کریم خان کی نیم کا حصہ اور اس کے دو بازو کی مانند تھے۔ بے حد ایماندار اور کریم خان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ جبران دین نسبتاً خوش مزاج جبکہ سرفراز اپنے حال میں مست رہنے والا انسان تھا۔

جبکہ کریم خان کی شہرت پورے محکمے میں بہت اچھی تھی۔ وہ چھ فٹ ایک انچ قد کا مالک تھا۔ رنگ گورا اور آنکھوں سے ذیانت نکلتی تھی۔ اس کی چھ ماہ پہلے ٹوپی سے شادی ہوئی تھی جو ان دنوں اپنے نیکے دوسرے شہر گئی ہوئی تھی۔

کریم خان کا ایک ہی دوست تھا اعیان جسے وہ جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ کریم خان کا کوئی دوسرا دوست نہیں تھا یا پھر یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اعیان نے کریم خان کو کسی دوسرے سے دوستی کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور اعیان جیسا دوست پا کر ایسے بھی کسی دوسرے دوست کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ جتنی محبت کریم خان کو اعیان سے تھی اس سے زیادہ محبت وہ کریم خان سے کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے کچھ بھی۔

کریم خان کی شہرت ایک ایماندار اور ہوشیار پولیس آفیسر کی حیثیت سے پورے محکمے میں زبان زد عام تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عزت نروانے کے لیے عزت کرنا بے حد

”سر پارٹی والی جگہ سے رئیس علی نواز کے فنگر پرنٹس پاسے گئے ہیں۔ جبکہ سب کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے پارٹی میں بالکل شرکت نہیں کی تھی۔“ چراغ دین نے کریم خان کے سر پر ایک اور ہم پھوڑا۔

”خیر دیکھتے ہیں۔ تم لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو اور پارٹی میں ملنے والے فنگر پرنٹس ہر لاش سے منچ کر دو۔ دیکھو کوئی نئی بات سامنے آتی ہے یا نہیں۔“ کریم خان کی ہدایت ملنے ہی دونوں حرکت میں آ گئے۔

پارٹی میں رئیس علی نواز کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا بہت ہی اچھے کی بات تھی جبکہ اس کے سارے ملازمین اس بات کے گواہ تھے کہ وہ پارٹی میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ ایک دن پہلے ہی اسپتال میں داخل ہو چکے تھے۔ دال میں کچھ نہ کچھ تو کالا ضرور تھا جسے کریم خان نے سفید کرنا تھا۔

کریم خان نے جیب میں بیٹھتے ہی آصف کو آغا خان اسپتال چلنے کا کہا رئیس علی نواز اسی اسپتال میں زیر علاج تھے۔ کریم خان اس سے مل کر کچھ باتوں کی وضاحت چاہتا تھا۔ آصف سڑک پر جیب دوڑانے لگا اور کریم خان کا دماغ کہیں کی ہار کیوں پر دوڑنے لگا۔

”رئیس علی نواز اس کھیل کا ماسٹر مائنڈ ہو سکتا ہے۔“ یہ کریم خان کی سوچ تھی۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کا اپنا خاندان اس کی لپیٹ میں کیوں آتا۔“

”مگر ہو سکتا ہے کہ اپنے خاندان کو بھی اس نے اس لیے نشانہ بنایا ہو کہ کسی کو اس پر شک نہ ہونے پائے۔

ویسے بھی کچھ پائے کے لیے کچھ ہونا بھی پڑتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رئیس علی نواز کیا پانا چاہتا تھا اتنی بڑی واردات کے ذریعے۔“

”لیکن وہ ایسی کیا چیز پانا چاہتا تھا جس کے لیے اسے ایسا انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اس کی ایک ساتھ اسنے سارے لوگوں سے دشمنی ہو اور اگر ہو تو اسنے دشمنوں کا اپنے دشمن کی پارٹی میں ایک ساتھ جمع ہونا

ضروری ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں سے نہایت محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا اس لیے اس کی ٹیم کا ہر ممبر اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ تین برسوں میں وہ چھوٹے بڑے میں سے زائد کیسز پر کام کر چکا تھا جنہیں اس نے جاکسی پریشانی کے حل کر بھی کر لیا تھا۔ اس کے شاندار ریکارڈ سے ڈی ایس پی زاہد علی بہت خوش تھا اور وہ کریم خان کی بہت عزت کرتا تھا اور پیچیدہ کیسز اسے ہی دیے جاتے تھے۔

مگر کریم خان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیس اس کے لیے کتنی بڑی مصیبت کا باعث بننے والا ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کیس کی وجہ سے اس کی زندگی میں کبھی بالکل چھنے والی ہے یا شاید یہ بالکل شروع ہو چکی تھی۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

”سر! اسے صرف ایک ہی گولی ماری گئی ہے وہ بھی سیدھی سر میں۔“ چراغ دین نے بتایا۔

”اس کے بعد گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے چلتی گاڑی میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ کوئی لٹنے سے طارق محمود گاڑی پر قابو نہ رکھ سکے گا اور گاڑی درخت سے ٹکرا کر رک گئی۔“ سر فرزانے مزید تفصیل سننا گاہ کیا۔

کریم خان نے دیکھا کہ گاڑی کی حالت واقعی بہت بری تھی اور اس سے زیادہ بری حالت طارق محمود کی تھی۔ اس کے سر میں ایک سوراخ تھا۔ باقی جسم پر بھی کئی چوٹیں تھیں جو کہ یقیناً ایکسیڈنٹ کی وجہ سے آئی ہوں گی۔ گاڑی میں خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

”اس کا مطلب ہے قاتل ماہر نشانہ باز ہے۔“ کریم خان نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”چلتی گاڑی میں سیدھی سر میں گولی اتارنا بہت بڑی بات ہے۔“

”سر! ایک اور سنسنی خیز خبر بھی آپ کو سنائی ہے۔“ چراغ دین نے کہا۔

”وہ کون سی؟“

بھی ناممکن ہے اور غریب شیف اور ویٹس دشمنی کا شکار ہوئے۔ ”کریم خان خود ہی سوال کر رہا تھا اور خود ہی ان کے جواب بھی دے رہا تھا۔

”مگر یارنی میں رئیس کے فٹس پرس کا پایا جاتا۔ طارق محمود کا گل۔ چھ نہ کچھ اور تیس نہ تیس تو گزری ضرور ہے۔“ کریم خان کے شک کا دائرہ سمیٹتے ہوئے رئیس علی نواز پر دم بھڑک رہا تھا۔

وہ طرح طرح کے خیالوں کے سمندر میں ڈوبتا تھا۔ آغا خان اسپتال پہنچ گیا۔

ابھی وہ اپنی جیب سے اترے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے دل میں جلنے والی امید کی شمع پھڑپھڑا کر دم توڑنے لگی۔ اسپتال کے سامنے ہی سی ٹی ٹی کا رپورٹ ایک خبر کی کوریج کر رہا تھا۔

”ماظرت میں اس وقت آغا خان اسپتال کے باہر موجود ہوں اور مصدقہ اطلاعات کے مطابق رئیس علی نواز جو یہاں زیر علاج تھے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“ کہا جا رہا ہے کہ۔۔۔۔۔



شام بڑھ چکی تھی اور رات دھیرے دھیرے جوان ہوتی جا رہی تھی۔ چاند اپنا قدم آسمان کے سینے پر رکھ کر اپنی چاندنی کو زمین پر بھیر رہا تھا۔

کریم خان اس وقت اعیان کے ساتھ ہینفس کے ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ عیان چھ فٹ دوڑنے کا لمبا چوڑا جوان تھا اس کا کسرتی بدن ہالی ووڈ کے کسی ہیرو کی یاد دلاتا تھا۔ نیلی نیلی نیشلی آنکھیں جن میں اگر کوئی ایک بار دیکھ لے تو اپنے آپ کو بھولے پر مجبور ہو جائے۔ چوڑی پیشانی اس کے ذہین ہونے کی گواہی دے رہی تھی اور لمبے لمبے بال ہوائس اڑتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم رہے تھے۔ رنگ روپ ایسا کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جو اسے ایک بار دیکھے وہ واپس دیکھنے پر مجبور نہ ہو۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ کسی یونانی دیوتا جیسا لگتا تھا جو شاہ نعلی سے زمین پر اتر آیا تھا۔

پارک میں کئی حسین لگائیں اعیان کو گھور رہی تھیں۔ گمراہ ان سے سب سے بے نیاز کریم خان سے باتوں میں مصروف تھا جو اسے اپنی آج کے دن کی دوز دھوپ کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

”بچھلے تین سالوں میں میں سے زیادہ کیسز حل کر چکا ہوں۔ مگر آج تک اتنا لکھا ہوا کیس نہیں ملا۔ سولوگ ایک ساتھ جیسے ہارٹ ایک کا شکار ہوئے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کھانے پینے کی ہر چیز کا ٹیسٹ کروایا لیکن سب بیکار۔ جس پر شک کرتا ہوں تھوڑی دیر بعد ہی کے مرے کی خبر مل جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اسے ابھننے نے تو میرے دماغ کے سارے ہار بلا کر رکھ دیے ہیں۔“ کریم خان پریشانی سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا۔

”میرے پاس فخر ہے۔“ اعیان نے کہا۔ ”تو میں کیا کروں۔ ڈر جاؤں۔“ کریم خان نے کہنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”ارے تو یہ کرو۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تو اپنے فخر سے تمہارے تیس کے اچھے ہوئے دھاگے کاٹنے کی بات کر رہا ہوں۔“ اعیان نے صفا فحشہ ہوئے کہا۔

”اوہ! میں سمجھا تم فخر دکھا کر مجھے لوٹا چاہتے ہو۔“ کریم خان نے تیزی سے سائیس لیتے ہوئے کہا جیسے اس کی سائیس اعیان کی بات سن کر اکھڑ چکی ہوں۔

”تمہارے پاس لوٹنے کوئی کیا۔ عزت تو کب کی بھا بھی گئے ہاتھوں لوٹا چکے ہو۔“ اعیان کی اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ اور اچانک کسی کو دیکھ کر اعیان کی ہنسی کو بریک سے لگ گئے۔ اس نے فوراً کریم خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے گیٹ کی جانب کھینچتا ہوا بولا۔ جلدی نکل رہا ہے۔“



”پیاری بانی ازمدگی میں پہلی بار تم سے کچھ کہنے کی ہمت کر رہا ہوں اور دعا ہے کہ یہ پہلا موقع آخری ثابت نہ ہو۔“ بچپن میں ایک بار تمہاری گہری سیاہ آنکھوں سے

دیکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ جھینپ گیا۔ ”مگر اس طرح لانے کا کیا مطلب ہے۔ سیدھی طرح نہیں کہہ سکتے تھے کیا۔“ اس کی جھنجھاہٹ میں کمی نہیں آئی۔

اعیان اس کی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ یہ مسکراہٹ کریم خان کے غصے کو اور ہمیز دینے لگی۔ ”تم..... تم..... تم.....“ وہ اعیان کو کوئی اچھی سی گالی دینا چاہتا تھا مگر جب اس موقع پر کوئی گالی یا نہیں آئی تو بولا۔ ”تم پاگل ہو۔“

”اس میں کوئی شک ہے کیا۔“

”جو تھوڑا بہت شک تھا۔ وہ بھی آج دور ہو گیا۔“

”اس طرح چلتے بھٹتے رہو گے تو کالے ہو جاؤ گے اور ہو سکتا ہے ہماری پیاری سی بھابھی اس کالے سائڈ کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔“ اعیان پر کریم خان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا جو ابھی تک کھا جانے والی نظروں سے اعیان کو گھور رہا تھا۔ اس نے چائیز رائس لیے اور اپنے ہاتھوں سے کریم خان کو کھلانے لگا۔ تھوڑا سا غرہ دکھانے کے بعد کریم خان کو کھانا ہی پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے مزید دیر کی تو اعیان زبردستی اس کے منہ میں نوالہ ٹھونسے کی کوشش کرے گا۔ پھر کریم خان نے عیان کو نوالہ کھلایا اور دونوں ایک دوسرے کو کھلانے لگے۔ اس پاس بیٹھے لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ وہ جب بھی ساتھ کھانا کھاتے تھے تو ایک دوسرے کو کھلا کر ہی کھاتے تھے۔

داشور کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ایک چل ایک چل ایک لمحہ انسان کی زندگی کو بدل کے رکھ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی سوچ تک بدل جاتی ہے۔ وہ جینے کا نیا طریقہ سیکھ جاتا ہے اور اتنا کچھ بدل جاتا ہے کہ خود انسان ہی بدل کے رہ جاتا ہے۔ لیکن ہانیہ کی زندگی کسی لمحے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک خط کی وجہ سے بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ خط جو اسے نو سال پہلے ملا تھا۔ وہ خط جس نے اسے محبت کے اندھیرے راستوں پر لا کھڑا کیا تھا اور اب وہ اس راستے پر اتنی دور آ چکی تھی کہ اس کا واپس لوٹنا ممکن ہی نہیں تھا۔

آنکھیں کیا ملائیں! میں تمہاری آنکھوں کے اندھیروں میں کھوسا گیا۔ لوگ زندگی بھر روشنی کی تلاش میں رہتے ہیں مگر جب میں سیاہ آنکھوں کے اندھیروں میں ڈوبا تو پتہ چلا کہ زندگی کتنی حسین ہے۔

نزشتہ آٹھ برسوں سے میں ان اندھیروں میں جھلک رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ پوری زندگی اسی ایک چل میں بتا دوں۔ بچپن میں جب بچے کھیلے کودنے اور کھانے پینے کے بارے میں سوچتے ہیں میرے پاس تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ سوتا تو تمہارے خواب دیکھتا اور جاگتا تو تمہیں ڈھونڈتا رہتا اور ہر روز خدا سے ایک ہی دعا کرتا تھا کہ وہ تمہاری ایک جھلک دکھا دے۔“

ہانیہ ہر روز کی طرح اس خط کو پڑھتے جا رہی تھی جو آج سے نو سال پہلے ملا تھا۔ اس کی آنکھیں غم بوری تھیں تب ہی اسے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہستہ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے خط کو سائیڈ ٹیبل کی دراز میں چھپا دیا۔ پھر وہ اٹھی اور اپنے گلابی گالوں پر بچا نسوؤں کو پونچھ کر دروازہ کھولا۔



”اب بتا بھی دو کہ بارک میں تم نے ایسا کون سا بھوت دیکھ لیا جو مجھے کھینچے ہوئے یہاں لے آئے۔“

دونوں اس وقت ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کریم خان حیران پریشان سا اعیان کے ساتھ کھچا چلا آیا تھا۔ راستے میں ڈرائیوٹ کرتے ہوئے بھی اعیان خاموش تھا اور اب جہت ہوٹل میں بیٹھ کر وہی کو کھانے کا آرڈر دے کر اور تھوڑا بہت کھا کر بھی وہ چپ رہا تو کریم خان کو پوچھنا ہی پڑا۔

”کچھ نہیں یاد۔ بہت تیز بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے تمہیں لے آیا۔“ اعیان نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا۔“ کریم خان تقریباً چیخ ہی اٹھا۔ اس کی چیخ سن کر قریب بیٹھے ہوئے لوگ مڑ کر انہیں عجیب نظروں سے

اب اس کی سوچوں کا محور صرف وہ شخص تھا جس کا نہ اسے نام معلوم تھا نہ پتہ اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ ایسی گمنام محبت کا شکار ہو چکی تھی بانیہ۔ صرف وہ خط تھا جو لکھنے والے سے متعلق واحد نشان تھا اور اس خط کے علاوہ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی بانیہ نے اس گمنام کو اپنے دل پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اس انجان شخص کی محبت میں ذوب ہو چکی تھی بلکہ محبت کی منزلوں سے بھی آگے نکلتے ہوئے وہ اس سے عشق کرنے لگی تھی۔ اگر اسے شکر کا خدشہ نہ ہوتا تو وہ شاید اسے پوچھنے تک لگتی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس سے جتنی محبت وہ انجان شخص کرتا ہے اتنی محبت دنیا میں اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

بانیہ اسے حد سے زیادہ چاہتی تھی مگر پھر بھی اسے اپنی محبت اپنے محبوب کی محبت کے آگے حقیر نظر آتی تھی۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا اور وہ بھی صرف ایک خط کی بدولت جو نو سال پہلے اسے ملا تھا۔

پچھلے نو سالوں میں اسے عادت ہی ہوئی تھی کہ جب تک وہ اس خط کو پڑھ نہیں لیتی تھی اسے فیند ہی نہیں آتی تھی۔ حالانکہ ان برسوں میں وہ اس خط کو لاکھوں بار پڑھ چکی تھی لیکن ہر بار وہ تحریر اسے بالکل نئی لگتی تھی اور ہر بار اسے پہلے سے زیادہ خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ اب تو یہ اس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا کہ وہ اس خط کو پڑھتی خوش ہوتی اور پھر خدا سے گلہ کرتی جس نے ابھی تک اس کا محبوب اس سے نہیں ملا یا تھا اور پھر دعا مانگتے مانگتے سو جاتی۔

مگر آج وہ نہ خدا سے گلہ کر سکتی تھی اور نہ ہی دعا مانگ سکتی تھی اور وہ یہ بھی کہ کوئی دخل اندازی کرتے ہوئے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی اس کی مٹی کھڑی تھی۔

"لو بیٹا! آج شام کو تمہارے نام یہ خط آیا تھا۔ میں دینا ہی بھول گئی۔ اب یاد آ گیا۔ غورزی یہی یادداشت ہوئی ہے۔" مٹی خط اسے تھا کر نیچے چلی گئی۔

اس نے خط دیکھا جس پر اس کے گھر کا پتہ لکھا ہوا تھا مگر وہ تحریر اس کے لیے نامانوس تھی اور نہ ہی سمجھنے والے کا کوئی نام لکھا تھا۔ اس نے اتفاقاً کھول کر کاغذ باہر نکالا۔ اس پر لکھی تحریر دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ کیونکہ اس تحریر کو وہ جیسے بھلا سکتی تھی۔ یہ وہ تحریر تھی جسے وہ ہر رات پڑھتی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو۔ اس خوشی میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ لگانے پر جس تحریر میں پتہ لکھا تھا وہ مختلف تھی اور یہ شاید اس کی بہت بڑی غلطی ثابت ہونے والی تھی۔

زیادہ خوشی، غم اور غصہ انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ماتہ کر دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ بانیہ کے ساتھ بھی تھا۔ اس خط کو پا کر وہ ساری دنیا کو بھول چکی تھی۔

اس نے دروازہ بند کیا اور باستر پر دراز ہو کر خط پڑھنے لگی۔

"پیاری بانی! تمہارا شہر کیا چھوڑا ایسا لگتا ہے اپنا دل اپنی جان اپنی دنیا سب کچھ وہیں تمہارے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ پہلے دن میں ایک دو بار تمہارا دیدار ہو جاتا تھا تو پوری رات چین سے تمہارے خوابوں میں کٹ جاتی تھی۔ مگر اب تو تم بخت فیند بھی نہیں تم ہوئی ہے اور چین بھی۔ کبھی کبھی بھی تو دل کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھڑا کر تمہارے پاس آ جاؤں۔ مگر یہ بھی ممکن نہیں ہے۔

جب تمہیں دیکھنے کی ترپ نے میرا جینا حرام کر دیا تو میں تمہارے شہر واپس آ گیا مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ تم بھی وہ شہر چھوڑ کر نہیں جا چکی ہو۔ کہاں کہیں یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔

مجھے ایسا لگا کہ اگر تم کچھ اور دن مجھے نہ ملیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مر جاؤں گا تم جہاں کہیں بھی ہو۔ پلیز میرے پاس آ جاؤ۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ پاگل ہونا نہیں چاہتا۔ میں تمہاری پاہوں میں اپنی ساری زندگی گزار دینا چاہتا ہوں۔ زندگی کی بقیہ دھوپ میں تمہاری گھنی زلفوں کا طلبگار ہوں۔ تم آ جاؤ نا۔ مجھے پاگل ہونے سے بچا لو۔ مجھے مرنے سے بچا لو..... بچا لو نا.....

چلیز..... چلیز..... مجھے بچا لو..... بچا لو..... بچا لو.....

نکلتے والا کانٹا مٹکھاتا اور نہ ہی کوئی ایئر ریس۔ وہ دو بچوں کی طرح خط کو انٹ پلٹ کرتی رہی جیسے کانڈ کے کسی کونے سے نام پتہ جھڑکڑ سے گا۔ اس نے لٹائے تو بھی چھان مارا مگر اس سے بھی کوئی مدد نہیں ملی۔

اس کے چہرے پر گہری مایوسی کے بادل چھانے لگے اور اس مایوسی نے اسے پاٹھوں کی طرح چلانے پر مجبور کر دیا۔

”نہیں..... یہ بے ایمانی ہے۔ نو سال پہلے تم مجھے ایک خط لکھا کر عذاب ہو گئے تھے اور نو سال بعد پھر صرف ایک خط بھیج دیا۔ خود نہیں مل سکتے کیا کہاں ہو تم میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ میں تم کو اپنی ہاتھوں میں چھپا لوں گی۔ ایک بار آ جاؤ پھر بھی تم کو خود ستالک نہیں ہونے دوں گی۔ صرف ایک بار مل جاؤ نا صرف ایک بار۔“

ہانیہ کی آواز اس گناہ محبوب تک تو کیا پہنچتی ہے بچے سوئے ہوئے اس کے مٹی پاپا تک ضرور پہنچتی تھی۔ اس کی مٹی دوزخ سے سوئے اوپر آگئی۔

”کیا ہوا کیا ہوا بیٹی کیوں چلا رہی ہو؟“
”تک..... چھ نہیں..... مم..... مٹی..... وہ ذرا کاٹا خواب دیکھ رہی تھی۔“ ہانیہ شرمندگی سے بولی۔

”اس کی زندگی بھی تو ایک خواب بن کر رہ گئی تھی جس کے نوٹے جھڑکے خواب وقت قریب آ گیا تھا۔ مگر وہ مصوم اس بات سے بے گمان تھی۔“



رات دیر تک کریم خان اور اعیان مستیاں کرتے رہے۔ رات گئی بات گئی کی طرح۔ مٹی صبح بہت سی پریشانیوں لیے بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ویسے بھی اس یس نے کریم خان کے دن کا چین اور سکون اڑا کر رکھ دیا تھا۔ مگر رات کی خیندا بھی سلامت تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی رات اور راتوں کی فینڈیں اپنی پیاری بیوی تو بہ کے نام کر رکھی تھیں۔ اگرچہ تو بہ ابھی اپنے میکے گئی ہوئی تھی مگر خواب میں کریم خان کا ساتھ نبھانے سے باز نہیں آتی تھی۔

ہانیہ کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور دل میں اٹھنے والی بے چینی اسے پاٹھ کر رہے تھی۔ وہ پورا خط پڑھنے کی جرات ہی نہیں کر سکتی۔ وہ آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ کافی دیر بعد جا اس نے کچھ سنبھالا لیا تو خط کو آگے پڑھنے لگی۔

”پاگل تو شاید میں ہوئی چکا ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور یہ بھی نہیں جانتا کہ تم کہاں ہو۔ یہ خط اس طرح تم تک پہنچے گا۔ چھ نہیں جانتا۔ تمہاری ہاتھ نہیں لکھ رہی ہے۔ پھر بھی یہ خط لکھے جا رہا ہوں۔“

مگر کچھ پتہ ہوا نہ ہو لیکن ایک بات میں اچھی طرح جانتا ہوں اور یقین بھی ہے کہ بھی نہ بھی نہیں نہ نہیں تم مجھے مٹی ضرور کیونکہ میری محبت ہی ہے اور قدرت اتنی ظالم نہیں ہے کہ وہ مزید مجھ سے روکے۔ ہر ایک ہو کر ہی رہیں گے۔ قدرت کو ہماری محبت کی قدر کرنی ہی ہوگی۔ ہانیہ اٹھ بیٹ پت ہے۔ اب مجھے روزانہ میری زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ ساری ساری رات آنسوؤں میں غوطہ زن رہتا ہوں اور صبح ہوتے ہی ایک مصعونی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر چالیتا ہوں۔ خود بھی ہنستا ہوں اور لوگوں کو بھی ہنساتا ہوں۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ ایک ہار ہنسنے کے لیے کتنے دن بنی دن میں وہ دردناک پڑتا ہے۔ دن میرے دل کے آنسوؤں و جان بھی پیسے کرتا ہے۔

اور میں خود بھی نہیں جانتا کہ کوئی نہیں دیکھ یا جان پائے۔ مگر بھی بھی اس مصعونی زندگی سے قطعاً آ کر سوچنے لگتا ہوں کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔ اس کا شرم ہو جاتا ہے۔ مگر یہ سوچ کر رک جاتا ہوں کہ میری یہ زندگی تو صرف تمہاری امانت ہے اور میں تمہاری امانت میں خیانت کیسے کر سکتا ہوں۔

اس وقت رات کے چار بج کر چالیس منٹ ہو رہے ہیں۔ اب میں سونے لگا ہوں۔ صبح چھ بجے سے پہلے پہلے جاگنا ہے ورنہ شامی شور مچاؤں گی۔“

خط ختم کر کے ہانیہ نے الٹ پلٹ کے دیکھا نہ تو

لگتا تھا کہ اس کے خوابوں کو بھی شاید قسمت کی نظر لگنے والی تھی اور قسمت کے گتے تو انسان کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ کریم خان اپنے کہن میں سب انسپکٹر سرفراز کے ساتھ دیکس علی نواز اور طارق محمود کے کہیں پر ڈسکس کر رہا تھا۔ اگرچہ ڈی ایس پی زاہد علی نے کریم خان کو ہر قسم کے دباؤ سے آزاد رکھا ہوا تھا مگر دباؤ ڈالنے کے لیے میڈیا ہی کافی تھا۔ جس کی ہر پانچویں خبر میں پولیس کی دل کھول کر کھپائی کی جا رہی تھی۔

”سراسری رپورٹس آپکی ہیں۔“ سرفراز نے کہا۔ کریم خان کی نظریں اسی پر تکی ہوئی تھیں اور وہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی آنکھیں کو محسوس کر رہا تھا۔

”ہاں بولو۔ کیا رپورٹس ہیں۔“ کریم خان جلد سے جلد یہ کہیں حل کر کے بے چینی سے نجات پانا چاہتا تھا۔

”سراسر ان رپورٹس میں کئی باتیں چونکا دیئے والی ہیں۔ نمبر ایک طارق محمود کا کل شام چھ اور سات بجے کے درمیان ہوا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ طارق محمود پارٹی میں شریک ہی نہیں ہوا تھا۔ کوئی ہے جس نے اسے کل کر کے اس کی شناخت چرائی اور اس کے دعوت نامے پر پارٹی میں شرکت کی۔ اب وہ کون ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ نمبر دو دیکس علی نواز کی پارٹی سے دو ایسے لوگوں کے فنگر پرنٹس ملے ہیں جو کسی بھی لاش کے فنگر پرنٹس سے میچ نہیں ہو رہے۔ نمبر تین پہلے فنگر پرنٹ کی پہچان ہو چکی ہے وہ کمال نام کے کسی شخص کے ہیں جو سات سال پہلے مار پیٹ کے جرم میں چھ ماہ کی سزا کاٹ چکا ہے۔ نمبر چار دوسرے فنگر پرنٹ کی پہچان نہیں ہو سکی نمبر پانچ۔ جائے وقوعہ سے یہ لاکٹ ملا ہے۔“ سرفراز کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ سرفراز نے کریم خان سے اجازت لی اور اس کے کہن سے باہر نکل کر بات کرنے لگا۔ کریم خان نے لاکٹ ہاتھ میں لے کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ کیونکہ اس لاکٹ کو تو وہ ہزاروں بار دیکھ چکا تھا اور یہ لاکٹ جس گھلے کی زینت بنتا تھا اسے بھی وہ جانتا تھا۔

”نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

سونے کی چین میں جڑے سونے کے لاکٹ پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کے ملاپ سے ایچ کا حرف بنا ہوا تھا۔ جو دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتا تھا۔ یہ لاکٹ آتش لگا کر آڑوڑے کر ہوا یا گیا تھا اور اسے اپنی آنکھوں پر کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ لاکٹ ہمیشہ اعیان کی گردن میں دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اس لاکٹ کے بارے میں اعیان سے کئی بار پوچھا تھا مگر اس نے کبھی بھی ڈھنگ کا کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ ہمیشہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے بال دیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے کرسی سے لپک لگا لی اور ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔

”اعیان تم یہ لاکٹ ہر وقت کیوں پہنے رہتے ہو؟“

”کیونکہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ اعیان نے ایک نٹ کھٹ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب کیا ہے تمہارا؟“ وہ ابھی ہوئی نظروں سے اعیان کو دیکھتا ہوا بولا۔

”مطلب صاف ہے۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔“

”میں تم سے لاکٹ کے بارے میں بات کر رہا ہوں اور تم ہو کہ بکواس ہی کیے جا رہے ہو۔“ کریم خان جھٹکا گیا۔

”اوہ تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا کہ تم نے جوک سنانے کی فرمائش کی ہے۔“ اعیان نے معصوم بننے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”یار مذاق مت کرو۔ یہ ایچ کون ہے۔“

”تمہارا نام کریم خان ہے نا۔“

”ہاں۔“

”خان میں کئے کے بعد ایچ آتا ہے نا۔“

”ہاں آتا ہے۔“

”بس اسی لیے میں یہ لاکٹ پہنے رہتا ہوں۔“
 ایمان اس لاکٹ کو بڑے پیار سے چھوتا ہوا بولا۔
 کریم خان نہ جانے اور کتنی دیر تک ماضی میں کھویا
 رہتا کہ اس کے موبائل کی مسلسل بجتی ٹیل نے اسے ماضی
 سے حال میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی
 سانس لی اور جیب سے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔
 ”ہیلو... کیا... کہاں... میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے
 اتنا ہی کہا۔ اسے ایک اور کل کی خبر ملی تھی۔



ہانیہ رات کو دیر سے سوئی تھی۔ اس لیے صبح دیر تک
 سوئی رہی۔ جب وہ ناشتہ کر رہی تھی تو اس کے نام ایک اور
 خط آ گیا۔ اس نے خط لیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔
 ابھی وہ غلاف کھول بھی نہیں پائی تھی کہ اس کا موبائل
 واہمریت کرنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا جو نامعلوم تھا۔
 اس نے کچھ سوچا اور پھر کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو۔ کیا آپ ہانیہ بول رہی ہیں۔“ دوسری طرف
 سے پوچھا گیا۔ ہانیہ کو وہ آواز کچھ سنی سنی ہی لگی۔
 ”ہاں میں ہانیہ ہوں۔ مگر آپ کون ہیں؟“
 ”میں تمہارا محبوب۔ کیا تم مجھ سے کل شاہ رکن عالم
 کے مزار کے پاس مل سکتی ہو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔
 اس بے تکی کو اس نے ہانیہ کا ٹون کھولا دیا۔ وہ غصے
 سے چلائی۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح
 بات کرنے کی۔ میں تمہاری جان لے لوں گی۔“

”میں ہی وہ گناہم جس نے آپ کو وہ خوار
 بھیجے تھے۔“ دوسری طرف سے شرارتی لہجے میں بولا گیا۔
 ”کیا... کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ اسے جیسے یقین
 ہی نہیں ہوا۔ اسے لگا اس نے سننے میں غلطی کی ہے۔
 ”یار میں ہی ہوں جس نے چھ سال پہلے آپ کو خط
 بھیجا تھا اور آج کل بھی میں ہی آپ کو خط بھیج رہا ہوں۔“
 اب میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 ”میں ابھی آ رہی ہوں۔ کہاں ہیں آپ۔“ یہ سن کر
 ہانیہ بے تاب سی ہوئی تھی۔

”ابھی نہیں کل شام پانچ بجے۔ شاہ رکن عالم کے مزار
 پر۔“ اجنبی نے پھر کہا۔
 ”کل نہیں۔ آج اور ابھی ملتے ہیں نا۔“ ہانیہ کے لہجے
 میں پرسوں کی تڑپ تھی۔ وہ جلد سے جلد اپنے محبوب تک
 پہنچ چاہتا تھا۔
 ”آج نہیں۔ کل ہی ملیں گے۔“

”اچھا اپنا نام تو بتا دو اور یہ نمبر آپ کا ہی ہے
 نا۔ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔“ ہانیہ بے
 خودی ہو کر کئی سوال ایک ساتھ کرتی گئی۔

”ارے بابا سانس تو لینے دو۔ کل تو ہم مل ہی رہے
 ہیں۔ تم کو سب معلوم ہو جائے گا۔ اوکے ہائے فیک کیسز۔“
 اجنبی نے اس کا جواب سنے بغیر ہی لائن کاٹ دی۔
 وہ کچھ دیر تو حیرانی سے اپنے موبائل کو دیکھتی رہی پھر
 پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگی۔



کریم خان کی پولیس جیب پوری رفتار سے سڑک پر
 دوڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کا رخ شہر سے باہر کی طرف تھا
 اور تھوڑی سی دیر میں وہ شہر کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ کافی آگے
 آ کر اس نے اپنی جیب کے کچے راستے پر ڈال دی اور کوئی دو
 گلوں کی گلی کے کچے راستے پر چلتے ہوئے اپنی جیب ایک
 کھنڈر کے آگے روک دی۔ جس کے باہر اس کی پوری نیم
 کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ کھنڈر کبھی پانی حویلی کے تھے۔ جو اب ٹوٹ
 پھوٹ کا شکار تھی۔ پچھلے کچھ سالوں میں یہاں آنے
 والے کئی لوگ پر اسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اس لیے
 اب اس کھنڈر کو سیب زدہ تصور کر لیا گیا تھا اور لوگ یہاں
 سے گزر کر نکل جاتے تھے۔

کریم خان اپنی نیم کے ساتھ کھنڈر میں داخل ہو گیا۔
 حویلی کے کمروں میں اندھا جھرا اچھلا ہوا تھا اور اس اندھیرے
 کی وجہ سے وہ کمرے کافی ہیبت ناک نظر آ رہے تھے۔ اس
 نے سپاہیوں کو باہر رکے کا اشارہ کیا اور چراغ دین اور مفرات
 کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں کل ہوا تھا۔

اس کمرے کا دروازہ ٹاپید تھا اور اندھیرے کی وجہ سے اندر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چراغ دین نے مارچ روشن کر کے اس کا رخ لاش کے چہرے کی طرف کر دیا۔ لاش کا چہرہ دیکھ کر کریم خان کا منہ کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ کمرے میں اندھیرا تھا جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت دونوں سب انسپکٹر نہیں دیکھ سکے ورنہ وہ ضرور پوچھتے اور کریم خان اس وقت کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

یہ لاش اسی شخص کی تھی جسے اس نے کل پارک میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ ایمان کے ساتھ وہاں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ شاید اسی کو دیکھ کر ایمان چونکا تھا اور کریم خان کو گھینپٹ ہوا ہوئی لے گیا تھا۔

اس نے اپنی حیرت پر قلم اُٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کو کیا لگتا ہے اس کا کل کس نے کیا ہوگا؟“

”اس میں لگنا لگانا کیا سہ! یہ تو یوں آسب زدہ ہے۔ کسی بھوت کے علاوہ۔“

ابھی چراغ دین اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ باہر سے کسی کی چیخ سنائی دی۔ وہ تینوں چونکے اور باہر کی طرف بھاگے۔

ایک سپاہی زمین پر گرا ہوا تھا جبکہ باقی سپاہی ڈرے سمے اس سے چھوڑ کر کھڑے تھے۔ کریم خان دور سے ہی چلا آیا۔ ”کیا ہوا؟“

”سہ! کسی نے میری ٹانگ پکڑ رکھی ہے۔“ سپاہی بہت گھبرایا ہوا تھا۔

کریم خان اس کی طرف بڑھا۔ سپاہی کی ایک ٹانگ جھانپوں کے اندر تھی۔ کریم خان نے ناول کر دیکھا۔ سپاہی کی ٹانگ کسی جنگلی نیل میں پھنسی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر کریم خان کی منہی چھوٹ گئی اور اس نے سپاہی کی ٹانگ نیل سے باہر نکالی۔ باقی سب لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ حالانکہ وہ سب اسے کسی بھوت کا کارنامہ سمجھ کر سمجے ہوئے تھے اور اب وہ خود اپنی ہی بے وقوفی پر مسکرا رہے تھے۔

”سرفراز تم سپاہیوں کو لے کر کھنڈر کی اچھی طرح تلاشی لو اور چراغ دین تم روشنی کا انتظام کرو۔“ کریم خان نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ کمرہ روشن تھا اور کریم خان کے ساتھ چراغ دین اس کمرے میں موجود تھے جبکہ سرفراز ابھی بھی اپنی تلاشی جاری رکھے ہوئے تھا۔

لاش اتنی بری حالت میں تھی کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے کسی شیطان نے مارا ہو یا پھر بدلے کی آگ میں جھل کر انسان سے حیوان بن چکے کسی شخص نے بھنبھوڑا ہونے کے بعد بھی لاش کی آنکھوں میں خوف صاف جھٹک رہا تھا۔

لاش کے ماتھے پر زخم تھے جس سے لگ رہا تھا کہ اس کا سر زور زور سے دیوار یا فرش سے ٹکرایا گیا ہوگا۔ اس کے کچھ دانت بھی نولے ہوئے تھے جو لاش کے پاس ہی اوجھلا دھڑکھڑے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور وہ بھی آس پاس ہی پڑی ہوئی تھیں۔ دوسرا ہاتھ کہنی سے کچھ نیچے سے الگ ہو کر لاش کے پاس پڑا تھا جبکہ ایک کان بھی فرش پر پڑا ہوا تھا۔ سینے پیٹ اور کمر پر کچھ کس سے زیادہ چھوٹے بڑے زخم تھے جو کسی چاقو یا خنجر سے لگائے گئے تھے۔ جس نے بھی اس شخص کو مارا تھا بہت ہی بے رحمی سے تڑپا تڑپا کے اور نہایت اطمینان سے مارا تھا۔ کریم خان جیسا انسپکٹر بھی لاش کی ایسی حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے لرز اٹھا تھا۔

پھر اس کی نظر اس کٹے ہوئے ہاتھ پر پڑی جس پر سات کا عدد گدرا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک بے خیالی میں سات کے ہندسے کو گھورتا رہا۔

”اس قتل کی اطلاع کس نے دی تھی۔“ اس نے چراغ دین سے پوچھا۔

”کال کسی پی سی او سے آئی تھی۔“ چراغ دین نے جواب دیا۔

”اس کی شناخت ہوئی یا نہیں؟“ اس کی آنکھیں لاش پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

”نہیں سہرا“

”جلد سے جلد اس کی پوری تفصیل معلوم کرو۔ اس کے دوست دشمن سب ہی کی فہرست کل تک میری میز پر ہونی چاہئے۔“ اس نے جہاں عین کا رڈ دیتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی دیر بعد سر فرار بھی اس کمرے میں آ گیا۔“

”سہرا! ہم نے پورا مختدر چھان مارا لیکن کچھ نہیں ملا۔“

اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔“ کہتا ہوا کریم

خان کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد شہر پہنچ کر وہ ایک جیولر کی دکان پر اس

لاکٹ جیسا دوسرا لاکٹ بنا رہا تھا جس کے بننے میں

پورے دو گھنٹے لگ گئے۔ اس نے دونوں لاکٹ ہاتھ میں

لے کر دیکھے۔ کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو لاکٹ

ہیں یا ان میں سے کون سا پرانا ہے اور کون سا نیا۔

دونوں لاکٹ لے کر اس نے اعیان کے گھر کا رخ

کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لاکٹ اعیان کا ہے بھی یا

نہیں۔ اگر اعیان کے گلے میں لاکٹ ہوا تو کوئی بات نہیں

تھی اور اگر لاکٹ غائب تھا تو پھر اس میں کوئی شک نہیں تھا

کہ اس کے پاس جو لاکٹ ہے وہ اعیان کا ہی ہے کیونکہ

اعیان سمجھی بھی وہ لاکٹ خود سے جدا نہیں کرتا تھا۔

کریم خان مسلسل اعیان کے دروازے کی بیل بجا

رہا تھا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اسے حیرت

ہو رہی تھی کہ اعیان دروازہ کیوں نہیں کھول رہا۔ اتنی بار

بیل بجانے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا گیا تو اس نے

جھنجھلا کر آخری بار بیل بجانے کا ارادہ کیا اور اسی وقت

دروازہ کھل گیا۔

”اتنی صبح صبح کیسے آ ہوا؟“ اعیان نے انگڑائی لیتے

ہوئے کہا۔

”بارہ بج چکے ہیں جناب اور آپ کے لیے ابھی صبح

ہی ہے۔“ کریم خان نے سے ننوتی ہوئی نگاہوں سے

دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے وہ کہاوت تو سنی ہی ہوگی کہ جب میں جگا۔“

تنب ہوئی صبح۔ میں ابھی سو کر اٹھا ہوں تو میرے لیے صبح

ہی ہوئی ٹیار۔“ اعیان پلکیں جھپک کر معصومیت سے بولا۔

کریم خان نے کچھ نہیں کہا بس تنکھی نظروں سے

اسے گھورتا رہا۔ اعیان اس کے گھر کے اندر آنے کا انتظار

کرتا رہا لیکن جب کریم خان اندر داخل نہیں ہوا تو اسے

بولٹائی پڑا۔

”مانا کتا آج میں بہت خوبصورت لگ رہا ہوں۔ اس

لیے تم مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔“ کریم خان

بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔ اندر آ کر آرام سے بیٹھ کر مجھے

دیکھتے رہنا۔ ویسے بھابھی سے کہنا پڑے گا کہ تم انہیں

خلاق دے کر مجھ سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ

رہے ہو۔“ کریم خان پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ مجھے تم سے شادی

نہیں کرنی۔ نہیں کرنی۔ میں گئے نہیں ہوں یا۔“ اعیان

نے شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

”بکومت۔“ کریم خان چھینپتا ہوا بولا اور اندر آ گیا۔

”سچ تو ہمیشہ نزوادی لگتا ہے میری جان۔“ اعیان

نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اندر آ کر اعیان ایک

صوفے پر لیٹ گیا اور کریم خان نے اس کے سامنے

نشست سنبھالی۔

”کیا لوگے۔“ مختدر اپنی ’سوز اپانی‘ پالمیوں پانی۔ اب

اعیان نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔ ایسا لگ ہی

نہیں رہا تھا کہ وہ جن چیزوں کا نام لے رہا ہے وہ لاسے کا

ارادہ بھی ہو۔ بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کریم خان کے منہ

سے ”کچھ نہیں“ کہلوانے کے موذ میں ہو۔

”کافی۔“

”کولڈ کافی“ وہ انتہا بلیک یا ”ٹرین؟“ اس نے

آنکھیں موندے ہی پوچھا۔

”میرے باپ جیسی بھی بنالو۔“ کریم خان اس کی

تائید شاپ چلتی زبان کو روکنے کے لیے بولا۔

اعیان اٹھا اور مسکراتا ہوا کچن میں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد کریم خان کو یاد آیا کہ اس نے

اعیان کے گلے میں لاکٹ پر تو دھیان دیا ہی نہیں۔ عیان

نظم
کون... کس مقام پر چھڑ گیا
ہم سے
چھ یا نہیں
یاد رہا تو بس اتنا
کہ جو چھڑ گیا
ایک بار
وہ پھر دو بار
ملا نہیں

کاجل شاہ..... خانیوال

خان کی طرف اچھا لٹے ہوئے ہوا۔
”اے پیرن لے گیا۔“ اس بار کریم خان کا لہجہ
قدرے ملتی تھا۔ وہ اعیان کو لاکٹ پہناتا چاہتا تھا کیونکہ
جس طرح وہ جانتا تھا کہ اعیان ہر وقت وہ لاکٹ پہنے
رہتا ہے۔ تو کوئی اور بھی ضرور جانتا ہوگا اور اعیان کے
گلے میں لاکٹ نہ دیکھ کر کوئی شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا
اور کریم خان اسے ہر طرح سے بچانا چاہتا تھا۔
اعیان نے اس کی بات مان لی اور برا سامنہ بناتے
ہوئے وہ لاکٹ پہن گیا۔ کافی شرم کر کے اس نے اعیان
سے اجازت لی اور باہر نکل گیا۔
اگر اعیان کی جگہ کوئی اور ہوں کریم خان کے شک
کے دائرے میں آتا چاہے وہ اس کی بیوی ہی کیوں نہ
ہوتی تو وہ اب تک اسے لاکٹ اب میں ڈال چکا ہوتا مگر وہ
اعیان کو ہر طرح کے شک سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اسی
لیے اس نے ویسا ہی لاکٹ بنوا کر اعیان کو زبردستی پہنا
بھی دیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب اعیان پر کوئی
الزام آتا ہے وہ ہر الزام اپنے سر لے لے گا۔ یہی تو اس کی
دوستی تھی۔

جب اپنے کام سے فارش ہو کر وہ اپنے گھر پہنچا تو
اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اعیان کی وجہ سے

کی باتوں میں الجھ کر وہ اپنے مقصد کی بات بھول گیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد اعیان کافی کے دو کپ بنا کر لے آیا۔
کافی پیتے ہوئے کریم خان نے غور کیا تو اس نے دیکھ
کہ اعیان کے گلے میں وہ لاکٹ نہیں تھا۔
”اعیان آج تم نے اپنی جان سے پیارا لاکٹ
کیوں نہیں پہن رکھا۔“ تھوڑی دیر تک کپ رہنے کے
بعد وہ بولا۔

”سنا چاندی عمر بھر ساتھ نہیں دیتا میری جان۔“
اعیان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”تو کیا تم نے اسے اتار کر تیس رکھ دیا ہے۔“
”نہیں وہ تمہارا پاس ہے۔ چلو جلدی سے میرا
لاکٹ نکالو۔“ اعیان نے کہا۔

اعیان کے جواب سے کریم خان جو نچکا رہ گیا۔ وہ تو
یہ سوچ رہا تھا کہ اعیان کا جواب یہ ہوگا کہ کہیں کھو گیا۔ مگر
اعیان تو۔

”میرے پاس... کیوں ہونا چاہئے۔“ کریم
خان نے ہکا ملاتے ہوئے کہا۔

”کیوں اور کیسے جیسے سوال بچوں کے منہ سے اٹھتے
گتے ہیں۔ چلو جیب میں ہاتھ ڈالو اور نکالو میرا لاکٹ۔“
”نہیں پتہ ہے یہ مجھے کہاں سے ملا ہے؟“ کریم
خان نے کچھ طنز نہجے میں کہا۔

”تم سے جو کہا گیا ہے پیسے وہ کرو۔ بعد میں اپنی
زبان کھولنا۔“ اعیان نے پھر شرارتی انداز میں کہا۔

کریم خان نے چپ چاپ نیا والا لاکٹ نکالا اور
اعیان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

اعیان اس لاکٹ کو ہاتھ میں لیتے ہی چونکا پھر اسے
غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یار پولیس والے
ہو کر دھوکا دیتے ہو۔ یہ میرا لاکٹ نہیں ہے۔“

”وہ میرے پاس ہے۔ تم فی الحال اسے ہی پہنے
رہو۔“ کریم خان نے کہا۔ وہ حیران تھا کہ دونوں لاکٹ
ایک جیسے تھے پھر اعیان نے کیسے پہچانا۔

”تو یہ بھی تم اپنے پاس ہی رکھو۔“ اعیان لاکٹ کو کریم

وہ سارا دن کافی ذہنی اذیت کا شکار رہا تھا جس کی وجہ سے وہ خود کو بہت تھکا تھا کا سامحسوں کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹا مگر فیندا اسے اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

موبائل کی مسلسل بیل سے اس کی نیند ٹوٹی۔ اس نے سائید ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا اور اسکرین پر دکھانا مہر دیکھ کر مسکراتے ہوئے کان سے لگا لیا۔

”ہیلو میری ٹوٹی۔ کیسی ہو۔“ وہ بولا۔

”میں تو تھیک ہوں مگر مجھے میرا پیارا پیارا سا بے بی کچھ پریشان لگ رہا ہے۔“ دوسری طرف سے ثوبیہ کی کھلتی ہوئی آواز آئی۔

وہ تنہائی میں کریم خان کو اکثر بے بی کہہ کر بلاتی تھی اور جب زیادہ سی پیارا تھا تو راجہ کہہ کر پکارتی تھی۔

”تم یاس نہیں ہو تو دل پریشان کی رہے گا نا۔ تم آ جاؤ نا۔“ کریم خان نے اپنے لہجے کو ہر ممکن خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

”ارے رے رے۔ میرے بے بی کو میری اتنی یاد آ رہی ہے کہ یاد میں تڑپ تڑپ کے جھوٹ بھی بولنا لگے گی نا۔ چلو اب یہ فوننگی بند کرو اور جی جی بتاؤ کہ بات کیا ہے۔ تم پریشان کیوں ہو۔“ ثوبیہ نے پہلے پیار سے ڈانٹا پھر تنبیہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یار پر کوئی میری بات مان لیتا ہے مگر ایک تم ہو کہ۔“

”یہ بیکار کی باتیں بھی ساتھ بیٹھ کر کریں گے۔ ابھی تو یہ بتاؤ کہ بات کیا ہے۔“ ثوبیہ نے فوج میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ وہ سب میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”اچھا جی ایسا ہے کیا۔“ ثوبیہ چمکی۔

”تم سے ایک کام ہے۔ کر لو گی؟“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”بے بی تمہارا ایک کیا سارے کام کرنے کو تیار ہوں مگر اتنی دور سے کیسے مردوں میں رہوں۔“ ثوبیہ دندھے

ہوئے لہجے کا ٹانگہ کرتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں لینے کے لیے اعیان کو بھیج رہا ہوں۔ تم کسی بھی بہانے اسے آٹھ دس دن روکے رکھنا۔ اس کے بعد اعیان کے ساتھ آ جانا۔“ کریم خان نے تنبیہ کی سے کہا۔

”اور کوئی ٹھم میرے سر تاج؟“ ثوبیہ کی یہ بات اچھی تھی کہ وہ کریم خان کی ہر بات بغیر زیادہ سوال کیے مان جاتی تھی۔

”اور اعیان کو یہ بھی مت بتانا کہ میں نے تمہیں اسے روکنے کے لیے کہا ہے۔“ اس نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

”فکر مت کریں۔ اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا۔ امی ہمارے ہیں۔ بعد میں کال کرتی ہوں۔ بائے اور ہاں بے بی کھانا وقت پر کھاتے رہنا۔ باہر کی قلمی بھنی چیزیں مست کھانا پیار پڑ گئے تو عیادت کی بجائے ناراض ہو جاؤ گی۔“ ثوبیہ فون بند کرنے سے پہلے یو پیانہ فریضہ نبھاتے ہوئے بولی۔

اس نے اپنا موبائل ہڈ پر پھینکا اور نہانے کا ارادہ کرتے ہوئے ہاتھ روم کی طرف بڑھتا تھا کہ اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے ہڈ کی طرف آیا۔ اس نے بے بی سوچ کہ ثوبیہ کوئی بات کہنا بھول گئی ہوگی اس لیے وہ بارہ فون کیا ہے۔ مگر اسکرین پر کوئی انجان نمبر بجنگ کر رہا تھا۔ اس نے دیکھ کر کہہ دیا۔ ”ہیلو۔“

”کریم خان! میری بات فور سے سنو۔“ اس نے رات بارہ بجے فیئر فائیو اسٹریٹ نمبر دو ہنگہ نمبر تین میں کمال کے چار رنجی اکٹھے ہونے والے ہیں۔ تم چاہو تو انہیں گرفتار کر سکتے ہو۔ وہ سفید رنگ کا ہنگہ ہے۔ بائیں۔“ یہ کہتے ہی دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی اور کریم خان ہیلو ہیلو ہی رہتا رہ گیا۔

ابھی اس نے موبائل کان سے ہٹایا ہی تھا کہ میسج کی ٹون بجی۔ اس نے دیکھا وہی انجان نمبر تھا اور اس پر وہی ایڈریس بھیجا گیا تھا جو ابھی فون کرنے والے نے بتایا تھا۔

کریم خان نے اسی نمبر پر کال بینک کی لیکن موبائل سوچ آف ہونے کی ریکارڈنگ سنائی دی۔ ”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔ شکریہ۔“

وہ موبائل ایک طرف رکھ کر سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی جو ساڑھے دس بجھا رہا تھا۔ اسے جو بھی کرتا تھا ویزھ گھنٹے کے اندر اندر کرتا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سرفراز کا نمبر ڈائل کیا۔

”السلام علیکم سہرا“ سرفراز کی آواز سنائی دی۔

”میں تمہیں ایک نمبر دے رہا ہوں۔ اس کے بارے میں تفصیلی انفارمیشن نکلواؤ اور ہو سکے تو لوکیشن بھی ٹریس کرلو۔“

”اوکے سہرا! آپ نمبر سینڈ کریں۔“

”بوسکے تو ایک گھنٹے کے اندر اندر مجھے یہ ساری تفصیل چاہئے۔“

”جی سہرا! میں کوشش کرتا ہوں۔“ سرفراز نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس نے چراغ دین کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو سہرا! رات کو ہماری یاد کیسے آگئی۔“ چراغ دین کی شوخ آواز سنائی دی۔

کریم خان نے چراغ دین کو پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

”ابھی ابھی مجھے انفارمیشن ملی ہے کہ رات کے بارہ بجے کمال کے چار ساتھی یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ انہیں گرفتار کرنا ہے۔“

”اوکے سہرا! مگر یہ کمال کون ہے اور کس جرم میں گرفتاری کر لی ہے۔“

”یہ وہی کمال ہے جس کے فکٹر پرنٹ ریپس ملی نواز کی پارٹی سے ملے تھے۔“

”اوہ! اس ناچیز کو کیا کرنا ہے۔“ چراغ دین نے حیران ہو کر کہا۔

”تم ٹیم کو لے کر ساؤتھ اسٹریٹ پر میرا انتظار کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہا ہوں اور ہاں تم لوگ

سادہ لباس میں آنا اور پولیس کی گاڑی کا استعمال مت کرنا۔ وہ بائیک بھی مت استعمال کرنا جس پر پولیس لکھا ہو اور پولیس کے جوتے بھی مت پہننا۔“ کریم خان کسی انجانے شہک کی وجہ سے وہاں جا رہا تھا اس لیے وہ کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

”اور کوئی حکم سہرا“ چراغ دین نے حیرت سے سنتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ بس میرے تے تک سب وہاں پہنچ جانے چاہئیں۔ اوکے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے ہوسٹر میں ریو اور لگایا اور بائیک لے کر فیروز خان کی طرف دوڑاؤنی۔ وہ وہاں پہنچ کر لوکیشن دیکھتا چاہتا تھا۔

میں منٹ بعد وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ اس جگہ میں ابھی کنسٹرکشن ہو رہی تھی اور کئی پلاٹ خالی پڑے تھے۔ وہ سفید رنگ کا مٹی بنگلہ تھا جس کا صرف گیٹ کالا تھا اور اس پر بھی بڑا سا کالا لگا ہوا تھا۔

اس نے بڑے غور سے اس پاس کا معائنہ کیا اور مطمئن ہونے کے بعد بائیک پر بیٹھ کر ساؤتھ اسٹریٹ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی ٹیم اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے ایک نظریاتی ٹیم پر ڈالی جو اس کی ہدایت کے مطابق سادہ لباس میں تھی۔ پھر اس نے آصف سے کہا۔

”اپنا موبائل مجھے دو۔“

آصف کو یہ کچھ حیرت ہوئی پھر اس نے اپنا موبائل کریم خان کو دے دیا۔ کریم خان اس پر کچھ ٹائپ کرتا رہا پھر موبائل آصف کو واپس دیتے ہوئے بولا۔

”تم سب کو لے کر اس سے پہنچ جاؤ اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر اس سفید بنگلے کی گھرائی کرو۔ ہم کچھ دیر بعد وہاں پہنچیں گے۔“

”ٹھیک ہے سہرا! اور کچھ۔“ آصف نے موبائل میں ایڈریس دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بھی اس بنگلے میں داخل ہو یا باہر آئے۔ مجھے فوراً اطلاع دینا اور اگر کوئی اس بنگلے سے نکل کر نہیں جائے تو خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس کا پیچھا کرنا۔“

رہتا تھا شاید ساتھیوں میں اس کی عزت کی ایک وجہ یہ بات بھی تھی۔

رکیم علی نواز کی پارٹی میں دو ایسے لوگوں کے فتنہ پرست پائے گئے تھے جو کسی لاش سے بچ نہیں ہو رہے تھے اور ان میں سے ایک کمال کے فتنہ پرست تھے اور کریم خان اس کے ساتھیوں پر نظر رکھ کر کمال تک پہنچنا چاہتا تھا مگر سرفراز کی باتوں نے تو معاملہ ہی کچھ اور کر دیا تھا۔ جس کمال پر اسے شک تھا اس کی لاش وہ صبح ہی دیکھ چکا تھا اور جس نمبر سے انظار مرنے کا ل کی تھی وہ بھی کمال کا ہی تھا۔

اس ایک بات نے اسے اپنا ارادہ بدسنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ جس طرح سے کوئی ایک کے بعد ایک سارے ثبوت مناتا جا رہا تھا اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے انہیں گرفتار کیے ہنا چھوڑ دیا تو ان کا مارا جانا یا پھر غائب ہو جانا یقینی تھا۔

اور یہ بات بھی اسے الجھن میں ڈال رہی تھی کہ کمال کے فون سے اسے کال کرنے والا کون تھا۔ کال کرنے والا کم از کم اعیان تو نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی آواز تو کریم خان لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا اور اپنے تجربے کی بنیاد پر اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ انظار مرنے بعد بدسنے کی خوشبو نہیں کی تھی اور اپنی اصلی آواز میں ہی بول رہا تھا۔ خزانہ مرنے کمال کا نمبر ہی کیوں استعمال کیا تھا؟

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ اسی نے کمال کو قتل کیا تھا اور اب اسی کے نمبر سے اس کے ساتھیوں کے بارے میں اطلاع دی تھی مگر وہ تھا کون اسی بات سے کریم خان سخت جھلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

کیا کمال کا کوئی ایسا ساتھی تھا جو بنا دت پر رتا آتا تھا اور اسے مارنے کے بعد اب اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی گرفتار کروانا چاہتا تھا یا پھر وہ کمال کا کوئی دشمن تھا جو بھی معاملہ کریم خان کی سمجھ سے باہر تھا۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کریم خان کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہو۔ یا پھر اسے کسی سازش میں پھنسانے کے لیے بلایا گیا ہو۔ وہ انہی سوچوں میں مگن تھا

آصف نیم کو لے کر جانے ہی والا تھا کہ کریم خان نے ایک اور حکم جاری کیا۔ ”سب لوگ اپنے اپنے موبائل واہیریت پر کریں۔“

سب نے ہدایت پر عمل کیا اور چراغ دین کے علاوہ سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔

سب کے جانے کے بعد کریم خان نے اپنی بانیگ اشارت کی اور چراغ دین کو اپنے پیچھے نے کا اشارہ کیا۔ دونوں آگے پیچھے چل دیے۔ کچھ دور جانے کے بعد کریم خان نے اپنی بانیگ ٹار شہید پارک کے پاس روک دی۔ پارک میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ زیادہ تر سناٹا تھا۔ وہ ایک طرف گھاس پر آنتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور چراغ دین ابھی بیٹھنے ہی والا تھا کہ کریم خان کا موبائل واہیریت ہونے لگا۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ سرفراز کی کال تھی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو سرفراز!“ دوسری طرف سے سرفراز کی پر جوش آواز آئی۔

”کچھ معلوم ہوا۔“ اس نے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر پوچھا۔

”سرفراز یہ نمبر کمال کا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کمال وہی شخص ہے جس کی لاش ہمیں صبح کھنڈر میں ملی تھی۔“

”اوہ۔“ پھر وہ بولا۔ ”میں اور چراغ دین ٹار شہید پارک میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم جلدی سے یہاں پہنچ جاؤ۔“ اس نے لاکھن کا سننے کے بعد موبائل میں وقت دیکھا۔ سو اگیارہ ہو رہے تھے۔ اس نے موبائل اپنی جیب میں رکھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چراغ دین اب بھی ہونی نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

کریم خان جلد بازی میں گرفتاریاں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان پر نظر رکھ کر کمال کے دوسرے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی نیم تربیت یافتہ تھی پھر بھی اگر کچھ گزبڑ ہوتی تو وہ ان کے بہت قریب تھا۔

کریم خان کی ایک اور خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کبھی اپنی مرضی نہیں چلاتا تھا بلکہ اپنے نیم نمبرز سے بھی مشورے لیتا

کہ اسے سامنے سے سرفراز آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے موبائل میں وقت دیکھا گیا روخ کر چھبیس منٹ ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی پھر اس نے سرفراز اور چراغ دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”سازھے دس بجے کسی انجان نمبر سے مجھے ایک کال آئی تھی۔ اس نے مجھے جنگلے کا پتہ سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ کمال کے چار ساتھی رات بارہ بجے یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم چاہیں تو انہیں گرفتار کر سکتے ہیں۔ اب کچھ دیر پہلے معلوم ہوا کہ جس نمبر سے مجھے کال آئی تھی وہ کمال کا تھا اور کمال کی لاش ہم صبح ہی دیکھ چکے ہیں۔“

”سرا جتنی بے رحمی سے کمال کو قتل کیا گیا ہے وہ ضرور بھوت بن گیا ہوگا اور اس کا بھوت چاہتا ہوگا کہ اس کے مارنے والوں کو سزا ملے اسی لیے اس نے کال کی ہوئی۔“ چراغ دین جیسے ضعیف الاعتقاد سے ایسی سی بات کی امید رکھی جا سکتی تھی۔

چراغ دین کی بات سن کر اتنی پریشانی میں بھی کریم خان کو فسی آ گئی۔ اس نے ایک نظر سرفراز پر ڈالی جیسے پوچھ رہا ہو کہ بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔

”سرا! مجھے لگتا ہے کہ کمال کے ہی کسی ساتھی نے اس کا مرزہ کیا ہے۔ اب اسے ڈر ہے کہ اس کے ساتھی اسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں وہ انہیں گرفتار کروانا چاہتا ہے۔“ سرفراز نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”وہ کون ہے؟ کون نہیں؟ یہ بعد میں سوچیں گے۔ سوال یہ ہے کہ انہی ہمیں کیا کرنا ہے۔“

اس سے پہلے کہ چراغ دین یا سرفراز کوئی جواب دیتے اس کا موبائل پھر بج اٹھا۔ اس نے دیکھا اسکرین پر آصف کا نام چمک رہا تھا۔

”ہاں بیلو۔“

”سرا! بھی ابھی ایک وی ٹیلی مرسڈیز میں آیا ہے اور کار باہر ہی کھڑی کر کے وہ جنگلے کے اندر جا چکا ہے۔“ آصف نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔ ہمارے آئے تک تم لوگ جنگلے سے دور رہی رہو۔ کوئی اور جنگلے میں آئے تو مجھ سے رابطہ کرنا۔“ اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

”ہاں اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔“ اس نے پھر سے وہی سوال اپنے دونوں ساتھیوں کے سامنے رکھا۔

”سرا! اگر وہ صحیح کمال کے ساتھی ہیں تو اپنی میں سے کوئی بھی فوج کر جانا نہیں چاہئے۔ وہ اس کیس کی گفتیش میں ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔“ چراغ دین نے اس بات کی بات کی تھی۔

”سرا! چراغ صحیح کہہ رہا ہے۔ اب ہمیں جلد سے جلد اس جنگلے پر پہنچ جانا چاہئے۔“ سرفراز نے بھی چراغ دین کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

کریم خان کچھ بولنا چاہتا تھا کہ پھر آصف نے کال کیا۔ اس نے بتایا کہ ایک اور آدمی جنگلے میں داخل ہو چکا ہے۔ کریم خان نے تاہم دیکھا گیا روخ کر پچپن منٹ ہو رہے تھے۔ اب اس نے بھی دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور گھاس سے اٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں سفید جنگلے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ کریم خان نے نظر دوڑائی تو اس کے ساتھی مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے اس جنگلے کی گمرانی کر رہے تھے۔ اس وقت بارہ بجتے ہی والے تھے جب ایک سرخ رنگ کی کار جنگلے کے باہر آ کر رکی جہاں پہلے ہی سے دو کارین موجود تھیں۔ اس سرخ کار میں سے دو آدمی اتر کر جنگلے میں چلے گئے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کمال کے چاروں ساتھی اس وقت جنگلے میں پہنچ چکے تھے۔ کریم خان نے اشارہ کر کے اپنی ٹیم کو پاس بلا لیا۔

”پہلے میں جنگلے کے اندر جاؤں گا اور مجھے کور کرتے ہوئے چراغ دین میرے پیچھے آئے گا۔“ پھر اس نے ایک طرف کھڑے تین ممبرز سے کہا: ”تم تینوں ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے ہمارے پیچھے آنا۔“ اپنے ساتھیوں کو اس نے ہدایت دیتے ہوئے کہا: ”تم دونوں

ان چاروں کے پاس سے جدید ریو اور ہمارے گھر گئے۔ جنگ کی تلاش کی گئی مگر انہیں کچھ نہیں ملا۔



انسان سوکھے پتوں کی طرح ہوتا ہے۔ جسے قسمت کی ہوا کب کہاں اڑا لے جائے کوئی نہیں جانتا اور یہ زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی صدیوں تک ایک کے بعد ایک خواب دکھائی دیتی ہے پھر کسی دن اچانک سب کچھ نکھیر کر رکھ دیتی ہے اور انسان کو اپنے خوابوں کی قبر پر آنسوؤں کے پھول چڑھانے کے لیے زندہ چھوڑ دیتی ہے۔

ایسے ہی کئی خواب زندگی نے بانیہ کی آنکھوں میں بھی تھار گئے تھے۔ جو پورے ہونے والے تھے یا ٹوٹنے والے تھے۔ کوئی نہیں جانتا۔

اس کی زندگی میں پہلی تبدیلی اس وقت آئی جب اس کے باقی اسکول کا رزلٹ آیا تھا۔ اس نے پورے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کے ٹھیک چند روزوں بعد اس کے نام ایک خط آیا جسے پڑھ کر اسے پتہ چلا کہ کوئی لڑکا اس سے حد سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ مگر وہ لڑکا کون ہے۔ کہاں رہتا ہے اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی کیونکہ اس لڑکے نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

بانیہ کو وہ خط پڑھنا بہت اچھا لگا تھا۔ وہ روزانہ دو خط پڑھنے لگی اور خط پڑھتے پڑھتے کب اسے اس لڑکے سے محبت ہوئی وہ خود بھی نہیں جانتی۔

انہی دنوں اس کے بابا کا تبادلہ دوسرے شہر ہو گیا۔ وہ بہت روٹی بہت چٹائی مگر اس کی کسی بے نہیں تھی۔ وہ اسے محبوب کا شہر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نئے شہر میں آنکر وہ بیروم اداس رہنے لگی۔ یہاں کئی لڑکوں نے اس سے دوستی کرنی چاہی مگر اس نے سب کو دھتکار دیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا محبوب اسے ضرور تلاش کر لے گا۔

بانیہ نے اپنی گمنام محبت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ اگر وہ بتاتی بھی تو لوگ اسے پاگل سمجھ کر اس کا مذاق ہی اڑاتے اور اپنا مذاق بنواتا کہے پسند ہوتا ہے۔

کاروں کے پاس ہی چھپے رہنا اور سرفراز تم جنگ کی پھیلی طرف چھپ جاؤ اور آصف تم اس طرف چھپ کر غم سے ہو جاؤ۔ کریم خان نے سب ساتھیوں کو ان کی پوزیشن سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میں پر باہر سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ان سے سیدھا بھڑکنے کی بجائے تم لوگوں کو بس یہ دھیان رکھنا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جنگ کے اندر داخل نہ ہونے پائے۔ اندر میں سب سنبھال لوں گا۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ ”چلو سب جلدی جلدی اپنی پوزیشن لے لو۔“ اس کے کہنے کی دیر بھی کہ سب حرکت میں آ گئے۔

دو ریو اور ہاتھ میں لے کر جنگ کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ اس نے قریب پہنچ کر اندازہ لگا لیا کہ گیت اندر سے لاک نہیں ہے اس نے ہلکا سا دھکا دیا اور گیت کھلتا چلا گیا۔

وہ بے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو گیت کے پاس ہی رکھنے کا اشارہ کیا اور باقی ٹیموں سے ساتھ آگے چلنے لگا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ شاید انہیں اس طرح کسی کے آنے کی امید ہی نہیں تھی۔ کریم خان نے ایک گہری سانس کھینچی کر دروازے پر زور کی لٹ ماری اور دروازہ کھلتے ہی وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ اندر موجود چاروں افراد انہیں دیکھ کر ہڑا کر کھڑے ہو گئے اور ان میں سے ایک بولا۔ ”کک۔۔۔ کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“

کریم خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی معلوم ہو جائے گا۔ پہلے اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔“ ان کی حیرانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے کچھ کرنے سے پہلے ہی ان پر قابو پا لیا تھا اور جب تک ان کی حیرت دور ہوئی انہیں بے بس کر دیا گیا۔ درندہ دہائی آسانی سے کریم خان کے ہاتھ آئے والے نہیں تھے۔

”اسپے ہارے میں کچھ تو بتائیے نا۔“ ہانیہ کا مقصد تو صرف اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا تھا۔
 ”کل سب کچھ معلوم ہو چاہے گا۔“
 ”مگر مجھ سے کل تک کا انتظار نہیں ہو پارہا ہے۔“
 ”پلیز۔ ابھی مجھے سونے دو۔ بہت سخت خیندا رہی ہے۔ کل جو دل چاہا ہے پوچھ لینا۔“ یہ کہہ کر دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔
 ہانیہ نے اپنا موبائل ایک طرف رکھا اور وہ بھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔



کرو گے یاد تو ہر بات یاد آئے گی
 گزرتے وقت کی ہر موج ٹھہر جائے گی
 یہ چاند بیٹے زمانوں کا آئینہ ہوگا
 یہ چاند.....

موبائل کی مسلسل بجنے والی بیل نے کریم خان کو غیند کی وادی سے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنکھیں بند کیں ہی ادھر ادھر ہاتھ مارا مگر موبائل نہیں ملا تو مجبوراً اس نے آنکھیں کھول دیں۔ موبائل ٹیکے کے نیچے رکھا ہوا تھا جب اس نے موبائل ہاتھ میں لیا تو اس وقت لائن ڈس کنکٹ ہو گئی۔ اس نے کال بسٹری چیک کی تو اطمینان کی دس مس کالیں آ چکی تھیں۔ ابھی وہ اطمینان کو کال کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل پھر سے گھٹنٹا لگا۔

”ہیلو۔“ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہیلو کو مارو گوئی۔ پہلے یہ بتاؤ کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے۔ کہیں بھائی کی غیر موجودگی میں کسی اور۔“
 ”کلو اس بند کرو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے۔“
 ”اور تم بھی یہ جان لو کہ تمہیں کال کر کر کے میری انگلیاں بھی دکھنے لگی ہیں۔ تمہیں کچھ احساس بھی ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ انگلیاں کتنے کام کی چیز ہوتی ہیں۔ اطمینان اپنی عادت کے مطابق شروع ہو چکا تھا۔“

”سورہا تھا یار۔“ اس نے جہاں ہی لیتے ہوئے کہا۔

پھر گزرتے چل کے ساتھ اس کی محبت گہری ہوتی جا رہی تھی اور آخر کار ایک دن اس کا یقین صحیح ثابت ہو گیا۔ پورے نو سال بعد اس کے نام ایک اور خط آیا۔ نئے لفافے میں بند وہ خط ایسا لگتا تھا جیسا آٹھ یا نو سال پہلے لکھا گیا ہو۔ اس سے اگلے دن پھر ایک خط آیا اسے دیکھ کر بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی آٹھ یا نو سال پرانا ہوا اور یہ بھی نئے لفافے میں بند تھا۔ دوسرے خط کے بعد اس گناہ محبوب کی کال آئی تو اسے سارے جہان کا خزانہ مل گیا۔ محبوب نے اس کے دیر کی تمنا پوری کرتے ہوئے اسے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے زیادہ خوش کن لمحات تھے۔

اس نے دن میں کئی مرتبہ اپنے محبوب کو کال کرنے کے بارے میں سوچا لیکن کال نہیں کر پائی اور آج تو جیسے وقت نے بھی اپنی رفتار انتہائی جلدی کر لی تھی گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یا شاید ہانیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جس کے لیے ایک ایک چل کا ٹھانڈیوں برابر لگ رہا تھا۔

اس رات اسے غیند بھی نہیں آئی اور جب وہ زیادہ ہی بے چین ہوئی تو رات کو ایک بجے کے قریب اپنے محبوب کو کال ملا ہی وہی۔ کئی بلیں جانے کے بعد کال ریسیو کی گئی۔ ”ہیلو۔“ بولنے والے کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گہری غیند سے جاگا ہو۔

”ہیلو کیسے ہیں آپ؟“ ہانیہ چمکتے ہوئے بولی۔
 ”یہ خبریت معلوم کرنے کا کون سا وقت ہے۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”آپ کا نام کیا ہے۔“ ہانیہ نے اس کے سوال کا جواب اپنے کی بجائے ایک اور سوال کر دیا۔
 ”تو اتنی رات کو صرف نام معلوم کرنے کے لیے کال کی ہے۔“ وہ لگ بھگ چیختے ہوئے بولا۔

”نہیں بلکہ یہ کہنے کے لیے کہ کل آنا مت بھولنا۔“ وہ معصومیت سے کہتے ہوئے بولی۔

”اگرے میں نے ہی تمہیں بلایا ہے تو میں خود آنا کیسے بھول سکتا ہوں۔“ اس بار اس نے نارمل لہجہ میں کہا۔

ابھی بھی اسے بہت گہری نیند آ رہی تھی۔
"کس کے ساتھ۔"

"تمہارے بھوت کے ساتھ۔" اس نے چڑ کر کہا۔
"پھر بھی ابھی تک زندہ ہو۔ یقین نہیں آ رہا۔" اس
کے چڑنے کا اعیان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔
"کل تم فری ہونا۔" اسے پتہ تھا کہ اعیان کی بکواس
یونہی چلتی رہے گی اس لیے اس نے اپنا ہی سوال کر دیا۔
"یار ابھی میں اتنا ابھی فالتو نہیں ہوا ہوں کہ فری میں
بے لگنوں۔ چلو تمہاری خاطر بہت بھی جاؤں گا۔ پہلے یہ تو
بتاؤ کام کیا ہے۔"

"تم کل اپنی بھابھی کو لینے چلے جاؤ۔ تم جانتے ہو
کہ میں اس عیس میں کتنا الجھا ہوا ہوں۔ ورنہ میں خود
ہی چلا جاتا۔"

"اوہ تو کل بھابھی یعنی تمہاری اسی چانی بیوی کو دایس
لا رہے۔ میں تو سمجھا کہ تم نئی شادی کر رہے ہو۔ میں تو
ابھی کسی نکاح خواں کے پاس بھی جانے والا تھا۔ ویسے تم
فکر مت کرو۔ آج پاگل اچھٹل برائی تم سے یہ کس نے
لے گی۔ پھر تم ہو گے اور فرصت ہی فرصت۔ آرام سے
سلا تا بھابھی کو۔"

"تمہیں کس نے بتایا۔" وہ حیران ہوتا ہوا بولا۔
"کس نے بتایا۔" اسے بتایا یہ مت پوچھو۔ کیونکہ وہ
بات اب گزر گئی۔ مطلب بھوت کال میں چلی گئی اور تم تو
جانتے ہی ہو کہ مجھے بھوتوں سے کتنا ڈر لگتا ہے۔" اعیان
بناوٹی خوف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"ہمیشہ اسی سپیدھی باتیں کرتے رہتے ہو۔ کبھی کوئی
بات ڈھنگ سے نہیں بتا سکتے کیا۔" کریم خان غصے
سے بولا۔

"بھائی جو پیدا ہی الٹا ہوا ہو۔ اسے تم جیسے
"تم کل ٹوپیہ کو لینے جا رہے ہونا۔" وہ اعیان کی بات
کو لچ میں ہی کاٹتے ہوئے بولا۔ وہ جانتا تھا کہ اعیان کی
یہ بکواس کبھی ختم نہیں ہوگی۔
"ارے ہاں بابا۔ کل تمہاری ٹوپیہ کو لینے چلا جاؤں

گا۔" بھینٹکس یار۔"

"اپنے بھینٹکس کی چٹنی بنا کے ڈبل روٹی یہ لگا کے
کھا لو۔ دوست کو بھینٹکس بولتے ہو۔ تم میں ذرا سی بھی شرم
حیا ہے کہ نہیں۔ جاؤ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"
اعیان نے غصہ دکھاتے ہوئے کال کاٹ دی۔ کریم خان
کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑنے لگی وہ جانتا تھا کہ اعیان
بہت بڑا ڈرامے باز ہے۔



"ہائی! اپنا جلدی سے اٹھ جاؤ۔ ساڑھے نو بجتے
واسے ہیں۔" ممی کی آوازیں کی اس کی آنکھ کھل گئی۔
"کیا ہے ممی۔ اتنی صبح کو اٹھا دیا۔" وہ انگڑائی لیتے
ہوئے بولی۔ ممی بھی وہ اپنے بند پر ٹپٹی ہوئی تھی۔

"آج تمہاری آنٹی کے ہاں جانا ہے۔ پچھلے ایک
مہینے سے تمہارے انکل بلا جا کر تھک گئے ہیں۔ آج
تمہارے بابا بھی تیار ہو ہی گئے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ بستر
چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو۔" ممی نے اسے بستر پر
دراڑ کر کھینچ کر پیار سے ڈالتے ہوئے کہا۔

بابا اپنی ممی کی بات سن کر گھبرا گئی اور ایک دم بستر سے
اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "اوہ ممی۔
آنٹی نے اس سٹنڈ کو نہیں۔ اگلے سٹنڈ کو بلایا ہے۔"
"اگلے سٹنڈ سے کوئیں۔ آج ہی بلایا ہے۔ صبح سے دو
بار فون بھی کر چکی ہیں۔" ممی اس کے چہرے کو عجیب
نظروں سے دیکھ رہی تھی جس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ایسا لگ
رہا تھا جیسے وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔

"کیا مجھے بھی جانا پڑے گا۔" وہ رو بائیں ہو کر بولی۔
"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ پچھلے ایک مہینے سے تو کوئی
خوش تھی کتنی کے گھر جاؤں گی اور اب۔"

"ممی آج میرا کہیں جانے کا دل نہیں کر رہا۔" اب وہ
اپنی ممی کو کیسے بتاتی کہ اتنا اسے اپنے محبوب سے ملنے جانا
ہے پھر آتا وہ کہیں اور کیسے جاسکتی تھی۔
"ارے تم چلو تو۔ دل بھی لگ جائے گا تمہارا۔" ممی

نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”ممنی میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ اس نے ایک اور بہانہ بنایا۔

”چلو میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ ممنی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

وہ کسی قیمت پر بھی نہیں اور جاتا نہیں جا رہی تھی اس لیے ایک کے بعد ایک بہانہ بناری تھی۔ مگر ممنی بھی کچھ سنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

”ممنی میری ایک تھیلی کئی برسوں کے بعد باہر سے آرہی ہے۔ مجھے اس سے ملنے جانا ہے۔ اس لیے آؤ خرکارا سے بولنا ہی پڑا۔“

”تو جب سے جھوٹ پر جھوٹ کیوں بولے جا رہی تھی میں اور تمہارے پاپا جا رہے ہیں۔ شاید آجائیں گے۔ کھانا فریج میں رکھا ہے گرم کر کے کھا لینا۔“ ممنی یہ کتنی بھونک مارا تھی اس کے کمرے سے نکل گئی۔

”سوری آئی۔ آپ سے تو کئی بار مل چکی ہوں۔ مگر اپنی زندگی سے ہلکی بار ملنے والی ہوں۔ اس سے کیا ہوا وعدہ کیسے توڑ سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور مسکراتے لگی۔



کریم خان نے اعیان کی باتوں کو بھی سمجھ گئی سے نہیں کیا تھا وہ چاہتا تھا کہ اعیان ایسے ہی مراضہ بولنے کا نالک کرتا ہے اور خود ہی مان بھی جاتا ہے۔ اس نے گھڑی میں ناظم دیکھا سناڑھے نو بج رہے تھے۔

رات کو کمال کے ساتھیوں کی گرفتاری بنگلے کی سہاٹی اور دوسری کارروائی چوری کرنے میں تین بج گئے تھے اور اسے چار بجے ہی سونا نصیب ہوا تھا۔ اس لیے وہ صبح دیر تک سوتا رہا تھا۔

کمال کے ساتھیوں کے بارے میں سوچ کر وہ خود ہی شے لگا۔ انہوں نے اتنی تیز رفتاری سے اپنی کارروائی کی تھی کہ ہوکھلاہٹ میں وہ پچارے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے اور ہکا بکا سے

اپنے ہاتھوں میں چڑی جھکڑیوں کو کچھ رہے تھے۔ فریش ہونے کے بعد وہ تیار ہو کر آفس پہنچ گیا جہاں چراغ دین اس کے کیمن میں انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ ”انہوں نے کچھ بتایا۔“ اس نے رات کو گرفتار ہونے والوں کے بارے میں پوچھا۔

”جی سر! صرف کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ بتایا ہے۔“ چراغ دین بولا۔

”کیا کیا بتایا۔ اب یہ تم بتاؤ۔“ ”سر! ان میں سے ایک کا نام جانوئی ٹی ہے۔ اس کا تعلق کوہرا گینگ سے ہے۔“

”وہاں... جانوئی ٹی۔ کوہرا گینگ۔ کیا بول رہے ہو۔ صبح صبح نشہ پی کر کتے ہو گیا۔“ کریم خان چلا ہی اٹھا۔ کیونکہ چراغ دین جس گینگ کے بارے میں بتا رہا تھا وہ بہت ہی خطرناک مانا جاتا تھا۔ اور اس گینگ کا دائرہ کار صرف کراچی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی دہشت پورے ملک پر مسلط تھی۔

”سر! میں تو پی کے بہک رہا ہوں۔ پوری بات سنیں گے تو آپ کو بن پیسے ہی چڑھ جائے گی۔“ چراغ دین کے لہجے میں ضرور کوئی بات تھی۔

”مگر ہمت وہاں کمال کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے گئے تھے۔ یہ جانوئی ٹی اور کوہرا گینگ بیچ میں کہاں سے آ گیا۔ کیا کمال بھی کوہرا گینگ سے تعلق رکھتا تھا؟“ اسے اب یہی لگ رہا تھا کہ کمال کا تعلق اسی بدنام گینگ سے رہا تھا۔ ”یہ معلوم نہیں ہو گا۔“ چراغ دین بولا۔

”تو کیا ہم نے جو گرفتاریاں کی ہیں ان کا کوئی تعلق کمال سے نہیں ہے؟“ اس وقت کریم خان کی حالت دیکھنے لگتی تھی۔

”سر! تعلق تو دور کی بات ہے۔ ان میں سے کوئی کمال کو جانتا تک نہیں۔“ چراغ دین نے جواب دیا۔

”جانتا تک نہیں سے کیا مطلب۔ وہ کمال کے ساتھی نہیں ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جی سر! ان میں سے کوئی بھی کمال کا ساتھی نہیں

ہے۔ ان کو کمال کی تصویر بھی دکھائی گئی مگر انہوں نے کہا کہ اس آدمی کو تو انہوں نے بھی دیکھا ہی نہیں ہے اور نہ ہی کمال نامی کسی آدمی کے بارے میں سنا ہے۔

”اس کا مطلب ہے انہوں نے ہمیں غلط اطلاع دی تھی۔ وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر گویا ہوا۔“ باقی کے تین کون ہیں؟“

سر دوسرا امان خان ہے جو گولڈن گینگ کے لیے کام کرتا ہے۔ تیسرے کا نام نواد سلیم ہے جو کنگ گینگ کا آدمی ہے اور چوتھا اجمل ہے جو کس گینگ کے لیے کام کرتا ہے۔ خود اس کو بھی نہیں پتہ۔ چرائی دین ایک کے بعد ایک کریم خان کے سر پر پھوڑتا جا رہا تھا اور وہ پچھلی پھٹی نظروں سے چرائی دین کو دیکھ رہا تھا۔

اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جو وہ سن رہا ہے وہ سچ ہے۔ کیونکہ جن گینگ کے نام چرائی دین نے اس کے سامنے لیے تھے وہ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت بڑے گینگ تھے اور ان کے بین الاقوامی ٹیکس کے ساتھ بھی ردِ اہل تھے۔ عام آدمی تو ایک طرف سیکورٹی ایجنسیاں بھی ان ٹیکس کا نام سن کر لرز جاتی تھیں۔ ان اسٹیلٹ اغواء برائے تاوان انسانی اسمگلنگ انسانی اعضاء کا کاروبار لڑکیوں کا کاروبار بلیک میلنگ انسدادی ترسیل اور منشیات سمیت یہ لوگ ایسی کئی غیر قانونی کارروائیوں میں ملوث تھے۔

کئی ایجنسیاں پچھلے پانچ سالوں سے ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں مگر ابھی تک ان کا کچھ نہیں بگاڑ پائی تھیں۔ ان ٹیکس کے کام کرنے کا طریقہ عام مروجہ طریقہ کار سے یکسر مختلف تھا۔ وہ اپنے ارکان کو فون پر ہدایت دیتے تھے اور ارکان کا کام ان ہدایات پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ یہ اتنے خفیہ طریقے سے کام کرتے تھے کہ ایک ممبر کو گینگ کے دوسرے رکن کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں ہوتا تھا۔ بس انہیں ناسک دیا جاتا تھا جسے انہیں پورا کرنا ہوتا تھا۔ انہیں یہ تک پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر کوئی رکن اپنے گینگ کے بارے میں جانتا تھا تو وہ تھا

صرف اس گینگ کا نام۔ اول تو اس گینگ کا ممبر پکڑا ہی نہیں جاتا تھا اور اگر بھی کبھار کوئی گرفتار بھی ہو جاتا تھا تو پولیس سے اس کچھ معلوم نہیں کر پاتی تھی۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چاروں کا تعلق الگ الگ گینگ سے ہے۔ کیا وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔“ کریم خان نے ہتھوڑ پر سوچنے کے بعد کہا۔ ”جب وہ اپنے اپنے گینگ ممبرز کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو ایسے میں الگ الگ گینگ سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ”نہیں سر! کل سے پہلے وہ نہ تو آپس میں کبھی ملے تھے اور نہ ہی کبھی بات کی تھی اور تو اور۔ کل سے پہلے وہ ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے تھے۔“ چرائی دین نے کہا۔

”تم کہتے ہو کہ کل سے پہلے وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ مگر ہم نے ان میں سے دو آدمیوں کو ایک ہی کار میں آتے دیکھا تھا۔“ اس نے اہم سوال چرائی دین پر تھوپ دیا۔ ”سر! اجمل اور نواد سلیم ایک ہی کار میں آئے تھے۔ کار اجمل کی ملکیت ہے۔“

”کار کس کی تھی اور کون کون ایک ہی کار میں آیا میں نے پوچھا کیا۔“ تم بہت جتنا پوچھا جائے اٹھا ہوا کرو۔ یہ بتاؤ ہم ایک ہی کار میں کیوں آئے جبکہ وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔“ کریم خان نے غصے سے کہا۔ عام طور پر وہ بھی اپنے ماتحتوں پر اس طرح غصہ نہیں کرتا تھا بلکہ ان کی بات بڑے سکون سے سنتا تھا اس لیے چرائی دین اپنی شوخ طبیعت کی وجہ سے کبھی بھی اس سے مذاق کر لیا کرتا تھا۔ مگر آج کریم خان کچھ زیادہ سی غصے میں لگ رہا تھا اور اس کا غصے میں آنا فطری عمل تھا کیونکہ بے درپے ہونے والے مختلف واقعات نے اسے گھن چکر بنا کر رکھ دیا تھا۔

”سر! ان سب کو ایک دوسرے کی فوٹو بھیجی تھی تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور اجمل کے پاس نے اسے

بتایا تھا کہ خواہ سلیم کو کس جگہ سے سیک کر کے سفید جگہ پر پہچانا ہے۔ اسکی ہی کچھ ہدایات خواہ سلیم کو اپنے پاس سے ملی تھیں۔ "اُس بار چراغ دین کا لہجہ مر جھپایا ہوا تھا۔

"مگر ان کے پاس نے ایسا کیوں کیا؟" وہ بولا۔

"سرا یہ تو ان کو بھی نہیں معلوم کیونکہ ان کو جتنا بتایا جاتا ہے اسی پر انہیں عمل کرنا ہوتا ہے۔ کچھ پوچھنے کا نہ ان کو حق ہے اور نہ ہی ان کی ہمت۔" چراغ دین نے جواب دیا۔

"بھول۔" وہ ہنکار کر بولا۔ "یہ معلوم ہوا کہ وہ چاروں سفید جگہ میں کس لیے جمع ہوئے تھے؟"

"وہاں کوئی پانچواں بھی پہنچنے والا تھا۔ جو انہیں بتاتا کہ انہیں کیوں بلایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے ہماری بھٹک مل گئی ہو اور وہ وہاں نہیں پہنچا۔" چراغ دین نے کہا۔

"جس طرح ان چاروں کو ایک دوسرے کی تصویر بھیجی گئی تھی تو اس پانچویں فرد کی فوٹو بھی بھیجی گئی ہوگی؟" کریم خان نے ایک اور نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں سرا اس پانچویں آدمی کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔"

"تو پھر وہ اسے کیسے پہچانتے؟"

"وہ انہیں کوئی خاص قسم کا کوڈ بتاتا۔"

چراغ دین کی بات سن کر کریم خان پھر چپ ہو کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے۔ کیا انہوں نے سب کچھ سچ بتایا ہے۔"

"نہر! آپ کو کوئی شک ہے۔" تفتیش سرفراز نے کی ہے۔ "چراغ دین نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر بعد چراغ دین مسکرایا تھا۔

کریم خان جانتا تھا کہ جب سرفراز تفتیش کرتا تھا تو مردے بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتے تھے وہ چاروں تو پھر بھی زندہ انسان تھے۔

"وہ سفید ہنگمہ کس کا ہے۔" چراغ دین کے جواب سے مطمئن ہو کر کریم خان نے پوچھا۔

"اس جگہ کا مالک دو مہینے پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہو چکا ہے۔"

ان باتوں نے کریم خان کی جھنجھلاہٹ میں اور اضافہ کر دیا تھا اور اس نے اشارے سے چراغ دین کو جانے کا کہا۔ چراغ دین کمرے سے نکل گیا مگر تیس سیکنڈ بھی مشکل سے گزرے ہوں گے کہ وہ کہیں میں آ گیا۔

"پاس۔ کیا بات ہے؟" کریم خان نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سرا ایک بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔"

"کون سی بات۔"

"سرا ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔" چراغ دین نے کہا۔

"کون سب میں؟"

"جن چاروں کو ہم نے رات کو اریسٹ کیا تھا۔"

"کیا بات مشترک ہے؟"

"سرا ان سب کی کلائی پر سات نمبر کا عدد لگا ہوا ہے اور ایسا ہی سات نمبر میں نے کمال کی کلائی پر بھی دیکھا تھا۔" اتنا بتا کہ چراغ دین دوبارہ باہر نکل گیا۔

"یہ سات نمبر کا کیا سرا ہے۔" کریم خان نے اپنی پیشانی کو رگڑتے ہوئے سوچا۔ آج صبح سے ہی اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ موہا کی رتبہ اسے واپس حقیقت میں پہنچ لائی۔ اس نے اسکرین دیکھی یہ کوئی اور ہی انجان نمبر تھا۔ "ہیلو۔" اس نے کال ریسپو کرتے ہوئے کہا۔

"نیشٹل ہائی دے پر جو جنگل ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

کریم خان نے اس کی بات کاٹے ہوئے کہا۔ "کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔"

"وہاں تالاب کے پاس جو۔" دوسری طرف سے کریم خان کی بات پر توجہ دیے بغیر مزید بولا گیا۔

کریم خان نے جڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور اس کی بات سچ میں کانتے ہوئے بولا۔ "تم لوگوں کو کیوں مار رہے ہو۔"

کہ ان کا کمال سے کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہے۔ جو اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہا تھا کہ وہ چاروں جھوٹ بول رہے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ انظار مرکال کے موبائل سے کال کر رہا تھا جس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ اس کا کمال کے قتل سے کسی نہ کسی طرح تعلق رہا ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ قتل خود اسی نے کیا ہو۔

کریم خان کو انظار مرکال کی بات پر کچھ کچھ یقین بھی ہو رہا تھا کیونکہ انظار مر نے بتایا تھا کہ ان سب کا تعلق سیون انسٹارنگ سے ہے اور کلائیوں پر گدا ہوا مسات کا عدد اسی بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات گردش کر رہے تھے جن کا جواب فی الحال اس کے پاس نہیں تھا۔

لیکن ابھی جو انظار میٹشن ملی تھی اس پر بھی عمل کرنا تھا۔ کریم خان نے سر فراز کو اپنے بہن میں بلایا۔

”سر فراز! معلوم کرو کہ یہ کس کا نمبر ہے اور ہو سکے تو لوکیشن بھی کر لیں کرنا۔“

پھر کچھ دیر بعد اس کی میم میٹشل ہائی وے کے جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ سب سے آگے کریم خان کی گاڑی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ اس کے باقی ماتحت اس کے پیچھے دو گاڑیوں میں آ رہے تھے۔ تینوں گاڑیوں کی رفتار بہت تیز تھی جیسے انہیں منزل پر پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔ لیکن پیچھے والی گاڑیاں کریم خان سے بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔

چند منٹوں کے بعد وہ مطلوبہ کرائنج کے پاس پہنچ چکا تھا جس کے باہر دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ کریم خان نے اپنی گاڑی تھوڑی دیر روک کر کرائنج کے گیٹ پر اتر ڈالی۔ اسے سی کا ہاتھ گیٹ کو بند رہا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی سے نیچے اتر کر کرائنج کی طرف دوڑنے لگا اور ساتھ ہی ہولسنر سے اپنا رول اور بھی نکال لیا تھا۔ گیٹ پر پہنچتے ہی اس نے زور سے لالت مار کر گیٹ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے فرسٹ فلور سے ایک آدمی کو جنگل کی

مگر دوسری طرف اس بات کا کوئی اثر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جہاں بات چھوڑی گئی تھی اس سے آگے بٹانے لگا۔ ”نکڑی کا رہا ہوا ایک کرائنج ہے۔ اس میں جمع ہیں۔“

”تم بہرے ہو کیا۔ میں اتنی دیر سے تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ اس نے پھر بات کا سنبھلے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس بار وہ اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

”کمال کے پاس شفقت چینا عرف ریڈ 001 کی پیش ہے گی جس کا تعلق سیون انسٹارنگ سے ہے۔“ دوسری طرف سے پھر کہا گیا۔

اس بار کریم خان نے اس کی بات سنا ہی نہیں سنی۔ جب دوسری طرف سے بات پوری کی گئی تو وہ بولا۔ ”تم ہمیں غلط انظار میٹشن کیوں دیتے ہو۔“

”یعنی آپ کو مجھ سے زیادہ ان مجرموں کی باتوں پر یقین ہے۔ تو کرتے رہو۔ میرا کیا جاتا ہے۔“ دوسری طرف سے اتنا کہہ کر اس کاٹ دی گئی۔

وہ حیران پریشان بیٹھا کچھ دیر تک بے خیالی میں اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو چھو رہا۔ اس کا دماغ مازوف ہو رہا تھا۔ پہلی بار کی طرح اس مرتبہ اس نے اس نمبر پر کال بیک کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ موبائل سوچ آف کر دیا گیا ہوگا۔

اس نے آواز سنتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ وہی پسے والی ہی آواز تھی جس نے اسے سفید پتھڑے کے بارے میں اندازہ کیا تھا۔ اس لیے کریم خان نے اس کے بارے میں جاننا چاہا تھا مگر وہ جو بھی تھا بہت سی کالیاں تھیں۔ کریم خان اس سے سوال کرتا رہا اور وہ اپنی ہی بات پوری کرتا رہا اور اس نے کریم خان کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا اور جواب دیا تو اس کے لیے ہی کئی سوال چھوڑ گیا۔ اب کریم خان کو فیصلہ کرنا تھا کہ کون سا چلتا اور کون چھوٹا۔ وہ چاروں جو بہت ہی کچے مجرم تھے یا یہ اندازہ۔

چنانچہ دین اسے بتا چکا تھا کہ ان چاروں کی کلائی پر بھی مردہ پائے جانے والے کمال کی طرح سات نمبر کا عدد گواہ ہوا تھا۔ جس سے یہ بات ساف ظاہر ہو رہی تھی

طرف کھٹنے والی کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی تیزی سے بیڑیوں کی طرف بھاگا۔

اس کا سارا دھیان اوپر کی طرف تھا۔ اس لیے وہ نیچے نہیں دیکھ پایا اور اس کا بیڑی کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ زور سے گرا کر یو الوور بھی اس کے ہاتھ سے پھوٹ کر دور جا گرا۔

گرتے ہوئے اس کی پیشانی ٹوہے کی گرل سے ٹکرائی جس سے اس کے ہاتھ سے خون نکلنے لگا۔ اس کے گھٹنوں میں بھی چوٹ آئی تھی۔ اسے سنبھال کر اٹھنے میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ اٹھتے ہی وہ پھر کھڑکی کی طرف بھاگا اور باہر کی طرف چھلانگ لگادی۔

دوسری طرف ایک چٹان تھی جس کی وجہ سے کھڑکی سے صرف پانچ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے کودنے کے بعد ادھر ادھر دیکھا۔ مگر اسے کسی ذی نفس کا کوئی نام نہ نشان نہیں ملا۔ اس کے گھٹنوں کی چوٹ اس کے مزید تیز بھاگنے میں مانع ثابت ہو رہی تھی اس لیے اس نے جنگل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ مرایہ کہ اسے کچھ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ آدمی کس سمت کو بھاگا ہوگا۔ مایوس ہو کر اس نے اپنے قدم واپس کاٹیج کی طرف موڑ لیے۔

چلتے ہوئے اسے کافی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت نہ کر کے کاٹیج کے سامنے کی طرف آ گیا۔ اس کے ماتحت گازیوں سے اثر کرائی کی سمت آ رہے تھے۔ وہ اٹھیں دیکھ کر چیخا۔

”آصف! تم سپاہیوں کو لے کر جنگل کی تلاشی لو۔ ابھی ابھی اس کھڑکی سے کوئی کوہر بھاگا ہے۔“

یہ ہدایت سن کر چرائی دین کے علاوہ باقی سب کریم خان کی بتائی ہوئی سمت کی طرف دوڑ گئے۔

چرائی دین بڑے غور سے کریم خان کے ہاتھ کی چوٹ کو دیکھ رہا تھا جس سے تھوڑا تھوڑا خون بھی بہہ رہا تھا۔ ”سر! آپ کو یہ چوٹ کیسے لگی؟“

کریم خان نے اسے پوری بات بتا کر حیب سے رومال نکال کر ہاتھ کے زخم کو دیا اور پھر اسے باندھ لیا اور چرائی دین کو اشارہ کر رہا ہوا ایک بار پھر مین گیٹ کی

طرف بڑھنے لگا۔ ابھی انہوں نے کاٹیج کے اندر دوسری قدم رکھے تھے کہ اپنے سامنے کا نظارہ دیکھ کر ٹھنک گئے۔

کریم خان اس آدمی کا پیچھا کرنے کے چکر میں اس لاش پر دھیان نہیں دے پایا تھا اور لاش کی اتنی بری حالت تھی کہ دیکھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ایک کتا ہوا سر کرسی پر رکھا ہوا تھا اور باقی جسم کچھ ہی دور زمین پر پیٹ کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک پیٹ ہی پہنی ہوئی تھی۔ جبکہ بالائی دھڑ برہنہ تھا اور پیٹھ کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی اور کھال کے کچھ ٹکڑے اس پاس بکھرے ہوئے تھے اور جس جس جگہ کھال اڑھڑی ہوئی تھی وہاں ٹمک اور سر جیسے ٹنگی ہوئی تھیں۔ یہ تشدد کی انتہا تھی۔ کریم خان جیسے مضبوط اعصاب کے مالک کی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے سیدھا کر کے دیکھے کہ پیٹ کا کیا حال ہے۔

اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اسے ایک کھڑکی پر پردہ لگا ہوا نظر آیا جسے اس نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر اتار لیا اور لاش کے اوپر ڈال دیا۔ وہیں ایک طرف اس کا ر یو الوور بھی گرا ہوا تھا جسے اس نے اٹھا کر واپس ہوسٹر میں رکھ لیا۔

پھر دونوں نے مل کر پورے کاٹیج کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کاٹیج میں کافی توڑ پھوڑ نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مقتول نے مرنے سے پہلے قاتل کے ساتھ کافی مزاحمت اور مقابلہ کیا ہو اور اس بکھرے ہوئے سامان سے الجھ کر ہی کریم خان کرا تھا۔ ورنہ بھاگنے والا اس وقت اس کی حراست میں ہوتا۔

کریم خان نے سپاہیوں کو جنگل کی تلاشی کے لیے بھیج دیا تھا مگر اسے یقین تھا کہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا اور وہ ناکام ہی لوٹیں گے۔ کاٹیج کی تلاشی کے دوران بھی انہیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو انہیں کسی قسم کی مدد فراہم کرے۔ بھاگنے والا انہیں کون تھا۔ یہ بات بھی کریم خان کو بڑی طرح الجھار رہی تھی۔ اس کی سوچ یہی بتا رہی تھی کہ وہ اندازہ مرقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اتنا مٹل ہرگز نہیں تھا کہ انہیں خبر دینے کے بعد کاٹیج میں بیٹھ کر ان کا

انتظار کرتے رہے کہ کب پولیس آئے اور کب وہ بھاگے۔ جبکہ کدال کے قتل میں کریم خان کو پورا یقین تھا کہ اس میں انفارمر کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا۔

وہ ابھی انہی سوچوں میں الجھا ہوا ہی تھا کہ اس کے موبائل پر سرفراز کی کال آ گئی۔
 ”ہاں سرفراز! کیا خبر ہے۔“ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

”سر! یہ نمبر شفقت چینا کا ہے۔“ دوسری طرف سے سرفراز نے بتایا۔

”تم شفقت چینا کی تصویر میرے نمبر پر سینڈ کرو۔“
 ”اوکے سر! میں ابھی اس کی تصویر آپ کے موبائل پر سینڈ کرتا ہوں۔“ پھر اس سے پہلے کہ کریم خان لائن ڈس کنکٹ کرتا دوسری طرف سے سرفراز چھٹا ہوا بولا۔

”سر! ایک بات تو سنیں۔“
 ”ہاں بولو کیا بات ہے۔“

”سر! ہم نے شفقت چینا والے نمبر کی لوکیشن ٹریس کی تھی۔ وہ ہمیں پولیس اسٹیشن کے عقب میں میدان سے ملا ہے۔“ سرفراز نے کریم خان کے لیے ایک اور الجھن کا اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم۔“ وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔
 ”جی سر! ہمارے ہی پولیس اسٹیشن کے عقب والے میدان سے یہ موبائل ملا ہے۔“

”تم نے وہاں اس پاس کسی کو دیکھا؟“
 ”نہیں سر! وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔“ سرفراز نے بتایا۔
 ”ٹھیک سے یاد کرو۔ کوئی تو ادھر ادھر سے آ جا رہا ہوگا۔“ کریم خان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”سر! جب ہم میدان کی طرف جا رہے تھے تو ہم نے ڈی ایس پی زاہر علی کو وہاں سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے علاوہ پورے میدان میں کوئی بھی نہیں تھا۔“
 تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد سرفراز نے جواب دیا۔

”اوکے۔ چلو تم شفقت چینا کی تصویر تو سینڈ کرو۔“
 اتنا کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

اب کریم خان کو اپنی بے وقوفی پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کال بیک نہیں کی تھی کہ انفارمر نے موبائل سوچ آف کر دیا ہوگا اور شاید یہ بات انفارمر بھی جانتا تھا جس کا فائدہ اٹھا کر اس نے موبائل پولیس اسٹیشن کے میدان میں پھینک دیا تھا۔ مگر اس نے یہ کیسے کیا ہوگا۔ اس کی سوچ کو تیج کی ٹون نے توڑا۔ اس نے دیکھا کہ سرفراز نے ایم ایم ایس کے ذریعے شفقت چینا کی تصویر سینڈ کر دی تھی اور یہ تصویر اسی شخص کی تھی جس کا کہنا ہوا اس کے سامنے کرسی پر رکھا ہوا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ انفارمر سچ کہہ رہا تھا اور اب تک اس نے جو بھی بتایا تھا وہ بھی سب سچ تھا۔ وہ چاروں مجرم کدال کے بی سائی تھے اور یہ شفقت چینا عرف ریڈ 001 ان سب کا باس تھا جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس کی کلائی پر بھی سات کا ہندسہ ہونا چاہئے۔

یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور لاش کا دایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اس کی کلائی پر کچھ بھی نہیں تھا پھر اس نے پایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اس پر سات کا عدد گدا ہوا تھا۔ اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ انفارمر نے اب تک انہیں بالکل صحیح معلومات فراہم کی تھیں اور وہ چاروں جھوٹ بول رہے تھے۔

اسی دوران کہیں سے موبائل بجنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے غور کیا تو اسے آیا واز لاش کے پاس سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ لاش کے پاس گیا اور پردہ ایک طرف بنایا۔ موبائل اس لاش کی پینٹ کی جیب میں تھا۔ اس نے نمبر دیکھا تو وہ نمبر اسے کچھ جانا پہچانا لگا۔ ”ہیلو۔“ وہ بولا۔

”ہاں ہیلو۔ کون بول رہا ہے۔“ دوسری طرف سے آنے والی آواز کو پہچاننے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔
 ”سرفراز تم۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”سر! آپ۔۔۔ آپ کے پاس یہ نمبر کیسے آ گیا۔“
 سرفراز نے بھی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ جیس شفقت چینا کی لاش کی جیب سے ملا ہے۔“
 مگر تم کو یہ نمبر کہاں سے ملا۔“ وہ ابھی تک حیران تھا۔

میں گھوم کر اسے گھمرا ہوا تھا۔
چراغ دین نے لاش کی تلاشی لینے کے چکر میں اسے
سیدھا کر دیا تھا۔ لاش کے پیٹ کی حالت اس کی پیشہ
سے بھی زیادہ بری تھی۔ اتنی بری کہ کریم خان سے بھی
نہیں دیکھی تھی۔

لاش کے پیٹ سے چھ سات جگہوں سے گوشت کی
بونیاں کاٹی گئی تھیں۔ کریم خان نے آگے بڑھ کر پردہ
واپس لاش کے اوپر ڈال دیا۔

پورے کالج کی تلاشی تو وہ لے ہی چکے تھے اب دو
کاروں کی تلاشی باقی تھی جو کالج کے باہر کھڑی تھیں۔ اس
لیے وہ دونوں کالج سے نکل کر کاروں کے پاس آ گئے۔
دونوں کاروں کے دروازے لاک نہیں تھے۔ ایک کار کی
تلاشی کریم خان اور دوسری کی تلاشی چراغ دین لینے لگا۔

”سرا مجھے اس کار سے یہ لفافہ ملا ہے۔“ اسے اپنے
بیچھے چراغ دین کی آواز سنائی دی۔

وہ بیچھے گھوما اور چراغ دین سے وہ لفافہ لے کر کھولا
تو اس میں سے تین سفید لفافے اور ہاتھ بوندے۔ اس نے
پہلا لفافہ کھولا تو اس میں کمال کی تین تصاویر تھیں۔ دوسرے
لفافے میں ان چاروں مجرموں کی تصویریں تھیں جو اس
وقت پولیس کی حراست میں تھے۔ جب اس نے تیسرا
لفافہ کھولا تو اس میں موجود تصویریں دیکھ کر اس کی آنکھیں
حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس لفافے میں ڈی ایس
بی زابد علی کی دو تصویریں تھیں۔ چراغ دین بھی ان تصویروں
کو بڑے۔۔۔ غور سے دیکھ رہا تھا۔ چھٹا تبیس سن کر اس نے
”دن اٹھائی تو اسے اپنے ماتحت واپس آتے ہوئے دکھائی
دیئے۔ جو ابھی ان سے کافی فاصلے پر تھے۔“

کریم خان نے وہ تینوں سفید لفافے دوبارہ بڑے
لفافے میں ڈال کر چراغ دین کو تھماتے ہوئے کہا۔ ”تم
یہ تصویریں لے جاؤ اور ان کا ذکر سر فراز کے علاوہ کسی سے
مت کرنا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گاڑی کی چابی
چراغ دین کو دی اور وہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔



”سرا آج نے رات کو جو نمبر دیا تھا۔ میں نے سوچا
اسے بھی زانیہ کر کے دیکھتا ہوں شاید شفقت چینا کی
طرح یہ بھی سوچ آگے مل جائے۔“ سر فراز نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے یہ کمال کا نمبر ہے۔“ وہ بولا۔
کیونکہ اس نے رات کو معلومات حاصل کرنے کے لیے
کمال کا ہی نمبر دیا تھا۔

”جی سرا“

”سر فراز اتم نے ان چاروں مجرموں سے ان کی کاپی
پرگڈے ہوئے سات کے عدد کے بارے میں نہیں پوچھا
تھا کیا۔“ وہ بولا۔

”جی سرا پوچھا تھا۔“

”انہوں نے کیا بتایا تھا؟“

”سرا ایک نے بتایا کہ وہ سات سال سے اس گینگ
کے لیے کام کر رہا ہے۔ پانچ سال پہلے اس کے پاس نے
ایک آدمی کو اس کے پاس بھیجا جس نے اس کی کلائی پر
سات کا عدد گود دیا تھا۔“

مگر اس کے پاس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی کلائی پر
سات کا بندہ کیوں گود دیا گیا ہے۔ باقی تینوں نے بھی
لگ بھگ ایسے ہی جواب دیے تھے۔

”اوکے۔“ اس نے لاکن کاٹ کر موبائل چراغ دین
کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”اس لاش کی تلاشی لو اور
دیکھو کہ اس کی جیب سے اور کچھ ملتا ہے یا نہیں۔“

کریم خان کی ہدایت پر چراغ دین نے اچھی طرح
تلاشی کی مگر اس لاش کی جیبوں سے اور کوئی چیز نہیں ملی۔

شفقت چینا کی جیب سے کمال کا موبائل ملنے سے
ایک بات تو واضح ہو رہی تھی کہ اس کا نقل بھی انڈیا مرے
ہی کیا تھا۔ کیونکہ یہ موبائل اسی کے قبضے میں تھا جس سے
اس نے گزشتہ رات کریم خان کو فون کیا تھا۔ ویسے اس
انڈیا مرے کی ہمت پر اسے سخت حیرت ہو رہی تھی۔ ایک اور
بات بھی واضح ہو رہی تھی کہ کالج سے بھاگنے والا انڈیا مرے
نہیں تھا کیونکہ وہ تو اس میدان میں موبائل پھینک رہا
تھا۔ مگر بھاگنے والا کون تھا۔ روزہ کریم سوال اس کے سامنے

تو لڑکے لڑکیاں بھی آہیں بھرتی تھیں۔ لگتا تھا قدرت نے اسے فرصت میں بنایا تھا اور حسن کی ہر خوبی اس کے انگ انگ میں بھری تھی۔

کانچ میں ہر دوسرا لڑکا اس کا دیوانہ تھا مگر وہ تو اپنے اس انجان شہزادے کی دیوانی تھی جس کے انتظار میں اس نے اتنے برس گزار دیئے تھے اور آج پورے نو سال بعد ان کے مرن کی گھڑی آ رہی تھی۔

وہ کافی دیر تک یونہی آکھنے میں اپنے سراپا کو دیکھتی رہی اور پھر خود ہی شرما کر رہ گئی۔ وہاں سے بہت کر وہ الماروں کے پاس آئی اور ایک لباس نکال کر دوش روم میں چلی گئی۔

جب وہ باہر آئی تو اس نے گلابی رنگ سوٹ پہن رکھا تھا جس پر بہت ہی بامزک کام کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ اور سفید چار بٹ کا دوپٹہ۔ قدرت نے اسے اتنی خوبصورتی سے نوازا تھا کہ کبھی میک اپ کی حاجت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

میک اپ کے نام پر اس نے آج اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اور اب وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی۔

اس نے مڑ کر وال کلاک میں دیکھا ابھی ایک ہی بجھا تھا۔ یعنی ابھی بھی وصال کی گھڑیاں ختم ہونے میں چار گھنٹے باقی تھے۔ وہ بے ہم نہو کر ہینڈ پریشہ کی اور گھڑی کی سوئیوں کو مچھر مچھا آگے بڑھتا ہوا دیکھنے لگی۔



اب آصف اور باقی سپاہی کریم خان کے نزدیک آ گئے تھے۔

”سر! ہم نے پورا جنگل چھان مارا۔ مگر ہمیں کوئی نہیں ملا۔“

”کوئی بات نہیں تم سب اس کا بیج کی تلاشی اس طرح لو کہ ایک سوئی چھنی چیز بھی تمہاری نگاہوں سے بچ نہ پائے۔“ وہ بولا۔

حالانکہ وہ چرائیں کے ساتھ تلاشی لے چکا تھا مگر

مکی اور پاپا کے چلے جانے کے بعد ہائیڈر میں رکھ لی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک فی وی دیکھتی رہی۔ حالانکہ اس کا دھیان فی وی پر بالکل بھی نہیں تھا۔ اس نے بیزار ہو کر فی وی بند کیا اور بے مقصد پورے گھر میں ادھر سے ادھر چکر لاتی رہی۔ مگر آج وقت کی رفتار کل سے بھی زیادہ سست لگنے لگی تھی۔ اسے ایک ایک لمحہ ایک صدی سے بھی طویل محسوس ہو رہا تھا۔

کافی دیر تک چکرانے کے بعد اس نے اپنا لپ ٹاپ آن کیا اور میلز چیک کرنے لگی۔ مگر جلد ہی وہ اس کام سے بھی اکتانہی اور اس نے لپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر کے رکھ دیا۔ اس کا آج کی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اسے گھیرے ہوئے تھی۔

وہ ہر پانچ منٹ بعد ناخن دیکھ رہی تھی۔ لیکن لگتا تھا جیسے وقت بھی اس سے کسی وقت کی دشمنی نکال رہا تھا۔ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے دل میں آیا کہ وہ گھڑی کی سوئیوں کو آگے بڑھا دے۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ کیا ایسا کرنے سے ناخن آگے بڑھ جائے گا؟ خدا خدا کر کے کسی طرح دوپہر ہوئی اور اس نے بارہ بجے ہی کچھ لینا شروع کر دیا۔ دیسے عام طور پر وہ دو بجے ہی بیچ کرتی تھی۔ مگر آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔ بیچ کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ پھر بے چین ہو کر اٹھی اور قدرت آکھنے میں اپنے سر پر پاپا کا جائزہ لینے لگی۔

سیاہ بڑی بڑی آنکھیں۔ آنکھوں پر لمبی حننی چکوں کا پردہ۔ ایسی آنکھیں جو جیسے دیکھیں اس پر نیکی سی گراویں۔ ستواں ناک۔ پتلے پتلے گلابی رسیے ہوئے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ چہرہ ول ول کرتے گلابی رخسار جن پر سیاہ تل قیامت ڈھار ہاتھ اور اسے دیکھ کر وہ شعر بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا کہ

اب میں سمجھا تیرے رخسار پہ تل کا مطلب دولت حسن پہ دربان بٹھا رکھا ہے سراجی دار گرن۔ مگر تک لیے گھنے ریشمی بال۔ غرض وہ حسن کا چلتا پھرتا شاہکار تھی۔ ایسا حسن جیسے دیکھ کر لڑکے

اپنے اطمینان کے لیے اس نے یہی بہتر سمجھا۔ سب اندر چلے گئے اور وہ کار سے نچک لگا کر پھر سوچ میں پڑ گیا۔
اگر یہ تصویر کار میں انفارمر نے رکھی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ڈی ایس پی زاید علی بھی سیون دستار ٹینک کا رکن ہے اور وہ ہمیں اپنے اگلے شکار کے بارے میں پیشگی اطلاع دے رہا ہے۔ یادہ نہیں چینیج کر رہا ہے کہ اگر ڈی ایس پی کو بچا سکتے ہو تو بچالو۔

اور جس طرح پچھلے دونوں سے ڈی ایس پی بیماری کا بہانہ کر کے برائے نام ہی آفس آ رہا تھا جبکہ وہ اس کیس میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں لے رہا تھا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی انفارمر ہو۔ وہ شکار سے یا شکاری۔ یہ تو اب اس کی کھائی دیکھ کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

پوری ٹیم آدھے گھنٹے سے زیادہ کیمچ کی تلاشی نہتی رہی لیکن وہاں کچھ ہوتا تو انہیں ضرور ملتا۔ وہ نامراد باہر نکل آئے۔ اس نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے کیمچ دی اور شہر آ کر وہ ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے اترتے ہوئے آصف سے بولا۔ ”تم آرنی اوجا کر ان دونوں کاروں کی تفصیل نکلاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ مارکیٹ کے اندر چلا گیا جہاں اس نے ایک خوبصورت سی مردانہ رست واقع خریدی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر پولیس اسٹیشن چلا گیا۔

اس نے سرفراز سے ڈی ایس پی صاحب کا معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی گھسے گھسے ہیں۔ دو تین گھنٹے میں لوٹنے کا کہہ گئے ہیں۔ اب وہ ان کے لوٹنے کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔



بانیہ نظریں نکالے گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتی رہی مگر پانچ منٹ میں ہی بیزار ہو گئی۔ پھر اس نے موبائل نکال کر اپنے محبوب کا نمبر ڈائل کیا۔ ”ہیلو۔ کہاں ہیں آپ؟“ اس نے دوسری طرف سے ہیلو سننے کے بعد کہا۔

”گھر پہنچے ہوں۔ کیوں۔“

”آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔“

”پوچھو۔“ دوسری جانب سے سرسری انداز سے کہا گیا۔

”آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں نا؟“
”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہاں بالکل کرتا ہوں۔“

”تو پھر پانچ بجے ہی ملنے کی شرط کیوں لگا رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کی پھر بولی۔ ”اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“

”ارے بس چار گھنٹے ہی تو باقی ہیں۔ جہاں نو سال انتظار کیا ہے وہاں چار گھنٹے اور سہی۔“ دوسری طرف سے ناراض آواز سنائی دی۔

”ان چار گھنٹوں میں ہم کتنے ہی لمحات ساتھ گزار سکتے ہیں۔ جو آپ کی بے جا ضد کی وجہ سے یونہی ضائع ہو جائیں گے۔“ وہ تپ کر بولی۔

بانیہ کی بات سن کر دوسری طرف کچھ خاموشی چھا گئی۔ وہ پھر بولی۔ ”کیا آپ نے کسی عامل سے مہارک گھڑی نکلوائی ہے۔ جو پانچ بجے سے پہلے ملے کو تیار نہیں ہیں۔“
”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ دوسری جانب سے جھنجھکی سی آواز سنائی دی۔

”تو پھر یہی بات ہے۔“ وہ اس بار قدرے غصے سے بولی۔ اسے غصا اس بات پر آ رہا تھا کہ اس کا محبوب اس کی نو سال کی تپ کو کسی خاطر میں ہی نہیں لارہا تھا۔

”اچھا بابا غصہ مت کرو۔ میں چند دس منٹ میں آتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی۔

اس نے ناختم دیکھا سوانح لکھ رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور باہر آ کر گھر لاک کر دیا اور ٹھیک دس منٹ بعد وہ شاد رکنی عالم کے مزار کی ایک مٹی پر بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔

ابھی اسے ہینٹے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے سامنے سے کوئی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے والے کی عمر چوبیس پچیس کے درمیان ہوگی۔ رنگ سافلا۔ عیانہ قد اور عام سا جسم۔

وہ سیدھا بانیہ کی طرف آ یا اور تیج مہاس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی کیونکہ آئے والا

اس کے لیے ابھی نہیں تھا۔

کی چوری پکڑی گئی ہو۔

”ہم چار سال تک کلاس فیلور ہے۔ تم پہلے سے مجھے نہیں بتا سکتے تھے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

بانپ کی بات سن کر سمیر نے سکون کی سانس لی اور بولا۔ ”کسے بتاتا۔ کہاں تم اور کہاں میں۔“

”یہ فلمی ڈائلاگ مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔“ وہ گھورتی ہوئی بولی۔

”میرا مطلب تھا کہاں تم پر یوں سے بھی زیادہ حسین اور کہاں میں کو بے جیسا کالا۔ مجھے تم سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔“

”آخر تم پہلے سے ہمت کر لیتے تو ہم آج ایسے نہ ہوتے۔“

”تو پھر آج ہم کیسے ہوتے۔“ سمیر مسکراتے ہوئے بولا۔

”دو چار بچوں کے ماں باپ ہوتے۔“ وہ شرماتے ہوئے بولی۔

سمیر بھی مسکرانے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ ”یاد تم نے وہ خط بڑے عجیب لکھے تھے۔ تم تو میرا پتہ۔ موبائل نمبر۔ ای میل آئی ڈی سب جانتے تھے۔ پھر ان خطوط میں جھوٹ کیوں لکھا تھا۔“

خط کا نام سننے ہی سمیر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔

”کیا سارے سوال آئی ڈی کرونی۔ کچھ تو بعد کے لیے بھی بچا کر رکھو۔“



شام کے چار بج رہے تھے۔ ٹویہ اپنی بی بی کے کمرے میں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ابو بزنس کے سلسلے میں دو تین دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لیے گھر میں اس وقت وہ دونوں ماں بیٹیاں ہی تھیں۔

ٹویہ پیر گوری چٹی۔ چمکے نہیں نقشبانی ہاں بے حد شوخ حسینہ تھی۔ وہ ہر کسی سے مذاق کر لیتی تھی۔ دوسروں کی نقل اتارنا اس کے بامیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا

”سمیر۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“ وہ حیران ہو کر بولی۔ وہ لڑکا کالج میں اس کا کلاس فیلورہ چکا تھا۔

”خود بلا کر کبہ رہی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔“ سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے۔ میں نے تم کو کب بلایا۔“ وہ حیرت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”یاد کرو۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو تم نے بلایا تھا۔“ سمیر نے کہا۔

”مذاق مت کرو۔ میں بھلا تمہیں کیوں بلاؤں گی۔“ اس بار اس نے تھوڑے تیز لہجے میں کہا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ وہ خط تم کو میں نے ہی بھیجے تھے اور کل کال کر کے مٹنے کا نام بھی میں نے ہی دیا تھا۔“ سمیر کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پریشان ہے یا اکثر جھوٹ بولتے ہوئے ایسا ہوتا ہے۔

”کیا۔ وہ تم ہی ہو۔“ بانیہ خوشی سے چلائی اور سمیر سے اپن کر رہنے لگی۔ سمیر حیران پریشان رہ گیا۔ وہ نہ اسے چپ کر پادار تھا اور نہ ہی خود سے الگ کر پادار تھا۔

”بانی۔ لوگ عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ پلیز خود کو سنبھالو۔“ سمیر پریشانی سے بولا۔

”دیکھنے دو۔ اب میں تم سے الگ نہیں ہو سکتی۔ تم پھر مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور اب میں تمہیں کس جانے نہیں دوں گی۔“ وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے جس محبوب کا اس نے نو سال انتظار کیا تھا وہ اب یہ موقع کیسے گنواؤں گی۔

سمیر نے بڑی مشکلوں سے اسے چپ کروایا۔ وہ سمیر سے الگ تو ہو گئی تھی مگر سمیر کا ہاتھ ابھی تک اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ سمیر نہیں بھاگ نہ جائے۔

”تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا۔“ وہ کچھ دیر بعد مارٹل ہوئی تو سمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”دھوکا ارے کیسا دھوکا؟“ سمیر ایسے چونکا جیسے اس

شریف تو تھا نہیں کہ خاموشی سے میزبانوں کے رحم و کرم پر گزارتا۔ وہ تو بالکل اپنا گھر سمجھ کر قلم چلا رہا تھا اور یہ تو یہ کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ جب بھی ملتا تھا ایسے ہی پیش آتا تھا۔

”مئی کہاں ہیں۔“ اعیان نے پوچھا۔
 ”مئی۔“ مئی کی مئی ”وہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔ کیونکہ وہ تو اپنی ماں کو ایسی ممتی تھی۔“

”آپ کی مئی اور کس کی مئی۔ اب میری مئی تو آپ سے اتنی محبت کرتی نہیں جو خدا سے پریشانی لے کر آپ سے ملنے جاتیں اور نہ ہی میں کسی فرعون کی مئی کی بات کر رہا ہوں۔ جو گناہ گھر کا آرام چھوڑ کر آپ کی خدمت میں پیش ہو۔“ اعیان نے سنجیدہ لہجے میں۔

”تو یہ کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ اعیان اتنی زور زور سے بول رہا تھا کہ اس کی آواز سن کر تو یہ کی ائی کو اپنے کمرے سے باہر آنا ہی پڑا کہ اتنا شور کون مچا رہا ہے۔“

ان کو دیکھتے ہی اعیان ان کی طرف لپکا اور اب سے سلام کیا۔ امی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ جبکہ تو یہ چن چن میں چلی گئی کیونکہ اسے اعیان کے پایے کا کچھ انتظار کرنا تھا اور امی کو تو یہ پہلے اعیان کے آنے کے بارے میں بتا چکی تھی۔

جب اعیان صوفے پر بیٹھ گیا تو امی بولیں۔ ”کیسے ہو بیٹا“

”آئی آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔“ اعیان نے سر جھکا کر نہایت ہی نرم لہجے میں جواب دیا۔

امی اس سے پوچھتی رہیں اور وہ ہر بات کا سر جھکا کر جواب دے رہا تھا بالکل کسی معصوم بچے کی طرح۔ یہ اس بات کا بھی غماز تھا کہ وہ کتنا ہی شوخ اور شرارتی سہی لیکن بڑوں کی عزت اور احترام کرنا اس کا فرض ہے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی بھابھی کے ساتھ الٹی سیدھی بکواس کر رہا تھا۔

کہ کوئی اس سے مذاق مستی میں جیت جائے۔ مگر ایک شخص ایسا تھا جس کے بولنے سے پہلے اسے کئی بار سوچنا پڑتا تھا۔ اور وہ کوئی اور نہیں کریم خان کا دوست اعیان تھا۔ ویسے وہ اعیان کی بہت عزت کرتی تھی اور اعیان بھی اس کا بہت احترام کرتا تھا۔

وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مگن تھیں کہ دروازہ کھلنے لگی۔ وہ اٹھی اور یہ سوچتی ہوئی دروازے کی طرف چل دی کہ اس وقت کون آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اعیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”آپ۔“ وہ حیرت سے بولی۔ حالانکہ رات کو کریم خان نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اسے لینے کے لیے اعیان کو بھیجے گا مگر وہ آج ہی چپک پڑے گا اسے یہ امید نہیں تھی۔

”آپ کے خشم نے مجھے آج آپ کو لینے کے لیے اور یہ منہ بند کر لیں ورنہ کھیاں گف مار کر دانت توڑ دیں گی۔“ اعیان نے تو یہ کا حیرت سے کھلا منہ دیکھ کر اپنے خاص انداز میں کہا۔

اعیان کی بات سن کر اس نے جھٹ سے اپنا منہ بند کر لیا اور پھر بولی۔ ”کیسے ہو۔“

”بہت بھوکا ہوں۔“ اعیان پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

وہ اتنی حیران تھی کہ اس نے اب تک اعیان کو اندر آنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دروازے کو پکڑے ہوئے تھی اب اعیان بچا رہا اسے دھکیل کر اندر آتے آتا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ کوئی چارہ نہیں تو وہ آگے بڑھا اور تو یہ کے ایک ہاتھ کو دروازے سے ہٹا کر اندر آ گیا اور وہ شرمندہ سی دروازہ بند کرنے لگی۔

”سفر کیسار با؟“ اب وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔
 ”بھابھی صاحبہ۔ سفر راستے اور منزلوں کی باتیں بعد میں پہلے کھانے کو کچھ لاؤ۔“ اعیان مسکین سے لہجے میں بولا۔

ظاہر ہے وہ بچا رہا پانچ گھنٹے کا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچا تھا اب بھوک تو لگانی ہی تھی۔ اب اعیان اتنا

نظروں سے دیکھتا پا کر ٹوبہ چین کی سانس نہیں لے پا رہی تھی۔

”بیٹا ابھی تو تم لہا سفر کر کے آئے ہو۔ تھک گئے ہو گے۔ ایک دو دن آرام کر کے پھر اپنی بھابھی کو لے جانا۔“ امی نے کہا۔

”جی ٹھیک ہے آئی۔“ اعیان نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اعیان کو امی کی بات ماننا دیکھ کر ٹوبہ نے سکون کی سانس لی۔

ٹوبہ نے کریم خان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اعیان کو کم از کم آٹھ دن روکے رکھے گی مگر اعیان تو آج کے دن بھی رکنے کو تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو گھبراہٹ مٹی مٹی کر رہی تھی کہ امی نے بات سننا ہی لی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ امی کے ایک بار کہنے پر ہی اعیان نے جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا تھا۔

اب ٹوبہ خوش تھی کہ امی کے کہنے پر وہ دو تین دن تو رگ ہی رہا ہے۔ بعد میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر روک نہ لے گی۔ مگر ٹوبہ کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ تھوڑی دیر بعد جب امی کسی کام سے پڑوس میں گئی تو ان کے جاتے ہی اعیان بولا۔ ”چلو بھابھی۔ تیار ہو جاؤ ہم ابھی جا رہے ہیں۔“

”مگر ابھی تو آپ مان گئے تھے کہ دو تین دن بعد جانے کے لیے۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”وہ بات پرانی ہو گئی۔ ہمیں آج اور ابھی گھر چلنا ہے۔“

”مجھے کچھ لینا ہے۔ اس لیے آج نہیں چل سکتی۔ ایسا کرتے ہیں پرسوں چلیں گے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”کراچی میں دنیا بھر کا سامان مل جاتا ہے اور یہاں سے کہیں زیادہ اچھا۔ آپ کو جو لینا ہے وہیں سے لے لینا۔“ اعیان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جانے کو تیار ہو۔

”وہ..... وہ..... وہ مجھے۔“ اعیان کو اٹھتا دیکھ کر ٹوبہ

اعیان کی یہی تو خوبی تھی کہ وہ اپنے رویے سے سب کو اپنا بنا لیتا تھا۔ وہ بڑوں سے ملتا تو اپنی عزت اور احترام سے پیش آتا کہ وہ اس کے گرویدہ ہو جاتے اور چھوٹے بچوں سے ملتا تو ان کے ساتھ چھوٹا بچہ بن جاتا تھا۔ دوستوں میں بیٹھتا تو اتنا انہی مذاق کرتا تھا کہ ان کا ہنس ہنس کے برا حال ہو جاتا تھا۔

اور جب اسے غصہ آتا تو وہ تباہی اور تہر کا ایسا دیوتا بن جاتا تھا کہ شیطان کی روح بھی کانپ جائے۔ غرض کہ اس میں انسانوں والی تمام اچھی اور بری خوبیوں کا موجود تھا۔

تھوڑی دیر بعد ٹوبہ نے ڈانٹنگ ٹیبل سجادی اور اعیان کے ساتھ امی بھی آ کر ٹیبل کے گرد بیٹھ گئیں۔ جب ٹوبہ بیٹھنے لگی تو اعیان نے اسے ٹوک دیا۔

”ارے آپ کہاں بیٹھ رہی ہیں۔ جب تک میں ان چیزوں کے ساتھ انصاف کرتا ہوں آپ اپنا سامان پیک کر لیں۔ بس آدھے گھنٹے کے اندر ورنہ نہیں یہاں سے ٹھکانا ہے۔“

ٹوبہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی وہ گھبرا گئی۔ اسے لگتا تھا کہ کم از کم آج کے دن تو اعیان جانے کی بات نہیں کرے گا۔ وہ کل اسے روکے رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لے گی۔ وہ بوٹھا کر بولی۔ ”اب ابھی..... ابھی ہم کیسے جاسکتے ہیں؟“

”میں کار لے کر آیا ہوں۔ اس میں چلیں گے اور کیسے چلیں گے۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں میں آپ کو پیدل لے کر جاؤں گا۔“ اعیان نے ٹوبہ کے گھبرائے ہوئے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب تھا ابھی ابو باہر گئے ہوئے ہیں۔ دو تین بعد آئیں گے۔ تب چلیں گے۔“ ٹوبہ کو جلدی میں یہی بہانہ سوچا۔ وہ اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔

”میں انکل کو نہیں آپ کو لینے آیا ہوں۔“ اعیان نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ امی برابر میں بیٹھی ہوئی تھی اس لیے اس نے حتی الامکان اپنا لہجہ ہلکا رکھا تھا۔ مگر اسے گہری

نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا بہانہ کرے۔

”مجھے تو آپ کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھے یہاں روک مجھے قتل کروانا چاہتی ہیں۔“ اعمیان نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ تو کریم نے کہا تھا کہ آپ کو آٹھ دس دن اپنے پاس روکے رکھوں۔ پھر آپ کے ساتھ آ جاؤں۔ اس لیے میں آپ کو روک رہی تھی۔ اور آپ اتنا بڑا الزام۔“ ثوبیہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر پائی۔ وہ بالکل روئے جیسی ہوئی تھی۔ اعمیان کا الزام سن کر اس کے سروں تلے زمین کھسک گئی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھ پائی کہ اعمیان اسے کس کا رہا ہے۔

”اگر آپ سیدھی طرح بتا دیتیں تو سچ اگلوانے کے لیے مجھے اتنا بڑا الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی۔“ اعمیان مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی غائب ہو چکی تھی۔

اعمیان کا آج ہی واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس نے تو ویسے ہی مذاق میں ثوبیہ سے پینلنگ کے لیے کہہ دیا تھا مگر اس کی بات سن کر جس طرح سے ثوبیہ گھبرا گئی تھی اس سے اعمیان نے اندازہ لگایا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ مگر وہ آنٹی کی وجہ سے کچھ زیادہ کہہ نہیں پایا تھا۔ اب آنٹی کے جانے کے بعد اس نے ثوبیہ پر الزام کا سپاؤ گرا کر اسے بوکھلا دیا اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ سچ بتانی چلی گئی۔ سچ سننے کے بعد اعمیان سمجھ گیا کہ وہ دن یہاں آرام سے رہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور یہ بات اس نے ثوبیہ کو بھی بتا دی تھی۔



”مجھے تم مل گئیں۔ سب کچھ مل گیا۔ اب کوئی سوال معنی نہیں رکھتا۔ اب مجھے ایسے سوالوں کے جواب نہیں چاہئیں۔“ ہانیہ نے سمیر کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ جب سے سمیر یہاں آیا تھا اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا

ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

”مجھے بھی تم مل گئی تو سب کچھ مل گیا ہے۔ اب مجھے خدا سے کچھ اور نہیں چاہئے۔“ سمیر نے ہانیہ کے ہاتھ کو ہلکا سا دبا دیا۔ ہانیہ نے کہا: ”سمیر کی آنکھوں میں محبت ہی محبت نظر آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا عام سا چہرہ بھی بہت خاص نظر آ رہا تھا۔

ہانیہ بے خود ہو کر سمیر کو دیکھ کر جا رہی تھی۔ سمیر تو پہلے سے اپنی پیاسی نظروں کو اس کے دیدار سے سیراب کر رہا تھا۔ دونوں اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بنا پلکیں جھپکائے۔ بنا کچھ کہے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے رہے ابھرتے رہے۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر تک اسی کیفیت میں کھوئے رہے کہ ان سے کچھ فارصلے پر بیٹھا ہوا جوز آپس میں کسی بات پر جھگڑنے لگا جن کی تیز آواز سے ان دونوں کی مدہوشی ٹوٹی۔

پہلے ہانیہ ہوش میں آئی اور ہوش میں آتے ہی اس نے سمیر کا ہاتھ چھوڑا اور اپنی پلکیں جھپکالیں۔ اس کے چہرے پر شرم کی لانی ورنی چلی گئی۔ شرماتے ہوئے وہ کچھ اور قسبیں نظر آنے لگی۔ سمیر تو جیسے اس کی اس ادھر پر مرمرا تھا۔ ”اتنی محبت کرتے ہو مجھ سے۔“ وہ بولی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے بھر آئی تھیں۔ وہ اسے حد سے زیادہ چاہتا ہے اور یہ بات وہ خط پڑھ کر جان چکی تھی مگر وہ اس کی محبت کا اظہار اس کی زبانی سننا چاہتی تھی۔

اب آنسو چاہے خوشی کے ہوں یا غم کے۔ انہیں تو انسانوں کا ساتھ نبھانے کے لیے لانا ہی ہوتا ہے۔

ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سمیر تڑپ گیا اور بولا۔ ”اس سے بھی زیادہ۔“ اور کھسک کے ہانیہ کے کچھ اور قریب آ گیا۔ اس نے ہانیہ کی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے ستارے اپنی ہتھیلی میں سینے اور انہیں اپنے ہونٹوں سے لگا کر پینے لگا۔

سمیر کی اس حرکت سے ہانیہ کچھ اور شرمائی۔ اس کا جھکا ہوا سر کچھ اور جھکتا چلا گیا۔

حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔ اس نے دیکھا۔ کال میسر کے نمبر سے آ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔ ”ہیلو۔“ وہ چمکتی ہوئی بولی۔

”ہیلو۔ کیا آپ ہانیہ بول رہی ہیں۔“ دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔

”جی ہاں میں ہانیہ بول رہی ہوں۔ مگر آپ کون۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں میسر کی بہن بول رہی ہوں۔ میسر بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ہم ان کو تھٹر اسپتال لے کر آئے ہیں۔ میسر بھائی آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ پلیز آپ جلدی سے آ جائیں۔“ میسر کی بہن بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔



کریم خان ایک بچے سے ڈی ایس پی زاہد علی کا انتظار کر رہا تھا اور اب پاگل گنگ پکھے تھے۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مگر دس منٹ بعد ہی وہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین لوگ اور بھی تھے۔ زاہد علی نے ان کا کریم خان سے تعارف کروایا وہ تینوں خفیہ ایجنسی کے انویسٹریگٹرز تھے۔

”کریم خان! آپس علی نواز کا کیس اب خفیہ ایجنسی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔“ زاہد علی نے کریم خان کی سوچ پر ایک اور حملہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے سر!“ وہ سری ہونٹی آواز میں بولا۔ اس کے لیے یہ ایک بڑا جھٹکا تھا۔

”مگر خفیہ ایجنسی اس کیس پر کام کر رہی ہے۔ یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور کو معلوم نہیں ہوئی چاہے۔“ ڈی ایس پی نے اسے ایک اور جھٹکا دیا۔

”وہ کیوں سر؟“

”آج کل کے مجرم پولیس سے نہیں ڈرتے مگر ان پر خفیہ ایجنسی کا رعب ابھی بھی قائم ہے۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ اب یہ یہ خفیہ ایجنسی کے پاس ہے تو وہ چونکا ہو جائیں گے۔ جہد ہم ان کی بے فکری کا فائدہ اٹھانا

”مگر میں شاید تم سے اتنی محبت نہیں کر سکی۔ ورنہ تم میرے اتنے قریب رہے اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی تمہارے ساتھ ساتھ ہونے کا احساس ہی نہیں کر سکتیں اور نہ ہی میری سانسیں بھی تمہارے عشق کی خوشبو کو محسوس کر سکتیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں مگر شاید اتنی نہیں جتنا تم مجھے چاہتے ہو۔“ ہانیہ کہتی رہی۔ اس کی پلکیں شرم سے بند ہوئے جا رہی تھیں کیونکہ میسر ایک تک اس کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میسر کوئی جواب دیتا اس کے موبائل پر رنگ بجنے لگی اور وہ موبائل پر بات کرنے لگا۔

”سوری ہانی۔ بہت ضروری کام آ گیا ہے۔ مجھے ابھی جانا ہوگا۔“ فون سننے کے بعد وہ اٹھ کر جانے کے لیے لڑھکھڑکھٹا ہوا گیا۔

”ابھی مت جاؤ نا۔“ ہانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ پیچ پھٹا دیا۔

”ہانی۔ ابھی مجھے جانے دو۔ اب تو ہم ملنے ہی رہیں گے۔“ میسر مسکرا کر بولا۔ آج وہ بہت خوش تھا اور بھلا خوش کیوں نہ ہوتا چاند سے بھی زیادہ حسین ہانیہ اس سے اتنی محبت کر رہی تھی۔ وہ اس وقت خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا اور بار بار دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔

”پنچر ملنے کے لیے پھنسنے کیوں پڑتا ہے۔ میں اب تم سے ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں نے کہہ دیا نا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے بس۔“ ہانیہ تڑپ کر بولی۔

کسی نہ کسی طرح میسر نے ہسلا پھسلا کر ہانیہ کو اس کے گھر روانہ کیا اور خود بھی وہاں سے چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہانیہ اپنے کمرے میں بینڈ پر لیٹی ہوئی تھی اور آج کی ملاقات کے بارے میں سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی۔ آج کا دن اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا۔

وہ ابھی خیالوں میں کھوئی رہتی مگر موبائل کی بیل اسے

”نہیں۔“ ہانیہ زور سے چیخی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی ورنہ اس کے امی ابو اس کے چلانے کی وجہ ضرور پوچھتے۔

”نہیں تھوڑی بہت خراشیں ہی آئی ہیں۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔“ سمیر کی بہن نے ہانیہ کے رونے کی آواز سن کر کہا۔

”نہیں۔ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ کی آواز بتا رہی ہے کہ معاملہ سیریس ہے۔“ ہانیہ روتے روتے بولی۔ ”ارے یقین کریں۔ سمیر بھائی کو بہت معمولی چوٹیں آئی ہیں۔“ اس بار سمیر کی بہن نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر ہانیہ نے لائن کاٹی اور گھر لاک کر کے پاگلوں کی طرح اپنی کار کی طرف بھاگی اور طوفانی رفتار سے کار دوڑاتے ہوئے اسپتال پہنچ گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کوئی بیچارہ اس کی کار کی زد میں نہیں آیا۔ کیونکہ وہ اس وقت بالکل مدہوشی کے عالم میں ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

اپنی کار پارک کر کے اس نے سمیر کا نمبر ڈائل کیا۔ کال سمیر کی بہن نے ریسیو کی اور ہانیہ کو روم نمبر بتا دیا۔ ابھی وہ پانچ چھ قدم ہی چل پائی تھی کہ اس کے موبائل پر کال آئی۔ اس نے اسکرین دیکھی اس کی امی کی کال تھی اور وہ اس وقت اس حالت میں نہیں تھی کہ امی کو کچھ بتا پائی اس لیے اس نے موبائل سوچ آف کر دیا۔ ہانیہ اس فلور پر پہنچی جہاں سمیر ایڈمٹ تھا۔ سمیر کی بہن اسے باہر ہی کھڑی مل گئی۔ وہ جلدی سے اس کے ساتھ روم میں آ گئی جہاں کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔

سمیر کے کہنے پر اس کی بہن اور ہانیہ کے علاوہ باقی لوگ باہر چلے گئے۔

”سمیر۔ یہ سب کیسے ہوا۔“ ہانیہ بولی۔ وہ سارے راستے روتی آئی تھی اور ابھی بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”میں نے تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ بس خدا

چاہتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی قیمت پر یہ بات باہر نہیں جانی چاہئے۔“ ڈی ایس پی نے ایک طرح سے اسے جتاتے ہوئے کہا۔

”او کے سر! یہ بات باہر بالکل نہیں جائے گی۔“ کریم خان نے کہا۔ اس کے علاوہ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

”اور ہاں۔ جس طرح سے تم اس کیس پر کام کر رہے تھے۔ اب نہیں کرو گے۔ لیکن تم اس کیس پر کام کرنے کا صرف دکھاوا کرتے رہو گے۔ باقی کا سارا کام خفیہ ایجنسی خود کر لے گی۔“ ڈی ایس پی سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ ”اب انہیں اپنے کیمن میں لے جاؤ اور اب تک کی ساری تفصیل اور پیش رفت انہیں بتا دو۔“

کریم خان کے پاس ڈی ایس پی کی بات ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک ڈی ایس پی کے دیئے ہوئے جھٹکوں سے سنبھل نہیں پایا تھا۔

ڈی ایس پی کی کلانی دیکھنے والی بات تو اس کے دماغ سے پوری طرح سے نکل ہی گئی تھی۔

کریم خان ان آفیسرز کو اپنے کیمن میں لے آیا جہاں وہ چار گھنٹے تک اس کا دماغ کھاتے رہے۔

رات کے تقریباً نو بج کر تیس منٹ پر وہ اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا اور ابھی وہ گھر کے دروازے کا لاک کھولنے کے لیے چابی نکال ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر کال آ گئی۔ اس نے دیکھا کال سرفراز کی تھی۔

”ہیلو سر! سرفراز کی آواز میں پریشانی کی جھلک تھی۔“

”ہاں سرفراز! بولو۔“ کریم خان نے بھی اس کی پریشانی کو محسوس کر لیا۔

”سر! ابھی ابھی مائی کلاچی روڈ پر ڈی ایس پی صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور انہوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا ہے۔“ سرفراز اور ابھی چھو کہہ رہا تھا مگر اپنے کانوں میں ہونے والی سائیس سائیس کی وجہ سے وہ چھ منٹ نہیں پار رہا تھا۔ ڈی ایس پی زبردستی کی موت کا سن کر اس کا دماغ جیسے کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔



نے اسی کی سزا دی ہے۔“ سمیر اپنے ہونٹوں پر ایک درد بھری مسکراہٹ بجاتے ہوئے بولا۔

”دھوکا..... کیسا دھوکا کہی، بھئی باتیں کر رہے ہو تم۔“ سمیر کی بات سن کے وہ تڑپ کے ہوئی۔

”وہ خط جو میں نے تمہیں لکھے تھے۔ وہ دراصل میں نے نہیں لکھے تھے۔ وہ خط مجھے ریلوے اسٹیشن سے ملے تھے۔“ سمیر نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

”سمیر یہ کون سا موقع ہے مذاق کرنے کا۔“ بانیہ اس کی بات سمجھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔“ سمیر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

سمیر کی بات سن کر بانیہ بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر سمیر کی بہن بھی بیٹھ گئی۔ سمیر کچھ دیر تک بانیہ کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر نظر ہٹا کر کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ لگ بھگ ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ ایک دن میں آفس کے کام سے ورنی جا رہا تھا۔ جب میں پینٹ فارم پر پہنچا تو ایک شخص تیزی سے بھاگتا ہوا میرے پاس سے زرد۔ اس کے پیچھے چوبیس پچیس سال کا ایک لڑکا بھاگا آ رہا تھا۔ اس جیسا حسین لڑکا میں نے زندگی میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس لڑکے کا بیگ نیچے گر گیا۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر آگے والے آدنی کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ وہ بیگ بالکل میرے پاس ہی گرا تھا۔

میں نے وہ بیگ اٹھا اور اس لڑکے کے پیچھے گیا مگر وہ بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ میں مایوس ہو کر وہیں کھڑا اس لڑکے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب بہت دیر بعد بھی وہ لڑکا واپس نہیں آیا تو میں نے یہ سوچ کر وہ بیگ اپنے پاس رکھ لیا کہ اس میں اس کا پتہ ہوا تو کوئی سے واپس آ کر اس تک پہنچا دوں گا۔ مگر جب گھرا کرتیں نے اس بیگ کو کھولا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اتنا کہہ کر سمیر کچھ دیر کے لیے چپ ہوا اور چھت سے نظر ہٹا کر بانیہ کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دوبارہ

بولنا شروع کیا۔ ”اس بیگ میں وہ دو خط تھے جو میں نے تمہیں بھیجے تھے اور تمہارے اسکول کے زمانے کی بہت ساری تصویریں تھیں۔ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمہارا ایڈریس بدل جانے کی وجہ سے وہ لڑکا اپنے خیر تم تک نہیں پہنچا سکا تھا۔ ان خطوط کے ذریعے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اس لڑکے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔ میں تمہیں کالج کے زمانے سے بہت چاہتا تھا۔ مگر کبھی اظہار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کیونکہ کالج میں جس طرح تم گم صم رہتی تھیں اور کسی کو گفت نہیں کر داتی تھیں مجھے لگتا تھا کہ تم کسی کو چاہتی ہو اور میرا انداز بالکل درست نکلا۔ ان خطوط کو پڑھ کے مجھے معلوم ہوا کہ تم کسے چاہتی ہو۔ ایک بار تو میں نے سوچا کہ وہ بیگ تم تک پہنچا دوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سمیر بن کر تو میں تمہیں نہیں پا سکتا۔ کیوں نہ وہ انجمن بن کر ہی قسمت آزمائی جائے۔ میں نے وہ خط جو اس لڑکے نے نو سال پہلے لکھے تھے۔ نئے لفافے میں رکھ کر تمہیں بھیج دیے۔ اور ایسا میں نے اس لیے کیا کیونکہ نو سال پہلے اس نے تمہیں ایک خط بھیجا تھا اس لیے تم اس کی رائٹنگ کو پہچانتی ہوئی۔ پھر میں نے انجمن بن کر تمہیں کالج کی اور میری امید کے مطابق تم میرے جانی میں پھنس گئیں۔ مگر کوئی طاقت تھی جو مجھے ایسا کرنے سے بار بار روک رہی تھی۔ پہلے میں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا۔ مگر اس انکمپڈنٹ کے بعد مجھے ماننا پڑا کہ تم اور وہ لڑکا ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔

جس دن میں نے تمہیں دھوکا دینے کا پکا ارادہ کیا تھا اسی دن میرا سب سے پیارا کتا پی مر گیا۔ جب میں نے تمہیں پہلا خط بھیجا تو بغیر کسی وجہ کے مجھے جانب سے نکال دیا گیا۔ کل میں نے تمہیں ایک خط بھیجا اور کالج کی تو میری کار چوری ہو گئی۔ مگر کل تک میں کچھ نہیں سمجھا تھا کہ میرے ساتھ سب اتنا برا کیوں ہو رہا ہے۔ مگر آج جب میں تم سے ملا تو آج میرا انکمپڈنٹ ہو گیا اور میں نے اپنی دونوں ناکیں ہمیشہ کے کھودی ہیں۔ تب مجھے احساس

ہوا کہ قدرت بھی تم دونوں کے ساتھ ہے۔ تم دونوں ایک نہ ایک دن ضرور ملو گے۔ میں نے تمہیں بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ جو بکے تو پائیز مجھے معاف کر دینا۔ اتنا کہہ کر میرے نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔

میر کی باتیں سن کر ہانیہ کا خون ابل رہا تھا وہ کرسی سے اٹھی اور پوری طاقت سے میر کے گال پر پھینر رسید کر دیا۔ پھینر اتنی زور کا تھا کہ اس کی آواز کمرے سے باہر بھی سنی گئی۔ اس کے بعد ہانیہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

کچھ ہوش نہیں رہتا۔ کچھ دھیان نہیں رہتا

انسان محبت میں۔ انسان نہیں رہتا

کم از کم ہانیہ کی لکھ بھڑکی حالت کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے۔ شاید وہ ہوش سے کام لیتی تو دھوکہ نہ کھاتی۔ غمزدہ عشق ہی کیا جس میں انسان ہوش میں رہے۔ عشق تو کہتے ہی اسے ہیں جو انسان کو بے خود اور بے بس بنائے رکھے۔ عشق انسان کو احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ کیوں کر رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے سیٹ سے پشت نکالی اور گہری گہری سانسیں لے کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

ہانیہ کو اس وقت میر پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میر نے تو ایک ماہر شکاری کی طرح دوسروں کے واسطے پر ایک جال بچھایا تھا۔ بے وقوف تو وہ خود بھی کہ بغیر کسی چھان چھنک کے اس نے مان لیا کہ اسے بلائے والا اس کا محبوب ہے۔ کوئی شکاری نہیں۔ وہ خود ہی دانہ چگنے چلی گئی تھی اب اسے چھٹا تو تھا ہی۔

وہ تو قدرت نے اس کا ساتھ دیا کہ میر کا ایکسڈنٹ ہو گیا اور اسے پوری سچائی معلوم ہو گئی۔ ورنہ جانے کتنے دنوں تک اس کے جھوٹے عاشق کے خول میں چھپا ہوا سانپ میر اسیے ڈستار ہوتا۔

ہانیہ یہی سمجھتی تھی کہ اس خط اور اس کی محبت کے بارے میں اس کے اور اس کے محبوب کے علاوہ کوئی نہیں

جانتا۔ اس لیے جیسے ہی اسے دوسرا خط ملا اس نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا کہ اسے خط بھیجنے والا اس کا وہی محبوب ہے جس کے لیے وہ تڑپ رہی ہے۔

اور ویسے بھی اگر کوئی شخص پورے نو سال تک پانی کی ایک ایک بوند کے لیے تڑپ رہا ہو اور پھر کوئی اسے ڈھیر سا راپانی دے تو وہ اس بات پر بالکل غور نہیں کرے گا کہ پانی دینے والا اس کا دوست ہے یا دشمن۔ وہ تو سیدھا پانی سے منہ لگائے گا اور پیتا جائے گا۔ اس لیے اگر ہانیہ نے کوئی غلطی کی تھی تو یہ ماننا بھی غلط ہوگا۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ بھی یہی غلطی کرتی۔

حالانکہ وہ میر کی زبان پر یہ جان کر بہت خوش ہوئی تھی کہ اس کا محبوب اسی شہر میں ہے اور جس طرح قدرت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسے پوری امید ہونے لگی تھی کہ اس کا محبوب بہت جلد اس سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔ اس نے سب کچھ قدرت پر چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا تھا۔ اب قسمت اسے جس طرف لے جا رہی تھی وہ جانے کو تیار تھی۔

ہانیہ گھر پہنچی تو اس کے امی ابو بھی گھر پہنچ چکے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ابو کے پاس ڈیپلیٹ چایاں تھیں اس لیے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ورنہ وہ اب تک گھر کے باہر کھڑے ہانیہ کا انتظار کر رہے ہوتے۔

گھر میں تھتے ہی اس کی امی نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ایک سہیلی کا ایکسڈنٹ ہو گیا تھا اس لیے وہ اسپتال گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ لگ بھگ ایک گھنٹے تک شاور کے نیچے بیٹھی رہی۔ اب وہ کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی تو لیے سے اپنے بال سکھا رہی تھی کہ اس کا موبائل گنگنا نے لگا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو اس کی سب سے پیاری سہیلی ٹوبیہ کی کال تھی۔ ہانیہ نے مسکراتے ہوئے موبائل اپنے کان سے لگا لیا۔ ”ٹوبیو۔ ٹوبیو۔ کیسی ہو تم۔“

”تمہیں کیا میں جیوں یا مروں۔ میں تمہارے شہر میں

ڈی ایس پی زاہد علی کی زندگی کا چراغ ایک سیڈنٹ کی صورت میں ہوا کے تیز جھونکے نے بجھا دیا تھا۔

کریم خان اپنے باس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ مگر آج صبح جب سے جنگل والے کانچ کے سامنے کھڑی کار سے ڈی ایس پی کی تصویریں ملی تھیں وہ اس سے ایک عجیب طرح کی نفرت سی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ڈی ایس پی یا تو وہ انصار مر ہے جو بڑی بے رحمی سے لوگوں کو مارتا پھر رہا ہے یا پھر وہ سیون انٹارگینگ کا کوئی ممبر ہے۔ مگر سرفراز کی زبانی ڈی ایس پی زاہد کی موت کی خبر سن کر اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ ٹھٹھکے ٹھٹھکے قدموں سے رو بار واپسی گاڑی میں آیا اور اشارت کر کے مانی کلاچی روڈ کی طرف بڑھا دیا۔

وہ جب مانی کلاچی روڈ پر پہنچا تو ٹریفک دور تک جام نظر آ رہا تھا اس لیے اسے اپنی گاڑی کافی پیچھے روکنا پڑی۔ وہ آخر کار گاڑیوں کے صف میں پیدل نکلتا ہوا وہاں پہنچا جہاں لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ کسی طرح لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہ سب سٹا گئے یا تو سامنے دل دہلا دینے والے منظر پر اس کی نظر پڑی۔

روڈ پر کافی دور تک خون کے دھبے جمے ہوئے تھے اور بہت دور تک ڈی ایس پی زاہد کا پتلا ہوا جسم روڈ سے چپکا ہوا تھا۔ اس کی جو حالت ہوئی تھی اسے لاش بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لاش تھی ہی کہاں۔ بس بہت دور تک روڈ پر گوشت لٹوٹے مچھرے بکھرے ہوئے تھے۔ شاید روڈ پر ملنے والی اس کی ذاتی اسپورٹس ہائیک پہنئے ہوئے کپڑوں اور ایسی ہی چیزوں سے اندازہ لگایا گیا تھا کہ مرنے والا ڈی ایس پی زاہد علی سے در نہ تو کچھ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ مرنے والا کون تھا۔ کیونکہ وہاں جسم کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں تھا جو پسینے سے بچ گیا ہو۔

یعنی شاہدوں نے بتایا کہ ڈی ایس پی ایسی جیٹی کی جانب سے بہت تیزی سے اسپورٹس ہائیک چلاتا ہوا آ رہا تھا اور یہ تو ڈیپارٹمنٹ کے سارے ہی لوگ جانتے تھے کہ زاہد علی کو اسپورٹس ہائیک کا کتنا جنون تھا۔ بتانے والوں

آئی ہوئی ہوں اور تم اپنا حسین و جمیل چہرہ دکھانے کے لیے تیاری نہیں ہو رہی ہو۔ میں تو بہت کر کے ایک بار جیسے جیسے تمہارے گھر آ جی جی بھی مگر تم نے تو دوسری گواہی دہری سمجھ کھا ہے۔" ٹوپیہ بولی تو غصے میں بولتی ہی چلی گئی۔

ٹوپیہ واقعی میں ہانیہ سے بہت ناراض تھی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اپنے میکے یعنی ہانیہ کے شہر مانان آئی ہوئی تھی۔ مگر ہانیہ ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔ جبکہ ٹوپیہ پانچ دن پہلے اس کے گھر اس سے ملنے آئی تھی۔

"ارے میری ماں۔ تم ناراض مت ہو۔ کل میں تمہارے گھر آ رہی ہوں نا۔" ہانیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں آئی نا تو دیکھنا تمہاری ناگہیں تو زردوں گی۔ پتہ ہے میں کتنا بور ہو رہی ہوں۔ مگر تمہیں میری کیا فکر ہوگی۔ تم تو اپنی ہی زندگی جی رہی ہو۔" ٹوپیہ ابھی تک غصے میں تھی۔ "اے یار۔ میری فکر کرنے کے لیے کریم بھائی ہیں نا۔" ہانیہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"انہیں بھی اپنی جاب سے فرصت ہو تو میری خبر لیں۔ میرے ماں باپ نے بھی نہ جانے میرے ساتھ کون سے جنم کی دشمنی نکالی ہے جو میری شادی ایک پولیس انسپکٹر سے کروا دی ہے۔"

"تو بھی یار۔ کیا چیز ہے۔ کسی بھی طرح خوش ہوتی۔"

"اگر تم کل آ گئیں تو میں بھی خوش میرا دل بھی خوش اور شائیں تو پہلے ہی بتائے دیتی ہوں اپنے دل کو تو خوش بنی رکھوں گی مگر اسے ہاتھ پیروں کو کھلا چھوڑ دوں گی۔"

ٹوپیہ نے بیاد بھری دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"یار وعدہ کرتی ہوں کل ضرور آؤں گی۔" ہانیہ بولی۔ "اوکے تو پھر باقی باتیں کل ہی کریں گے۔ کال پر زیادہ پیسے خرچ کرنے کا کیا فائدہ۔" اور ہانیہ کا جواب سننے بغیر ہی ٹوپیہ نے فون کاٹ دی۔



انسان بچا رہ بھی ہوؤں میں چلتے اس چراغ کی مانند ہوتا ہے جسے ہوا کا ایک جھونکا بھی بھی بجھا سکتا ہے۔ آج

”اعیان کی پیدائش بھی وقت سے پہلے ہو گئی تھی کیا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ٹوہیہ کے اس بے تکل سوال سے جھلا کر بولا۔

”کیونکہ اعیان صاحب جواپ کے مطابق کل آنے والے تھے۔ آج ہی یہاں وارد ہو چکے ہیں۔“ ٹوہیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا واقعی۔ پھر تو یہ پیدائش والا سوال تم اسی سے پوچھ لو۔“ اعیان کے ہنسنے کی خبر سن کر جیسے ایک اطمینان سا ہو گیا تھا۔

”کیا آپ نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے جو میں اعیان سے پوچھوں۔ وہ تو مجھے کچا ہی چبا جائے گا۔“ ٹوہیہ کھٹکھٹائی ہوئی بولی۔

کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور پھر فون بند کر کے وہ سو گیا۔



کراچی کے علاقے فیض فیر ۱۷ کے ایک خوبصورت بنگلے میں ایک تیس بیستیس سال کا آدمی جس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ اور جسم پتھری طرح مضبوط لگ رہا تھا۔ اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا رہا تھا۔

اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا کر وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا اور سوکے بورڈ کی طرف بڑھا۔ کمرے کے کوئی بہن آن کرنے کی بجائے بورڈ کی ایک خالی جگہ پر اپنی انگلی میں پسینی ہوئی انگلی لگائی۔ انگلی لگاتے ہی ایک ملکی سی آواز ہوئی اور کمرے کے ایک کونے کا فرش اپنی جگہ چھوڑنے لگا اور نیچے جاتی ہوئی میڑھیاں نظر آنے لگیں۔

وہ نقاب پوش میڑھیاں اترنے لگا اور جیسے ہی اس نے ساتویں زمین پر قدم رکھا اوپر کا فرش آٹو میٹک طریقے سے بند ہو گیا اور وہ میڑھیاں جواپ تک اندھیرے میں تھیں روشنی میں چمکنے لگیں۔ نیچے ایک طویل کوریڈر تھا جس میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔

کے مطابق مائی کاچی اور ایم فی خان روڈ کے سنگم پر موز کاسٹے ہوئے تھیں اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی اور دوسری جانب سے آنے والی کار کی زد میں آ گیا۔ اس کی ہائیک ایک طرف جا گری وہ خود ہی سڑک پر گر گیا اور چیخ سے آنے والے ٹرالر کے پیہوں کے نیچے آ گیا اور ٹرالر اسے بہت دور تک کھینچتا چلا گیا اور صحیح معنوں میں ڈی ایس پی صاحب اسٹیکر کی طرح سڑک پر چپک کر رہ گئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر کریم خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے وہ منظر دیکھا نہیں گیا وہ واپس مڑا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے غسل کیا اور ٹوہیہ کو یہ بتانے کے لیے موبائل پر نمبر ڈائل کیا کہ کل اعیان اسے لینے آ رہا ہے۔

”چلو بے بی۔ کیسے ہو تم۔“ دوسری طرف سے کال پک کرتے ہی ٹوہیہ کی چٹکتی ہوئی آواز آئی۔

”ایک دم مست اور میری جان کیسی ہے۔“ اس نے زبردستی اپنی آواز کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔ ”ٹوہیہ اس کی آواز میں پریشانی محسوس کر سکتی تو پھر پوچھ پوچھ کر اس کا راز کھا جاتی۔“

”اودھیر۔ خدا۔ میرے بے بی کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ آج کل مجھ سے جھوٹ ہی بولتا ہے۔ چلو زیادہ ناگہم مت کرو اور یہ بتاؤ کہ اتنے پریشان کیوں ہو۔“ ٹوہیہ آخراں کی بیوی تھی۔ نہ بتانے کے باوجود وہ جانے کس طرح اس کی طبیعت کو پہچان جاتی تھی۔

”یار پولیس کی تو جواب ہی ایسی ہے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ عجیب ہوتا رہتا ہے۔ خیر چھوڑو۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ تمہیں لینے کے لیے کل اعیان پہنچ جائے گا۔ اس بار اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ اس بار اس نے اپنے بچے کو خوشگوار بنانے کی ناکام کوشش نہیں کی تھی۔“

”آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔“

”پوچھو۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

اس کی بات سن کر زاہد علی چونک کر بولنے کی خطا کر بیٹھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

اس کے اتنا کہتے ہی نقاب پوش کی ایک اور زوردار لڑائی اسے پیٹ پر کھانی پڑی۔ ”سائلے جب تجھے کچھ بولنے کو کہتا ہوں تو چپ رہتا ہے اور چپ رہنے کو کہتا ہوں تو بولنے لگتا ہے۔“ تجھے پاگل سمجھا ہوا ہے کیا۔“

اتنا کہنے کے بعد نقاب پوش نے جیب سے ریسمون کشٹرول نکالا اور سائلے دیوار پر لگی ہوئی ایل سی ڈی آن کر دی جس پر ڈی ایس پی زاہد علی کے ایکسیڈنٹ کی ویوز چل رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر زاہد علی نے چلا کر کہا۔ ”یہ کیا ہوا اس ہے۔“

”کتنے کیئے۔ مجھ پر چلاتا ہے۔“ یہ کہہ کر نقاب پوش نے زاہد علی پر لڑائیوں اور کھڑکوں کی برسات کر دی اور تب تک مارتا رہا جب تک وہ چیخ چیخ کر بے ہوش نہ ہو گیا۔

زاہد علی تقریباً آدھے گھنٹے تک بے ہوش رہا۔ پھر اسے دھیرے دھیرے ہوش آنے لگا اور تھوڑی دیر میں وہ پوری طرح ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ چکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اسے اپنے بدن میں ناقابل برداشت تکلیف محسوس ہوئی۔ اس کے منہ سے آہ نکھننے والی تھی جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہونٹ مضبوطی سے کھینچ کر اندر ہی روک لیا اور اپنی بند آنکھیں ذرا سی کھول کر دیکھا۔ سائلے ہی وہ نقاب پوش تھا جس میں ایک فوڈا لیے اس کے ہوش میں آنے کا منظر کھڑا نظر آیا۔ نقاب پوش کو دیکھ کر ایک اسی پولیس آفیسر بیوتے ہوئے بھی اس کے پورے بدن میں خوف کی ایک ٹپکی سی دوڑ گئی۔ عہدہ اپنی جگہ۔ انسان تو پھر انسان ہوتا ہے اور اتنا تشدد کو کون برداشت کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں اور بے ہوشی ظاہر کرنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس پاگل نقاب پوش کو معلوم ہو گیا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں تو مار مار کر میری ہڈیاں تو زڈالے گا۔ مگر اس کی یہ غلط فہمی بھی جلد ہی دور ہوئی کہ نقاب پوش کو اس کے ہوش میں آنے کا علم نہیں ہے۔

”ابے او جاز اولاد۔ یہ نوٹسکی بند کر دے یا نکلیں جو

کئی رہا دیوں سے گزرنے کے بعد وہ نقاب پوش ایک ایسے کمرے میں آیا جہاں ایک شخص لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے بس کھڑا تھا۔ یہ بندھا ہوا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ڈی ایس پی زاہد علی تھا۔

نقاب پوش اس کے پاس آتا ہوا بولا۔ ”کیا حال ہیں ڈی ایس پی زاہد علی صاحب۔“

”کون ہو تم۔“ زاہد علی نے اس سے پوچھا۔

زاہد علی کا اتنا بولنا بھی جیسے جرم بن گیا۔ نقاب پوش کا ہاتھ اٹھا اور ایک زٹانے سے اس کے گال پر پڑا۔ جس سے زاہد علی کو دن میں بھی تارے نظر آنے لگے۔

”تمہاری یہ ہمت کہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے اپنا سوال کر رہا ہے۔“ نقاب پوش نے غصے سے کہا۔

”تم چاہتے کیا ہو۔“ زاہد علی نے پھر پوچھا۔

یہ سنتے ہی نقاب پوش نے ایک زوردار لڑائی زاہد علی کے پیٹ پر ماری اور تکلیف کے مارے زاہد علی کی پیٹھیں نکل گئیں۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی آستین اور دوسرے اعضا نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہو۔

”پھر سوال کرتے ہو۔ ایک بار کی بات سمجھ میں نہیں آتی کیا۔“ وہ غصے سے چلا رہا تھا۔

زاہد علی اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر وہ مزید بولا تو نقاب پوش پھر اس پر تشدد کرے گا۔ مگر اس کا یہ سمجھنا بھی غلط تھا۔ نقاب پوش کچھ دیر تک تو اسے دیکھتا رہا۔ جب زاہد علی کچھ نہیں بولا تو اس نے ایک لمحہ اس کی پیٹھ پر مارتے ہوئے کہا۔ ”اب خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ بھونکتے کیوں نہیں۔“

نقاب پوش کی بات سن کر زاہد علی کا دماغ پکرا گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ نقاب پوش پاگل اور سکی ہے۔ کیونکہ اگر وہ کچھ بولتا ہے تب بھی مار کھاتا ہے اور خاموش رہتا ہے تب بھی بخشا نہیں جاتا۔

وہ چپ ہی رہا اور کچھ بولنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے چپ دیکھ کر نقاب پوش بولا۔ ”چلو چپ ہی رہو۔ ویسے بھی مردے بولا نہیں کرتے۔“

ثوبند کر کے کھڑا ہے۔ نکال کر تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔“
 نقاب پوش کی دھمکی سن کر اس نے ایک دم گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔
 ”ٹریڈر تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اب میں یہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ اپنے بدن کی کتنی ہڈیاں تڑوا کر تم سے بچتا ہے۔“
 نقاب پوش نے غرا کر کہا۔
 زابد علی کچھ نہ بول اور نہ ہی اپنے جسم میں پھسل پھسل پر قابو پا سکا۔

”یہ بتاؤ۔ وہ انفارمر کون ہے۔“
 ”ننگ۔۔۔ کو۔۔۔ کون سا۔۔۔ ان۔۔۔ انفارمر۔۔۔“
 زابد علی ہکلاتے ہوئے بولا۔ خوف کی وجہ سے وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں پا رہا تھا۔
 ”دینی انفارمر جس کی کالیں آج کل انسپکٹر کریم خان کے پاس زیادہ ہی آرہی ہیں۔“ نقاب پوش کھا جانے والے سلجھ میں بولا۔
 ”مم۔۔۔ مگر۔۔۔ آپ کو ننگ کیسے معلوم معلوم ہوا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سب۔۔۔“ زابد علی کی حالت نازک ہو رہی تھی۔

زابد علی یہ سوچ رہا تھا کہ کریم خان نے طارق محمود کے قتل کے علاوہ کوئی بات باہر جانے نہیں دی تھی۔ پھر انفارمر کے بارے میں اس نقاب پوش کو کیسے معلوم ہوا۔
 ”پولیس میں صرف چند لوگ وطن کے لیے کام کرتے ہیں۔ باقی سب ہمارے لیے۔“ نقاب پوش نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ وہ انفارمر کون ہے۔“ اس بار زابد علی نے ہکلائے بغیر جواب دیا۔ اب ننگ نقاب پوش نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اس لیے شاید اس کا ڈر کچھ کم ہو رہا تھا۔

زابد علی کی بات سنتے ہی نقاب پوش حرکت میں آیا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا پوری طاقت سے زابد کی پنڈلیوں سے ٹکرایا۔ اور پھر وہ غصے سے چلا کر بولا۔ ”مگر مجھے کیوں لگتا ہے کہ وہ پولیس کا ہی کوئی آدمی ہے اور تم

اسے جانتے ہو۔“
 ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کون ہے۔ اور ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ پولیس کے زیادہ تر لوگ تمہارے لیے کام کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہیں ان سے معلوم ہو چکا ہوتا۔“ زابد علی نے غصے سے چلا کر کہا۔ مگر جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کیا غلطی کر چکا ہے۔ اس نے گھبرا کر نقاب پوش کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر زابد علی کو اتنا ڈر لگا کہ اس جیسے اعلیٰ عہدیدار کا پیشاب خطا ہو گیا۔

اس کی حالت دیکھ کر نقاب پوش کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ کافی دیر تک ہنستے رہنے کے بعد نقاب پوش بولا۔ ”میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ کچھ لوگ وطن کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ اور کریم خان اور اس کی ٹیم کا شمار بھی انہیں وطن پرستوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔“

اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔
 ”اس لیے تمہیں دنیا کی نظروں میں مردہ بنا کر زندہ یہاں منگوا لیا۔ تاکہ تمہاری مدد سے اس انفارمر تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر میرا خیال غلط نکلا۔ تم بھی انفارمر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ خیر اب اپنی دنیا تو تم واپس جا ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کے لیے تو تم مر چکے ہو۔ اب اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرے لیے کام کرو گے۔ ورنہ۔“ نقاب پوش نے اپنی بات اٹھوری چھوڑ دی اور وہاں سے واپس چلا گیا۔

اس ورنہ کا مطلب زابد علی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ وہ ورنہ نہیں تھی جو اکثر شہر کی دیواروں پر لکھی ہوتی ہے کہ ہمارے لیڈر کو رہا کرو۔ ورنہ ہم دوسرا لیڈر ڈھونڈ لیں گے۔



صبح کے سازجے نہج رہے تھے جب ہانیہ کے ابو اسے ثوبہ کے گھر کے آگے اتار کر آفس چلے گئے تھے۔ ہانیہ گیٹ کے پاس آئی اور ڈور بیل پر اٹکی رکھ دی۔ اتفاق

سے گیت اعیان نے کھولا اور سامنے ہانیہ کو دیکھ کر چونک گیا۔ دوسری طرف ہانیہ کی نظر اعیان پر پڑی تو وہ چلیں چھپکائے بغیر اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

ہانیہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ”کیا کوئی مرد بھی اتنا حسین ہو سکتا ہے۔“ ہانیہ کو جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اعیان کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ ایک بار نہیں۔ بار بار دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے۔ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

اعیان ابھی چلیں چھپکائے بنا ہانیہ کو دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ کے علاوہ اسے نہ تو کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ یہی حالت ہانیہ کی بھی تھی۔ جانے کتنے پل ایسے ہی گزر گئے۔

سب سے پہلے اعیان ہی ہوش میں آیا اور ہانیہ کی کیفیت دیکھ کر مسکرائے لگا۔ اور اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہانیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ارے تو اس طرح لائن کیوں مار رہی ہو۔ یہ تو دس روپے اور یہاں سے نکل لو۔“

اعیان کی آواز سن کر ہانیہ خواب کی سی کیفیت سے باہر آئی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر شرمائی اور گردن جھکا لی۔ اعیان کی بات تو وہ ٹھیک طرح سے سن ہی نہیں پائی تھی۔ اس لیے چپ کھڑی رہی اور کچھ نہیں بولی۔

”اے لڑکی۔ کیا تم بھری ہو۔“ اعیان ذرا تیز آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر بھی ہلکا سا غصہ نظر آنے لگا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں شرارت صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

”جی..... جی..... میں ہانیہ ہوں۔“ وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ اس کا دل بار بار اعیان کو دیکھنے کی ضد کر رہا تھا۔ جیسے رو کرتے ہوئے وہ اپنی نظریں زمین پر نکلے ہوئے تھی۔ وہ عجیب سی الجھنوں کا شکار ہو رہی تھی۔

”ہانیہ ہو تو کیا نام کے الگ سے پیسے لوگی۔“ اعیان بولا اور پرس سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہانیہ کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ٹوبہ کی فرینڈ ہوں۔“ ہانیہ اس نوٹ پر ایک نظر ڈال کر اعیان کی نیلی نیلی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا اور یہ اس کی غلطی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظریں اعیان کی نظروں سے ملیں۔ اس کا دل پچھاتی زور سے دھڑکا کہ ایک لمحے کو تو اسے ایسا لگا جیسے وہ پیسوں کو توڑتا ہوا باہر آ جائے گا۔ ہانیہ نے گھبرا کر دوبارہ نظریں جھکا لیں۔

”ٹوبہ کی دوست ہو تو کیا میں اس خوشی میں ڈانس کروں۔“ اعیان باقاعدہ اپنے کو لہے مٹکاتا ہوا بولا۔ یہ دیکھ کر ہانیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ میں ٹوبہ سے ملنے آئی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر بیٹھ گئی۔

ہانیہ کو کھٹکھٹا کر ہنسا دیکھ کر اعیان کے چہرے پر ایک سکون سا پھیل گیا۔

”میں بھابھی سے پوچھتا ہوں۔ تم باہری رہنا۔ اندر آنے کی کوشش مت کرنا۔ سنا ہے آج کل بھکاری لوگ دن میں گھر کی لوکیشن دیکھ کر جاتے ہیں اور رات کو چوری کر لے جاتے ہیں۔ اعیان بولا۔

اعیان کی بات سن کر ہانیہ کی ہنسی کو بریک لگ گئے اور وہ نہ چلا کر اعیان کو دیکھنے لگی۔

”پتہ نہیں چلا بھی کیا ہو گیا ہے کہ اب بھکاریوں سے روٹی کسے لگی ہیں۔ یہ کہتا ہوا اعیان اندر چلا گیا۔ وہ سپیدھا چکن کی طرف بڑھا کیونکہ اس وقت ٹوبہ چکن میں ہی تھی اور اب تک اعیان کا چہرہ جو مائل لگ رہا تھا اس پر ایک دلکش مسکراہٹ آ کر بیٹھ گئی۔ شاید برسوں بعد اعیان کے لبوں پر اتنی شاندار مسکراہٹ پھیلی تھی۔

دوسری طرف ہانیہ کو اب سمجھ میں آیا کہ اعیان اس کی طرف پیسے کیوں بڑھا رہا تھا۔ اس نے اپنے سر پاپر نظر ڈالی۔ بلیک جیمز اور پاپوناپ میں وہ کسی بھی زاویے سے بھکارن نظر نہیں آ رہی تھی۔

”بھابی! آپ سے ملنے آپ کی کوئی فرینڈ ہانیہ کی ہیں۔“ اعیان چکن کے پاس پہنچتے ہی چلا آیا۔

”کہاں ہے وہ۔“ ”ٹوبہ پکن سے باہر آ کر ادھر ادھر
نظریں دوڑاتے گی۔“

”باہر کھڑی ہے۔“ اعیان مسکراتے ہوئے بولا۔

اعیان کی بات سن کر ٹوبہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ
کھولا پھر کچھ سوچ کر بنا کچھ کہنے باہر کی طرف لپکی اور
ہانیہ کو لے کر اندر آ گئی اور دونوں ڈرائنگ میں آ گئیں۔
اعیان بھی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔

”ہانیہ! ان سے ملو یہ ہے کریم کا جان سے بھی پیارا
دوست اعیان۔ اور اعیان بھائی یہ میری بیسٹ فرینڈ
ہانیہ۔“ ٹوبہ نے دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”ہانیہ تم تو بھابی سے ملنا آتی تھیں نا اور کمال ہے ابھی
تک نہیں ملیں۔ اوہ ایشیا تم کو ملنا نہیں آتا۔ چلو کوئی بات
نہیں۔ میں سکھاتا ہوں۔“ اعیان نے کہا اور ہانیہ کی
طرف بڑھنے لگا۔

ٹوبہ اور ہانیہ دونوں ہی اعیان کی بات کا مطلب
سمجھنے سے قاصر تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ سمجھ
پاتیں۔ اعیان نے قریب پہنچ کر ہانیہ کو اپنی ہانہوں میں
لے لیا۔

اعیان کی ہانہوں میں آتے ہی ہانیہ کو اپنے اندر ایک
سکون سا اثر ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنا سر اعیان کے
چوڑے اور مضبوط سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور
خود بخود ہی اس کے ہاتھ اعیان کی کمر کے نزدیک اور
نزدیک آتے گئے۔ اس سے پہلے کہ ہانیہ اسے خود سے
چپکا لیتی اعیان نے اسے خود سے الگ کیا اور صوفے پر
جا کر بیٹھ گیا۔

ہانیہ جو اعیان کی ہانہوں میں بے انتہا خوشی محسوس کر
رہی تھی اور خدا سے دعا کر رہی تھی کہ اعیان اب پوری
زندگی اسی طرح اسے اپنی ہانہوں میں بھر کر گھرا رہے اور
وہ اسی طرح اپنا سر اس کے سینے سے نکالے اور اپنی
آنکھیں بند کیے پوری ایسی ہی گزار دے۔ اسے اعیان کا
اپنی ہانہوں سے آزار نہ بہت برا لگا۔ اسے بہت تیز غصہ
آنے لگا اور ذرا ہی دیر میں غصے کی لہر اس کے چہرے پر

پھیل گئی۔

اعیان کی اس حرکت پر ٹوبہ بھی بوکھلا گئی تھی اور ہانیہ
کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ جلدی سے بات کو سنبھالتے
ہوئے بولی۔ ”ارے اعیان بھائی کی تو عادت ہے مذاق
کرنے کی۔ تم برا مت ماننا۔“

ٹوبہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اعیان کی اس حرکت پر ہانیہ کو
بہت غصہ رہا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ ہانیہ کو غصہ پکڑنے پر
نہیں بلکہ چھوڑنے پر آ رہا تھا۔ ٹوبہ آگے بڑھی اور ہانیہ کا
ہاتھ پکڑ کر سامنے والے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔
”تم دونوں باتیں کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ بولتے
ہوئے ٹوبہ پکن میں چلی گئی۔

”ایک بات تو ہے۔ غصے میں تم اور زیادہ خوبصورت
لگتی ہو۔ بالکل کشمیری سی۔ جیسی۔ دل کرتا ہے کھا
جاؤں۔“ اعیان نے ہانیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کر بڑے رومانوی لہجے میں کہا۔

ابھی وہ اعیان کی بات کا جواب دینے کے بارے
میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسے سامنے سے آنٹی آتی ہوئی
نظر آئی۔ اور اس نے کوئی جواب دینے کا ارادہ ترک کر
دیا اور آنٹی سے بولی۔ ”سلام آنٹی۔ کیسی ہیں آپ۔“

پھر بہت دیر تک ہانیہ اور آنٹی آپس میں باتیں کرتی
رہیں۔ اس دوران اعیان صوفے سے سر نکالے یوں
آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا جیسے ان دونوں کی بور باتوں
سے اسے غیندا آنے لگی ہو۔

ہانیہ آنٹی سے باتیں کرتے ہوئے بار بار ان سے
نظریں بچا کر اعیان کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک بار آنٹی کی
کسی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے اعیان پر نظر
ڈالی۔ اتفاق سے اعیان نے بھی اسی لمحے اپنی آنکھیں
کھول دیں۔ دونوں کی نظریں ایک پس کے لیے آپس
میں ملیں۔ ہانیہ اپنی چوری پکڑے جانے پر گھبرائی اور
جلدی سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہانیہ کی اس حرکت پر اعیان مسکراتا رہا پھر بولا۔ ”ہانیہ
آپ کیا کرتی ہیں۔“

”میں ایک سوفٹ ویئر انجینئر ہوں۔ مگر پچھلے مہینے اپنی جاب چھوڑ چکی ہوں اور آپ کیا کرتے ہیں۔“ ہانیہ نے اعیان کی بات کا جواب دے کر اپنا سوال کر دیا۔

ہانیہ حیران تھی کہ کبھی وہ اس سے ٹو تزاک سے بات کر رہا ہے تو کبھی آپ جناب ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ گزشتہ کی طرح پل پل رنگ بدلتا ہے اب اسے خوبصورت شخص ہانیہ کو قدم قدم پر حیرت میں ڈال رہا تھا۔

”میں بھی فی الحال آپ کی طرح جاب لیس ہی ہوں۔“ اعیان نے بڑے ہی شائستہ لہجے میں کہا۔

ٹو بیہ اپنے ہاتھوں میں ناشتے کی ترے لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ پھر سب نے ساتھ مل کر ناشتہ کیا اور کافی دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد ہانیہ اور ٹو بیہ کچن میں چلی گئیں اور اعیان وہیں بیٹھا آٹنی سے باتیں کر رہا۔

باتوں ہی باتوں میں کب کب لُچ کا وقت ہو گیا۔ یہ ہی نہیں چلا آج کا لُچ ہانیہ اور ٹو بیہ نے مل کر بنایا تھا۔ شام کے وقت ٹو بیہ کے کہنے پر اعیان نے کار نکالی اور ہانیہ کو اس کے گھر چھوڑنے کے لیے راضی ہو گیا۔ وہ چپ چاپ ڈرائیونگ کر رہا تھا جبکہ ہانیہ بے چینی سے بار بار اعیان کو دیکھ جا رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اعیان کو خاموش دیکھ کر اس کی ہمت نہیں رہی تھی۔

اچانک اعیان نے اپنی کار ایک اسکول کے آگے روکی اور کار سے اتر کر اسکول میں جانے لگا۔ ہانیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہوئی۔ اندر آ کر اعیان اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ہانیہ باہر ہی کھڑی ہوئی۔ اعیان نے پرنسپل سے کچھ باتیں کیں اور پرنسپل نے ان دونوں کو وینٹک روم میں بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک بہت چارہ سا بچہ بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر اعیان کرسی سے اٹھا اور گھٹنے زمین پر ٹکا کر ہانڈس پھیلا دیں۔ وہ بچہ

”پاپا“ کہہ کر اعیان سے لپٹ گیا۔ اعیان نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھاما اور بڑی محبت سے اس کے ماتھے اور گالوں کو چومنے لگا۔

اس بچے کے منہ سے پاپا سن کر ہانیہ کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں اور سانس بھی بہت ہلکے ہلکے چل رہی تھی۔ ایک ہی لمحوں میں اسے ایسا لگنے لگا جیسے وہ صدیوں کا سفر طے کر کے آئی ہو اور بہت تھک چکی ہو۔ اس کی آنکھیں رونے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں جسے اس نے بڑی مشکلی سے روکا۔

اب وہ کس کی شکایت کر سکتی تھی اور کرتی بھی تو کیا کرتی۔ شکایت تو اسے اپنی قسمت سے تھی۔ جس میں قدرت نے صرف غم ہی غم لکھے تھے۔ کوئی خوشی ملتی بھی تو مل بھر کے لیے اور پھر اسے رو رو کر ان خوشیوں کا قرض اتارنا پڑتا تھا۔

ہانیہ نے آج پہلی بار اعیان کو دیکھا تھا۔ وہ ٹو بیہ کی شادی میں نہیں جاسکتی تھی۔ کیونکہ شادی سے ٹھیک ایک دن پہلے اس کی مانی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ورنہ شاید چھ مہینے پہلے ہی وہ شادی میں اعیان سے مل چکی ہوتی۔

اعیان کو دیکھتے ہی اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ اسے صدیوں سے جانتی ہے۔ اسے اعیان کا مذاق اس کا چھیڑ چھاؤ کرنے کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔ اگر کوئی اور اس سے ایسی باتیں کرنا تو وہ اس کا سر پھوڑ دیتی۔ صبح جب اس نے اعیان کو دیکھا تھا وہ اپنے اس محبوب کو بھی بھول گئی تھی جس کے انتظار میں اس نے نو سال تڑپ تڑپ کر گزارے تھے۔

شاید اعیان کی خوبصورتی اسے اعیان کا دیوانہ بنا رہی تھی۔ مگر اب اسے معلوم ہوا کہ اعیان نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ وہ بچہ بالکل اعیان کی کاپی تھا۔ اعیان کی جیسی ہی نیلی نیلی آنکھیں۔ ہو سہوا اعیان جیسا چہرہ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کمرے میں ایک ٹھیکس دو اعیان موجود ہوں۔ ایک چھوٹا اعیان اور ایک بڑا۔ مگر وہ بچہ خوبصورتی میں اعیان سے کہیں کم تھا۔ اعیان ابھی تک

بچے کے گالوں کو چوم رہا تھا۔
 ”پاپا! مٹی نہیں آئیں۔“ بچے نے اعیان سے کہا۔
 ”بیٹا مٹی ابھی بڑی ہیں۔ اگلی بار آئیں گی۔“ اعیان نے پیار سے بچے کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”پاپا مجھے مٹی کی بہت یاد آتی ہے۔“
 ”اور پاپا کی یاد نہیں آتی آپ کو۔“ اعیان اس معصوم کے معصوم سے گالوں کو چومتا ہوا بولا۔

”پاپا آپ کی یاد تو مٹی سے بھی زیادہ آتی ہے۔“ بچہ معصومیت سے بولا۔

”آؤ! آپ کوئی آنٹی سے ملواتا ہوں۔“ اعیان بچے کا ہاتھ پکڑ کر ہانیہ کی طرف بڑھا۔

”بیٹا یہ سچا آپ کی آنٹی ہانیہ اور ہانیہ یہ ہے میرا بیٹا فیضان۔ پیار سے ہماری فیضی کہہ کر بلاتے ہیں۔“

”سلام آنٹی۔“ فیضی نے ہانیہ کو سلام کرتے ہوئے کہا۔

ہانیہ نے فیضی کو گود میں اٹھایا اور اس کا ماتھا چوم کر بیٹے کو ہار دیا۔

”لو کے فیضی! اب ہم چلتے ہیں۔“ اعیان نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہانیہ نے اعیان کی آنکھوں میں آنے والے آنسو دیکھ لیے تھے۔ مگر وہ سمجھ نہیں سکی کہ وہ وہ کیوں رہا تھا۔ وہ بھی اعیان کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دونوں چپ چاپ آ کر کار میں بیٹھ گئے۔ اعیان نے ہانیہ سے کار راستہ معلوم کیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اس وقت اعیان کے چہرے پر ایک درد سا پھیلا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

ہانیہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ کچھ دیر بعد اعیان نے کار ہانیہ کے گھر کے باہر روک دی۔ کار کے رکتے ہی ہانیہ بنا کچھ کہہ کر تری اور اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

”گھر لا کر مہمان کو اندر آنے کا نہیں کہو گی۔“ اعیان

نے ہانیہ کو چپ چاپ گھر کے اندر جاتے دیکھ کر چلا کے کہا۔ اس وقت اس کے لبوں پر ایک شرارتی مسکراہٹ جمی ہوئی تھی۔ چند لمبے پہلے جو درد اس کے چہرے پر تھا اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”تم میرے کون ہو جو میں تمہیں اندر بلاؤں۔“ ہانیہ پیچھے مڑتے ہوئے غصے سے بولی۔

”ارے اتنی جلدی بھول گئیں سب کچھ۔“

”میں تم جیسوں کے منہ پر تھوکنہ بھی پسند نہیں کرتی۔“ ہانیہ نفرت سے بولی۔

”کوہ! خود اپنے منہ پر تھوکنہ پسند کرتی ہو۔ اچھا ہے۔“

ویسے میں تو تمہارے ان رسیلے ہونٹوں کو چوسنا پسند کروں گا۔“ اعیان نے ہانیہ کی بات کا برا نہ مناتے ہوئے کہا۔

اعیان کی بات سن کر ہانیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ غصے سے چلائی۔ ”تم جیسے ہزاروں کتے رال نکالتے میرے گے پیچھے پھرتے ہیں۔“

”کتے! اوہ! اچھا تو یوں کہو نا کہ تم کتیا ہو۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں تو انسان سمجھ کر تمہارے ساتھ ہا میں کیے جا رہا تھا۔“ اعیان نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنی کار آگے بڑھا دی۔

ہانیہ غصے سے زمین پر پاؤں پٹختی رہ گئی۔ مگر جیسے ہی اعیان کی کار اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ چہرے سے غصہ و یکدم غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک بیاس او ر تپ نے لے لی۔

ہانیہ نے اعیان کے ساتھ اتنی بدتمیزی اس لیے برتی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اعیان آئندہ بھی اس سے ملنے یا بات کرنے کی کوشش کرے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اعیان کی طرف کبھی چلی جاتی تھی اس لیے اب وہ اس سے دور ہی رہنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ جو راستہ منزل تک نہ جاتا ہو اس پر چلنے کا کیا فائدہ۔



”اعیان بھائی! اتنے سویرے سویرے تیار ہو کر کہاں جا رہے ہو۔“ ثوبیہ نے اعیان کو تیار ہوتے دیکھا کر کہا۔

جو اپنی انگلی میں کار کی چابی گھماتا ہوا ہمارا چار ہاتھ تھا۔
 ”ہانیہ نے ڈیٹ پر بلایا ہے۔“ اعیان یہ کہتا ہوا ہمارے
 نکل گیا اور کوئی یہ یہ سن کر حیرت میں رہ گئی۔
 کچھ ہی دیر میں وہ اپنی کار ہانیہ کے گھر کے سامنے
 روک کر بیچے اتر رہا تھا۔ گیسٹ پر پہنچ کر اس نے پہلے میل
 بجانے کے بارے میں سوچا مگر پھر گیسٹ کو نیم وا کر کچھ کر بغیر
 کسی میل و جھٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت ہانیہ کی
 امی کچن سے نکل کر دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔
 اعیان کو یوں بڑا اجازت گھر میں آتا دیکھ کر چونک کے
 رکت گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔
 ”السلام علیکم امی جی۔ کیسی ہیں آپ۔“ اعیان نے
 ان کے قریب پہنچ کر ارب سے سلام کیا۔
 ”میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر کون ہوں۔“ امی حیران ہو کر
 بولی۔ اسے سب سے زیادہ حیرت اعیان کے امی جی
 بولنے پر ہو رہی تھی۔
 ”امی جی میں ہانیہ کی دوست ٹوبہ کا دلیر ہوں۔“ وہ
 نرمی سے بولا۔
 اوہ تو بیٹا کھڑے کیوں ہوا۔ ڈانڈا جاؤ۔“ امی اسے
 ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔
 ”جی شکر یہ امی جی۔ بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ بھابھی
 نے ہانیہ کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔ ان کا روم کہاں ہے۔
 میں انہیں تیار ہونے کا کہہ دیتا ہوں۔“
 ”اس کا کمرہ اوپر والے پورشن میں ہے۔“ امی نے
 اپنے ہاتھ سے اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 اعیان بے دھڑک اوپر جانے لگا اور امی اس کے لیے
 ہتھ بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔
 اعیان جب ہانیہ کے کمرے میں پہنچا تو وہ سو رہی
 تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا پھر
 آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے اٹھا
 کر بٹھا دیا۔
 ”آپ... یہاں۔“ ہنر بڑا کراٹھتے ہی ہانیہ کی
 نظر اعیان پر پڑی تو وہ گھبرا کر بولی۔

”بھابی نے بھیجا ہے۔ تمہیں لینے کے لیے۔ تم پانچ
 منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ ورنہ اسی حالت میں اٹھا کر لے
 جاؤں گا۔“ اعیان نے ہانیہ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔ آپ نیچے انتظار کریں میں ابھی آتی
 ہوں۔“ ہانیہ ہیڈ سے اٹھتے ہوئے بولی۔
 اعیان نیچے پالور کچن کے دروازے سے لگ کر ہانیہ کی
 امی کو دیکھنے لگا جو کچھ بنا رہی تھیں۔ امی کی نظر اس پر پڑی تو
 جھڑی سے بولی۔ ”ارے بیٹا آپ یہاں کیا کر رہے ہو۔
 ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔“
 ”امی جی۔ صرف پانچ منٹ ہی تو کرنا ہے یہاں۔
 اس لیے میں نے سوچا اکیلا بیٹھنے کی بجائے آپ سے ہی
 باتیں کر لوں۔“
 ”بیٹا ایک بات پوچھوں۔“
 ”جی پوچھیے۔“
 ”آپ مجھے امی جی کیوں کہہ رہے ہو؟“
 ”میری امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے
 اپنی امی یاد آ گئیں۔ بس بے دھڑک آپ کو امی کہہ دیا۔
 آپ کو اچھا نہیں لگا کیا۔“
 ”ایسی بات نہیں ہے بیٹا۔ میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔
 تم مجھے امی کہہ سکتے ہو۔“ اعیان کی بات سن کر امی کے دل
 میں ممتا بھر آئی۔ ہانیہ ان کی اگلی اولاد تھی اور انہیں ایک
 بیٹے کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی تھی۔ اعیان کی اس بات سے
 وہ تڑپ اٹھیں اور آگے بڑھ کر اعیان کے گلے میں ہاتھ
 ڈال کر اس کے سر کو نیچے جھکا دیا اور اس کے ماتھے کو چومنے
 لگی۔
 ہانیہ جو اس وقت اوپر سے اتر کر رہی تھی یہ منظر دیکھ کر
 حیرت زدہ رہ گئی۔ اعیان کی پیٹھ ہانیہ کی طرف تھی اور امی
 جس والہانہ پن سے چوم رہی تھی اس نے اسے شدید غلط
 فہمی میں مبتلا کر دیا۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہاں سے دیکھنے
 والا اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا
 تھا جیسے اس کی امی اعیان کے جونت چوم رہی ہے۔ شاید
 امی لیے بزرگوں نے کیا خوب کہا ہے کہ کبھی کبھی آنکھوں

دیکھا بھی غلط ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت ایک پاکیزہ جذبے کو ہائیہ ہوں بھرا ایک لمحہ سمجھ رہی تھی۔ ہائیہ نے عجیب سی نظروں سے اپنی امی اور اعیان کو دیکھا اور اندر چلی گئی تاکہ اس کی امی کو بھی کے سامنے شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

تھوڑی دیر بعد اعیان کی کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور ہائیہ اس کے برابر میں خاموش بیٹھی۔ اس کے دماغ میں رد و حرکت کر چکن والا منظر گھوم رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی امی اتنی گری ہوئی عورت ہو سکتی ہے کہ ایک حسین مرد کو دیکھ کر اس کے لب چوسنے لگ جائے گی۔ وہ اس بات کو کیسے جھٹلا سکتی تھی۔ اس نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے اپنی ماں سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

سڑک تقریباً سلساں تھی۔ اکا دکا کاریں ہی ادھر ادھر جاتے نظر آ رہی تھیں۔ اچانک اعیان نے تیزی سے بریک لگا یا اور کار سے اتر کر دوسری طرف کو بھاگا جہاں دو آدمی سگریٹ جیتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے پاس بیٹھتے ہی اعیان نے ان میں سے ایک آدمی کی پینٹی پر زور دار ٹھونسنا دے مارا۔

”اوتے“ وہ آدمی زور سے چلایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کر تا۔ انویان کی ذات اس کی پیٹھ پر پڑی اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ابھی وہ سنہٹنے لگی نہ پایا تھا کہ اعیان کا ایک اور مکا اس کے چہرے پر پڑا جس سے اس کے دورانٹ نوٹ کر نیچے گر گئے۔

استنے میں دوسرے والے آدمی نے پیچھے سے اعیان کے کندھے پر چاقو سے حملہ کیا۔ اعیان بجلی کی سی تیزی سے نیچے جھک گیا اور اس کا چاقو اسی کے سانس کے سینے میں دامن طرف دھنستا چلا گیا۔ اور چاقو مارنے والا حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اعیان نے اس کی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پیٹ میں لگا تار کئی کئی جھڑویے اور ہر کے پروہ نیل کی طرح ڈکرا رہا تھا۔

تب ہی اعیان کو اپنے پیچھے غراہنے سنائی دی۔ وہ آدمی

جس کے سینے میں چاقو لگا تھا وہ اپنے ہاتھ میں ریو اور لیے کھڑا تھا۔ ”اب تم نہیں بچھ گے۔“ اور اتنا کہتے ہی اس نے ٹریگنر دبا دیا۔ قتل کی تیزی سے گولی اعیان کی طرف بڑھی تھی اتنی ہی تیزی سے وہ ایک طرف کو جھٹک گیا اور گولی دوسرے سانس کے سینے میں جا لگی اور وہ آدمی ایک دل خراش چیخ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو اس کی جگہ اعیان زمین پر پڑا ہوتا۔ مگر نہیں کیا پتہ تھا کہ اعیان خود حفاظتی کا اتنا ماہر ہے کہ وہ چاہے چھ کی چھ گولیاں اس پر فائر کر دینا تب بھی شاید ہی کوئی گولی اس سے چھو پائی۔

اگر پانچ چھ آدمی ایک ساتھ بھی اس پر حملہ کرتے تو محال ہے کہ وہ اسے بچ کر پاسے۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس نے گولی سے بچنے۔ دھن کے حملے کو ناکام بنانے۔ نشانہ بازی۔ جوڑو اور دیگر مارشل آرٹ میں بھرپور مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ اتنا ماہر نشانہ باز تھا کہ آنکھیں بند کر کے اڑتی چیز یا کونشانہ بنا سکتا تھا۔

اور رہی بات دماغ کی تو اس کا دماغ ایسے حالات میں اتنی تیزی سے کام کرتا تھا کہ جب تک مخالف کسی پیسٹرے کے بارے میں سوچ ہی رہا ہوتا تھا اور اعیان ایکشن بھی لے چکا ہوتا تھا۔

جس کے ہاتھوں امی کے ساتھ کی گولی لگی تھی وہ پچھلی آنکھوں سے اپنے ساتھ کو دیکھ رہا تھا۔ اعیان کا ایک ہیر ہوا میں ابرایا اور دوسرے ہی پل اس آدمی کے ہاتھ سے ریو اور نکلتا چلا گیا وہ ریو اور اٹھانے کے لیے جھکا اور اعیان نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ ریو اور تک پہنچتا اعیان کا سر اس سے ٹکرایا اور وہ پیچھے جا گرا۔ اعیان بھی نیچے گر کر اور نیچے گرتے ہی اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس ریو اور کو رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

ابھی اعیان اٹھا ہی تھا کہ وہ آدمی چاقو لے کر خونری انداز میں اس کی طرف لپکا۔ اعیان نے جھکائی دے کر اس کا دار خالی جانے دیا۔ اس نے دوسرا وار کیا مگر اس بار

بانیہ کار کے باہر کھڑی پریشان نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے یا اعمیان کیوں ان انجان لوگوں سے جھگڑا کر رہا ہے۔ بانیہ کو کار کے باہر دیکھ کر اعمیان دور ہی سے چیخا۔ ”کار میں بیٹھو۔ جلدی۔“

اعمیان کی آواز اور اس کے چہرے پر اتنا غصہ دیکھ کر بانیہ سہم گئی اور ایک دم سے کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اعمیان نے کار میں بیٹھتے ہی کار آگے بڑھا دی۔ اس بار وہ کار کو نارمل اسپید سے دوڑا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے اس کے چہرے پر چھائے غصے کے بادل چھٹنے لگے اور اس کی جگہ اسی پہلے وہی دلی دلکش مسکراہٹ نے لے لی۔

یہ سب کچھ صرف دو منٹ کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ بانیہ پاگل سی اعمیان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اعمیان ان دونوں آدمیوں کو مارنے کیوں گیا تھا۔ پھر وہ پولیس سائزن کی آوازیں سن رہی تھیں کہ وہ بھاگا تھا تو اب نارمل انداز سے کار کیوں چلا رہا ہے۔

جب اعمیان کے چہرے پر مسکراہٹ پوری طرح پھیل گئی تو بانیہ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ ان دونوں کو مارنے کیوں گئے تھے؟“

”کیونکہ وہ چلک چلیں پر ہمو گنگ کر رہے تھے اور آپ کو شاید پتہ نہیں ہے کہ عوامی مقامات پر سگرمٹ نوشی جرم ہے اور انہیں اس جرم کی سزا تو مٹی ہی چاہئے نا۔“ اعمیان نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ زور سے چلائی۔ ”صرف اتنی سی بات پر آپ سچ میں پاگل ہیں۔“



کریم خان کا کل کا دن نارمل انداز سے گزرا تھا۔ کل ڈی ایس پی زاہد علی کی تہفین میں جانے کے علاوہ اس نے اور کوئی خاص کام نہیں کیا تھا۔

کل رات ہی اسے سرفراز سے معلوم ہو گیا تھا کہ نئی ڈی ایس پی انیٹا اعوان نام کی کوئی لڑکی ہے۔ وہ اپنے کہیں

بھی ناکا سر رہا۔ پھر وہ ایک جنوبی انداز میں لگا ہوا اعمیان پر حملہ کرتا رہا اور اعمیان ہر بار بڑی خوبصورتی سے اوپر اوپر ہو کر بچتا رہا۔ ایسا لگتا رہا تھا جیسے اعمیان اس آدمی کو حملہ کرنے کی پریکٹس کر رہا ہو۔ اس کے ہر حملے سے بچنے کے بعد اعمیان کے چہرے پر مسکراہٹ بڑھتی جا رہی تھی اور ہر بار کام حملے کے بعد اس آدمی کا فہرہ بھی بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ غصے کے مارے اس کے منہ سے جھانک لگنے لگا۔ ہر لڑائی کا پہلا سبق ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر حال میں اپنے فہرہ پر قابو رکھو اور مخالف کی اٹلی چال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ غصہ عقل کو کھاتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو مخالف تم کو کھا جائے گا۔

وہ اب کھڑا ہو رہا نہ رہا تھا۔ اچانک اعمیان اس کی طرف بڑھنے لگا۔ حیرت سے اعمیان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس آدمی نے حملہ کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا اور اعمیان کے سینے پر حملہ کیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اعمیان کے سینے پر کوئی زخم پہنچاتا اعمیان پیچھے کی جانب ایسے گرا جیسے کوئی لاش گری ہو۔ مگر اس سے پہلے کہ اعمیان کی سر زمین سے گرتی اس نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر لگا دیے اور ایک زوردار لٹ اس آدمی کی دونوں ہاتھوں کے بیچ میں پڑی۔ وہ چیخ کر زور سے دوہرا ہوا اور زمین پر بیٹھ جلا گیا۔

اعمیان کی دوسری لٹ اس جگہ پڑی جہاں اس کے اپنے سامنے غلطی سے چاقو مارا تھا۔ وہ گرا کر پیچھے گر گیا۔ اعمیان آگے بڑھا اور اس کے پیٹ میں لٹ مارنے لگے۔ ”بولو۔ تم۔“

مگر اس سے پہلے کہ اعمیان اپنی بات پوری کرتا اور سے پولیس سائزن کی آواز اس کی کانوں میں پڑی۔ اس کے چہرے پر پچھلی ہوئی مسکراہٹ کی جگہ جھنجھلاہٹ نے لے لی۔ اس نے جلدی سے اپنی جیب سے موہاٹل نکالا اور اس آدمی کو سیدھا کر کے اس کی فونو کی۔ پھر وہ لاش کی طرف بھاگا اور جلدی سے اس کی بھی فونو لے کر اپنی کار کی طرف دوڑا۔

میں بیٹھائی ڈی ایس پی صاحبہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے اسے اپنے کیمن میں طلب کر لیا۔

ڈی ایس پی کے کمرے کے باہر پہنچ کر کریم خان نے دستک دی۔ ”ایس کم ان۔“ اندر سے ایک میٹھی سی آواز آئی۔

کریم خان اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کرسی پر دو دھڑکیسی گوری اور بہت ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔

اب چونکہ کریم خان اور سابقہ ڈی ایس پی زاہد علی آپس میں بہت فری تھے۔ اس لیے وہ جب بھی زاہد علی کے کمرے میں آتا تھا تو نہ سیلوٹ کرتا تھا اور نہ ہی ٹیخنے کے لیے زاہد علی کی اجازت کا انتظار کرتا تھا۔ اپنی اسی

عادت سے مجبور کریم خان نے آج بھی یہی کیا اور نہ تو اس نے نئی ڈی ایس پی کو سیلوٹ کیا اور ان کی اجازت کے بغیر ہی سیدھا جا کر کرسی پر براجمان ہو گیا۔

نئی ڈی ایس پی ڈسپلن کی بہت پابند تھی۔ وہ خود بھی ڈسپلن میں رہتی تھی اور ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتی تھی۔ ذرا

ذرا سی بات پر اسے بہت غصہ آ جاتا تھا۔ اور غصے میں وہ کیا کچھ کہہ دیتی تھی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

جب انیتا نے اس طرح کریم خان کو آ کر کرسی پر بیٹھتے دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا۔ ”تمہیں انسپیکٹر کس نے بنا دیا۔ تمہیں تو اپنے سینئر آفیسرز کی ریسپیکٹ کرنی بھی نہیں آتی۔“

جب کریم خان کے کانوں میں انیتا کی آواز پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ وہ کیا غلطی کر چکا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ شرمندہ سا کرسی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ”سوری میم۔“

کریم خان کے سوری کہنے سے انیتا کے غصے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے کریم خان کو دیکھ رہی تھی۔ ”انسپیکٹر کریم خان۔ کیا تم ہی ریٹس جی نواز والے کس کو پینڈل کر رہے ہو۔“

”نومیم۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا اوپر سے مجھے خط لکھ کر کہیں گے۔“ اس بار انیتا نے چلا تے ہوئے کہا۔

انیتا کو اتنا بھڑکتا دیکھ کر کریم خان بھی گھبرا گیا تھا۔

اس کے ساتھ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ زاہد علی تو اس کے ساتھ نہایت ہی دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کرتا تھا۔

”کچھ دنوں سے ریٹس جی نواز والا کیس خفیہ ایجنسی کے پاس ہے۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ مگر فیملی تمہیں بھی اس کیس سے الگ نہیں کیا گیا ہے۔“

”فیملی یہ کیس ابھی ابھی میرے پاس ہے۔ مگر مجھے آؤر روئے گئے ہیں کہ میں اپنے طور پر اس کیس پر کوئی کام نہیں کر سکتا۔ بس نام کے طور پر ہی یہ کیس میرے پاس ہے۔“ کریم خان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اور تم نے مان لیا۔ تمہارے اندر عقل نام کی کوئی چیز بھی ہے یا نہیں۔“ انیتا غراتے ہوئے بولی۔

”زاہد علی صاحب نے مجھے ایسا آؤر دیا تھا تو میں ماننے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔“

”تم اور تمہارا پاس زاہد علی ایک نمبر کے بے وقوف ہو۔ اب اگر خفیہ ایجنسی والے اس کیس کو سلجھا لیتے ہیں تو ان کا نام ہو جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو بے عزت ہونے کے لیے پولیس ڈپارٹمنٹ تو ہے ہی۔“ انیتا وائٹ چیس کر بہت غصے میں کہہ رہی تھی۔

کریم خان اس صورت حال میں خود کو بالکل بے بس تصور کر رہا تھا۔ انیتا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی اس پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کیے وہ سر جھکائے شرمندہ سا کھڑا رہا۔

”اب سب سے پہلے تم مجھے اس کیس کی وجہ باتیں بتاؤ جو تمہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اس کے بعد ہم ان باتوں پر ڈسکس کریں گے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔“

”میم اس کیس میں مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ مری مری سی آواز میں بولا۔

”تمہارا نکل ملاؤ ہو۔ اپنی کام چوری کی وجہ سے ہی تم نے خوشی خوشی زاہد کی بات مان لی تھی۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ پولیس کو تراس کھانے کی عادت پڑ گئی ہے اور یہ بھی

نہیں

نہیں

نہیں

نہیں

سچ کہتے ہیں کہ بڑی کھانے اور کتوں کی طرح بھونکنے کے علاوہ ہماری پولیس کچھ نہیں کرتی۔“ کریم خان کی بات نے اعتنا کا غصہ مزید فزوں کر دیا تھا۔ اور وہ غصے میں جانے کیا کیا بولتی چلی گئی۔ آج تک کریم خان کی ایسی بے عزتی کسی نے نہیں کی تھی۔ شرمندگی کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکائے جیب چاہا۔ اعتنا کی ڈانٹ سنتا رہا۔

”اب جیب کیوں ہو۔ جلدی بلنا شروع کرو۔ ویسے تو میں سب کچھ قائل میں پڑھ چکی ہوں مگر میں وہ سب کچھ تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔“ اعتنا ایک بار پھر غصے سے چلا کر بولی۔

”میم۔“ رئیس علی نواز کی پارٹی میں جتنے بھی لوگ شریک ہوئے تھے۔ ان سب کی موت ہارٹ ایک سے ہوئی تھی۔ سب کی لاشیں مل چکی تھیں سوائے ایک آدمی کے۔ اس کا نام طارق محمود تھا۔ پھر سمندر کی طرف جانے والی سڑک پر جاوٹے کا شکار ہونے والی ایک کار سے اس کی لاش ملی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی موت ہارٹ ایک سے نہیں بلکہ سر میں گولی مارنے سے ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہمیں پتہ چلا کہ اس کی موت شام چھ اور سات بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ یعنی کہ رئیس علی نواز کی پارٹی شروع ہونے سے پہلے اور اس بات کی تصدیق یوں بھی ہوئی ہے کہ پارٹی میں اس کے کوئی فتنہ پرنٹس نہیں پائے گئے۔ وہاں سے ملنے والے فتنہ پرنٹس میں تین ایسے تھے جنہیں اس پارٹی میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔

پہلے فتنہ پرنٹ خود رئیس علی نواز کے جو ایک دن پہلے سنا غا خان اسپتال میں ایڈمٹ ہو چکے تھے۔ جس کے گواہ اس کے گھر کے ملازمین ہیں۔ اور میں نے خود اسپتال کی ویڈیو فوٹیج دیکھی تو پتہ چلا کہ وہ تو اسپینے بند سے بلا تک نہیں۔ مرنے سے پہلے کہ ہم اس سے چھ پوچھنا چاہتے تھے کہ پرنٹس کی وجہ سے ان کی بھی موت واقع ہوئی۔ یہ سب پہلے دن کی بات ہے۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ جو دوسرے فتنہ پرنٹ پائے گئے تھے وہ کمال ناہی کسی شخص کے تھے جو سات سال پہلے چھ ماہ کی سزا کاٹ چکا تھا۔ مگر تیسرے فتنہ پرنٹ کسی کے ہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ پھر اسی صبح بی بی اسے کسی کی کال آئی جس میں بتایا گیا کہ کھنڈر میں ایک لاش ملے گی۔ اور وہاں سے واقعی ایک لاش ملی جو کمال کی تھی جس کی کلائی پر سات کا ہندسہ گدا ہوا تھا۔ پھر اسی رات تقریباً ساڑھے دس بجے کمال کے گھر سے کسی نے مجھے کال کر کے بتایا کہ وہ شخصیں فیروز خان کے ایک بیٹے میں کمال کے چار ساتھی جمع ہو رہے ہیں۔

اس رات ہم نے کارروائی کر کے چاروں کو گرفتار کر لیا۔ مگر جب ان سے تفتیش کی گئی تو کہانی بالکل الٹ نکلی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چاروں الگ الگ گینگ کے ممبر ہیں۔ مگر کمال کی طرح ان چاروں کی کلائی پر بھی سات کا ہندسہ گدا ہوا تھا۔ تھرڈ ڈگری استعمال کرنے پر بھی انہوں نے کوئی یقینی جواب نہیں دیا۔

اور پھر اگلی صبح کسی انجمن نمبر سے اس انفارمیشن نے مجھے دوبارہ کالی کر کے بتایا کہ فیصل ہائی وے پر واقع ایک کالج میں کمال کے پاس شفقت چیتا عرف ریڈ 001 کی لاش ملے گی جس کا تعلق سیون اسٹار گینگ سے ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نمبر جس سے انفارمیشن کال کی تھی وہ اسی شفقت چیتا کا تھا۔ اور وہ موہا مل ایسی پولیس اسٹیشن کے میدان سے پتا نہ کیا گیا۔ اور وہاں کالج میں شفقت چیتا کی جیب سے کمال کا موہا مل ملا۔

(باقی ان شاء اللہ کلمہ)



دیپکے تار

شہناز نسیم

نشے میں انسان کو کچھ نظر نہیں آتا، لیکن اکثر کچھ باتیں نشے کو فوراً دیتی ہیں۔

ایک ایسے ہی شخص کا واقعہ، جو نشے میں گناہ کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن اس کی بیوی کی آواز اسے حال میں واپس لے آئی۔

مارجوری اپنے فلیٹ کے لاؤنج میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ٹی وی سیٹ کی آواز بند کر رکھی تھی اس لیے خبریں نہ سننے والے اناؤنسر کے ہونٹوں کی حرکات بڑی دلچسپ بلکہ مستحکم خیال لگ رہی تھیں۔

مارجوری ہمیشہ سے کم مود اقح ہوئی تھی۔ مگسپ کرنا اس کی طبع کے خلاف تھا اس لیے وہ پارٹیز وغیرہ میں شرکت کرنے سے عموماً گریز بھی کرتی تھی۔ جارج نے درست ہی کہا تھا کہ اس رات جو آفس پارٹی ہو رہی ہے وہاں جا کر دو آکر بہت محسوس کرے گی۔

”کو کھوٹا ڈرائنگ روم کسی کو جانتی ہی نہیں ہو وہاں سب ایسی چیزیں ہوں گے۔“ مارجوری نے بھی اس کی تردید نہیں کی اور راضی ہو رہی تھی۔

جب جارج پارٹی میں جانے کے لیے لباس بدل رہا تھا تو مارجوری اسے دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ عہد شباب گزر جانے کے باوجود جارج کی جسمانی کشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس کے جسم پر اوجیز عمری اپنا وار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی خوش لمباہی بھی ویسکی کی ویسکی ہی تھی۔ اس نے شوخ رنگ کی شرٹ پہنی، پھولدار نمائی لگائی، کوٹ کی بریسٹ پائمنٹ میں رومال سجایا اور پھر اپنے لیے لیے تھوٹھریالے بالوں میں بھیچیرنے لگا۔

”پارٹی میں تمہیں اپنی آواز کا فن دکھانے کے لیے تو ضرور کہا جائے گا۔“ مارجوری نے کہا۔

جارج نے اسے کہنے کے قریب تر ہو کر اکاؤ کا سفید بالوں کو سیاہ بالوں کے نیچے چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہمیشہ مجھ سے یہی فرمائش کی جاتی ہے کہ آج فلاں کی آواز نکال کر دکھاؤ آج فلاں کی نقل اسکر کر دکھاؤ۔“

مارجوری کی جارج سے پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی

تھی اور وہ جارج کی اس انوکھی خوبی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر مشہور لوگوں کی آواز اور لہجے کی وہ بہت قریب آ کر سکتا تھا۔ اس کی یہ حفت اپنے ارد گرد اچھا خاصا مجمع لگانے کے کا م آتی تھی اور کئی سیاست دانوں، واکاروں اور اس طرح کے نامور لہجے میں ہو بہو بات کر کے سامعین کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔

جارج نے اپنی تیاری کا آخری ٹچ دیتے ہوئے کوٹ پر رش پھیلا دینے میں اپنے سر پر ایک آخری نظر ڈالی اور پھر اپنی کار کی چابیاں اٹھاتے ہوئے نکلا۔

”ڈرائنگ میری واپسی تو شاید بارہ بجے کے بعد ہی ہوگی اس لیے میرے انتظار میں جاگتی نہ رہنا، بے فکر ہو کر سو جانا۔“ پھر اس نے مارجوری کے گال پر پیار بھری چپٹ لگائی اور کہا۔

”ڈرائنگ کوئی ایسا کام نہ کرنا جو تمہارے شوہر تدارک نہ پائے ہو۔“ پھر وہ سگریٹاں ہوا باہر چلا گیا۔

مارجوری کے چہرے پر ہنسکی مسکراہٹ تھی وہ سوچ رہی تھی کہ آج جارج اسے با اعتماد لہجے میں اسے کوئی ایسا ویسا کام نہ کرنے کی ہدایت کیوں دیتا رہتا ہے؟ اسے یہ یقین کیوں ہوتا ہے کہ میں واقعی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی؟

وہ صوفے کی پشت پر سونیک کر سوجتی رہی۔ چشم تصور سے وہ اس پارٹی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ جس میں شریک ہونے کے لیے جارج اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔ جارج تو محفل کی جان بن چکا۔ چھیل چھیلایا، سارے خوش رو، خوش گفتار، خوش پوش اور پھر وہ اضافی کشش، وہی ہر شخصیت کے لب و لہجے کی کامیاب نقل، لڑکیاں تو اس پر نوٹ ہی پڑتی ہوں گی۔ کیے ہوئے چھل کی مانند۔ وہ اس وقت ضرور کسی نہ کسی حسین لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے لہو کر رہا ہوگا بلکہ شاید بوسے بازی بھی، لیکن مارجوری کو یہ بھی یقین تھا کہ اس کا شوہر اس حد سے جھاد نہیں کرے گا وہ

شوہروں کو قتل ڈال کر رکھتی ہیں۔“

مس دلسن نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں کہا۔

”ڈاؤننگ، تمہارے پاس تو اپنی بیوی کو مطمئن کرنے کا بہترین ذریعہ موجود ہے۔ تم مسٹر بلیک برن کے لہجے کی انتہائی کامیاب نقل ادا کر سکتے ہو ان کی آواز میں تم اپنی بیوی کو فون کر کے کہو کہ پارٹی ابھی دیر تک جاری رہے گی اور چونکہ پارٹی کی کامیابی کے لیے جارح جیسے دلچسپ شخص کی یہاں موجودگی ضروری ہے اس لیے اسے گھر کو لے کر زیادہ دیر ہو جائے تو اس کی بیوی مائنڈ نہ کرے۔ مجھے یقین ہے تمہاری بیوی مسٹر بلیک برن کی سفارش کے بعد بے فکر ہو کر سو جائے گی اور ہم مزے سے۔“ اس نے آنکھ مار کر بات مکمل کر دی۔

جارح کو تسلیم کرنا پڑا کہ مس دلسن کی ترکیب بہت عمدہ ہے واقعی اگر مار جوڑی کو معلوم ہو جائے کہ اس کا شوہر اس کے اصرار پر مجبور ہو گیا ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح راضی ہو جاتا ہے اور اس کی دہشت پر حلقی کا اظہار نہیں کرے گی۔ آخر باس کو خوش رکھنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔

مس دلسن جارح کو اسی طرح اپنے ساتھ چلائے ایک بیانیوں کی طرف لے گئی اور وہاں جارح نے اپنی بیوی کو فون کیا تو مار جوڑی نے فوراً ہی ریسپونڈ کیا اور جارح کا انداز دلچسپ نکالا تھا مار جوڑی ابھی تک سوئی نہیں تھی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

جارح نے اپنے بائیں مسٹر جوزف بلیک برن کے لب و لہجے میں انتہائی کامیاب نقل ادا کرتے ہوئے مار جوڑی سے سوئی کچھ کہا جو کہ دلسن نے بتایا تھا۔

پھر جارح نے مار جوڑی کی آواز سن لی جس نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

”جوزف ڈاؤننگ، میں نے تمہیں سنی بار سن گیا ہے کہ مجھے میرے فلیٹ کے نمبر پر فون نہ کیا کرو تم سمجھتے کیوں نہیں کیا تم چاہتے ہو کہ جارح سب کچھ جان جائے۔“

۶۶

اس سے بے وفائی کا مرتکب تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ پارٹی میں خوش گیمیاں اور خوش گیمیاں کرنا تو خیر کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن کسی لڑکی کو لے کر پارٹی سے غائب ہو جانا یہ ممکن نہیں، جارح ایسا ہرگز نہیں کر سکتا مار جوڑی نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔

جارح اس وقت باقی رقص کر رہا تھا اس نے کئی لڑکیوں کے ساتھ رقص کیا تھا اس سے قبل حسب معمول اس سے مختلف شخصیات کی آوازیں بھی سنی گئی تھیں اور بڑی آواہاں سنیں تھیں۔ جب رقص کا آغاز ہوا تو اسے اپنا پارٹنر تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔ وہ دفتر کی تین چار ہلکے لڑکیوں کے ساتھ رقص کر چکا تھا اور اب اس کے بازو دکن کے حوالے میں مس دلسن تھی۔ ڈسکو کے شعبے کی لڑکیوں میں دلسن کا جسم بے حد گداز اور گرم تھا اس دلسن کی جنسی کشش تو ناقابل برداشت تھی اور اس وقت وہ فوراً مدعوں بھی تھی اس لیے جارح کے ساتھ چلتی ہی جارہی تھی۔ اب پارٹی میں پہلے کی ہی گیمیاں بھی نہیں رہی تھیں۔ زیادہ تر شادی شدہ جوڑے، شادی رگ دپے کی منگنا بہت دور کرنے کے لیے گھروں کا رخ کر چکے تھے۔ باس جوزف بلیک برن بھی کب کا جا چکا تھا اور دوسرے بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جا رہے تھے لیکن مس دلسن جارح کو چھوڑنے پر تیار نظر نہیں آتی تھیں۔ شاید جارح بھی اس سے جان چھڑانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ شراب کے نشے میں نسیم کی مہک نے اس پر بے خودی سی طاری کر دی تھی۔ مس دلسن سوچ پاتے ہی اسے کھینچ کر نسبتاً ایک ویران گوشے میں لے گئیں جہاں روشنیوں کی چمک نہیں تھی۔ وہاں غنچے کی دانیاں لے لے لگتی تھیں سے جارح کے گلے کا ہاتھ لگتی۔ اس کی شدت نے جارح کو بالکل ہی بے قابو کر دیا تھا۔

مس دلسن نے کمبوا آواز میں کہا۔

”سنو ڈاؤننگ، میں نے اس پارٹی کا اختتام میرے فلیٹ پر چل کر ہو دیا صرف تمہیں گئے اور میں۔“ جارح نے اشارت میں سر ہلانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے تقابذ کیا اور اپنی درست دلچ پر نظر ڈالی۔ پارٹی کرکچس منٹ ہو چکے تھے اور جارح جانتا تھا کہ اس کی تاکید کے باوجود مار جوڑی سوئی نہیں ہوگی اس کا انتظار نہ رہی ہوگی۔ اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

”میں خود ہی چاہتا تھا کہ میں آرمیں اور زیادہ دیر نہ ہو تو میری بیوی اسے پسند نہیں کرے گی تم جانتی ہی ہو وہاں اپنے

ضرب پلس

فیاض الرحمان قادری

فطرت کے ساتھ ایک طویل عرصے سے انسان کی جنگ جاری ہے، انسان مستقبل کی تسخیر چاہتا ہے۔ بلکہ مستقبل تک پہنچنے کا آرزو مند ہے
ایک سائنسدان کی جدوجہد کا حیرت انگیز احوال

جس۔ اس کے لہجے میں غور و فکر کا پہلو نمایاں تھا۔
”پلیز مسٹر وائی، آپ یہ تمام کہانی ایک مرتبہ پھر سناؤں۔ لیکن اس مرتبہ ذرا آہستہ آہستہ سنیں۔“ وائی نے جو کہانی سنانا کر پہلے ہی تنگ آ چکا تھا۔ احتجاجی انداز میں ہاتھ بلند کیے مگر پلیز ٹریوس نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔
”ہاں ہاں مجھے معلوم ہے تم مجھے یہ کہانی پہلے بھی سنا چکے ہو لیکن تمہیں خیال کرنا چاہیے کہ پروفیسر بروئسکی نے اس ملک کے الیکٹرانکس کے ماہر مارٹن فسنڈاں تھے۔ تم ان کے پائل اسٹنٹ تھے۔ اس حیثیت سے تمہیں اس بات کا مجھ سے بہتر علم ہوگا کہ آیا وہ کسی نہایت اہم منصوبے پر کام کر رہے تھے یا نہیں۔ وائی وزی نے اس کا پتہ نہ لے سکا۔ اس نے ایک گہرا اور تختہ اس کے سر پرنا شروع کیا۔“
”پروفیسر بروئسکی ان دنوں ایک ہائم مشین پر کام کر رہے تھے۔ اس کا آخری ایڈجسٹمنٹ آج صبح ہی ہم نے کیا تھا۔“
”کس قسم کی مشین تھی یہ؟“ ٹریوس نے پوچھا۔
”اس مشین کا مقصد کرکٹس کی زندگیوں کو وقت کی قید سے آزاد کرنا تھا۔“

وائی نے تشریح کی۔ ”آپ صرف ان باتوں کا تصور کر سکتے ہیں جو اس مشین کی بنا پر ممکن ہو سکتی ہیں اس مشین کے ذریعے یہ پتا چلایا جا سکتا ہے کہ آئندہ چند ہفتوں یا چند سالوں میں دوسری حکومتیں کس قسم کے اقدام

انٹیشن برائے کے انٹیکٹر ٹریوس نے اپنے گھٹے سر کو پریشانی کے عالم میں تیزی سے ہچکایا۔ اس نے چاروں طرف دیکھی ہون لاش پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالی۔ یہ لاش لیبارٹری کے وسط میں بنے ہوئے چھتیل کے کھنڈ کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ لیبارٹری کی دیواروں پر لگے ہوئے برقی آلات سے نکلنے والی تیز تیز جھلک پوری لیبارٹری میں بھیلی ہوئی تھی۔

انٹیکٹر ٹریوس پاس ہی کمرے میں سفید جوت میں ملبوس شخص کی طرف مڑا۔

”وائی! یہ بات میری سمجھ سے بالا کر ہے۔“ اس نے کہا۔

”اور تم مجھ سے یہ توقع بھی نہ کرنا کہ میں اس بات پر یقین کروں گا کہ بٹلر سے دوپا توپ فوروں کی وجہ سے پروفیسر بروئسکی کی موت ہم گھنٹے سے واقع ہوئی ہے۔“
پانچرے کے اندر بند دو خروش باہر آئے کو بے تاب تھے اور اوھر اوھر دوڑ رہے تھے۔

وائی غصے کے عالم میں لیبارٹری میں اوھر اوھر کھل رہا تھا۔

”یہ خود کشی ہے سراسر خود کشی۔“ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

”یقین کرو اس کی موت خود کشی کا ہی نتیجہ ہے۔ وہ محض غلط اندازوں کی وجہ سے مر رہا ہے۔“

”خود کشی۔“ انٹیکٹر نے حیرت سے کہا۔
”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں

کرنے والی ہیں۔“

”ٹھیک، یہ بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”اب مجھے اس بات کا شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پروفیسر کو دشمن کے ایجنٹوں نے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وانکی نے اپنی بات جاری رکھی۔

”پروفیسر کا اصرار تھا کہ مشین کو نوٹ اٹھایا جائے میں نے انہیں اس غلطی کی بنا پر پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا ان کی بے ثباتی کا عالم تو یہ تھا کہ وہ اس پہلے ٹیسٹ کے لیے خود ہی اس کمینٹ میں داخل ہونے لگے لیکن میں نے انہیں ایسا کرنے سے بڑی مشکل سے باز رکھا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ پہلے ٹیسٹ کے لیے خرگوش کے جواز کو استعمال کریں۔“

”ایک منٹ وانکی۔“ انسپکٹر فریو نے چمچہ سوچتے ہوئے اور بایاں گال کھجاتے ہوئے کہا۔

اگر تم دونوں ہی اس وقت کمینٹ سے باہر تھے تو پھر تم کیسے بچ گئے؟“

وانکی نے دیوار پر لگے ہوئے کنٹرول پینل کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ وہ مقام ہے جہاں میں کھڑا ہوا تھا اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ جگہ ٹیسٹ کے ایک پارٹیشن کے پیچھے ہے۔“

”ٹھیک، ٹھیک اپنی بات جاری رکھو۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”پروفیسر نے کمینٹ کا دروازہ بند کر کے مجھ سے کہا کہ میں 1983ء کے لیے کنٹرول سیٹ کروں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ یہ پہلا تجربہ ہے لہذا کم مدت کے لیے کنٹرول سیٹ کیا جائے لیکن پروفیسر اس تجربے کے سلسلے میں اتنے پر جوش تھے کہ میری بات نہیں مانی۔ مجبوراً میں نے سوچا آج کروڑوں کے نتیجے میں روشنی مدھم ہوئی اور پھر..... اور پھر.....“

انسپکٹر نے اس کا بازو دچکڑا لیا۔

”مجھے یہ بات معلوم ہوئی چاہیے وانکی۔“ انسپکٹر نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”اچھی بات جاری رکھو۔“

”ٹھیک ہے انسپکٹر میں بتاتا ہوں۔“ وانکی نے کہا۔

”تھوڑی دیر میں اچانک ایک دھماکہ ہوا اس کے ساتھ ہی کمینٹ کا دروازہ کھل گیا خرگوش پھیل کر باہر آ گئے جنہوں نے پروفیسر کو نیچے گرا دیا جو نبی مجھے محسوس ہوا کہ اصل واقعہ کیا ہے میں نے تیشین ریورس میں چلا دی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی بے چارہ پروفیسر اپنے انجناک کا تکی چکا تھا۔“

انسپکٹر فریو نے سخراٹ انداز میں کھکا را۔

”میری بات سنو وانکی۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”تمہیں ذرا ڈھٹک کی بات کرنی چاہیے۔“ اس نے

دونوں خرگوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم اب بھی اس بات پر مصر ہو کہ ان دو معصوم

نصے جانوروں کی وجہ سے ایک جواب اور طویل القامت

شخص دم گھٹ کر ہلاک ہو گیا۔“

”بے وقوفی کی بات تو آپ کر رہے ہیں انسپکٹر میں

صرف ان دونوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ وانکی نے

تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

”کیا آپ اب بھی نہیں سمجھ سکتے؟ ناظم مشین کو چار

سال آگے کی طرف سیٹ کیا گیا تھا۔ جیب انہوں نے

دروازہ کھولا تو ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ فرش سے

لے کر چھت تک صرف خرگوش ہی خرگوش نظر آ رہے تھے

اور اسی سلسلے میں ہم نے غلط اندازہ لگایا تھا۔“



غلط فہمی

راحیلہ ناز

بعض اوقات نامساعد حالات انسان کو ایسے مقام لاکھڑا کرتے ہیں کہ وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں ہونے والے اپنے ہر فعل کو وقت کی ضرورت اور بالکل صحیح گردانتا ہے۔
فرانس کے دور افتاد پہاڑی سلسلے میں ایک سیاح کو پیش آنے والے ایک دلچسپ حادثے کی روداد جس کا انجام ہڑہ کر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چٹیلی، جھمکانی دھوپ اور خود رو جھاریوں میں سے نکلنے والے پھولوں پر تھلیاں منڈلا رہی تھیں۔ میں اپنے گرد و پیش میں گھومنے سے مناظر سے لطف اندوز ہوتا وہاں گھوم رہا تھا۔ دھوپ نے میرا پورا جسم پسینے میں بھگو دیا تھا۔

ایک جگہ میں پسینہ پونچھنے کے لیے رکا تو اچانک میرا پاؤں رپٹ گیا۔ میں نے گرنے سے بچنے کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا چاہا مگر ناکام رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا۔ توازن بگڑنے کی وجہ سے میں ایک گہرے گڑھے میں جا گرا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ میں اپنے حواس بحال نہ رکھ سکا اور بے ہوش ہو گیا میرے گرد و پیش میں کیا تھا؟ اس کا مجھے احساس بھی نہ ہوا پا۔

چنانچہ کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا حواس بحال ہونے پر میں نے اٹھنا چاہا تو دائیں پاؤں میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میرے پیر میں موج آگئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گہرے گڑھے میں سے آسمان نظر آ رہا تھا مگر بہت کم جس سوراخ سے میں گرا تھا اس کے دہانے سے بہت بلکی سی روشنی آ رہی تھی گڑھا کسی بھی طور پندرہ سولہ

فرانس کے جنوبی حصے میں واقع ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو ناثر دان کہلاتا ہے۔ ناثر دان کی پہاڑیاں، سیاحوں میں اس اعتبار سے بہت مشہور ہیں کہ وہاں بڑے بڑے پتھر، تلے اوپر جمع ہو کر عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور آدمی ان کے درمیان کھڑا ہو کر یوں محسوس کرتا ہے جیسے ان گنت خوفناک اور مہیب جانوروں کے غول میں گھر گیا ہو اور وہ خوفناک جانور بتدریج اس کے گرد اپنا گھیراٹک کر رہے ہوں۔

ان پہاڑیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بوڑھی عورت چھتری سمیت ان پر چڑھ جائے تو ان بھاری چٹانوں کو چھتری سے با آسانی لڑھکا سکتی ہے۔ یوں جیسے بچے بے سے گیند لڑھکا دیں۔ ان پہاڑیوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں لا تعداد غار اور بے حساب کھائیاں بھی ہیں۔ فرانس جانے والا کوئی بھی سیاح ان پہاڑیوں کو دیکھے بغیر، واپس نہیں لوٹتا۔ سیاحوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جس نے ناثر دان کی پہاڑیوں کو نہیں دیکھا اس نے دراصل فرانس ہی نہیں دیکھا۔

مجھے بھی سیاحوں میں پھیلا یہ متولہ ان پہاڑیوں کی طرف بھیج لایا تھا۔ اس روز وہاں

فٹ سے کم لمبا نہ تھا۔

بروقت دوسری جانب چھلانگ لگا کر میں نے خود کو اس پتھر تلے آنے سے بچایا۔ بڑے پتھر کے نیچے ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے پتھر، کنکریاں اور بہت سی مٹی بھی نیچے آ گئی جس سے میں کسی طرح بچ پایا جب لمبے کی بارش مٹی تو میں نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اب پتھروں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر خود نے کے مترادف تھا۔

میں دیوانہ وار گڑھے میں چکر لگانے لگا اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں باہر گھوم رہا تھا تو مجھے دور دور تک اس علاقے میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں نے جتنی پکار کی تھیں بھی بیرونی ادا کرنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

میری کسٹم تصور میں اخبارات میں چھپنے والی خبروں کی سرخیاں اُبھرا آئیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک انگریز انجینئر جو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے فرانس آیا تھا۔ اچانک ہی لاپتا ہو گیا تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

اس دمشت اٹلیز خیال نے مجھے اور پریشان کر دیا۔ میرے حواس دھیرے دھیرے میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ میں حیران پریشان اور گرم صمراہی جلد کھڑا تھا کہ میری سماعت سے مٹیوں کی جھنجھلاہٹ ٹکرائی، میں چونکا ہوا گیا۔ میں نے سر اٹھایا تو وہ کھیاں خلا سے نیچے آ کر بائیں جانب چلی گئیں ان مٹیوں کے چھٹے ایک غول کی صورت میں لا تعداد کھیاں تھیں۔ چلی دو شاید ان کی رہنمائی کر رہی تھیں۔

میں نے اس جانب قدم بڑھائے، جدھر کھیاں جارہی تھیں میں چند ہی قدم چلا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ مجھے

یہ انکشاف میرے لیے خاصا پر ہول تھا۔ میرا سر چکر اُٹ گیا یہ چند دہائیوں سے گزرے گزرے میں سے نکلتا آسان نہیں تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ میرے ایک پاؤں میں موج بھی آ گئی تھی۔ میرے جسم پر پتھروں کی رگڑ سے پڑنے والی خراشیں تھیں اور اس اچانک حادثے پر میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔

میری کاروہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں جیسے تیسے کر کے وہاں پہنچ سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس گڑھے سے نکل جاتا گڑھا نیچے سے چوڑا مگر اوپر سے تنگ تھا اور اس میں سے نکلتا آسان نہیں تھا۔

میں نے ایک ملکی سی گراہ بھری اور اپنے دائیں پاؤں کی دونوں ہاتھوں سے خوب اچھی طرح مالش کر ڈالی۔ مالش سے خاصا افادہ محسوس ہوا اب میں اپنا پاؤں زمین پر ٹیک سکتا تھا اور اس پر اپنے جسم کا وزن بھی ڈال سکتا تھا۔ میں نے اس گڑھے سے نکلنے کا ہر صورت میں تہیہ کر لیا میں باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ میری نظر غار میں ابھرے ہوئے ایک بڑے پتھر پر جمی جو غار کی دیوار میں خاصا آگے کی جانب نکلا ہوا تھا۔

میں نے چھلانگ لگا کر اس بڑے پتھر کو پکڑا اور اس پر پاؤں جما کر اس پتھر کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا جو میرے ہاتھوں کی پہنچ سے صرف چند انچ دور تھا۔ میں نے دو پتھر پکڑنے کے لیے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اوپر کی جانب چھلانگ لگا لی تھی مگر وہ پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا جس پر میں کھڑا ہوا تھا اور تیزی سے نیچے گرتے ہوئے گڑھے کے فرش پر جا کر ٹک گیا۔

ہلکی روشنی میں ایک انسانی لاش دکھائی دی میں سرتاپا کانپ اٹھا، پتا نہیں وہ کون بد نصیب تھا جو اس طرح دیارِ غیر میں مارا گیا تھا۔ پھر مجھے اپنا خیال آگیا کیا میرا بھی یہی حشر ہوگا؟ اس خیال کے ساتھ ہی میرے جسم میں تھر تھری چھوٹ گئی اور پسینہ بدن کے مساموں سے پھوٹ نکلا۔ شاید میں بھی کسی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اپنا دل مضبوط کیا اور لاش کے قریب چلا گیا۔ یہ خیال میرے لیے تقویت کا باعث تھا کہ جب مرنا ہی ٹھہرا تو اس سے ڈرنا کیا۔ لاش کے جسم پر براؤن پتلون اور سیاہ چمڑے کا جیکٹ تھا جبکہ سر پر ایک گہرا زخم تھا جس میں سے خاصی مقدار میں خون نکل کر اس کے چہرے پر جم گیا تھا اس طرح کہ اس کی صورت میں پہچانی نہ جاتی تھی۔

میں نے بغور زخم کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کے سر پر کسی نوکدار وزنی چیز سے وار کیا گیا تھا لاش کے معائنے کے دوران میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لاش سے بد بو نہیں اٹھ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے میرے گڑھے میں گرنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں لا کر پھینکا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ کھینچوں کی تعداد اور ان کی جھنجھناہٹ میں اضافہ ہونے لگا تو مجھ پر ابھرنے سوار ہو گئی۔ موت کا خوف اب میرے اعصاب پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر لاش کی جیبوں کی تلاشی لی تو ایک چری ہو اور شناختی کارڈ ملا۔ شناختی کارڈ کے مندرجات کے مطابق وہ ڈی میگا رڈو تھا۔ میری ہی طرح ایک انگریز جو ایک بینک آفیسر تھا جبکہ میں ایک دندان ساز تھا۔ میں نے ہوئے کو مزید الرٹ پلٹ

سب ٹھیک ہو جائے گا
لڑکی کے باپ نے شادی کے ایک امیدوار سے کہا۔
”میری بیٹی میرے گھر میں جس طرح پلی بڑھی ہے کیا تم اسے اس طرح رکھ سکو گے؟“
”جی نہیں۔“ امیدوار بولا۔ ”لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تھوڑے دنوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“
”یعنی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ باپ نے حیرت سے پوچھا۔
”یہی کہ میں جس طرح اس کو رکھنا چاہوں گا اسے اس کی عادت دلا دوں گا۔“

کر دیکھا تو تھوڑی سی فراموشی کر لی، چند ٹریوٹر چیک اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرچہ ملا جس پر نائپ میں چند سطری عبارت درج تھی۔ اب سورج ڈھل رہا تھا۔ اس لیے گڑھے میں روشنی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ میں بہ مشکل اس تحریر کو پڑھنے میں کامیاب ہو سکا پرچے پر لکھا تھا۔

”ڈی میگا رڈو، تم نے ہماری تنظیم سے غداری کی ہے لہذا تمہارے لیے موت کی سزا تجویز کر دی گئی ہے تم جہے دنیا کے کسی بھی گوشے میں چھپ جاؤ میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے اور تمہیں مجوزہ سزا دیں گے پھر تمہاری زبان کاٹ کر“ کافی دیر ”کے حضور پیش کر دی جائے گی۔“

تنظیم پرچے کے اختتام پر نام کی جگہ بین الاقوامی تنظیم ”ساحران“ کے سربراہ اعلیٰ کے دستخط تھے جو کسی انسانی کھوپڑی سے مشابہہ تھے۔ اس پرچے کو بڑھ کر میرے جسم پر ایک بار پھر لڑوہ طاری ہو گیا جو لوگ اس تنظیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان کے لیے یہ پرچہ بے معنی اور فطعلی غیر

اہم تھا مگر میں جانتا تھا کہ ”بین الاقوامی تنظیم ساحران“ کیا جانتی تھی اس تنظیم کا چہ چا برطانوی اخبارات میں بہت عرصے سے ہو رہا تھا۔

یہ ایسے افراد کا ٹولہ تھا جو کالے علم پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں غیر قانونی اور زیر زمین تھیں۔ اس لیے پولیس کو ہمیشہ ان کی تلاش رہتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ڈی میگارڈو یقیناً پولیس کا خبر ہوگا اور اس نے تنظیم کے بارے میں کوئی خفیہ بات پولیس کو بتادی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ کچھ ماہ پہلے برطانیہ میں اس تنظیم کے بیشتر افراد کی گرفتاری اس کی خبریں بھی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں جو یقیناً ڈی میگارڈو کی جانب سے ملنے والی اطلاعات ہی کی مرہون منت تھیں۔

مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آئی کہ ڈی میگارڈو تنظیم کے ہر کاروں کے خوف سے فرانس بھاگ آیا ہوگا مگر ایسے یہاں بھی پناہ نہیں ملی موت اس کا مقصوم بن گئی تھی۔ تنظیم کے ارکان نے اسے ڈھونڈ نکالا اور بالآخر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں لاش کے قریب سے ہٹ گیا اور گڑھے کی ایک دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں موت کا انتظار کرنے لگا۔ جو بتدریج میری جانب بڑھ رہی تھی اور جس سے فرار ممکن نہیں رہا تھا۔ رفتہ رفتہ غار میں ٹھن بڑھنے لگی اور لاش سے تعفن اٹھنے لگا۔ کھبوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ہی میری وحشت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر لاش کے قریب گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تنظیم کے افراد نے اس کی زبان کاٹی تھی یا نہیں، ایک دندان ساز کی حیثیت سے میں ان گنت افراد کے جڑے اور منہ ان کی مرضی کے خلاف کھلوا چکا تھا مگر وہ ایک لاش تھی۔ اس کا جڑا

کھولنے میں مجھے پسینہ آ گیا۔ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا۔ منہ کھلنے پر میں حیران رہ گیا۔ مجھے ڈی میگارڈو کے حلق میں موجود اس کی زبان صاف دکھائی دے رہی تھی جو اپنی جگہ موجود تھی۔

میں ابھٹن اور حیرت کا شکار ہو گیا میں سوچ رہا تھا کہ آخر تنظیم کے لوگوں نے اپنا عمل پورا کیوں نہیں کیا انہیں یقیناً اپنے سربراہ اعلیٰ کا حکم پورا کرنا چاہیے تھا۔ ورنہ خود ان کی خیر نہ ہوتی وہ بھی کسی ناپید و نذاب کا شکار ہو سکتے تھے۔ اسی لمحے ایک اور خیال میرے ذہن میں در آیا۔ یہ یقین ممکن تھا کہ کسی وجہ سے انہیں ڈی میگارڈو کی زبان کاٹنے کا وقت ہی نہ ملا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ڈی میگارڈو کی زبان کاٹ کر اپنے پاس کے سامنے لے جا کر پیش کر دے گا تا کہ وہ اسے ”کالی دیوی“ کے حضور پیش کر سکے۔

یہ خیال میرے لیے خاصا دہشت ناک اور لرزہ خیز تھا۔ میں نے غار میں چاروں طرف دیکھا۔ غار کی دائیں جانب ایک بڑا سا پتھر پڑا تھا۔ میں فوراً ہی اس کے عقب میں چھپ کر بیٹھ گیا تا کہ آنے والے کی نگاہ مجھ پر نہ پڑ سکے۔ مجھے جب تنظیم کے ہر کاروں کا خیال آتا تھا میں کانپ اٹھتا تھا میں نے دل ہی دل میں اس وقت کو کوئی لمحہ نہیں گزرنے دیا اور ناثر دان کی پہاڑیاں دیکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی کر بیٹھا تھا۔

مجھے پتھر کے پیچھے چھپے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے غار میں جھانک کر دیکھا ہو بلکہ ہی آہٹ بھی ہوئی تھی میں آنے والوں کے خوف سے مزید دبک گیا۔ چند ثانیے بعد ہی غار کے دبانے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور دو

میں مر جاؤں گی

ترین کے ایک ڈبے میں دو عورتیں کھڑکی کے پاس بیٹھیں آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ گارڈ کے آنے پر ایک عورت نے شکایت کی۔

”یہ خاتون کھڑکی کھلی رکھنا چاہتی ہیں جس کی وجہ سے مجھے سخت سردی لگتی ہے۔ ذرا لگتا ہے کہ کہیں بخار میں میں مر نہ جاؤں۔“

دوسری عورت نے کہا ”لیکن اگر کھڑکی بند رکھتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میرا دم گھٹ جائے گا اور میں مر جاؤں گی۔“

دونوں عورتوں کی فریاد سن کر گارڈ گھبرا گیا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے ڈبے میں بیٹھے مسافروں میں سے ایک مسافر سے درخواست کی کہ وہ ایک خاتون کی سیٹ سے اپنی سیٹ بدل لے۔ یہ سن کر اس مسافر نے کہا۔

”جناب! سیٹ بدلنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس کا آسان حل یہ ہے کہ پہلے آپ کھڑکی بند کر دیں اس سے پہلی خاتون دم گھٹ کر مر جائے گی پھر آپ کھڑکی کھول دیں تاکہ دوسری خاتون سردی سے مر جائے گی اور اس طرح ہم سب آرام اور سکون سے سفر کر سکیں گے۔“

میرے لبوں سے بے ساختہ ایک طعنائیت بھری سانس نکل گئی اب میں آزاد تھا اور آسانی سے اوپر جا سکتا تھا اور پر پہنچتے ہی مجھے مقامی پولیس کو اس واقعہ کی تفصیلی رپورٹ دینی تھی۔ لیکن غار سے نکلنے کا عمل اتنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ جتنا کہ میں نے سمجھا تھا کیونکہ میری ٹانگ کی تکلیف دوبارہ شروع ہو گئی تھی اور کمزوری کا احساس مجھ پر غالب آچکا تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور اسی رسی کے سہارے غار سے نکل آیا۔ اس وقت میں خود کو دندان ساز کی بجائے ایک ہیرو تصور کر رہا تھا جس نے ایک غیر قانونی تنظیم کے دو افراد کو جہنم رسید کر دیا تھا اور

آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا گویا تنظیم کے ہر کارے ذی میگارڈ کی زبان کاٹنے کے لیے آ پینچے تھے اور اب نیچے اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ سر اٹھا کر غار کا روشن حصہ دیکھتا رہا ان میں سے ایک نے غار میں رسی لٹکانی جو بل کھاتے ہوئے نیچے آ کر غار کے فرش سے ٹک گئی پھر ان میں سے کسی ایک نے رسی کو جھٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور اس کے سہارے پھسلتا ہوا نیچے اترنے لگا۔

میں نے اپنا سانس روک لیا جو نبی اس کے پاؤں زمین سے ٹکرانے وہ گہرے سانس لیتا ہوا لاش کی طرف بڑھا اور جھٹک کر اس کا جائزہ لینے لگا اسی اثنا میں دوسرا آدمی بھی نیچے اتر آیا میں نے دل میں دلی میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ ذی میگارڈ کی زبان بعد میں کاٹتے پہلے میری خبر لیتے اور مجھے بھی ذی میگارڈ کے پیچھے ایک لمبے سفر پر روانہ کر دیتے تھے۔

وہ دونوں لاش پر جھگے بغور اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کی پشت میری جانب تھی میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے قریب پڑا ہوا ایک وزنی پتھر اس شخص کی کھوپڑی پر دے مارا جو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پتھر ٹکٹے ہی اس کے حلق سے ایک کریسہ چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر ترپنے لگا دوسرے آدمی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے ایک اور وزنی پتھر اٹھایا اور اس کی کھوپڑی کی طرف اچھال دیا اس بار بھی میرا نشانہ خطا نہیں گیا اس آدمی کی بھی کھوپڑی کھل گئی اور وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح فرش پر گر کر ترپنے لگا۔

سازی کا پیشہ اختیار کر کے غلطی کی مجھے پولیس کے
ٹکٹے میں ہونا چاہیے تھا۔“

”ضرور۔“ اس نے سرد مہری سے کہا اس کا لہجہ
کچھ اس انداز کا تھا میں چونک کر اس کی طرف
دیکھے بغیر نہ رہ سکا شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔

”تمہیں یہ جان کر دکھ ہوگا کہ موسیو میگا رڈو کا
قاتل پہلے ہی گرفتار ہو چکا ہے۔“ اس نے سانپ
کی طرح پھنکار تے ہوئے کہا۔

”میں نے لاش حاصل کرنے کے لیے دوا دی
روانہ کیے تھے وہی دونوں جنہیں تم نے پتھر مار کر
شدید زخمی کر دیا۔ ان دونوں کا شمار فرانس کی پولیس
کے بہترین آدمیوں میں ہوتا ہے، لیکن اب وہ
اسپتال میں پڑے ہیں۔“

”مگر..... مگر..... وہ..... تو.....!“ میں ہکا کر
رہ گیا اور اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔ ساری بات
غلط فہمی کی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ فرانس کی
پولیس کے آدمی ہیں میں تو انہیں بین الاقوامی تنظیم
ساحران کے ایجنٹ سمجھا تھا جو اپنے پاس کے حکم
کے مطابق ڈمی میگا رڈو کی زبان کاٹنے کے لیے
گڑھے میں اترے تھے۔

پولیس چیف نے مجھے درستی سے گھورا اور پھر
چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں دل ہی دل میں ان دونوں کی جلد صحت
یابی کی دعا کرنے لگا۔ اگر وہ مر جاتے تو مجھ پر
فرانس کی پولیس کے دو بہترین آدمیوں کو قتل
کمر دینے کے الزام میں مقدمہ بھی چل سکتا تھا۔
پہلے میں ذیل جاتا پھر سوئے دار۔

۴۵

معاشرے کے دو ناموروں کو کاٹ پھینکا تھا۔

غار سے باہر آنے کے بعد میں نے اس سمت
چلنا شروع کر دیا جہاں میری کار کھڑی تھی لیکن میں
بہ مشکل چند ہی قدم طے کر پایا تھا کہ مجھے چکرا گیا
اور میں بے ہوش ہو گیا بے ہوشی سے قبل مجھے
صرف اتنا یاد ہے کہ میں پتھروں پر گر پڑا تھا۔ اس
کے بعد مجھے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک
اسپتال کے بستر پر پایا میری ہمار داری پر متعین
نرس نے مجھے بتایا کہ چند سیاح اتفاق سے اس
پہاڑی سلسلے پر جانے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بے
ہوش پڑے پایا تو اتھا کر شہر لے آئے۔ میری کار
ان لوگوں کو کہیں نظر نہ آئی تھی۔ میں نے اثبات
میں گردن ہلا دی کہ ریکے بارے میں مجھے فکر مند
ہونے کی ضرورت نہیں تھی وہ بعد میں بھی آ سکتی تھی
اسی دن مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا میں
پورے دو دن بے ہوش رہا تھا۔

دوسرے روز جب کہ میں اپنے ہوٹل کے بستر
پر بیٹھا سو پ فی رہا تھا اور اپنے اس چہرہ کو دیکھ رہا تھا
جنس پر پلستر چڑھا دیا گیا فرانس کی پولیس کا چیف
مجھ سے ملاقات کرنے آیا اس کا چہرے گھوڑے کی
طرح سخت اور آنکھیں سانپ جیسی چمکیلی تھیں۔

اس نے مجھ سے استفسار کیا کہ مجھے کیا واقعہ
پیش آیا تو میں نے جواب میں اسے پوری تفصیل
سے آگاہ کر دیا وہ خاموشی سے سنتا رہا میں خاموش
ہوا تو اس نے چپچپے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے موسیو اپنے اس کارنامے پر تم
خود کو ہیرو سمجھ رہے ہو گے۔“

”ہاں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے دندان

قلندر و فنارت

امجد جاوید

قلندر نو طرح کے ہوتے ہیں لہٰذا وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہی حاصل کرتے ہیں کلیات ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندہ ریچہ اور کئے نہ جانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آپن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر تچایا جو اپنے تئیں بننا مسخیر کرنے کی نعرہ میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسالتوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران اس داستان کی انفرانیت کی گواہی آپ خود دین گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا نعرہ نہیں کرتی ہے۔

حرج اترتے ہو گیا۔ قدموں کی چاپ نہیں آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی تربیت یافتہ ہیں۔ میں نے سامنے دیکھا، بائیت کور میز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بتا دیا کہ وہ آ رہے ہیں۔ اس نے دروازے کی طرف سے آئی۔ اس نے پائسل کا بیٹھنی بیٹھ بیٹایا اور وہ بائیت کے لیے پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔

بائیت دو مشن کے اندر ہی وہ اوپر آ گئے۔ وہ چار تھے۔ ایک سے آئی تھی۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ نہ جمال اور.....“

”کیوں نہیں آئے، دیکھو۔“ دوسرے نے حکمران انداز میں کہا۔ اسی لمحے وہ آگے آ کر پھیلنے لگے۔ اس طرح وہ مجھے دیکھ لیتے، میں جب تک ایک دو کو فائر مارتا، جب تک وہ مجھے نشانہ بنا لیتے۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے بائیت کور نے فائر کر دیا۔ اس لمحے انہیں سمجھ نہیں آئی کہ یہ فائر کس طرف سے ہوا ہے۔ میں نے اسی لمحے کا فائدہ اٹھایا اور بھیجی میں نے ایک سے ہاتھ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

پائسل سمیت اس کا ہاتھ اڑ گیا تو اس کے منہ سے بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد موقع نہیں تھا۔ ان کی طرف سے کوئی چلی اور بائیت کور بھی اگلا فائر کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے فائر کر دیا۔ وہ واپس مڑنا چاہتے تھے یا نہیں، ابھی میں سامنے نکل کر ان پر فائر کرتا چلا گیا۔ وہ چاروں

میں نے سمجھتے ہوئے سیل فون کو جیب سے نکال کر دیکھا۔ اسکرین پر انہیں نمبر جھلکا رہے تھے۔ پھر باہر کی جانب نظر دوڑائی۔ وہ لوگ اندر آ رہے تھے۔ میں نے بائیت کور کی طرف دیکھ کر فون رسیو کر لیا۔ میرے سینو کے جواب میں کسی اصحی نے کہا۔

”اسمارٹ مین، میرے بندے تمہارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ امید ہے تم زیادہ اسمارت بننے کی کوشش نہیں کرو گے اور چپ چاپ ان کے ساتھ آ جاؤ گے۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تفصیل میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا، جب تم میرے سامنے اپنی موت کے لیے بھیک مانگ رہے ہو گے۔ میں.....“ وہ کہہ رہا تھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، کیا چاہ رہا ہے۔ میں نے سیل فون بند کر کے جیب میں رکھا اور تیزی سے اٹھا۔ بائیت کور مجھے دیکھ رہی تھی، اس لیے مجھ سے پہلے ہی وہ اٹھ کئی۔

”یہ لوگ ہمارے لیے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بکلی کی سی تیزی کے ساتھ سامنے کے واش روم میں گھس گئی۔ یہ چند قدم چلتے رہنے کے دوران اس نے اپنا پائسل نکال لیا تھا۔ میں دوسری طرف بنے ہوئے ستون کے ساتھ لگ گیا۔ وہاں سے سیز جیوں کا سہرا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دو سیزھیاں چڑھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں پوری

چہروں پر کافی حد تک تشویش دیکھی تھی۔

میں نے بانٹیا کور کو یہ سمجھایا تھا کہ وہ ایک دم سے سیز جیوں پر سے لڑھکتے ہوئے ایسے پیچھے گرتی چلی جائے جیسے کہ وہ بے ہوش ہے یا مر چکی ہے۔ ایک آدھ ٹائٹ کو ان حملہ آوروں کی توجہ ہٹائی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنا ہاسٹل میری طرف پھینک دے۔ وہ وہاں پر ان چاروں میں سے کسی کا بھی اسلحہ استعمال کر سکتی تھی۔ چند لمحوں ہی میں اس نے پروے کے ایک کپڑے میں ہاسٹل باندھ کر بالکل میرے اوپر تک پہنچا دیا۔ میں نے لئے لئے وہ کھولا، اس کا سیکزین دیکھا اور فلیشمن جو کرا سے ایکشن کے لیے کھڑا تھا۔

میں غور سے شہت باندھے ان پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ جو بھی ان کی توجہ ہٹی، انہوں نے گھوم کر دیکھا، سچی میں نے دونوں ہاتھوں سے پوری توجہ کے ساتھ دو فائر کیے۔ ان کے ہاتھوں سے ہاسٹل نہ جانے کدھر گرے، اس کے ساتھ ہی ان کے حلق سے جھنجھیں بلند ہوئیں۔ میں نے اگلا لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ جس وقت تک ان کی جھنجھیں کم ہوتیں، میں میرے سے کود گیا تھا۔ بلاشبہ بانٹیا کور بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے قدم جو زمینی پر گرے۔ وہ دونوں باہر کی جانب بھاگ کر آئے ہوئے دکھائی دیے۔

میں اسپرنگ کی مانند اچھلا اور ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ میں ان پر وار کروں گا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں ایک دم سے جھک گیا وہ میرے اوپر سے الٹ کر باہر فرش پر جا گرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتے میں ان کے سر پر پکچنگ کیا۔ اس وقت تک بانٹیا کور بھی آگئی۔ اس نے آتے ہی ایک بندے کے منہ پر زوردار تھوکر ماری۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اس کے منہ پر تھوکر رسید کی۔ وہ آؤخ کی کڑیہ آواز نکال کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

خطرہ مٹ جانے کا احساس کر کے لوگوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ یہ ایسی صورت حال تھی، جس میں

فرش پر پڑے چیخ رہے تھے۔ بلاشبہ نیچے والوں نے اوپر آنا تھا یا پھر بھاگ جانا تھا۔ میں انہیں بھاگنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے ہاسٹل کا سیکزین بدلا اور سیز جیوں کے سرے پر دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے بانٹیا کور کو دیکھا۔ وہ پاؤں کی ٹھوکر سے ان کا اسلحہ ان سے الگ کر رہی تھی۔ وہ ایسا کر پٹکی تو میں نے اسے سیز جیوں کے سرے پر نظر رکھنے کو کہا۔ وہ میری جگہ آگئی تو میں تیزی سے شہت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک الماری کی کنڈی نہیں تھی۔ میں نے اسے کھولا اور نیچے قدم رکھا اور ایک ہاتھ سے جھول گیا۔ ہی لمحے مجھے اندر کا منظر دکھائی دیا۔ وہ منظر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔ مجھے ایک دم سے شاک لگا۔ ان دونوں حملہ آوروں نے دو عورتوں اور چند بچوں کو گرفتار بنایا ہوا تھا۔ بچوں کی ہچکیاں بلند بھی ہوتی تھیں۔ اگر ایک ہوتا تو میں چشم زدن میں اس کا صفایا کر چکا ہوتا۔ وہ دو تھے۔ اگر ایک مرنے تو دوسرا نقصان پہنچا سکتا تھا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میں نیچے بڑی آسانی کے ساتھ جا سکتا تھا لیکن اوپر جانا بہت مشکل تھا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ بانٹیا کور دوسری طرف نکال کر کھڑے ہوئے تھی۔ میں وہیں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر بہت مشکل سے کھڑا ہوا یا لیکن میری حرکت سے آواز پیدا ہوئی۔ میں کوئی ایسی آواز بھی نہیں نکالنا چاہتا تھا، جس سے نیچے کھڑے حملہ آور متوجہ ہو جاتے۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور بانٹیا کور کو فون کر دیا۔ اس نے بجائے فون سننے کے چند ٹائٹ کے بعد کھڑکی میں آ کر دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا، تو میں نے سیل فون کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوبارہ کال کر کے نیچے کی صورت حال کے بارے میں بتایا۔ پھر اسے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے۔ اس وقت وہ عورتوں اور بچوں کی زندگی کا سوال تھا۔ بانٹیا کور پیچھے ہٹ گئی تو میں نے بڑی احتیاط سے خود کو اس طرح میرے پر لٹا لیا کہ آواز تک پیدا نہیں ہونے دی۔ اس بار جب میں نے ان حملہ آوروں کے

تنگ تکی سے کہا تو وہ میری لوکیشن پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا تو وہ بولا۔

”آپ سپر ہی اسی روڈ پر آتے چلے جائیں۔ پھر دائیں جانب آئیں گے تو نہر آجائے گی۔ جب تک میں پہنچ جاتا ہوں، میں کار میں سوار ہو گیا ہوں، میں قریب ہی ہوں۔“ اس نے روانی سے کہا۔ میں اگلے چوک کو دیکھنے لگا جہاں سے مڑنا تھا۔ ہم نہر پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے طارق کھڑا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہم کون سی کار میں ہیں۔ میں نے کال کر کے اسے بتایا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک بنگلہ نما گھر میں آ گئے۔

”وہ منیجر بھی اوجھڑی ہے۔ آپ خود اس سے پوچھ لیں۔“ طارق نے بتایا۔

”ان دونوں کو اتار دو۔ ذرا خاص مہمان ہیں، ان کی خاطر رانی کرو، ان کے ہاتھوں پر زخم ہیں، انہیں فرسٹ ایڈ دو پھر ان سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

”ننگے فرش پر ایک اوجھڑ عمر فرہ ماہی شخص اوجھڑا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔“

”کیس ہے وہ منیجر۔“ طارق نے بتایا تو میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ آواز سن کر اس نے بہ مشکل پوٹے کھولے، میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خیریت اتر آئی۔ وہ میری جانب خوف زدہ لگا ہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر یوں سرگرداں جیسے وہ مایوس ہو کر ہر طرح کی صورت حال کو قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ میں نے اس کے بال پکڑے اور اس کا سر اٹھا کر پوچھا۔

”کیسے ہوا سب؟“

”جس وقت فیضان بہت کی گاڑی پولیس سیز کوآرڈر کے سامنے پھنسی تھی، اس وقت تمہارے دو بندے ٹیکسری میں موجود تھے اور الطاف گجر بھی وہیں تھا۔ یاد ہے آپ کو؟“ اس نے یوں کہہ کر یاد دلانے کی کوشش کی جیسے یہ

ہمارے لیے خطرہ بڑھ جاتا۔ پولیس کو جواب دینا، وقت ضائع ہونا اور خواہ مخواہ تعقیب سے گزرنا، کئی ایسے مرحلے تھے۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ ان دونوں کے لیے کمریہاں سے نکل جائیں۔ میں نے فوری طور پر ان کی تلافی لینے ہوئے وہاں کے لوگوں کو کہا کہ فوراً رسی لائیں۔ جب تک ہم نے ان دونوں سے تلافی لی تب تک ہمیں رسی دستیاب ہوگئی۔ میں نے دونوں کو باندھتے ہوئے بانٹا کور کو سمجھا دیا کہ اب کیا کرنا ہے۔ وہ تیار ہوگئی۔ جیسے ہی میں نے دوسرے کو باندھا، وہ کار کی جانب بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے کار قریب لائی۔ اس کا دروازہ کھولا۔ ابھی ایک آدمی تیزی سے بولا۔

”مارے کیا کر رہے ہو بھائی، پولیس آتی ہی ہوگی۔“

ہم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ان دونوں کو اٹھا کر، کار کی چھجلی سیٹ کے درمیان رکھا۔ بانٹا کور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم وہاں سے چل دیے۔

”کہہ رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”فی الحال چھپتے چلو۔ بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سیل فون نکال لیا۔ میں نے طارق نمبر کے نمبر پر کال کی۔ میرے خیال میں اس نے سیل بھی نہیں سنبھالنے دی تھی کہ فون پک کر لیا۔

”سر میں آپ ہی کو فون کر رہا تھا۔“ اس نے تیزی سے پرچوش لہجے میں کہا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس بندے کا پتہ چل گیا ہے، جس کی وجہ سے آپ کے گھر پر حملہ ہوا تھا۔ وہی منیجر تھا، وہ ہمارے پاس ہے اس نے بتایا۔“ وہ بولا۔

”اچھا میں یہ تفصیل تمہارے پاس آ کر سننا ہوں۔“

مجھے کوئی سیف باؤس بتاؤ، یا پھر ایسی جگہ جہاں دو غلط قسم کے بندوں کے ساتھ ہم بھی کچھ وقت گزار سکیں۔“

میں نے کہا تو وہ تشویش سے بولا۔

”اوہ ایسا کیا ہو گیا سر؟“

”یار، آکر بتاتا ہوں نا، جلدی بولو۔“ میں نے کافی حد

بہت پرانی بات ہو۔ میں سمجھ گیا تھا۔
”آگے کہو۔“ میں بولا۔

”اس وقت مجھے فون کال ملی کہ میرے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے، انہوں نے میرے بیٹے کی آواز تک مجھے سنائی۔ میری بات کروائی اس سے۔“

”تمہارے بیٹے کا اغوا!“ میں نے یوں پوچھا جیسے مجھے بہت حیرت ہوئی ہو۔ حالانکہ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک نئی کہانی گھرے گا۔

”جی، میں یہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی مجھ سے تاروان مانگے گا، جیسے آج کل اغوا برائے تاروان کی دبا بھلی ہوئی ہے۔“ اس نے کراسپتے ہوئے کہا۔

”تو پھر...؟“ میں نے پوچھا۔

”انہوں نے مجھ سے کوئی رقم نہیں مانگی، بلکہ انہوں نے مجھ سے کام لینے کے بارے میں کہا اور جب انہوں نے مجھ سے کام بتایا تو میں نے سوچ لیا کہ اب نوکری تو چھوڑنا پڑے گی۔ اپنے بیٹے کی خاطر میں نے نوکری چھوڑنے کا سوچ لیا تھا۔ دوسرا انہوں نے میرے بیٹے کو نقصان نہ پہنچانے کا وعدہ کیا تھا۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہاں راست سے کس طرح کے بندے کو رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے تصدیق کی تو میں نے بتا دیا کہ بندہ ابھی تک ادھر ہی ہے۔ انہوں نے مجھے ان سب پر نگاہ رکھنے کو کہا۔ یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ جب تک وہ آئے آپ لوگوں کے بندے الطاف گھر کو نکال کر لے جائے تھے۔ پھر مجھے کہا گیا کہ میں اپنے مالک کو یہاں بلواؤں، میں نے اسے جان لیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں پتہ۔ میرا بیٹا ابھی تک ان کے پاس ہے۔“ وہ یوں بولا جیسے ابھی سر جائے گا۔

”انہوں نے تم سے کام کیا لیا؟“ میں نے قہر سے پوچھا تو وہ بولا۔

”جب تک وہ پہنچے آپ کے بندے تو جانتے تھے۔ انہوں نے یہی کہا کہ میں وہ بندے پہچان کر اسے دوں کہ وہ کون ہیں۔ میں نے اپنے ایک بندے کو ان کے

پیچھے لگا دیا تھا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر میں نے وہ بندے نہ پکڑوائے تو میرا بیٹا بازیاب نہیں ہوگا۔ میرا آدمی ان دو بندوں کا گھر دیکھ آیا۔ بعد میں انہیں گھر کا بھی پتہ چل گیا۔“

”کیا ملا تجھے، نہ بیٹا اور نہ نوکری، اب کہو گے کہ ان کے بارے میں بھی نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں، کہاں کے ہیں، ہم انہیں نہیں جانتے۔“ میں نے خطرناک انداز میں کہا۔

”جی بالکل، میں نہیں جانتا۔ مگر میرے بیٹے کو انہوں نے ہتھ نہیں کہا۔ میری اس سے بات ہوتی ہے، اب شاید وہ اپنی ماں سے بات کرنا ہوگا۔“

”مضبوط تم نے اپنے بندوں کے ذریعے ہمارے گھر کی نشاندہی کروائی اور انہوں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ اگر ہماری قسمت اچھی نہ ہوتی تو اب تک ہم منوں منی کے نیچے پڑے ہوتے۔ خیر۔ اب تم ہمارے مہمان ہو۔ دیکھتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں، جو ہم تک پہنچے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب کیا کرنا ہے اس کا؟“ طارق نے پوچھا۔

”یہ مہمان ہے۔ اسے کھانا دو، اب کچھ نہیں کہنا اسے۔ میں بعد میں بات کروں گا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور چل دیا۔ جیسے ہی کمرے میں آئے تب میں نے طارق سے کہا۔ ”اس کا بیٹا اگر واقعی ہی اغوا ہوا ہے تو، الگ بات ہے اور اگر نہیں، تب پھر معاملہ دوسرا ہوگا۔ اب پتہ یہی کرنا ہے کہ اس کا بیٹا اغوا ہوا تھا؟ اس کے بیٹے کا پتہ کرو۔ اس کے گھر کی اور گھر والوں کی خفیہ گھرائی ہو۔“

”جی ہو جائے گا۔“ طارق نے کہا تو ہانپتا کور نے میرے کان دھڑے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”لوئے۔ بھوکا ہی ماردینا ہے تو نے، کوئی روٹی کا بھی بندو بست ہے یا زری تفتیش ہی چلتی ہے۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔“ میں نے یوں کہا جیسے اس کی بات سمجھ میں آئی تھی ہے تو اس نے بیڈ کے سرے پر رکھا تکیہ اٹھایا اور میرے سروے مارا۔

تھی۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں دو اور غیرہ بھی دے دی گئی ہوگی۔ میں ان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور نرمی سے پوچھا۔

”کون ہو تم لوگ؟“

”ہم کوئی بھی ہیں، تم اپنا کام کرو، ہمیں مارو، ہماری بوٹی بوٹی کرو، دکھاؤ اپنی درندگی۔ مارو.....“ اس نے انتہائی نفرت سے مجھے گالی دی۔ ایک دم سے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اندر سے ایک لہر اٹھی لیکن جس طرح یہ لہر اٹھی تھی۔ اسی طرح میں نے اس پر خود قابو پالیا۔

”میں یہ جانتا ہوں کہ تم دونوں مجرم نہیں ہو اور نہ وہ تھے، جو تم لوگوں کے ساتھ تھے۔ تھے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ چونکہ اب وہ مر چکے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں ان کی آخری رسومات ان کے مذہب کے مطابق ادا کر دی جائیں۔ باقی تم لوگوں سے باتیں تو میں بعد میں بھی کر لوں گا۔“ میں نے انتہائی تحمل سے کہا تو میرے یوں کہنے پر ایک نے سر اٹھا کر اسی نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

”وہ نہیں رہا تو کوئی بات نہیں، اب اس کا جسم ہے، چاہے جلا دو یا دفنادو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ یہ تو کئی بات ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ وہ جس مذہب سے بھی تعلق رکھتے ہیں، میں..... میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسرا کتابائے ہوئے انداز میں بولا۔

”جو مرضی کرو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔“ لیکن ہمیں تو ہے۔“ میری پشت سے ہانپتا کور کی آواز آئی۔ انہوں نے سامنے کھڑی ہانپتا کور کو دیکھا پھر استہزاء پنداز میں مسکرا دیے۔ میرے لیے یہ کافی حیرت والی بات تھی کہ یہ لوگ اتنے نڈر ہیں۔ لیکن دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ نڈر ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی غیرت مند آدمی بچوں اور عورتوں کو پرغلام نہیں بناتا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے یوں کھڑی تھی، جیسے ابھی ان پر برس پڑے گی۔

”تو کرتے رہو، ہم سے کیا پوچھ رہے ہو۔“ پہلے نے

”بس بس منٹ دے دیں مجھے۔“ طارقی نے کہا اور جلدی سے مڑ گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد ان کے لیے نہایت پر تکلف کھانا بچن دیا گیا۔ ہانپتا کور نے سیر ہو کر کھایا۔ پھر چائے کا گم لے کر بیڈ پر جا بیٹھی۔

”اب تو کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ سکون سے سو جانے کو من کر رہا ہے۔ آؤ، کچھ دیر سکون سے سو جائیں۔“ اس نے خمار آلود آواز میں کہا تو میں ہنس دیا وہ جو ساتھ لائے ہیں ان.....“

”انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ صبح تک وہ باتیں کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

”اگر سو نہ ہی ہے تو ناؤں چلتے ہیں۔“ میں نے رائے دی

”اب تو بٹنے کو بھی جی نہیں کر رہا اور تم ظالم ہو پھر سفر کرنے کا مشورہ دے رہے ہو۔“ وہ قشلی آواز میں بولی تو میں ہنس دیا

”وہیسیے تمہیں ادا کار ہونا چاہئے تھا۔ اسکرین پر دھمال ڈال دو، سچی۔“

”میرا تو ابھی دھمال ڈالنے کو بڑا دل کر رہا ہے، آؤ کتا۔“ اس نے باقاعدہ ہانپتا پھیلا کر کہا تو میں اپنا قبچہ نہروک رکھا تو وہ بھی کھل کر ہنس دی۔

ہم چائے پی چکے تو میں اٹھا اور نیچے والے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ان دونوں کو رکھا ہوا تھا۔ وہ فرش پر پڑے تھے اور ان کی آنکھوں میں نفرت اعلیٰ رہی تھی۔ مجرم چاہے کتنا بڑا ہو، اس کی آنکھ میں خوف ڈر آتا ہے۔ لیکن وہ جو کسی مقصد کے لیے نکلا ہو، اس کی آنکھ کچھ اور ہی بول رہی ہوتی ہے۔ یہ آنکھیں دیسی ہی نہیں جو کسی مقصد کے لیے لڑ رہے ہوتے ہیں۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ مقصد انسانیت کے لیے قابل قبول ہیں ہے یا وہ حیوانیت اور شیطانت کے ترغیب میں پھنس کر اسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں جھانک کر کافی دیر دیکھتا رہا۔ ان کے ہاتھوں ہر سفید پتی بانگھی ہوئی

بھی اسی طرح اکتائے ہوئے انداز میں کہا جیسے ہم ان کے آرام میں خلل ڈال رہے ہوں۔

”تم لوگوں سے تو بہت کچھ پوچھنا ہے، دیکھو، ہم کتنے اچھے ہیں کہ تم دونوں سے یہ پوچھ رہے کہ کیسے بتاؤ گے آرام سے یا ذلیل ہو کر۔“ بانیتا کور نے دانت پیستے ہوئے کہا تو دونوں نے سرائی کر دیکھا

”بندھے ہوئے۔۔۔۔۔“ دوسرے نے کہنا چاہا تو وہ آگے بڑھی اور اس نے قریب کھڑے ایک بندے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”اسے کھول دو۔“

وہ بندہ آگے بڑھا اور اس نے دوسرے کو کھول دیا۔ وہ آزاد ہوتے ہی کھڑا ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بانیتا کور سے زیادہ بھاری ہے۔ مگر میں بھی اس کا اعتماد رکھنا چاہتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سامنے کھڑے اس بندے کو وار کرنے کی دعوت دی۔ وہ سرعت سے آگے بڑھا اور اس نے جھکاؤ دے کر پوری قوت سے مکا اس کے منہ پر مارا مگر اس کی کوشش رائیگاں گئی۔

بانیتا کور نے اس کی کھائی پر ہاتھ مارا اور وہ بے ساختہ آگے جھک گیا، بانیتا نے اس کی گردن پر زور دیا کھائی رسید کی، جس سے وہ اپنی ہی جوتک میں لڑکھڑاتا ہوا آگے دیوار کی جڑ میں جا گرا۔ بانیتا کور نے اسے اٹھنے نہیں دیا، پوری قوت سے پاؤں کی ٹھوک اس کے سر پر دے ماری اس کا سر دیوار سے لگا۔ وہ چکر اگیا۔ وہ رکی نہیں، اس نے اس کا سر پکڑا اور دوبارہ اسے دیوار پر دے مارا۔ خون کا فوارا اس کے سر سے نکل پڑا۔ بانیتا کور نے اسے کالر سے پکڑا اور تھیمٹ کر کمرے کے درمیان میں لے آئی۔ پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چند ثانیے میں وہ اوجھ سوا ہو گیا تو وہ ایک طرف ہو کر بولی۔

”اب اسے کھول دو، اور اس پر غصہ اپنی ذال دو۔“
”ٹھہرو۔“ میں نے کہا اور پھر بندھے ہوئے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا خیال ہے؟“

وہ چند ثانیے سوچتا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں

جواب دیا

”پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔“

بانیتا کور ایک طرف پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
”کون لوگ ہو تم؟“

میرے یوں پوچھنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”ہم بھارتی ہیں اور اپنے مشن پر ہیں۔“

”ہمارے پیچھے کیوں تھے؟“

”تم دونوں کو اغوا کر کے لے جانا تھا؟“ وہ بولا۔

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہیں، جہاں ہمارا پاس کہتا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔“ وہ بولا۔

”کب سے یہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”دو سال ہو گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”میرے پیچھے ہی کیوں؟“

”کہنا پاس نے حکم دیا ہے کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ تم ہی الطاف گجر کو پکڑ کر لائے ہو۔ تم ہمارا نیٹ ورک تباہ کر دینا چاہتے ہو۔“ وہ نفرت سے بولا تو میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا

”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، کیا اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ یقین جانو، ہمیں جاسنے دوں گا۔ کیونکہ تم ایک مقصد کے لیے لڑ رہے ہو۔ تم کوئی مجرم نہیں ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے پہلی بار نرم انداز میں میری طرف دیکھا، پھر مایوس سے بولا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے پتہ نہیں، میرا پاس کہاں ہے، مجھے بس میرے ساتھی سے قسم ملا اور میں اس کے ساتھ چل دیا۔“

”فحیک ہے پڑے رہو، جب تجھے اپنے پاس سے رابطہ کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے بتا دینا۔“ میں نے کہا اور باہر چل دیا۔ دوسرا بے ہوش ہو چکا تھا۔ قریب کھڑے بندے نے اسے دوبارہ باندھ دیا تھا۔

.....

کیا بچوں کی طرح کر رہی ہو۔“ وہ اکتاتے ہوئے بولا۔
 ”میں نے کہا تا کہ تمہاری باتوں پر میرا دل نہیں مان
 رہا ہے۔ اور اب اس کی وجہ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں
 ہے۔“ اس نے تنگ کر کہا۔

”اچھا، میرا مغز نہ کھاؤ، صبح وہ وقت کور آ جائے گی اور،
 اس سے پوچھ لینا تفصیل کہ میں کہاں تھا۔ اگر چاہو تو ابھی
 پوچھ لو کہ میں کہاں تھا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل
 فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اچھا، غصے کیوں ہوتے ہو، بس تم نے کہا اور
 میں نے مان لیا۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا۔
 ”تو پھر، یوں اجنبی کیوں لگ رہی ہو؟“ جہاں نے
 پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہارے لیے چائے لانا بھول گئی، وہ لے
 آؤں۔ یا پھر کوئی کوئی چائے دوں؟“

”ہر پریت۔“ اور جیسو، میرے پاس اور تناؤ بات کیا
 ہے؟“ جہاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا، وہ
 چند لمحوں اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بیڈ کے کنارے
 بیٹھ گئی تو اس نے پوچھا۔ ”لوگو کیا بات ہے؟“

”میں بہت ڈسٹرب ہوں جی، میری سوچیں مجھے
 پاگل کر رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔“ اس
 نے بے چینی کے سے انداز میں کہا۔

”کیسی سوچیں ہیں؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”یہی کہ یہ جو ہم ایکشن ٹرنے جا رہے ہیں، کیا ہوگا
 اس سے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم انٹیلی کی سیٹ
 جیت جائیں گے اور مجھے سو فیصد امید ہے کہ ہم جیت بھی
 جائیں گے لیکن اس کے بعد ہوگا کیا؟ پورے علاقے
 میں جہاں صرف چند لوگ ہمارے دوست ہوں گے،
 وہاں اس سے کہیں زیادہ دشمن پیدا ہو جائیں گے۔ ایک
 خوشامدی ٹولہ بن جائے گا جو ہمیں گھیرے میں لے لے
 گا۔ اگر ان کے کام ہوتے رہے تو وہ دوست دکھائی
 دیں گے اور اگر کام نہ ہوئے تو یہی لوگ سازش کریں
 گے۔ منافقت کریں گے اور دشمنوں کا ساتھ دیں گے، مان

رات کا پہلا پہر ابھی ختم نہیں ہوا تھا جب جہاں نے اوٹی
 نڈ پہنچ گیا۔ پھر پھوٹ گیت کور کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی
 تھی۔ اس نے ڈرائیونگ روم داخل ہوتے ہی فتح بلائی تو
 پھر پھوٹنے جواب دے کہا۔

”تو پھر جلدی سے کھانے پر آ جا، میں تیرا انتظار کر رہی
 ہوں اور باقی سب کو بھی بلاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ آواز دینے لگی۔ جہاں نے جین جین گیا۔ چند
 منٹوں میں سارے وہاں آ گئے۔ خوشگوار ماحول بن گیا۔
 وہ وہاں بیٹھنے سے اور باتیں کرتے رہے۔ جہاں نے
 جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ رتن دیپ سنگھ نے انکیشن ہی کے
 لیے بلایا تھا۔ پارٹی میں ہر پل اوپر نیچے تو ہو رہی ہے۔
 ایسی ہی کچھ باتیں کر کے اس نے سب کو مطمئن کر دیا کہ
 وہ بہت اہم کام سے گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تھا اور ایسا ہونا ناممکن تھا کہ وہ
 اپنے کمرے میں ہو اور ہر پریت اس کے پاس نہ ہو
 ۔ وہ ایزی ہو کر بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ ہر پریت آ گئی۔ وہ
 حسب معمول اس کے پاس بیڈ پر نہیں بیٹھی، بلکہ قریب
 بڑی ایزی چیئر پر سٹ کر بیٹھ گئی۔ جہاں نے پہلے تو
 غصوں نہ کیا، پھر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے
 حیرت سے پوچھا۔

”خیر تو ہے پریتو، یوں اجنبی ہو رہی ہو؟“

”کہاں تھے تم، اتنی رات کو اچانک نکلے؟“ اس نے
 جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

”بتانا تا کہ میں رتن دیپ سنگھ کے پاس گیا تھا۔ کیوں
 تم تنگ کیوں کر رہی ہو؟“ اس نے ہر پریت کی آنکھوں
 میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے تنگ نہیں لگتا ہے۔“ اس نے اعتماد سے
 کہا۔

”مطلب میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ اس نے
 ناراضگی سے کہا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی
 ”کوئی وجہ تو ہو، میرے جھوٹ بولنے، نہ بولنے کی،

پر اعتماد کیا ہی نہیں جاسکتا، ہم ہر طرح کے لوگوں کی نگاہوں میں آجائیں گے۔ وہ سکون وہ اطمینان، جو تھوڑا بہت ہمیں میسر ہے، وہ بھی نہیں رہے گا۔“ وہ یوں کہتی چلی گئی، جیسے وہ پھٹ پڑی ہو۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ جہاں نے نرمی سے پوچھا۔
”یہ سب چھوڑ دو، میں انوجیت کو تو یہ نہیں کہہ سکتی، تمہیں تو کہہ سکتی ہوں۔“ وہ پھر یوں بولی جیسے اسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ آخر کہنا کیا چاہتی ہے۔ جہاں نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑا اور پھر اسے قریب کر لیا۔ وہ ساری کی ساری اس کی طرف ہو گئی۔ جہاں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”پر تھو! کچ بتانا، بات کیا ہے؟“
وہ اس کے چہرے پر دیکھتی رہی، جیسے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہو پھر کچھ محسوس بعد بولی۔
”جہاں! ہم کب تک بھاگتے دوڑتے رہیں گے، کالج لائف میں اک جوش تھا، عقل نہیں تھی، بہت کچھ کیا کیونکہ ہمیں لگتا تھا کہ اب کچھ دن ہی ہیں، جب ہم اپنی قوم کو آزاد کرالیں گے، لیکن اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ اب ناممکن ہے، آزادی ہم سے بہت دور ہو گئی ہے، ہم لڑتے ہوئے مر جائیں گے اور شاید اگلی نسل ایسا کچھ نہ پائے۔“
اس کے لہجے میں مایوسی حیرت ہی تھی۔

”پھر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟“ اس نے پوچھا۔
”میں کہ زندگی کو زندگی سمجھ لیں اور جو ہو رہا ہے اسے قبول کر لیں۔ خود سے ایسا کچھ نہ کریں جو زندگی کو ختم کرنے والا ہو، سکون بھی تو چاہئے نازندگی میں۔“ اس نے اپنی آنکھوں میں اُمید کے نہ جانے کتنے دینے چلائے کہا تو جہاں آہستہ سے بولا۔

”پر تھو! جیسا تو چاہے گئی نا، ویسا ہی ہوگا۔ ہم ابھی اور اسی وقت الیکشن نہ لڑنے کا اعلان کر سکتے ہیں لیکن اس سے ہوگا کیا؟ ہم پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا۔ ہم بہت آگے نکل آئے ہیں، بہت ساری جگہوں پر یہ طے کر لیا گیا ہے، اب واپسی ناممکن ہے۔“ جہاں نے اسے

سمجھاتے ہوئے کہا۔
”لیکن ابھی تو اتنی مشکل نہیں ہے، بعد میں تو.....“
اس نے کہنا چاہا تو جہاں اس کے ہاتھ کو دبا کر بولا۔

”زندگی یہ نہیں ہے جو تم چاہ رہی ہو۔ زندگی کا مقصد کچھ دوسرا ہے۔ میں ابھی تمہیں بتانے والا نہیں بلکہ تمہیں دکھاؤں گا زندگی ہوئی کیا ہے اور آزادی ایک دن میں نہیں مل جاتی۔ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ ہم نے آزادی کی اس وقت قدر نہیں کی جب وہ ہمارے سامنے دھری ہوئی تھی۔ اگر ایک بار آزادی چھین جائے تو پھر بہت دیر لگتی ہے۔ اب یہ آزادی بہت وقت بعد ملے گی اور بڑا خون بہانا پڑے گا۔ ہم جس سے آزادی مانگ رہے ہیں وہ کیسے ممکن ہے۔ اور آخری بات، تم اتنی مایوس کیوں ہو گئی ہو، کب سے تم نے عقل کی باتیں سوچنا شروع کر دی ہیں؟“ اس نے بڑے پیار سے کہا۔
”مجھے ڈر لگتا ہے جہاں، ہماری قربانی ہمارا لہو کہیں رائیگاں نہ چلا جائے۔“ وہ دکھ سے بولی۔

”بیشک وہ لہو رائیگاں جاتا ہے، جس میں انسانیت سے محبت نہ ہو۔ ہم کسی کو نیچا دکھانے یا اپنی امانت کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں، ہمیں طاقت سے بھی غرض نہیں لیکن۔ اگر کوئی ہماری حرمت کو نقصان پہنچائے گا تو اس کے لیے معافی نہیں ہے۔ بتاؤ کیا ہوئی چاہئے معافی؟“ اس بار جہاں بات کرتے ہوئے کافی حد تک جذباتی ہو گیا۔ اس پر وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“
”پر تھو، میں سمجھتا ہوں کہ تم اکیلے ہوتی ہو اور اوٹ پناہگ سوچتی رہتی ہو۔ خیر، اب تم مجھے ایک اچھی سی چائے پلاؤ، پھر میں تمہیں ایک مزیدار بات بتاتا ہوں۔“ جہاں نے یونہی کہہ دیا تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ وڑے لیے واپس آ گئی۔

”دھوتی لے کر آ رہی تھی۔ اب سناؤ مزیدار بات۔“
اس نے فرسنا اپنے سامنے بیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔
”مزیدار بات یہ ہے کہ باغیا کو اس وقت جہاں کے

پاس لاہور میں ہے۔“ اس نے ایک دم سے کہا۔

”ارے واہ، وہ کیسے؟“ وہ کافی حد تک حیرت سے جوش سے بولی۔

”نہیں چلی گئی اس کے پاس۔“ حسپال نے کہا۔

”کاش ہم بھی وہاں جاتے۔“ ہر پریت نے آہ

بھرتے ہوئے کہا تو حسپال بولا۔

”بس یہ انکیشن سے فارغ ہو جائیں، پھر شری نکانہ

صاحب چلیں گے درشن کے لیے۔“ اس نے کہا اور

چاپے بنائی ہر پریت کے چہرے پر پھینٹنے لگوں کو دیکھنے

لگا۔ سچی اس نے موضوع بدل دیا۔ وہ انکیشن کے بارے

میں بتانے لگی۔ یو جی ارد گرد کے گاؤں جانے کی باتیں۔

رات گئے وہ دونوں باتوں میں الجھے رہے۔ یہاں

تک کہ انو جیت بھی ان کے پاس آگیا۔ وہ انکیشن ہی کی

باتیں کرنے لگا۔ رات کے دوسرے پہر تک باتیں

کمرے کے بعد وہ سونے کے لیے چلے گئے۔

صبح کی روشنی بہت حد تک پھیل گئی تھی جب حسپال کی

آنکھ کھلی۔ اس کے پاس سوائے نو تن کور کا انتظار کرنے

کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے تیار ہوا۔ اور

بحیرہ رانگ روم میں آگیا۔ بحیرت کورہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

وہیں اسے پتہ چلا کہ رات چند کے ایک گھر سے لڑکی افوا

ہوئی ہے۔ بھائی کی آنکھ کھلی تو اس نے مزاحمت کی، جس

پر انہوں نے بھائی کو فائر مار دیا۔ وہ بے چارہ وہیں مر گیا۔

اب نہ لڑکی کا پتہ ہے اور نہ لڑکی لے جانے والوں کا۔

انو جیت انہی کے گھر گیا ہوا ہے۔

”پھوپھو، یہ تو بہت برا ہوا، میں دیکھتا ہوں۔“ اس

نے اپنا سیل فون نکال کر کہا اور انو جیت کے نمبر نمائے

لگا۔ جلد ہی اس نے فون رسیو کر لیا۔

”کچھ پتہ چلا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی سراغ نہیں ملا، پولیس آئی تھی اور قانونی

کارروائی کر کے چلی گئی ہے۔ لاش بھی پوسٹ مارٹم کے

لیے لے گئے ہیں۔ اب دیکھیں۔“ وہ جواب میں بولا۔

”اچھا، میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر

دیا۔ وہ اٹھنے لگا تو بحیرت کور بولی۔

”ناشتہ کر کے جانا، وہاں پتہ نہیں کتنا وقت لگ

جائے۔“

”جی پھوپھو، جیسا آپ کہیں“ اس نے کہا تو بحیرت

کور اٹھ کر چن کی طرف چل دی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ بلیر سنگھ سٹج کے پاس جا

پہنچا۔ وہ اپنے گھر ہی تھا اور پنجاست گھر جانے کے لیے

تیار ہو گیا تھا۔ حسپال کے جاتے ہی وہ اس کے ساتھ کار

میں بیٹھا اور ابھر چل دیا۔

”سٹج جی، آپ کو کوئی اندازہ ہے یہ جو افوا ہوئی ہے

لڑکی، یہ کون کر سکتا ہے؟“ حسپال نے اپنا کام شروع کر دیا

”انہی دیکھتے ہیں، کیا نکلتا ہے۔ اصل میں یہ جو

لڑکیوں کے افوا والے معاملات ہیں نا، ان میں آدمی

سے زیادہ وہ ہوتے ہیں جن میں لڑکیاں خود شامل ہوتی

ہیں۔ بس لوگوں میں یہ بات مشہور نہ ہو کہ لڑکی گھر سے

بھاگ گئی ہے۔ کچھ لوگوں کی آپس کی دشمنی کی سمیٹ

چڑھ جاتی ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جرم ہو، کچھ

نہیں لگتا کہ کسی کی اتنی جرات ہو گئی ہے کہ وہ ایسا جرم

کرے، وہ اب پہلے والا ماحول نہیں رہا۔“ بلیر سنگھ نے

اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کیسے یہ معلوم کر پائیں گے؟“ حسپال نے

پوچھا تو وہ بولا۔

”دیکھو بیٹا، سیانوں کی ایک کہادت ہے کہ جہاں جرم

ہوتا ہے، سراغ بھی وہیں سے نکلتا ہے۔ سب سے پہلے تو

ان کے دشمن کو شک کی زد میں لایا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی نئی یا

انوکھی بات نہیں ہے یہاں۔ سچی ایسا کرتے ہیں۔ وہ یا

اپنی صفائی دیتے ہیں یا پھر ایسا کوئی سراغ پاست دے

دیتے ہیں، جس سے بات آگے چلائی جاتی ہے۔ اگر

انہوں نے اپنی صفائی دے دی تو بہت حد تک یہ معاملہ

صاف ہو گیا۔ اگر لڑکی کہیں دوسرے لڑکے کے ساتھ

بھاگی ہے تو بھی وہیں بات کھل جاتی ہے۔ کیونکہ خود کو

اُترام سے بری کرنا ہوتا ہے نا مڑموں نے۔“ سٹج نے

”اور اگر جرم ہو تو۔۔۔“ جہاں سے پوچھا۔

”تو پھر لوگ پولیس کی مدد لیتے ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو انصاف ملتا ہے۔ ایسا جرم کرنے والا اکثر ہمیشہ طاقتور بندہ ہی نکلتا ہے اور طاقت ور ہاتھ نہیں آتا۔“ وہ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اسی خاموشی میں وہ پنچائیت گھر چاہنے لگا۔ وہاں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر صرف کوئی قتل ہو گیا ہوتا تو شاید ایسے وقت میں یہ پنچائیت نہ ہوتی بلکہ آخری رسومات کے بعد یہ سب ہوتا لیکن چونکہ ایک لڑکی کا اغوا ہوا تھا، اس لیے پنچائیت بلانا لازمی تھا۔ وہاں کیا فیصلہ ہوتا یہ بھی سننے کے لیے جہاں جی وہیں بیٹھ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ باتیں سننے رہنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ یہ کسی باہری کے بندے کا کام ہے۔ گاؤں میں ان کے رشتے داروں ہی سے ان کی چیقلش تھی۔ انہوں نے نہ صرف صفائی دے دی تھی، بلکہ آئندہ بھی اگر ان کا کوئی جرم ثابت ہو جائے تو وہ ہر طرح کی سزا کے لیے تیار تھے۔ سبھی لوگوں کا اس پر اتفاق تھا کہ لڑکی بہت اچھی تھی، کسی نے اس میں ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی شک بھی کیا جاسکے۔ ملے جی پاپا کہ پولیس سے مدد لی جائے اور خود بھی کوشش کی جائے۔

جہاں وہاں سے آٹھ گیا۔ اس نے ملیر سنگھ بیچ سے بڑے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا کچھ جی، جب تک پولیس اس لڑکی تک پہنچے گی، اس کا یہ نہیں کیا حشر ہو جائے گا۔ وہاں ان کی دسترس ہی میں نہ رہے۔“

”اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ کوئی سراغ تو ملے جہاں کوشش کی جائے، اب جیسے ہی ملے گا، کچھ کرتے ہیں۔“ وہ دونوں اس گھر میں گئے جہاں کی لڑکی اغوا ہوئی تھی۔ اوجیل عمر ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ لیکن اغوا ہوئی اور بھائی لیکن کو بچاتا ہوا مارا گیا تھا۔ ان پر تو قیامت گذر رہی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا کہ لڑکی کی ایک جگہ

بات چل رہی تھی لیکن ابھی کچھ بھی ملے نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ ساتھ والے گاؤں کمونڈ کی بھادو میں رہتے تھے اور لڑکا اپنے کام کی غرض سے ٹھوڈر شہر میں رہتا تھا اور وہیں کسی کے پاس ملازم تھا۔ ابھی تک ان دو خاندانوں میں بات اس لیے ملے نہیں ہو پائی تھی کہ لڑکے والے جہیز کا کچھ زیادہ ہی مطالبہ کر رہے تھے۔ جبکہ لڑکی اس لیے نہیں مان رہی تھی کہ اسنے لاپچی لوگوں کے ہاں وہ شادی نہیں کرے گی۔ والدین کا خیال تھا کہ وہ لوگ اگر کچھ کم جہیز پر راضی ہونے تو یہیں ہاں کر دیں گے۔ وہ کچھ دیر ان کے گھر رہے اور پھر وہاں سے واپس آ گئے۔

جہاں نے ملیر سنگھ بیچ کو اس کے گھر چھوڑا ہی تھا کہ ایسے میں نوتن کور کی کول آگئی کہ وہ گھر پہنچ چکی تھی۔ جہاں کا من بہت بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اسی دھی من کے ساتھ گھر آ گیا۔

نوتن کور ڈرائنگ روم میں ہی تھی اس کے پاس برپریت بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ان کے سامنے کھانے پینے کو کافی کچھ رکھا ہوا تھا۔ جہاں ان کے پاس جا بیٹھا۔ تو نوتن کور نے ہی غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”خیر تو ہے نا جہاں، ایسے منہ کیوں بنا رکھا ہے؟“

”یار، بات ہی ایسی ہے، بہت دکھ ہو رہا ہے۔“ وہ آزرہ دیکھتے میں بولا۔

”اسکی کیا بات ہو گئی، وہی تو پوچھ رہی ہوں؟“ اس نے لکھتے ہوئے پوچھا تو جہاں نے سارا احوال کہہ دیا۔ تو وہ بھی افسردہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بہت برا ہوا۔“

”وہ غریب لوگ ہیں، اگر قاتل مل بھی گئے نا تو وہ ان کا کچھ نہیں کر پائیں گے۔“ برپریت نے کہا تو جہاں نے اس کی طرف دیکھ کر سچ لہجے میں پوچھا۔

”برپریت۔! ان قاتلوں کا پتہ تو ملے، تم تو ایسے کہہ رہی ہو، جیسے تمہیں پتہ ہے کہ اس کے قاتل کون ہیں، اور کوئی بھی ان کا کچھ نہیں بچا کر پالے۔“

”میں مانتی ہوں کہ مجھے نہیں پتہ لیکن تم جانتے ہو کہ

سوال

ایک سفید پوش آدمی ایک مالدار کے پاس پہنچا اور بولا ”جناب بے روزگار ہوں، روزگار دلوا دیجیے۔“

مالدار آدمی بگڑ کر بولا۔ ”اے میں نے لوگوں کو روزگار دلانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا؟“ اس شخص نے نہایت عجز و انکساری سے کہا۔

”جناب میں تین روز سے بھوکا ہوں روزگار نہیں دلوا سکتے تو روٹی کے لیے ہی کچھ پیسے دیجیے۔“

مالدار آدمی اور بھی غصہ اور طیش میں آ کر کہنے لگا۔

”کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے، ہر روز تم جیسے کئی فراڈیے آتے رہتے ہیں یہاں۔“ یہ سن کر ساکل نے جیب سے پستول نکالا اور کہنے لگا

”اب تو غالباً میری مالی مدد کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔“

جاوید احمد صدیقی... راولپنڈی

ایسے جرم کون لوگ کرتے ہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر پولیس کی بجائے ہم ان قاتلوں کی تلاش کریں تو جلدی ان تک پہنچی جائیں گے۔“ وہ مایوسانہ لہجے میں بولی۔

”ہر پریت یہی ہے وہ ضرورت، جس کی وجہ سے ہمیں طاقت اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ بے شک دشمن پیدا ہوتے ہیں، لیکن طاقت کے آگے، بہت کم لوگ سر مار سکتے ہیں، سو دفعہ سوچتے ہیں۔ یوں بے بس نہیں ہوتا پڑتا۔“ یہی معاملہ اگر ہمارے ساتھ ہوتا تو ہم کیا کرتے۔ یہ جنگل ہے ہر پریت، اس میں کیسے رہنا ہے یہ اب ہمیں جانوروں ہی سے سیکھنا ہوگا۔ انسان اب مہذب نہیں رہا۔ درندہ بھی بھوک لگنے پر شکار کو نکلتا ہے، جبکہ انسانوں کی ان بستیوں میں ہر وقت صیاد گھات لگائے بیٹھا ہے، شاید ان کی بھوک مٹی ہی نہیں۔“ جہاں جیسے ایک دم ہی سے پھٹ پڑا تھا۔

”جہاں! تم پر سکون رہو بہت مہراں کرے گا، تم پریشانی مت لو۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کو خاموش ہوئی پھر اس سے پوچھا۔ ”کیا پولیس سے تم ذاتی طور پر ملے ہو؟“

”نہیں، ابھی تو نہیں ملا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دیکھتے ہیں، وہ کیا کر سکتے ہیں۔“ فوٹن نے کچھ دیر سے کہا کہ جہاں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ ایک دم سے پر سکون ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

میں نے بانیتا کور کے ساتھ بڑے سکون سے ناشتہ کر کے فہیم کو فون کیا۔ میں نے یہاں آتے ہی اس اجنبی ”باس“ کا نمبر اسے دے دیا تھا کہ جس نے مجھے دھمکی لگائی تھی۔ یہ سب اسی کے لوگ تھے۔ وہ چاروں تو مر گئے۔ پولیس انہیں اٹھ کر لے گئی تھی۔ باقی دو ادھر پڑے ہوئے تھے۔ میڈیا پر بہت کچھ ہوتا رہا تھا۔ جسے میں نے تھوڑا بہت سنا، پھر دھیان ہی نہیں دیا۔ فہیم سے کہا تھا کہ وہ پتہ کرے یہ کس کا نمبر ہے؟ لیکن باوجود رات گزر جانے کے وہ ابھی تک بتا نہیں پایا تھا۔ دوسری نفل پر کال

رہیو کرتے ہوئے اس نے مایوسی سے کہا۔

”ابھی تک اس کے بارے میں پتہ نہیں چلا، میں نے ارد گرد اور روایت سے بھی مدد لی، مگر پتہ نہیں چلا۔“

”نہیں ان کے پاس تو وہی کچھ نہیں ہے جو ہمارے پاس ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دنیا بہت آگے چلی گئی ہوئی ہے۔ اگر یہ نیکنا لوجی ہمارے پاس ہے تو کسی دوسرے کے پاس بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ہے اس کا تو زنجی مل سکتا ہے میں نے سلمان سے بات کی ہے، وہ بھی مصروف ہے، اس نے رابطہ نہیں کیا۔ ارد گرد بھی اسی تلاش میں ہے۔“ اس

نے مجھے پوری تفصیل بتادی۔

”اب اسے تلاش تو کرتا ہے، کیسے ہوگا، یہ تو وہی جانتے ہیں نا جو اس کے ماہر ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے امید ہے، ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“ وہ اعتماد سے بولا تو میں نے اس سے کہا۔

”کو کے، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

میں نے سیل فون بند کر کے جیب میں رکھا اور اٹھ گیا۔ پھر مختصر انداز میں باغیتا کو روکنا دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس کمرے کی طرف چل پڑے جہاں ان دونوں کو رکھا ہوا تھا۔ اس وقت منجر سے مجھے کوئی دیکھی نہیں تھی۔ میں اسے بعد میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ان دو بندوں سے دیکھی تھی۔

وہ دونوں فرش پر بندھے ہوئے چیت پڑے تھے۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ویسی ہی نفرت تھی جو میں نے رات کے وقت دیکھی تھی۔ جس نے باغیتا کو اسے مار کھائی تھی، وہ ذرا بھی مہم نہیں تھا۔ جبکہ دوسرا میری جانب سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اسی سے بات کروں گا۔ میں نے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا۔

”دیکھو بھئی، تمہارے پاس نے مجھ سے تو رابطہ نہیں کیا اب تک، اگر تم لوگوں کو کوئی طریقہ آتا ہو تو بتاؤ؟“ میرے اس سوال پر ان میں سے کوئی بھی نہیں بولا تو میں نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

”کوئے بولو۔“ باغیتا کو نے ان کے پاس آ کر پوچھا۔

”چلو یہ بتاؤ، کہ وہ کون ہے کہاں ہے، میں خود مل لیتا ہوں جا کر؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمیں اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ وہ یہاں اس ملک میں ہے یا نہیں دوسرے ملک میں موجود ہے۔ ہمیں تو حکم ملتا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں۔“ دوسرے نے دھمے نہجے میں جواب دیا۔

”کیسے ملتا ہے حکم؟“ میں نے پوچھا۔

”فون پر، وہ بھی ہمارے لیڈر کو بتاتا تھا، وہ ہمیں ساری تفصیل بتاتا تھا۔“ اس نے اسی نہجے میں جواب دیا۔

”کون تھا لیڈر؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ شاید مر گیا ہے۔ وہ ان چاروں میں سے ایک تھا جو اوپر تم دونوں کے پاس گئے تھے۔“ دوسرے نے کہا ہی تھا اور میں مزید کہنے لگا تھا کہ میرا سیل فون بج گیا۔ میں اسکرین پر دیکھا تو ایک دم سے مسکرا دیا، پھر کال ریسیو کرتے ہوئے اٹھ کر آن کر دیا، اس کی ہیلو کمرے میں گونج گئی تو میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”بھئی داو، ابھی تمہارے بندوں کے ساتھ تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہاں گیا وہ چوہا، کس مل میں ہے، کسکی دے کر غائب ہو گیا ہے۔“

میرے کہنے پر وہ مجھ سے بھی اونچا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”میں کہیں بھی نہیں ہوں اور تمہارے بالکل قریب ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی تمہیں ابھی کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ بہت لمبا کھیل کھیلتا چاہتا ہوں جہاں تو ابھی سے مجھے تلاش کرنے لگ گئے ہوں۔ ابھی تو میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں کہا۔“

”جھوٹ بولتے ہو تم بااثر تم اتنے ہی طاقتور ہو تو میرے سامنے آؤ، پھر چاہے جتنی مرضی لمبی انگڑ چلے، میں کھیلوں گا۔ ورنہ میں نے تمہیں تلاش کر لیا تو تمہارا کھیل ختم کر دوں گا۔“ میں نے بڑے ٹھن سے کہا۔

”نہیں ایسے نہیں جمال۔۔۔۔۔ جب میں کھیلنے کا کہہ رہا ہوں تو آؤ۔“ کھیلوں جیت ہار کے بغیر کھیل کیے ختم ہو سکتا ہے اور ہاں۔۔۔۔۔ اگر میں ہار گیا تو خود اپنا آپ تیرے حوالے کر دوں گا اور۔۔۔۔۔ اگر جیت گیا تو تجھے مرنا ہوگا۔“

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تم کھیلنا چاہتے ہو تو کھیلو، میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا، پھر فیصلہ میں کروں گا اور ہاں دھوکے سے اور چھپ کر وار مر نہیں کرتا۔“ میں نے اس سے تھکیک آمیز نہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

وہ تیزی سے بولا۔

”میں نے پتہ کیا تھا۔ وہ انگو اتو ہوا تھا، اور اب بھی.....“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رکا، پھر بولا۔ ”نہیں، میں پھر سے دیکھتا ہوں۔“

”گڈ بوائے، اچھی طرح دیکھنا، مجھے کچھ اور ہی دکھائی دے رہا ہے فی الحال۔“ میں نے کہا اور بانٹا کور کے ساتھ باہر کی جانب چل پڑا۔

میں ٹاؤن والے نئے گھر میں جب پہنچا تو وہاں سکوت تھا۔ وہاں میرے ذہن پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ مجھے جانتا بھی تھا، میرے قریب بھی تھا، میری انتہائی احتیاط کے باوجود مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ محسوس ہی بہت زیادہ تھا کہ وہ کون تھا؟ اس پر وہ میرے اتنے قریب تھا کہ میرے بارے میں جان لیتا تھا۔ یہ کیسے؟

اس وقت بانٹا کور نیچے نیم اور مہوش کے پاس چلی گئی تھی۔ باقی سب بھی۔ یہیں موجود تھے۔ میں کمرے میں تنہا تھا۔ میں اس پاس کے بارے میں جتنا بھی سوچتا، میرا ذہن اسی قدر بھر جاتا۔ میں اس بارے میں سب سے بات کرتا چاہتا تھا، مگر اس وقت وہ سارے ہی پاس کا نمبر اور اس کی لوکیشن تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جس طرح مجھے کارخانے کے مالک زوہیب کے بارے میں پتہ چلا تھا، ویسی ہی توجہ لگا کر دیکھوں۔

میں نے خود کو ذہنی چھوڑ دیا اور بیڈ سے نیچے قالین پر آ بیٹھا۔ میں نے پوری توجہ یہ سوچنے پر لگا دی کہ وہ کون ہے اور میرے بارے میں کیسے جان لیتا ہے۔ چند لمحوں ہی میں میرے دماغ سے ساری سوچیں ہٹ گئیں۔ میں نے خود کو خلا میں محسوس کیا۔ میری بند آنکھوں کے سامنے بننے والے دائرے ختم ہو گئے اور وہاں پر اس طرح رنگ پھیلنے لگے، جیسے کئی لوگ ان رنگوں کو اڑا رہے ہوں۔ وہ لوگ تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن مختلف رنگ اڑتے اور فضا میں جا کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے۔ وہ رنگ مختلف بادلوں کی صورت اختیار کر

”یہ فلسفے چھوڑو اور آج کی حقیقت والی بات کرو۔“

”اب ملے ہیں تو باتیں ہوتی رہیں گی۔ خیر ہمت ہے تو اپنے دو بندے لے جاؤ، میرے پاس بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ بے چاروں نے بہت مار کھائی ہے۔ وہی بندے جنہیں تو نے میرے لیے بھیجا تھا تاکہ وہ مجھے پکڑ کر تیرے پاس لے آئیں، بے چارے۔“ میں نے افسوس ناک انداز میں کہا۔

”او چھوڑو جمال، ایسے کیڑے مکوڑے پتہ نہیں کہتے روزانہ کا کروچ کی طرح مرتے ہیں، دو بلٹ ان کے دماغ میں اتار دو، وہ بھی میری طرف سے، کیونکہ ایسے لوگوں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، وعدہ رہا کہ ان کے مرنے کے عوض میں تمہارے چار بندوں کی جان بخش دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔

”چلو انتظار کرو میرا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون واپس جیب میں رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ فطری طور پر ان کے چہرے مایوسانہ حد تک مسخ ہو گئے تھے۔

”تمہارا پاس بہت چالاک ہے، کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں کو مار دوں۔ اس کی بات مانوں گا تو بھی اسی کا فائدہ اور زندہ چھوڑ دوں گا تو بھی وہی فائدہ ہے میں رہے گا، کیسا؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جو تمہارا دل چاہے۔“ دوسرا مردہ لہجے میں بولا اور اس نے اپنا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ میں اٹھا اور بانٹا کو باہر جانے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ سامنے ہی طارق، نذیر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے کچھ چھپاتے اور تھوڑا بتاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے انہیں کسی جیل میں رکھوا دیا جائے۔ بعد میں دیکھیں گے۔“

”اور وہ منجر پاس کا کیا کر رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”وہ اگر آج کوئی بات بتاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ اسے بھی ان کی طرح جیل میں رکھوا دو اور یہ پتہ کرو کہ اس کا بیٹا واقعی ہی انگو اتو تھا یا یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ میں نے کہا تو

”خامبر ہے، مجھے ان کو اپنے ساتھ لے کر جانا ہے۔“
ان کے بغیر تو کام نہیں چلے گا، لیکن سارے تو نہیں جائیں گے۔ ہاں جنید اور علی نواز تو تم اپنے پاس رکھ لو۔“ اس نے مشورہ دیا

”نہیں، تم انہیں بھی لے جاؤ۔ اپنا سیٹ اپ بنالو۔ پھر اس کے بعد دیکھیں گے کیا ہوتا ہے، اس وقت پتہ نہیں کیا صورت حال ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”میں نے اپنا سیٹ اپ دوئی میں بنانا ہے۔ یہ سب تو نہیں جائیں گے نا وہاں پر۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”لیکن تم دوئی میں تو نہیں رہو گی نا، کراچی تو آنا ہوگا، ان لوگوں کی تمہیں وہاں ضرورت ہوگی اور پھر تم سب سے میرا رابطہ رہے گا۔ جب بھی اور جس کی مجھے ضرورت ہوگی، میں بلا لوں گا۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں، یہاں پر آپ کا کام چل جائے گا؟“ اس نے پوچھا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیوں نہیں، بلکہ میں اب کہوں گا کہ تم سب لوگ جاؤ، ممکن ہے میں بھی وہیں کراچی آ جاؤں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیرے پیچھے پیچھے دوئی چلا آؤں۔“

میری اس بات وہ مسکرا دی۔ پھر خوشگوار لہجے میں بولی۔

”چلیں، یہ تو اچھا ہوگا کہ تم وہاں آ جاؤ، کچھ دن سکون سے کٹ جائیں گے۔ پھر پوری پوری پلاننگ کے ساتھ نیا کام شروع کریں گے۔“

”اوکے، جیسا تم چاہو۔“ میں نے اطمینان سے کہہ دیا۔ میں اس سے مزید بحث نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد وہ جانے کو تیار ہو گئی۔

دو پہر تک وہ لوگ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہیں ایک ٹی ٹیوٹی کی فلائیر سے سینین مل گئیں۔ وہ سبھی تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ دار سے نے ان سب کے لیے کھانا تیار کیا ہوا تھا۔ وہ سب نے مل کر کھایا اور پھر وہ سب نکل گئے۔

اس وقت دو پہر ڈھل چکی تھی۔ میں اور بانیتا کورلان

جاتے۔ جب ابھی وہ بادل بننے تو ان میں سے مجھے ایک شہر کا منظر نظر آتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں فیضا میں ہوں یا ہوائی جہاز میں۔ فیضا نیچے کسی شہر کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ پھر میں فیضا میں فلا بازیاں کھاتا ہوا نیچے آنے لگا۔ یہاں تک کہ میں ایک سڑک پر جا گرا۔ میرے ارد گرد بہت سارے لوگ آ جا رہے تھے۔ ہر بندے کا اپنا رنگ تھا۔ میں نے اپنے رنگ پر غور کیا تو میرا رنگ بھی مختلف تھا۔ مجھے وہ نیلا اور ارغوانی کا ملا جلا لگا۔ وہ مجھے دھواں کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ جو اوپر کی جانب اٹھ جاتا تھا۔ میں جس بندے کو بھی دیکھتا، وہ بھی دھواں کی مانند تھا۔ وہ دھواں بھی اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا۔ اچانک وہ منظر ہٹ گیا۔ ایک معمول کی زندگی میرے سامنے تھی اور پھر وہ منظر بھی ہٹ گیا۔ میں اپنے آپ میں آ گیا۔ دروازے میں گیت کھڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے تم ایسے قالمیں پر کیا کر رہے ہو؟“
”میں بہت تھک گیا تھا۔ یہ جسم کو سکون دینے کی ایک مشق ہے، وہ کر رہا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سکون سے کہا تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر آ گئی۔ میں اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے ان سب کی کوششوں کے بارے میں بتاتی رہی اور میرا ذہن ان مناظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا، جو میں کچھ لمحے پہلے دیکھ چکا تھا۔ وہ سب کیا تھا، مجھے اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ان مناظر کو سمجھنا کچھ دیر کے لیے موقوف کیا اور گیت کی بات سمجھنے لگا۔
”میں نہیں سمجھتی کہ اب میں اس جگہ پر اپنا پروڈکشن باؤس چلا پاؤں گی۔ وہ جگہ اب غیر محفوظ ہو گئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کیا خیال ہے تمہارا؟“ میں نے پوچھا۔
”میں واپس کراچی چلی جانی ہوں۔ وہیں پر کام کرتی ہوں۔“ اس نے اپنا خیال بتایا۔

”تو اس کا مطلب ہے، باقی کچھ لوگ بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔“ میں نے پوچھا۔

میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان سب کے جانے پر ہلکا سا جھٹکا کا احساس ہو رہا تھا۔ میں انہی کی باتیں یاد کرتے ہوئے اس بتا رہا تھا کہ کتنا اچھا وقت ان سب کے ساتھ گزارا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے دور ہو۔“ بانیتا کور نے پرشوق نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ساتھ چاہے چند دن کا ہو، احساس تو ہوتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں، مجھے اسی طرح یاد کیا تھا۔ جب تم پہلی بار امرتسر سے آئے تھے؟“ اس نے اسی طرح پرشوق نگاہوں سے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ ایمانداری سے بتاؤں گا۔ تم مجھے بہت عرصہ تک یاد آتی رہی ہو۔ تب تک ہم دوبارہ نہیں مل گئے۔“ میں نے پوری سچائی سے بتایا تو اس کی آنکھیں تنک مسکرا دیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ میرے سیل فون پر چوہدری اشفاق کے نمبر جھنگانے لگے۔ میں نے کال ریسیو کی تو وہ سکون سے بولا۔

”یار۔! کوئی نورنگر آنے کا ارادہ ہے؟“

”کیا ہوا کوئی خاص کام؟“ میں نے پوچھا۔

”خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ وہ جو ملنگ اور جوگی رام اعلیٰ تم یہاں چھوڑ گئے تھے، وہ سب بھی یہیں ہیں۔ میں نے ان میں تو کوئی خاص بات نہیں دیکھی، لیکن چند دنوں سے ان کے پاس کچھ لوگوں کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ وہ بندے مجھے مشکوک لگتے ہیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور دوسری ہینکل تو نہیں ہے علاقے میں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی تک تو نہیں ہے۔ لیکن میرا دامغ کبیر با ہے کہ ان لوگوں میں کوئی گڑبڑ ہے۔“ اس نے اکتھتے ہوئے کہا تو میں نے ایک دم سے فیصلہ کر لیا۔

”ٹھیک ہے، میں پیکر لگاتا ہوں۔ تم ان لوگوں کا ٹھکانہ معلوم کر کے رکھو۔ دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ پھر کچھ ابھر ادھر کی باتوں کے بعد فون بند

کر دیا۔ فون رکھ کر میں نے بانیتا کور کو اس جوگی اور ملنگ کا قصہ سنانے لگا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سختی رہی۔ پھر ایک دم سے بولی۔

”چل یار۔! ادھر حیرے نورنگر ہی چلتے ہیں۔ ایک دو دن ادھر گزار کے آتے ہیں۔ تب تک کوئی بات سمجھ میں آ جائے گی، اس باس کے حوالے سے۔“ بانیتا کور نے یاد دلایا تو مجھے کچھ گھٹنے پیلے کا منظر یاد آ گیا جو میں نے مراقبہ کی سی کیفیت میں دیکھا تھا۔ ایک ہار تو میرا دل کیا کہ میں وہ منظر بانیتا کور کے ساتھ شیئر کروں، پھر ایک دم سے ارادہ بدل دیا۔ جب مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تو پھر اس کے ساتھ دماغ ہی کھپاتا ہے۔ سچی میں نے اکتھتے ہوئے کہا۔

”چل اٹھ پھر تیار ہو جا، چلیں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ اٹھ گئی۔

میں نے اپنے ساتھ دارے کو بھی تیار کر لیا۔ نبھانے کب کا وہ نورنگر نہیں گیا تھا۔ میں نے دارے کو چلنے کا کہہ دیا تو وہ دوسرے ملازم بھی چل گئے، وہ میاں بیوی، کب کے یہاں آئے ہوئے تھے۔

”اچھا، پھر تم لوگ ایسا کرو۔ ان دونوں بزرگوں کو بھی ساتھ لے لو، انہیں بھی اپنے ساتھ نورنگر لے جاؤ۔ جتنے دن رہنا ہوگا، رہو۔ ان بزرگوں کو چاہے حویلی میں چھوڑ دینا۔ ایک ہفتہ تک تم لوگ خوب گھوم پھر لو۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو سبھی خوش ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ ایک دو دن نورنگر رہ آؤں گا پھر اہل کے ساتھ وقت گزاروں گا۔ بانیتا کور بھی ساتھ آ جائے گی۔

”ٹھیک ہے، ہم پھر وہ نورنگر ڈنیل گاڑی لے جاتے ہیں۔“ دارے نے تیزی سے اجازت چاہی۔

”چل لے جا۔ ہم آ جائیں گے۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جب میں تیار ہو کر واپس آیا تو بانیتا کور بالکل ہڈی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور بالکل کوئی پنجاب کی منیاء دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ کیڑے کہاں سے لیے؟“

دروازہ کھولا۔ بانیتا کو رنے وہ سارا سامان جلدی سے پھینکی
سیٹ پر رکھا، جو رکھتے ہی بکھر گیا۔ سب سے اوپر کچھ
پر فیوم کی بوتلیں تھیں۔ وہ جو گری تو ان میں سے دو نوٹ
نکلیں۔ کار میں تیز مہمک پھیل گئی۔

”اوہ۔ ایہ کیا ہوا یا ر۔“ وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔
”کچھ نہیں ہوا، پر فیوم ضائع ہو گیا۔“ میں نے ہنستے
ہوئے کہا تو وہ ملتے ہوئے بولی۔

”میں نے ٹیکر آتی ہوں، بس ایک منٹ ٹھہرو۔“
”چلو آ جاؤ، کچھ اور بھی ہیں۔“ میں نے کہا تو میری
باٹ سنی ان سنی کرتی ہوئی دوکان میں گھس گئی۔ میں نے
وہ دونوں بوتلیں اٹھا لیں تاکہ انہیں باہر پھینک دوں اور
ان کی تیز مہمک سے نجات ملے۔ میں نے جیسے ہی وہ دونوں
ہوئی بوتلیں اٹھا لیں، ان میں پڑا ہوا پر فیوم میری کپڑوں
پر گر گیا۔ میں نے وہ بوتلیں باہر پھینک دیں اور ڈرائیونگ
سیٹ پر آن بیٹھا۔ میں نے دروازے کھول دیے تاکہ وہ
مہمک ختم ہو جائے۔ پانچ منٹ کے دوران بانیتا کو ر پلٹ
آئی۔ اس نے دو کی بجائے چار بوتلیں خرید لی تھیں، وہ
اس نے ڈیش بورڈ پر رکھ دیں اور ہم چل پڑے۔

”ہم جدھر سے گزرتے جا میں، ادھر سے خوشبو
بکھرتی چلی جائے گی۔“ بانیتا کو ر نے کہا اور بچوں کی طرح
نفس دی۔ جبکہ مجھے وہ مہمک اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اس وقت ہم شہر ہی میں تھے۔ سورج غروب ہو گیا
تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے کہا۔

”یار کھانا نہ کھا لیں۔ یہاں سے نورنگر کا فاصلہ چار اور
پانچ گھنٹوں کا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوتا، رستے میں کچھ دیکھ لیں گے یا
وہیں چل کر کھا لیں گے۔“

اس نے کہا تو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر دگا
دی۔ تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد میں پٹرول
لینے کے لیے ایک فلنگ اسٹیشن پر رکا۔ وہیں ایک ہوٹل
بھی تھا۔ اسے دیکھتے ہی بانیتا کو ر نے کہا۔

”ارے یہاں تو ڈھابہ بھی ہے، ہمیں سے کچھ کھانی

”میں نے اور گیت نے خریدے تھے۔ باقی میں نے
کافی کپڑے رکھ لیے ہیں۔ کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس
نے میری طرف دیکھ کر مصنوعی شرماسٹ سے کہا تو میری
نہی نکل گئی۔

”اچھا چلو، نکلو، مجھے چوہدری اشفاق کے لیے کچھ
چیزیں بھی خریدنی ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے قریب
پڑے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھو! میں تیار ہوں، چلو۔“ اس نے کہا تو میں
نکل پڑا۔ میرا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔

”کیا خریدنا ہے اس کے لیے؟“ بانیتا کو ر نے یونہی
پوچھا تو میں نے ہنستے ہوئے بتایا

”پچھلی بار جب میں نورنگر گیا تھا تو چوہدری اشفاق
نے بڑے مان سے ایک بات کہی۔“

”کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”کہنے لگا کہ پھانکے سے مجھے چوہدری اشفاق تو ہونا
دیا ہے۔ اب میرا کھرا کھاؤ بھی ایسا ہونا چاہیے۔ اب آؤ تو
شہر سے کپڑے، پر فیوم، اور وہ ساری چیزیں لے کر آنا
جس سے بندے کی ثبوت شور بنے۔ بس اس کی ثبوت شور کا
سامان لینا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں ہنس دیا۔ تو وہ بھی
کھلکھلا کر ہنس دی۔

”یار یہ تعلق، یہ رشتے یہ مائے، جن پر مان ہوتا ہے،
جنہیں ہم اپنا کہہ سکتے ہیں، ان کے لیے کچھ کرتے وقت
کتنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ بڑی آواز سے بولی۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا تو ہم ایسے ہی باتیں
کرتے ہوئے مارکیٹ جا پہنچے۔

تقریباً دو گھنٹے تک یونہی جو کچھ میں آیا اس کے لیے
خریدتے رہے۔ ہمیں شاپنگ کرتے ہوئے کوئی دیکھتا تو
بلاشبہ ہمیں اتار ڈی کہتا۔ اسی دوران گیت کا فون آ گیا کہ وہ
لوگ گراچی پہنچ چکے ہیں۔ ابھی ایئر پورٹ سے نکل رہے
ہیں۔ ہم شاپنگ بیگز سے لدے واپس گاڑی تک آئے
۔ میں نے اپنا سامان بانیتا کو ر کے دونوں ہاتھوں میں
پکڑے ہوئے سامان کے اوپر رکھ دیا اور چابی نکال کر

نالیس؟

اس کے لہجے میں بے بسی صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔

”میں اپنے گھر میں ہوں۔ اگر تم میں ہمت ہے تو میرے سامنے آ جاؤ اور پھر تمہارا دعویٰ کدھر گیا کہ تم ہر وقت مجھ تک پہنچ سکتے ہو، میرے قریب ہو اور میں نے اسے مزید غصہ دلاتے ہوئے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ باغیتا کو میری باتوں سے اندازہ لگا چکی تھی کہ فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے انتہائی اختصار سے اسے بتایا تو وہ بولی۔

”پہلے پتہ تو کرو، گھر کا؟“

ارد گرد کے کسی بندے کا فون میرے پاس نہیں تھا۔ میرے پاس اس سیکورٹی گارڈ کا نمبر بھی نہیں تھا۔ وہ دارے کے پاس تھا۔ میں نے دارے کو فون کرنے کا سوچا ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

”لو جمال، جس گھر سے ہم آئے ہیں، کسی نے وہاں راکٹ لانچر اور ایم مار کر پورے گھر کو اڑا دیا ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”اے پولیس والوں نے۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔

”سیکورٹی گارڈ کہاں تھا؟ وہ وہاں پر اس لیے کھڑا رہا کہ لوگ آئیں اور ایم مار کر چلے جائیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے بھی پوچھا تھا پولیس والوں سے، انہوں نے بتایا کہ وہ شدید زخمی ہے اور اسپتال میں پہنچا دیا گیا ہے، انہوں نے آتے ہی اسے گولیاں ماری تھیں۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔

”تم کہاں پر ہو؟ اور پولیس والوں کو اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ابھی نور گھر پہنچا ہی ہوں اور انہیں بھی یہی بتایا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے میں سرتابوں کچھ۔“ میں نے کہا اور چند لمحے سوچ کر طارقی نذر کو فون کر دیا۔ اسے ساری صورت حال بتا کر کہا۔

”اسے دیکھ لینا، اب ہم نے وہاں واپس نہیں جانا،

”یہاں سے کھالیتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اتر گئی۔ میں نے بیٹرول لیا اور ایک جانب کار پارک کر کے اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہاں دش خاصاً تم تھا۔ شاید رات کا سہا پہر تھا۔ اس لیے ٹرک اور دوسری گاڑیاں نہیں رک رہی تھیں۔ ہم نے بڑے سکون سے کھا کھایا اس وقت چائے پیتے ہوئے باغیتا کو خاموش تھی کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر نگاہ کی۔ اسی پاس کا فون تھا۔ میں کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو!“ میں نے بڑے سکون سے کہا۔

”کہاں ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا تو مجھے اچانک اس کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ اس کا تو یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہر وقت میرے قریب ہے، یہ اب کیوں پوچھ رہا ہے۔ میں نے ایک لمحہ میں سوچا اور جواب دیا

”اپنے گھر میں ہوں۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے اچھٹے ہوئے جواب دیا۔ میں نے پوری طرح یہ احساس کر لیا کہ اس کے لہجے میں وہ پہلے والی خوشگواریت نہیں تھی۔

”تم یقین نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”میں اس لیے یقین نہیں کر سکتا کہ ابھی چند منٹ پہلے میرے لوگوں نے تمہارے گاؤں والے گھر کو لانچروں سے اڑا دیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم وہاں ہو اور فوجی گئے ہو۔“ وہ تیزی سے بولا تو میں نے مزید اسے چاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم نے بموں سے گھر کو اڑا دیا ہو گا لیکن میں تو گھر میں ہوں۔ اور تم سے بات کر رہا ہوں اور پھر میرے مرنے کی خبر مجھے سنار ہے ہو، حیرت ہے۔ ابھی تو ہم نے کافی لمبی آنکڑھینی تھی۔ اپنے وعدے سے جھگی کر گئے ہو۔ مجھے مار کر۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز اتر آیا تھا۔

”تم اپنے گھر میں نہیں ہو۔“ اس نے غصے میں کہا تو

تجھی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، اب یہاں نہ ماں تھی اور نہ سوہنی۔ مجھے یوں لگا جیسے ساری حویلی ہی ویران ہو۔ میں چلتے ہوئے ڈرفلنگ روم میں جا بیٹھا پیچھے ہی وہ دونوں آگئے۔ حویلی کے ملازمین کو پتہ چل گیا تھا کہ میں آگیا ہوں۔ وہ آنے لگے۔ چوہدری اشفاق نے کھانا لگانے کا کہا تو باغیتا کو رنے بتایا کہ ہم ایک ڈھابہ ہوٹل سے کھا آئے ہیں، چائے وغیرہ پی جا سکتی ہے۔ وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ باس کی کال آگئی۔

”تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم بچ گئے ہو، ورنہ آج تمہارا کام ختم ہو جانے والا تھا۔“ اس نے غصے اور مایوسی سے لے لے کر میں یوں کہا جیسے اسے بری شکست ہو چکی ہو۔
”دیکھو، تم جو کوئی بھی ہو، اپنی بات پر قائم رہنے والے نہیں ہو۔ ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو کافی بے غیرت قسم کے ہوں۔ چھپ کر واپس کرنے والا بے غیرت ہی تو ہوتا ہے، جس کے باپ کا کوئی پتہ نہیں ہوتا، لہذا اگر مجھ سے دشمنی لینی ہی ہے تو مراد گئی دکھاؤ، بھجروں سے میں نہیں لڑتا۔“ میں نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تم مجھے ایسا اشتعال نہیں دلا سکتے ہو، میں چاہوں تو ابھی تمہیں ختم کر سکتا ہوں، لیکن میں تم سے کھیل.....“ اس نے کہا جاپا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

”کیوں بند کرو، اور اگر ہمت ہے تو میں لاہور کے مال روڈ پر، ایک ریسٹوران میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میں دیکھ لوں گا تمہیں۔ ایک گھنٹے کی تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ مجھے تلاش کر لو، میرا وعدہ ہے میں خود کو تیرے حوالے کر دوں گا اور نہ تلاش کر سکے تو تم اپنی شکست مانجے ہوئے خود اپنے آپ کو میرے حوالے کر دینا، کیسا ہے یہ کھیل؟ آؤ، اب میں تمہارے ساتھ کھیتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو، تم زیادہ دیر تک میری لگا ہوں سے اوجھل نہیں رو سکتے ہو۔“ اس نے انتہائی غصے میں کہا تو میں چونک گیا۔ کیا اس وقت میں اس کی لگا ہوں سے اوجھل ہوں؟ جیسے ہی مجھے یہ

سیکورٹی گارڈ کا ہر ممکن خیال کر رہا۔
”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس نے کہا تو مجھے خیال آیا۔

”اور ہاں۔ وہ میجر کے بیٹے کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”آپ نے درست فریک دیا تھا۔ مجھے تھوڑا پتہ چلا ہے، تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔
”اوسکے۔“ میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ ہم نے کپڑے پہنے۔ بل دیا اور کار میں آ بیٹھے۔

میرے سامنے سوالیہ نشان تھا۔ اس باس کا دعویٰ بالکل غلط تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اصل میں وہ مجھ تک نہیں پہنچ پاتا تھا صرف اپنی ذہانت سے مجھے چکر دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اگر وہ درست تھا تو اس بار وہ دھوکا کیسے کھا گیا؟ میں فوراً باغیتا اسی بارے میں باتیں کرتے ہوئے سفر کرتے چلے گئے۔ یہ معرکہ حل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ نور نگر آ گیا۔

ہم نور نگر پہنچ گئے۔ تمام راستے میرا طارق سے رابطہ رہا۔ وہ مجھے دیاں کے بارے میں بتاتا رہا۔ باغیتا کو رنجی بار یہاں آئی تھی۔ جیسے ہی ہم حویلی کے گیٹ پر آئے، چوہدری اشفاق سامنے آ گیا۔ گیت کھل گیا۔ میں نے جب تک کار پورچ میں روکی تب تک چوہدری اشفاق ہمارے قریب آ گیا۔

”جی آیاں لوں باغیتا۔“ اس نے پورے خلوص سے کہا۔

”بہت مہربانی چوہدری اشفاق، اب میں تمہارے لیے چھلانی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کار سے شاؤنک بیگ نکالنے لگی۔ تجھی چوہدری اشفاق نے پوچھا۔

”یار اتنا تیز پرفیوم، تو نے پہلے بھی نہیں لگایا تھا، یہ کیوں؟“

”یہ تیرے لیے لائی ہوئی ایک پرفیوم کی شیشی نوٹ گئی تھی۔ وہ مجھ پر گرئی۔ ابھی کپڑے بدلتا ہوں۔ یہ بہک چلی جائے گی۔“ میں نے کہا اور اندر کی جانب بڑھا۔

خیال آیا تو میں چونک گیا۔

بہت چھوٹا ہو گیا۔ وہ اصل میں قتل کو چھپائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ لڑکی کو بھی..... یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ پھر دھکی لکچے میں بولی۔ ”سوان و جوبات پر نگاہ رکھی جائے، جن کی وجہ سے وہ لڑکی اغوا ہو سکتی ہے یا ہوئی ہے، قاتل خود بخود واضح ہو جائیں گے۔“ اس نے اپنی بات کبہ دی۔

”تو یہ بتا کہیں سے کریں؟“ جہپال نے پوچھا۔
”دو جگہ ہیں، ایک تھانہ اور دوسرا اسی لڑکی کی کوئی سہیلی، ان سے بات آگے بڑھے گی۔“

”جہاں تک تھانے کا معاملہ ہے اگر انسپکٹر نے بات چھپانا چاہی تو وہ کبھی بھی ہمیں اصل بات نہیں بتائے گا اور اگر..... جہپال نے کہنا چاہا تو فون بولی۔

”پریشان مت ہو، ابھی کچھ دیر میں پہل چل جائے گا۔ میں نے گرین کور سے کہا ہے۔ وہ اسی انسپکٹر کے سیل فون کو ٹریس کر رہی ہے۔ ان دونوں میں اس کا بس سے سب سے زیادہ رابطہ ہوا ہے، وہ سامنے آجائے گا، اسے دیکھ لیتے ہیں۔“

”اور وہ سہیلی والا معاملہ؟“ جہپال نے پوچھا۔
”وہ دوسرا آپشن ہے، وہ میں اور ہر میریت دیکھ لیں گے۔“ اس نے سکون سے کہا اور دوکرکس دیکھنے لگی۔
”میں کروں اس سے بات؟“ جہپال نے بے تابی سے کہا۔

”کر لو، مگر وہ ذمہ دار لڑکی ہے، اپنا کام کر رہی ہوگی، مطمئن ہو کر ہی فون کرے گی۔“ نوتن نے کہا۔
”دیسے یہ سلمان نے ہمیں جو سیل فون دے دیئے ہیں، تا یہ بھی کمال کی چیز ہے، گیس ٹریس نہیں ہوتا۔ ورنہ ہم ابھی تک پکڑے گئے ہوتے۔“ جہپال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہیں تو سہی، لیکن کب تک، میں سوچ رہی تھی جس دن اس سے بھی بڑھ کر کوئی ٹیکنالوجی آگئی، ماسوفٹ وغیرہ مارکیٹ میں آگیا، تب کیا ہوگا، ہمیں شاید پتہ بھی نہ چلے۔“ نوتن کور نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور تھوڑے سے فاصلے پر موجود نیوب ویل کی جانب بڑھ گئی۔ جہپال بھی

اب بھاگومت، آؤ، مجھے پکڑو، تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ میں کس جگہ پر ہوں؟“ میں نے کہا تو وہ خاموش رہا تب میں بولا۔ ”صلہ کر کے بھاگ جانے والوں کے باپ کا پتہ نہیں ہوتا، دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، بے غیرت اور منافق اور یہ اپنے باپ کے نہیں ہوتے، بار جانے کا اعلان کر دو اور خود کو میرے حوالے کر دو یا پھر مجھے آکر پکڑو، مزاحمت نہیں کروں گا۔ کیوں منظور ہے؟“

اس نے جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔ مجھے تھوڑا بہت مجھ آنے لگی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک خاص دوست کو فون کیا اور اسے سمجھاتے ہوئے اس ریستوران کے بارے میں بتایا اور اسے سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں بعد رابطہ کروں گا۔

جگا..... جگا..... جگا.....

روپہر کے بعد ہی کا وقت تھا جب نوتن کور اور جہپال کھیتوں کی طرف نکل گئے تھے۔ سامنے سرسبز و شاداب فصلیں ابلہا رہی تھیں۔ ملکی ملکی ہوا چل رہی تھی۔ صاف اور شفاف ہوا، جسے سینے میں اتارتے ہوئے بھی سکون ملا تھا۔ اصل میں وہ اسی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔

”نوتن کور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ جرم کس نے کیا ہے؟“ اس نے بات بڑھائی۔

”جہاں تک میں نے اب تک سنی ہوئی بات پر تجزیہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ فقط لڑکی ہی اغوا کرنے آئے تھے۔ درمیان میں بھائی آیا تو وہ قتل ہو گیا۔ اگر ہم دونوں جرائم کو ساتھ ملا کر سوچیں گے تو کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ صرف لڑکی کے اغوا کو سامنے رکھیں گے تو کوئی سراغ ہاتھ لگنے کا امکان ہو سکتا ہے۔“ نوتن نے انتہائی سنجیدگی سے اپنی رائے دی تو اس نے پوچھا۔

”تمہاری اس رائے نے میری وجہ یا بنیاد کیا ہے؟“
”کیونکہ اغوا ایک سنگین جرم تو ہے ہی، اس پر قتل ہو جانا سنگین تر ہو گیا۔ اب مجرموں کے لیے اغوا کا معاملہ

نوتن کور نے مایوسی سے کہا اور اٹھ کر دوسرے صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”کیا مشکل ہوئی؟“ جہاں نے پوچھا۔

”اب اس میں پارٹیاں آجائیں گی، جھوٹ اور سچ کی تیسر نہیں رہے گی، میں کہتی ہوں کہ یہ نہ ہو۔“ وہ پھر مایوسانہ لہجے میں بولی۔

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ جہاں نے کہا اور انوجیت کا فون ملانے لگا، کچھ ہی دیر بعد مل گیا تو اس نے اسٹیکر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں ہو؟“

”میں ادھر ہوں میلان پور میں، ادھر ایک جلسہ ہے اور پچھ لوگوں سے ملنا بھی ہے۔“ اس نے تفصیل بتادی۔

”مجھے یہ بتانا، ٹیوٹر میں چند رستگھ کون ہے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”جی، جو ہمارے مخالف انکیشن کرنے کی تیاری کر رہا ہے، وہ ہماری تیسری بڑی مخالف پارٹی ہے۔ اگر ہم نہ ہوں تو وہ انکیشن جیت سکتا ہے۔“

”کیسا بندہ ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”اچھا نہیں ہے، جردنم پیش ہے، لوگ اس کے شر سے اس کی عزت کرتے ہیں، کیوں کیا ہوا؟“ انوجیت نے پوچھا تو اس نے کہا۔

”مجھے شک ہے کہ، باغواہ ہونے والی لڑکی، اس کی کارستانی ہے۔“

”ممکن ہے، لیکن اسے ثابت کرنا اور ثابت ہو جانے پر لڑکی کا برآمد کرنا بہت ہی مشکل ہے، یوں کہہ لیں شیر کے منہ سے نوالا کھینچنا، کیونکہ وہ ایک کل بھی اس کے ساتھ نہ چکا ہے۔ اگر یہ سب ہو بھی جائے تو وہ کون سا اس نے کیا ہوگا۔ ایسے۔۔۔۔۔ اس نے مزید کہنا چاہا تو جہاں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”میں دیکھ لوں گا تم اپنا کام جاری رکھو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر ہر پریت کی طرف دیکھ کر بولا۔

”جونی سے جو، چائے پی پلا دست۔“

اس کے ساتھ چل دیا۔

انہیں وہاں کھڑے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گرلین کور کا فون آگیا۔ اس نے بات کی تو اس نے فون جہاں کی جانب بڑھا دیا۔ جہاں نے فون پکڑا اور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں گرلین کور۔ کیا بنا پھر؟“

”جہاں ویرے ایک ہی نمبر ہے، وہ بھی ٹیوٹر سے ہے۔ ان پر باتیں ہوئی ہیں۔ اس بار سے میں جتنی بھی تفصیلات سمجھنے لگی ہے، وہ میں نے میل کر دی ہے۔ وہ دیکھ لیں، اگر وہ آپ کے کام کی ہوئی تو۔“ وہ چمکی۔

”ہم دیکھ لیتے ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ جہاں نے کہا اور چند اور اسی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ بات کرنے کے بعد وہ کھیتوں میں نہ بھر سکتا فوراً ہی واپس گھر پہنچ آئے۔ اس نے راستے ہی میں ہر پریت سے کہہ دیا تھا کہ لیپ ٹاپ کھول لے۔ اس منٹ میں جب وہ ڈرائنگ روم میں آئے تو وہ لیپ ٹاپ کھولے بیٹھی تھی۔ جہاں نے اپنا ہی میل جس کھول اور گرلین کی میل دیکھی۔ اس میں: بے گئے نمبر کے آگے بکھرے رنگ لکھا ہوا تھا۔ کس وقت مٹی دیر کی کال ہوئی، یہ بھی درست تھا۔

”وہ لڑکی کتنے بچے لخواہ ہوئی تھی؟“ نوتن نے پوچھا تو ہر پریت تیزی سے بولی۔

”بہن کوئی رات کے دو بجے ہوں گے ایسی وقت بتایا تھا انہوں نے۔“

”اور یہ یہ جہاں؟“ نوتن نے ایک وقت کے دوران پرانی رشتے ہوئے کہا۔ یہ ایک گھنٹے بعد کال ہوئی ہے اور پھر مسلسل صبح تک وقفے وقفے سے کال ہوئی رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ چند رستگھ کون ہے؟ یہ ساتھ میں اس کا یہ بھی ہے۔“

”نام تو سنا سنا سا لگ رہا ہے۔“ ہر پریت نے کہا پھر ایک دم چونک کر بولی۔

”ارے یہ وہی تو نہیں ہماری مخالف پارٹی کا سیاست دان۔ میرا خیال ہے یہ انکیشن بھی لڑ رہا ہے؟“

”اگر وہی ہے تو، بہت مشکل درپیش ہو سکتی ہے۔“

”میں کہتی ہوں۔“ ہر پریت نے کہا اور اٹھ گئی۔

وہ چند قدم دور گئی ہوگی کہ نوتن نے جہاں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا ہر پریت کو رو اپنے نئے گروپ کے بارے میں نہیں پتہ یا.....؟“

”نہیں اور اس کے بارے میں ابھی اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، راز جس قدر اپنے درمیان میں رہے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اسی لیے محتاط تھا۔“ جہاں نے اسے سمجھایا۔

”نو پھر تمہیں کسی طور بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں، میں دیکھ لیتی ہوں سب، شام تک اس بارے پتہ چل جائے گا کہ وہ لڑکی اس گنبد کے پاس ہے کہ نہیں۔“ نوتن نے حوصلہ افزاء لہجے میں کہا۔

”کیا کروگی، انہیں بتاؤ گی۔ کیا وہ سب اتنی جلدی آ جائیں گے؟“ جہاں نے پوچھا۔

”اوئے میں نے اسی وقت ان سب کو بتا دیا تھا، جب یہاں میں نے یہ بات سنی تھی۔ دراصل رات میری بلدیو سنگھ سے بات ہوئی تھی۔ بچن کو تو بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔“

”بچن کو، وہ کیوں..... مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو ان کے پاس جا کر پتہ چلے گا۔“ یہ کہہ کر وہ لڑکی بھر کو رکی، پھر کہتی چلی گئی، ”میں نے انو جیت کے ایکشن

کے بارے میں بلدیو سنگھ بتایا تو وہ بہت زیادہ ہرجوش ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا ہے، ہمارا کوئی بندہ تو ہوگا

پارلیمنٹ میں۔ وہ یہی پلان کر رہا تھا کہ اسے ہوتا مانا جیسے ہے۔ اسی لیے وہ آج دوپہر ہر پہلے ہی نمودر میں آ گئے

ہوئے ہیں۔ ابھی میں انہی کے پاس چلی جاؤں گی۔ میرے خیال میں اب تک وہ کوئی نہ کوئی کام تو کر رہی تھیں

ہوں گے۔“ نوتن نے بتایا تو جہاں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کیا کریں گے یہاں؟“

”مجھے یہاں بھارت میں ایکشن اور سیاست دانوں کا

نہیں پتہ۔ یہاں جمہوریت کم اور ڈرامے بازی زیادہ

ہے۔ ساری پارلیمنٹ کو دیکھ لو، اس میں کتنے لوگ ہیں جو صاف ستھرے ہوں گے، ان میں زیادہ تر لوگ اپنے

اپنے علاقے کے غنڈے اور بد معاش ہیں۔ جرائم پیشہ ہیں، اپنے گالے دھندوں کو تحفظ دینے یہاں بیٹھے ہوئے

ہیں۔ ان کے لیے الیکشن جیتنا اور ہر حال میں جیتنا زندگی اور موت سے بڑھ کر کھیل ہوتا ہے۔ جس طرح انو جیت

نے بتایا ہے کہ گنبد رکون ہے؟ اس سے لگتا نہیں کہ وہ کیسا بندہ ہوگا۔ اور تمہارا دوسرا مخالف بندہ، ان سیاست دانوں

میں کتنے ایسے ہیں، جو صاف ستھرے ہیں۔ سو یہاں الیکشن جیتنا تو ووٹوں سے جاتا ہے لیکن وہ ووٹ حاصل

کیسے کیسے جاتے ہیں، یہ ایک آرٹ ہے، ہنر ہے میری جان، جسے ابھی تم نہیں سمجھ سکتے۔“ اس نے ہنستے ہوئے

کہا۔ آخری لفظ ہر پریت نے سن لیے تھے۔ اس لیے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے نوتن، یہاں الیکشن جیتنا ایک آرٹ ہی ہے۔ بہت ظلم ہوتا ہے لوگوں کے ساتھ۔ ان

کی امیدوں کے ساتھ کھیلتے ہیں یہ لوگ۔“

”اچھا چلو یہ ختم کرو، اب یہ سوچو، کیا کرتا ہے۔ نوتن تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ جہاں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”میں تو ابھی وائس چانسلر جاؤں گی وہاں پانچ کام ہیں اکل، اگر وقت ملا تو آؤں گی، آخر ہم بھی تو ملازم ہیں

رتن دیپ سنگھ جی کے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”یار نوتن، ابھی تو اتنا کام نہیں، لیکن الیکشن کے دنوں میں تو کام بہت بڑھ جائے گا۔ تم وہ چند دن ہمارے

ساتھ آ جاؤ۔“ ہر پریت نے اس سے کہا۔

”میں رتن دیپ سنگھ سے اجازت لے کر آ جاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ.....“ اس نے کہنا چاہا تو ہر پریت تیزی سے بولی۔

”تم نوکری چھوڑ دینا، انو جیت اگر ممبر بن گیا تو بہت کام ہوگا، وہ تمہیں سنبھال لینا۔“

”دیکھیں گے۔ فی الحال تو میں چائے پی کر نکل رہی

واپس لے آئے۔ وہ چھت پر کھڑا ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا کہ بلند یوسنگھ کا فون آگیا۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جیپال، ابھی نوتن کور نے مجھے بتایا ہے۔ تم جاؤ، لوگوں میں گھلوملو، دس بجے تک تم نے وہیں رہنا ہے، باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے سمجھا گئی ہے میں نے کیا کرنا ہے۔“

”کوئی کسی قسم کی مدد؟“ جیپال نے پوچھا۔

”ہوگی تو بتا دوں گا۔ یہ کنفرم ہو گیا ہے کہ وہ لڑکی انہی کے پاس ہے۔ اسے وہیں نہیں رکھا ہوا ہے۔ مل جائے گی۔ میں پھر فون کرتا ہوں۔“ بلند یوسنگھ نے کہا تو وہ بہت حد تک پرسکون ہو گیا۔ وہ تیزی سے نیچے آیا۔ ہر پریت ابھی نکلی نہیں تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ اب وہ مختلف لوگوں کے گھروں میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے ہر پریت کو سمجھا دی۔ لیکن اس معاملے کی ہوا بھی نہیں گلنے دی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس وقت کی آوارہ گردی کیوں ضروری ہے؟

وہ دونوں ہی مختلف گھروں میں جاتے رہے۔ ان کے پاس انوجیت کے لیے دوٹ مائٹلے کا ہانک معقول بہانہ تھا۔ ہر جگہ سے یہی کہا گیا کہ وہ لوگ دوٹ انہی کو دیں گے۔ جیپال اور ہر پریت دونوں ہی سمجھ رہے تھے کہ ورنر بڑا سیانا ہو گیا ہے۔ کوئی ایک فیصد لوگ ہی انکار کرتے ہیں اور وہ لوگ نظر پانی قسم کے ہوتے ہیں جو بہت کم قسم کے ہوں۔ ورنر کوئی بھی نہیں کہتا۔ جیپال نے وقت گزارا تھا۔ وہ گزار لیا۔ دس بج گئے تھے۔ اسے بلند یوسنگھ کے فون کا انتظار تھا۔

اس وقت وہ ایک گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، جب بلند یوسنگھ کا فون آگیا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس دوران وہ اس سے خاموشی باتیں کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کیلا ہوا تو بولا۔

”کب جاؤ، کیا بنا؟“

”تم نے کبھی کہانی سنی ہے کہ کسی جن کی کسی طوطے میں جان ہوتی ہے۔“

”ہاں سنی ہے؟“ اس نے سمجھتے ہوئے جواب دیا

ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ غصہ دئی۔

جائے بیٹے کے بعد نوتن کور اپنی کار میں نکل گئی اور ہر پریت چکن کی جانب بڑھ گئی۔ ایسے میں جیپال نے صوفے پر بیٹھ کر بلند یوسنگھ کو فون ملایا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

”نوتن نے مجھے ساری بات بتا دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام اسی جگہ رستگھ ہی کا ہے۔ اسی کی ایک کڑی کھنٹی ہے۔“

”وہ کیا؟“ جیپال نے تیزی سے پوچھا۔

”میرے ایک بندے نے بتایا ہے کہ وہ لڑکا جس کے ساتھ لڑکی کی بات طے ہو رہی تھی، وہ جگہ رستگھ کے ہاں کام کر رہا ہے۔ اس کا ذاتی ملازم ہے۔“ بلند یوسنگھ نے پر سکون لہجے میں کہا۔

”کہیں یہ کام۔“ جیپال نے یہ کہنا چاہا تھا کہ بلند یوسنگھ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”وجہ کچھ بھی رہی ہو، یہ ایک کڑی ہنسی سے ارہتہ ہے، ممکن ہے، اسی لڑکے نے جگہ رستگھ سے کہہ کر پوچھ لیا۔“

فیسر سے سفارش کروائی ہو لیکن ایک بات طے ہے، اتنی رات کو، اتنی جلدی یہ ہوتا نہیں۔ خیر، تم چہ کراؤ کہ لڑکے اور لڑکی والوں کے درمیان کوئی اختلافی بات تو نہیں چل رہی تھی۔“

”تھا یہی جہیز کم زیادہ کا چکر تھا۔ تم ایسے کرو، سیدھا اسی لڑکے کو۔۔۔۔۔ جیپال نے غصے میں کہا۔

”نہیں پھر بھی تم چہ کرو، کوئی بڑا معاملہ تو نہیں چل رہا تھا۔“ بلند یوسنگھ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”او کے۔“ جیپال نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہ ہر پریت کے ذمے لگائے گا۔ وہ اسی کسی بات کا پتہ لگائے گی اگر کوئی ہوئی تو۔ اس نے چکن میں جا کر ہر پریت کو سمجھایا اور اوپر چھت پر جا پہنچا۔

اس نے وہاں جاتے ہی خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ وہ بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ یہ کیا ہو سکتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خود نمودر جائے اور صبح ہونے سے پہلے لڑکی کو

کلمہ میٹھے ثروتکے

”اگر آپ کا وزن زیادہ ہے اور لوگ آپ پر ہنستے ہیں نیز آپ پتلا ہونا چاہتی ہیں تو نیوز چینل ہاقاعدگی سے دیکھیں امید سے وزن کم ہوگا۔“
”اگر آپ کو خوش گوار خواب نظر نہیں آتے اور ڈرلگتا ہے تو سونے سے پہلے آمینہ ضرور دیکھیں، کبھی ڈر نہیں لگے گا۔“

امجد علی..... میں پور خاص

”کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟ کوئی تفتیش میں پیش رفت، کوئی شک میں پڑا؟“

”او کہاں کی تفتیش جی، آج کل تو آپ سیاست دانوں کے معاملات ہی نہیں سانس لینے دیتے، کبھی کسی کی سیکورٹی، کبھی کسی وئی آئی بی کا استقبال، پرنٹو کول، یہ انکیشن بھی تو بھگتا ہے ہیں۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا

”اور اگر وہ لڑکی قتل ہوگئی تو کیا ہوگا؟ وہ کس کے ذمے ہوگی؟“ ہسپال نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

”یہ تو جی، قتل کرنے والے جانیں، یا پھر آپ مجھے کے کسی بڑے سے کہیں، اب مجھے جو حکم ملتا ہے، میں تو وہی کروں گا۔“ اس نے پھر اسی انداز میں کہا۔

”یہ حکم آتے کہاں سے ہیں، جن کی وجہ سے بے چارے عوام کو انصاف نہیں ملتا؟“ وہ طنز یہ لہجہ میں پوچھا۔

”میں نے بحث نہیں کرنی، مجھ سے تو جو ہو سکتا ہے کر رہا ہوں، دن رات عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن ان لوگوں کا قصور، انہیں کچھ نہ کچھ تو.....“ ہسپال نے کہنا چاہا مگر وہ تیزی سے بات کاٹا ہوا بولا۔

”ابو جی، اب میں کیا کروں، اندھی تفتیش ہے، کوئی سرا پتہ وہ ہیں تو میں اسے ابھی اٹھوا لیتا ہوں۔ پھر بعد میں

”تو بس پھر، وہ ضوطا ہمارے پاس ہے۔ صبح تک سارے معاملات حل ہو جائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”او کے، پھر صبح ہی دیکھیں گے۔“ ہسپال نے جواب دیا تو بلند یونٹنگھ نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہر پریت کے ساتھ واپس گھر آ گیا۔

انہیں گھر آئے کچھ ہی وقت گزرا ہوگا۔ کہ اوگی پنڈ سے کچھ لوگ ان کے پاس آ گئے۔ وہ لوگ ان کے ساتھ تھے، جن کی لڑکی اغوا ہوئی تھی اور ان کا بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ وہ ابھی باہر لان میں بٹھا دیئے گئے۔ وہ ابھی بیٹھ ہی رہے تھے کہ ہسپال کے ساتھ ہر پریت بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ ابھی ان میں سے ایک بزرگ نے بات کی۔

”ہسپال چتر! ہم سب حیرے پاس آئے ہیں تاکہ تو ہماری مدد کرے۔ ہماری تو کوئی بھی بات نہیں سنتا۔“

”بزرگو بتائیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑے سکون اور خیر سے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”ہمیں اب تک یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ وہ لوگ کون تھے۔ کس نے کیا ہے سب۔ لیکن یہ کیسا ظلم ہے کہ تمہانیدار بھی ہماری کوئی بات نہیں سنتا ہے۔ اس نے ایک درخواست لکھ لی ہے اور ایف آئی آر کاٹ کر ہمارے ہاتھ میں تمہادی ہے۔ وہ دن ہو گئے، وہ ہمیں ملتا ہی نہیں ہے، چند بار فون کیا ہے، اب تو وہ گالیاں دیتے لگا ہے کہ فون کیوں کرتے ہو۔ کہاں جائیں، کس کے پاس فریاد کریں۔“ لڑکی کا باپ یہ کہتے ہوئے رو دیا

”چلیں بات کرتے ہیں اس سے،“ ہسپال نے کہا۔ ”رب تمہارا بھلا کرے، اگر تمہاری وجہ سے ہمیں اپنی جی ملی جائے۔“ لڑکی کا باپ بولا۔

”اس کا فون نمبر دو، میں ابھی بات کرتا ہوں اس سے۔“ ہسپال نے کہا تو ایک نوجوان نے تمہانیدار کا نمبر دے دیا۔ ہسپال نے کال ملائی تو کچھ دیر بعد اس نے فون ریسیو کر لیا۔ ہسپال نے اپنا تعارف کر لیا تو وہ بولا۔

”جی، حکم،“ اس کے لہجہ میں طنز آ گیا تھا۔ ”وولڑکی، جو اغوا ہوئی اور اس کے بھائی کے قاتل

آپ لوگوں نے ہی ان کی سفارش کرنی ہے کہ یہ بے گناہ ہیں، انہیں چھوڑ دیں۔“

”چلو بھیک ہے، ہم بھی کوشش کرتے ہیں، آپ بھی کرو، جیسے ہی کوئی سراپت ملا، بتاتے ہیں۔“ جہاں نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

کبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے فون جیب میں رکھا اور تھانیدار سے ہونے والی بات انہیں بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ ساری بات سن کے وہی بزرگ بولا۔

”سر دار جی، یہ تو اس کی کچھ بھی نہ کرنے والی باتیں ہیں نا۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اب یہ تو بات کئی ہوئی ہے کہ اس وارہات میں کوئی ایسا بندہ ملوث ہے، جو اس تھانیدار پر بھی اپنا حکم چلا سکتا ہے۔“ اس بزرگ نے کہا۔ تو جہاں نے اس لڑکی کے باپ سے پوچھا۔

”وہ جو لڑکا ہے، جس سے لڑکی کی بات چل رہی تھی، ان سے کوئی اختلاف ہوا یا کوئی بات؟“

”ہماری تو ان سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، یہی چیز کی بات تھی، اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بس طے ہو رہی تھی بات۔“ باپ نے جیسی ہی آواز میں جواب دیا۔

وہ لوگ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ کھور شہر میں جا کر بڑے آفیسر سے ملا جائے۔ کل صبح جانے کا فیصلہ ہوا۔ جہاں نے ان کے ساتھ جانے کی ہائی بھرتی اور انہیں یہ حوصلہ دیا کہ اب یہ ان کا مسئلہ نہیں اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہ لڑکی باز یا یہ روائے میں پوری طرح ساتھ دے گا اور جو انہوں نے نقل کیا ہے، اس کا حساب بھی لیں گے۔ وہ کافی حد تک مطمئن ہو کر چلے گئے۔ انہیں گئے ہوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ فون کور کا فون آگیا۔ وہ اسی فون سے کال کر رہی تھی، جو نو لیس نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا۔

”لڑکی اسی جگہ رینگھ کی شہ پر اغوا ہوئی ہے، یہ معلوم ہو گیا ہے۔ اس کے قریبی دو بندے پکڑ لیے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی اٹھالی ہے۔“

”کیا، اس کی بیٹی۔ مطلب.....؟“ جہاں نے حیرت سے کہا تو فون کور بولی۔

”بلد یو سنگھ اس معاملے میں بڑا سخت ہے۔ وہ لڑکی بھی تو کسی کی بیٹی ہے، کیا کسی امیر اور طاقت ور کی بیٹی میں سرخاب کے پڑ گئے ہیں کہ وہ اغوا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بلد یو سنگھ نے تو اس لڑکی کو بتا دیا کہ تمہارے باپ کے گناہ کے بدلے اسے اغوا کیا گیا ہے۔“

”تو کیا بنا، جگہ رکوپتہ چلا؟“ اس نے پوچھا۔

”بتا دیا اُسے اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑکی واپس گاؤں نہ پہنچی تو وہ اس لڑکی کو کہیں دور لے جائیں گے۔“ فون نے بتایا

”اغوا کرنے کی وجہ کیا تھی؟“

”وہی لڑکا، جن سے لڑکی والوں کی بات چل رہی تھی۔ اسے پکڑ لیا ہے، اسی نے بتایا۔ اب اصل بات کیا ہے، یہ بھی پوری طرح پتہ نہیں چلی۔ تفصیل معلوم ہو جائے گی۔“ فون کور نے بتایا تو جہاں اندر سے حائل اٹھا۔

”یہ نہیں آتا ہوں وہاں، دیکھی جائے گی، اسے تو میں سبق.....“

”سارا حیل ملز جائے گا۔ صبح تک انتظار کرو، پھر تم ہی اس سے سیدھے ہو جاؤ۔ یہ لوگ درمیان سے نکل جائیں گے۔“ فون نے کہا۔

”چلو دیکھتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آئے گی، جہاں نے کہا۔“

”تم آرام کرو، یہ دیکھ لیں گے سب۔“ فون کور نے اعتماد سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

جہاں کا دور ان خون تیز ہو گیا تھا۔

جہاں.....

باہر کے لوگ تھے۔" اشفاق چوہدری نے تفصیل سے بتایا
"اس کے بعد انہوں نے چھ کیا، کوئی مشکوک..."
میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"نہیں، انہوں نے کچھ نہیں کیا، ان کا ایک اپنا معمول
ہے اور وہ اس طرح اپنے دن گزار رہے ہیں۔ مالی جب
تھی، وہ سیکورٹی کی لگا میں کھینچے رکھتی تھی، علاقے میں کوئی
پرندہ بھی سر مارا تھا تو اس کے بارے میں بھی پوچھنا چھ
گرتی تھی۔ وہ بائبر رہتی تھی۔ مجھے علاقے میں پھرنا پڑتا
ہے۔ اس طرف زیادہ دھیان نہیں رکھ پاتا۔"

"تو چاہتے کیا ہو۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا؟" میں
نے اس کی بات سنن چاہی۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ خطرناک لوگ ہیں، دشمن پھر
دشمن ہوتا ہے، اس کا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں چلتا
کرو یا ان کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہے وہ کرو کیونکہ
دو دن سے ان کے پاس ایک شخص آیا ہوا ہے۔ پوچھنے
پر پتہ چلا ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ دو کب آیا، کہاں سے
آیا، اس بارے میں وہ مطمئن نہیں کر۔ گا۔ میں نے جب
اسے اسے دیکھا ہے، وہ میرے دماغ کو کھٹک رہا ہے۔"
اس نے اپنے خیال واضح کر دیا۔

"تو ابھی چلو، ان کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے
اچھے ہونے کہا۔ مجھے یہی خیال آیا تھا کہ اس کا ایک ہی
بیٹا اس سے دور تھا جو دشمن میں رہتا تھا۔ اُسوی سے تو اسے
میں میں تلاش نہیں کرتا، وہ دشمن آگیا ہے۔ میں اسے
فوری طور پر مانا جاتا تھا۔ ابھی میں نے پٹان کیا تھا کہ
اسے یہی میں تلاش کیا جائے۔ اب وہ ویسے ہی یہیں آ
گیا تھا۔

"چلو۔" اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا
اور اٹھ گیا۔

"ہائیا! اگر تم چاہو تو آرام کرو۔" میں نے کہا تو وہ بنا
کوئی بات کیے اٹھ کر باہر چل دی۔ اسے میرا ہونا کہنا اچھا
نہیں لگا تھا۔ وہ پورچ میں کھڑی کار کی کچلی نشست پر جا
بیٹھی تھی۔ اسے مزید کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ سو میں

اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں اور یہ دعویٰ کسی حد تک
تسلیم بھی کیا جاسکتا تھا کہ اس نے دو بار مجھ پر حملہ کیا اور
دونوں بار شخص خوش قسمتی کے ساتھ رب کی رضا کے باعث
بچ گیا تھا۔ پہلی بار ریسٹوران میں اس نے حملہ کر دیا،
اسے کیسے پتہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہاں مجھے ایک شک
تھا کہ جو لوگ حملہ کرنے والے تھے، انہیں میرے بارے
میں معلوم نہیں تھا۔ مطلب انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوا
تھا۔ پس لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی ٹریک پر چلتے ہوئے
سیدھے ہمارے سر پر آن پہنچے۔

دوسری بار بھی ایسا ہوا تھا۔ میں نے گاؤں میں جو گھر
لیا تھا، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کے
لیے میں بہت راہ داری بدلتی تھی، لیکن اس نے وہاں بھی
حملہ کر دیا۔

یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جب وہاں کوئی بھی نہیں تھا،
کہا اس نے اسی تاکہ میں وہاں حملہ کیا کہ وہاں کوئی نہیں تھا
بصرف ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے، یا پھر ایسے پتہ کی
نہیں چلا کہ وہاں پر کوئی نہیں ہے، اور سب خوش قسمتی سے
بچ گئے؟ ہاں میرے لیے ایک معذرتہ جاتا تھا۔ ایسا
کیوں تھا؟ وہ خود مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا یہ قسمت
مجھ پر بہرہ بان تھی؟ میں یہی فیصلہ نہیں کر پاتا تھا۔

یہ ساری باتیں ہمارے درمیان زیر بحث آچکی تھیں،
لیکن کوئی سراپتہ ہمیں مجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اشفاق
چوہدری نے کہا۔

"یہ سمجھنے سمجھنے کی باتیں تو چلتی رہیں گی، ان
دونوں کا کیا کرنا ہے، میری بہت زیادہ توجہ ان کی طرف
رہتی ہے۔"

"کیا تم نے ان کی کوئی ایسی سرگرمی دیکھی ہے یا
معمول سے بہت کچھ ہوا ہے، جس کی وجہ سے تمہیں کوئی
شک محسوس ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان دونوں کو ہاتھ انہیوں کے ساتھ ملے ہوئے
دیکھا گیا ہے۔ وہ ویسے لوگ تھے، جو نہ تو اس علاقے کے
ہیں اور نہ ہی دوبارہ دیکھے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے وہ

خاموشی سے پنجرہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اشفاق چوہدری نے اس پر غصہ کیا اور چل دیا۔

ہم مسافر شاہ کے ٹھہرے کے پاس پہنچے تو اس کے ساتھ بنے ہوئے کمروں میں گھب اندھیرا تھا۔ کسی کمرے میں کوئی ذرا سی روشنی نہیں تھی۔ ملاؤں کی اس رات میں بس تارے چمک رہے تھے۔ ٹھہرے کے ارد گرد صرف وہی منظر دکھائی دے رہا تھا، جہاں ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ ان کمروں کے پاس کار جا رکی۔ کاررکتے ہی ایک نوجوان جوگی کمرے سے باہر آیا۔ اسے شاید ہم دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس لیے پورنی طرح سامنے آ گیا۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا اور لوہی آواز میں کہا۔

”رام لعل کو بلاؤ۔“

وہ میری آواز سن کر چونکا اور پھر مجھے پہچان کر ٹھٹھک گیا۔ پھر فوراً اندر کمرے کی طرف چلا گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا، جوگی رام لعل باہر آ گیا اور سیدھا میری جانب بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب آتا، میرے اور جوگی رال لعل کے درمیان بانٹیا کور آگئی۔

”ہو گیا۔“ بانٹیا کور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دور رکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو وہ رک گیا۔ اس نے اپنی چند حیاتی آنکھوں سے ہماری جانب دیکھا اور بولا۔

”مہاراج۔ اس سے کہیں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟“

”اوپس رام لعل، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

”آئیں آ جائیں اندر۔“ وہ اندر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو بانٹیا کور اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اشفاق چوہدری اس کے پیچھے بڑھا، پھر رام لعل اور میں اندر کمرے میں چلے گئے۔

اندر فرش پر دو پیچھی ہوئی تھیں۔ اس کے اوپر دیواروں کے ساتھ تین بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ

لگے بستر پر ایک سنجیدہ سا جوان بیٹھا ہوا تھا۔ جو مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ باقی دو بستر خالی تھے۔ میں ایک بستر پر بیٹھ گیا تو وہ جوان میری جانب بڑھ آیا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔

”یہ میرا بیٹا ہے، جی سندر لعل۔ تمہاری بیٹی کا بھتیجا ہے، مجھے ملنے کے لیے آیا ہوا ہے۔“

”یہی ہے وہ، جو زہر کے بارے میں اتھارنی رکھتا ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ داسا مسکرا دیا۔

”جی، یہی ہے۔“ رام لعل نے کہا۔

”یہاں کسے آیا، قانونی طریقے سے یا غیر قانونی؟“

”قانونی لوگوں نے غیر قانونی طور پر بھیجا ہے۔“ رام لعل کی بجائے وہ بولا۔

”کیسے؟“ میں نے سکون سے پوچھا۔

”انہی لوگوں نے، جنہوں نے میرے باپ کو یہاں بھیجا ہوا ہے۔“

”تمہیں ہی کیوں بھیجا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کچھ عرصہ سے یہاں کے بارے میں انہیں کوئی معلومات نہیں ملی۔ وہ مجھ تک پہنچے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں یہاں آؤں اور پتہ کمروں کہ بات کیا ہے۔ کیونکہ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ باپ زہرہ ہیں اور آزاد زندگی گزار رہے ہیں لیکن وجہ نہیں کہ وہ جو معلومات درکار تھیں وہ نہیں مل رہی ہیں۔“ سندر لعل نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”اب تم رام لعل کو پسے آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو باپ کی مرضی ہے، یہ کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے جوگی کی طرف دیکھ کر کہا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں بولو رام لعل، کیا چاہتے ہو؟“

”میں سچی اور دل کی بات بتاؤں تو وہ یہ ہے کہ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں، اسی جگہ، میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔ نہ واپس اپنے گاؤں مناسکر اور نہ کہیں دوسری جگہ۔ میرا پرچار جاتا ہے تو جائے۔ میں آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی پورے دل سے۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی لجالت سے کہا۔

”جن لوگوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے، کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ تم یہاں پکڑے جاسکتے ہو؟“

”مجھے یہ کہانی سنانے کو کہی گئی ہے کہ میں اندرون سندھ سے یہاں آیا ہوں۔ وہی جو کہانی باپو سناتے ہیں۔ یہ تو باپو جی نے مجھے یہاں کے بارے میں بتا دیا ورنہ تو میں یہی کہانی سنانے والا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آپ سے بات کروں کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔“

”ظاہر ہے اب اگر تم رام لعل کو نہ لے کر گئے تو تم بھی ممبئی میں جیلوں سے نہیں رہ پاؤ گے۔ ٹھیک ہے لے جاؤ اپنے باپ کو اور اس ملنگ کو بھی اور انہیں یہ باور کرا دینا کہ اب کوئی بندہ ادھر کا رخ نہ کرے۔“ میں نے ایک دم سے فیصلہ سنایا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔

”بہت دھننے واہ مہاراج۔“ سندھ لعل نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو رام لعل کا چہرہ مرجھا گیا تب میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کوئی بات نہیں، میں تمہیں مناسک سے واپس منگوا لوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔“

”جی مہاراج۔“ وہ ایک دم سے کھل گیا۔

”اچھی جاؤ گے یا۔۔۔“ میں نے جان بوجھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”جی امی، آج رات ہی، یہاں بھی بندے ہیں، جن کی نگاہ مجھ پر ہے، آپ یہاں ہوئے اور۔۔۔۔۔“ اس نے بھی اپنی بات روک کر کہا تو میں ساری بات سمجھ گیا۔

”اس کا مطلب ہے یہاں پر کام ہو رہا ہے؟“ میں نے پتی سے کہا۔

”جاتے سے سب کے بارے میں بتا جاؤں گا اور ایک تھکد بھی دے جاؤں گا۔“ وہ خوشی سے بولا۔

”تھکد وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بنیادی طور پر ایک کیسٹ ہوں، میں نے زہر پر بہت حجر بات کیے ہیں۔ جس طرح قدرتی شہد کے اپنے اثرات ہوتے ہیں اور ان جیسے اثرات انسانی کوشش پیدا نہیں کر سکتی، اسی طرح سانپ کے منہ میں بنا ہوا زہر

”اور وہ ملنگ، کیا بتا اس کا منہ چھوڑا کہ نہیں اس نے؟“ میں نے جان بوجھ اس کے بارے میں پوچھا۔

”بس ایک بختہ لگا اسے خود پر قابو پانے میں۔ اب ٹھیک ہے، روزانہ صبح تھڑے پر چھباز لگا تا ہے۔ اور اسی طرح شام کو بھی وہ اپنی ڈیوٹی دیتا ہے جو آپ اس کے ذمے لگا گئے ہیں۔“ وہ اسی لہجے میں بولا، ہاتھ اس کے جڑے ہوئے۔

”وہ کھو بھئی رام لعل، مجھے یا میرے کسی بندے کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور اس دوران میرا سلوک بھی تم نے دیکھ لیا، تمہیں شک نہیں کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تم یہاں رہنا چاہتے ہو، اب پتہ نہیں تم رہ پاتے ہو یا نہیں۔ یہ الگ بحث ہے، لیکن اگر تم واپس جاتے ہو تو وہ لوگ ساری زندگی تمہیں مشکوک سمجھتے رہیں گے۔ وہ تم پر یقین نہیں کریں گے، کیا کہتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ہے، وہ مجھے مشکوک ہی سمجھیں گے۔“ جوگی نے جواب دیا تو سندھ لعل نے تیزی سے بولا۔

”نہیں باپو جی، میں ان سے بات کر کے آیا ہوں، وہ بھی جانتے ہیں کہ آپ مجبوری میں نہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تو کوئی بھی کہانی انہیں سنائی جاسکتی ہے۔ میں تب سے سبکی پوچھ رہا ہوں، اور ابھی یہ مہاراج آج بھی گئے ہیں، ان کے سامنے بھی پوچھتا ہوں کہ یہاں کیوں رہنا چاہتے ہیں؟“

”دیکھ بیٹا۔ میں ساری زندگی اس دشت کی سیاحی میں رہا ہوں، صحرا کی خاک چھائی ہے، ہر طرح کے بندے سے ملا ہوں، لیکن جو شائق یہاں ہے، مجھے نہیں سے نہیں ملی۔ یہاں نہیں زیادہ گیان ہے، جو میں نے نہیں دیکھا، پر نہیں عمر مٹی ہے۔ تم آگے ہو، اپنے سارے پر پوار کو لے جاؤ۔ میں شائق سے یہاں مرنا چاہتا ہوں۔“

”اس بار تو چلو، پھر چاہے ادھر آ جانا۔ میں نے وہاں وعدہ کیا ہے۔“ اس کے بیٹے نے کہا تب میں نے پوچھا۔

بھی اپنی خاموشیت رکھتا ہے۔ اس طرح کے خواص کیسٹیکل سے نہیں بنائے جاسکتے۔ اگر کسی شے میں مہلک اثرات ہیں تو اسی میں زندگی بخش اثرات بھی ہیں۔ ضرورت صرف تلاش کرنے کی ہے۔ سانپ کے زہر کے انسانی بدن پر جو اثرات ہو سکتے ہیں، میں نے ان پر بہت کام کیا ہے۔ اب تک میرے دو تجربے بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اس نے بتایا

”کون سے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
”میں نے ایک دو ایسی تیار کی ہے، جو کسی انسان کو ایک خاص مقدار میں دی جائے تو اس کی سوچوں پر تو بڑا پایا جاسکتا ہے۔ کسی دور میں فحشیت سے کام لیا جاتا تھا، وہ سب وقتی نشے ہیں لیکن یہ ایسا ہے کہ چند دن تک ایک خاص مقدار بدن میں اتار دی جائے تو انسان کی سوچوں کو تہہ پل کر دیا جائے۔ جب اس سے جو کیا ہے نتیجہ ملے سکتے ہیں اور یہ وقتی نہیں ہوتا۔ اس نے تفصیل سے کہا۔
”اس کے اثر کو ختم کرنے کے لیے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس کا توڑ ہے، لیکن میں یہی بتاتا ہوں کہ اس دوا کا اثر ختم نہیں ہو سکتا، یونکہ یہ انہی لوگوں کو دی جاتی ہے، جنہیں صرف مرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ دوا عام استعمال میں نہیں لائی جاتی اور ایک خاص اہمیت اختیار کرتی ہے۔ میں اگر توڑ دے دوں جب میری اہمیت تو ختم ہوئی تا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

مجھے وہ بہت ہی تیز اور سمجھدار لگا تھا۔ اپنا بچاؤ پسے سوچ کر کہنے والی اکثر کامیاب ٹھہرتا ہے۔
”اور دوسرا؟“ میں نے پوچھا۔

”دو دوا مہم سہ ہے، وہ میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ چونکہ بہت تیز خوشبو لگانے کے عادی ہیں، اس لیے میں وہ آپ کو بتا رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں چونکہ گیا، کیا است بھی یہ بہت بڑی لگ رہی ہے؟ لیکن میں خاموش رہا تا کہ اس کی بات سن سکوں، وہ کہہ رہا تھا، ہاتھ لگ نب میں فقط ایک قطرہ ڈال دیا جائے، اس میں

نہا نہیں، آپ کے بدن سے ایسی بھینی بھینی خوشبو پھوٹنے لگے گی کہ دوسری صنف مد ہوش ہو جائے گی۔ یہ چھوٹا سا چمکھار میں نے پیسے بنانے کے لیے کیا ہوا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا یہ چیزیں تم ساتھ میں اٹھائے پھر رہے ہو؟“
بانیٹا کور نے پہلی بار بات کی

”بھیس جو بدل کر آتا تھا یہاں اور بھی بہت کچھ ہے جوئی کی بوتلی میں۔“ یہ کہہ کر وہ ہٹکے سے منس واپس۔
”پہلی دلی کا تو تھیک ہے، دوسری دلی کا کوئی سائیڈ لپٹائیٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں، یہ میرے امیر ترین کلائنٹس کے لیے ہے لوگ ان سے پوچھتے ہیں یہ پر فہم دنیا کے کس مقام سے ملتا ہے، مگر وہ نہیں جانتے۔ اس نے یہ بات سنجیدگی سے کہی

”اس کا تجربہ کروانے کے لیے تمہیں ایک دن رکتا پڑے گا۔“ میں نے اسے کہا تو وہ بولا۔

”جیسے آپ کی مرضی، میں ایک ہفتہ بھی رک جاؤں گا۔“ اسے دوا کا تجربہ کر لیں۔“

”تھیک ہے، تم ابھی رہو یہاں پر، بلکہ پورا پر پورا رہو۔“ اس نے تجربات کریں گے اور دوسری اگر کوئی چیز ہوئی تو اس پر بھی بات ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”اور اگر تمہاری باتیں غلط اور تمہارا سہہ دوسرے جھوٹے ہیں تو ابھی راتوں رات نکل جائے، یہ نہ ہو کہ تم میرا ارادہ بدل جائے۔“ بانیٹا کور نے کہا تو اس پر سندھ لگا کر کیسٹ نے صوم کراستہ دیکھا، پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے سر کو ہلانے لگا تھا۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اٹھ گیا۔ میں ہٹک کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ سامنے کھڑا تھا، مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے پوچھا۔

”اب کیسے؟“

”آپ نے ڈیوٹی لگا دی، جو مزہ اس ڈیوٹی میں ہے شاید ہی کسی اور شے میں ہو۔“ وہ تشکر بھرے لہجے

میں بولا۔

”کہاں ہے وہ؟“

”میں نے لان میں بٹھایا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
”اچھا، میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ پلٹ گیا۔
میں تھوڑی دیر کا ریڈور میں ٹہلتا رہا پھر نیچے چلا گیا۔ وہ لان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیسے آئے صبح صبح، خیریت؟“ میں نے پوچھا۔
”جی رات وہ آپ کی سیکورٹی گارڈ نے جو بات کہی وہ مجھے بہت کھلی ہے۔ میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ خود اپنے سامنے تجربہ کروا سکوں۔ اگر کچھ ہو تو مجھے وہ خورا شوق کر دے۔“ اس کے لہجے میں دکھ سے زیادہ انکابول رہی تھی۔

”وہ میری دوست ہے یا۔ تم اس کی بات کا برا نہ منو۔ اس نے جو کہا۔“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے

”آپ نے جو میرے باپ پر دنیا کی ہے، میں اس کا احسان بھی نہیں دے سکتا۔ آپ چاہتے تو انہیں قتل کر سکتے تھے، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا، وہ آپ کے دشمن تھے۔ میں یہ ثابت کر کے جانا چاہتا ہوں کہ میں دشمنی نہیں کر رہا، میں یہاں سے جاؤں گا تو آپ کا احسان مند ہو کر۔ اور جب یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ میرے احسان مند ہوں گے۔ میں اُسکندہ بھی دوست ہی ثابت ہوں گا۔ آپ نہ بھائیں اس سے، میں ہوں ادھر۔“ اس نے ضدی سے بچے میں کہا تو میں اس کی ذہنی حالت کو سمجھنے لگا تھا۔ وہ وہاں کا مانا ہوا کیسٹ اپنے باپ کو بچانے اور رفا کے کہنے پر یہاں آیا تھا۔ اپنی انا پر ہلکی سی قرب بھی برداشت نہیں کر پایا تھا۔

”اچھا، ٹھیک ہے، آؤ اندر بیٹھتے ہیں اور چائے پیئیں۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ کر میرے ساتھ اندر آ گیا۔
ہانپتا کور مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس کے سامنے ایک قطرہ عیب میں ڈالا تو خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ وہ باہر انتظار کرنے لگا۔

”چلو باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ میں نے کہا اور کار میں جا بیٹھا۔ اسنے میں وہی سندر لعل تیزی سے میری طرف آیا۔ اس نے ایک کانڈ میری جانب بڑھا کر کہا۔

”یہ میں نے وہ دوسری دوا کا پورا فارمولا لکھ دیا ہے۔ یہ کسی بھی ماہر کیسٹ کو دیکھا دیں، وہ یہ دوا تیار کر دے گا۔ اس سے یہ بھی پوچھ لیں کہ انسانی بدن پر اس کے کیا اثرات ہوں گے اور یہ دوا اس کا تجربہ یہ کروالیں۔“

میں نے کانڈ کا وہ پرچہ اور دوا پکڑ لی۔ مجھے لگا کہ ہانپتا کور کی بات اسے کھا گئی تھی۔ یہ ایک فطری سی بات ہے، کسی کی ذات اور کام کو جب نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا رد عمل ضرور ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سندر لعل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ورنہ اس کی موت اس کے سامنے تھی۔ اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کو ختم کر کے ہمیں مار دینا چاہتا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔

حوالی واپس ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ راستے میں اشتقاق چوہدری یہی کہتا رہا کہ انہیں جس قدر جلدی ہو سکے یہاں سے روانہ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ ہم بھی اس کی وجہ سے لیپسٹ میں آ سکتے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں صبح فیصلہ کرنے کا کہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ میں بیڈ پر آن لینا۔ ابھی مجھے خیال آیا، میں نے اپنے دوست کو فون کیا اور حالات پوچھے۔ اس نے کہا۔

”وہاں کوئی بندہ نہیں آیا، جسے مشکوک نہا جاسکے۔“
”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ہانپتا کور میرے ساتھ بیڈ پر بھی وہ بھی لیٹتے ہی سو گئی۔ رات کافی ہوئی تھی۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو سورج مشرقی افق سے نہیں نکلا تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لیتا ہوا حوالی کی چھت پر جانے لگا تو حوالی جی کے ایک ملازم نے مجھے

”باہر ایک جوئی آیا کھڑا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے، سندر لعل نام بتایا ہے۔“

لوگ تھے۔ ہم وہاں جا کر رکے تو دیکھا، جوگی رام لعل، سندھ لعل اور ملنگ باہری زمین پر گھڑی بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس جا بیٹھا اور کچھ دیر باتوں کے بعد انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا۔

”دیکھیں۔ میں یہاں نہیں رہا اور نہ ہی مجھے رہنا ہے لیکن آپ لوگوں کے باعث ہمارے دوست کو پریشانی ہو رہی ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے، جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ ہم آج ہی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ آپ سے رابطہ رہے گا۔“ جوگی رام لعل نے کہا تو میں نے اسے سمجھایا

”ہمیں آپ لوگوں کے بارے میں بالکل پتہ نہیں ہے کہ آپ کون ہوں کہاں سے آئے ہو یہاں کس لیے تھے۔ ہم نے آپ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک صرف اس لیے کیا کہ آپ فقیر لوگ ہیں۔ یہی بیان ہر جگہ دینا، ہم آپ کو یہاں سے اب بھی نہیں جانے دینا چاہتے تھے کہ آپ لوگ خود یہاں سے چلے گئے۔“

”جی میں سمجھ گیا مجھے کیا کرنا ہے۔“ اس نے کہا تو میں وہاں سے اٹھ گیا۔ پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ اشفاق چوہدری ہمیں نوڈلر سے بہت دور تک چھوڑنے آیا تھا۔

.....

دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ جہاں اپنے کمرے میں بند پر پڑا، یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ اب تک بدبو سنگھ کا خون نہیں آیا اور نہ ہی نوٹن کوڑنے اطلاع دی۔ وہ یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ اسبوں نے مجھے پاندھ کر رکھ دیا ہے۔ اگر میں وہاں ہوتا تو اب تک کچھ کر چکا ہوتا۔ اسے خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ یہی اس نے نوٹن کوڑ کو کال کر دی۔ اس کی آواز سننے ہی بولا۔

”اب تک کیا۔“

”جند سنگھ سے بات چل رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی دے دی جائے اور وہ لڑکی لے لی جائے۔“ اور جو اس کا بھائی قتل ہو گیا، وہ کس کھاتے

میں خوب نمایاں یہاں تک کہ میں پر سکون ہو گیا۔ وہ جوتیز خوشبو، میرے ساتھ تھنی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی۔ ایک بھینی بھینی خوشبو نے مجھے حصار میں لے لیا۔ جو بہر حال مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

”والہی مست کر دینے والی خوشبو ہے۔“ بانیتا کوڑ نے خمار آلود آواز میں کہا تو سندھ لعل ایک دم سے خوش ہو گیا۔ میں نے ناشتہ لگوانے کا کہہ دیا۔

”ناشتے کے دوران وہ بہت ساری باتیں کرتا رہا۔ جن میں سے کچھ کی مجھے سمجھ آئی اور کچھ کی نہیں۔ جس وقت وہ جانے لگا تو اس نے دو چھوٹی چھوٹی بوتلیں میری جانب بڑھا کیں۔ وہ دو مختلف رنگ کی تھیں۔“

”یہ کیا ہے؟“

”یہ آپ بعد میں سکون سے پیہ کر سکیں۔ میں نے اس کے ساتھ سب کچھ لکھ کر اس لفافے میں ڈال دیا ہے۔ اب مجھے آگیا دیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملا یا تو وہ چلا گیا۔

دو پہر ہو چکی تھی۔ جب میں بانیتا کوڑ حویلی سے نکل پڑے۔ اشفاق چوہدری نے وہاں کے ایک ایک معاملے کے بارے میں مجھے بتایا۔ انکیشن کے لیے ماحول تیار ہو رہا تھا۔ علاقے میں سیاسی پارٹیوں کے کارندے اپنے اپنے طور پر سرگرم تھے۔ ہم نے ہر موضوع پر بہت دیر تک بات کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اشفاق چوہدری کے پاس ساری باتیں ختم ہو گئیں۔ اس کی تان بیکٹیا پر آ کر ٹوٹی کہ انہیں یہاں سے بھیج دیا جائے۔ کیونکہ اگر کسی بھی ادارے کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہیں اور انہیں یہاں ہم نے رکھا ہے تو خواہ مخواہ کی مصیبت آ جائے گی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ اور چھ دیر بعد مسافر شاہ کے تھڑے کی طرف چل دینے تھے۔ تاکہ ان کے پاس جا کر انہیں وہاں سے چلے جانے کا کہہ دیا جائے۔ اچھی تک میرے دل سے جو بھینی بھینی مہک اٹھ رہی تھی اس نے مجھے مدہوش سا کر دیا تھا۔

اشفاق چوہدری دوسری کار میں تھا۔ اس کے ساتھ دو

دو گھنٹہ شہر میں اے سی پی آفس کے سامنے جا کر کے۔
ہسپال کا دو ماخ اس وقت بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ پر سکون تھا۔
سے ان مراحل سے بھی دلچسپی نہیں ہوئی، جو اس عوام
کے خادم تک پہنچنے کے رکاوٹوں کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ تین
گھنٹوں کا فون بارشانی ملا کہ وہ اندر آ کر بات کریں۔ ہسپال
بلیئر ٹنگھ اور ٹرکی کا باپ اندر چلے گئے۔ اے سی پی اپنی
کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے بیٹوں کو دیکھا اور بیٹھنے کا
شارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے تو بلیئر ٹنگھ نے اپنا مدعا بیان کیا۔ اور
گئی کے تھا تیار کے بارے میں بتا دیا کہ وہ تعاون کر سکتے

”او کے بلٹھی مل گئی۔ یہی بڑی بات ہے۔ اب مجھے کچھ سکون ہوا ہے۔ اب میں سونے لگا ہوں، سچ ہی ملاقات ہوئی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر کے میز پر لیٹ گیا۔ کچھ پروہ یہی معاملہ سوچتا رہا، پھر اس کی آنکھ ملی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی سے فریش ہو کر تیار ہوا اور نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اسے ہر پریت تیار ملی۔ دونوں نے ناشتہ کیا اور وہ کمزور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہسپتال لاشعوری طور پر نوٹن کور کا انتظار کر رہا تھا جو ابھی تک وہاں نہ پہنچ چکی تھی۔ ہر پریت کو الداس کہہ کر اس نے پورچ میں جا کڑن کیا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے نوٹن کور سے پوچھا۔

کی بجائے یہاں بٹا رہا ہے۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں بلواتا ہوں اس تھا نیدار کو۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کور کا اور پھر بولا۔

”اور کوئی قسم ہے میرے لیے۔“

ان آخری لفظوں کے کہنے کا مطلب یہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا کہ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ بھی جہاں نے سکون سے پوچھا۔

”یہ آپ کا دیکھنا، کتنے دنوں تک چلے گا؟“ اس کے لہجے میں بچہ ایسا تھا کہ اے سی پی نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اس کی بدتمیزی پر اسے فہم آ گیا ہو۔ پھر بھی اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”کیا کہہ سکتے ہیں، ہمارے پاس کوئی ایسا چمکا رہا ہے نہیں کہ ایک دوسرے سے وضوح نکالیں۔ کرتے ہیں اس پر کام۔ آپ دھیرے دھیرے رہیں۔“

”دیکھیں، یہ ہمارے علاقے کے لوگ ہیں۔ ان کا مسئلہ دنوں میں نہیں گھنٹوں میں ہونا چاہیے۔“ جہاں نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا۔

”یہ آپ جیسے عوامی نمائندوں کو ہر جگہ اسے نمبر بنانے کی کیوں پڑی رہتی ہے۔ کہنا دیکھتے ہیں تو دیکھتے ہیں۔ اب تم لوگ جاؤ۔“ اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو لڑکی کا باپ پہلے ہی اٹھ گیا۔ ہلیر سنگھ سچ اٹھا اور پھر جہاں اٹھ گیا۔ اسے اے سی پی کی سردمہری بہت بری لگی تھی یہ وہاں آگئے۔

”یہ اونی سے کون لوگ یہاں آئے ہیں؟“

”ہم ہیں۔ ایک شخص نے جواب دیا تو وہی شخص بولا

”سردار گنڈ سنگھ جی آئے ہیں۔ انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ وہاں سے آئے ہو یہاں، تو یہ تم لوگوں کی سہانا (ہمدردی) میں آگئے ہیں۔“

اتنی دیر تک وہ ان کے قریب آگئے۔ سردار دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے ان کے قریب آگیا اور آتے ہی زور دار انداز میں فتح پلائی

”ست سری اکال۔“ لوگوں نے اس کی فتح کا جواب دیا۔ تو وہ بولا۔

”بھگھے بہت دکھ ہوا ہے، میں نے ساری جانکاری لے لی ہے۔ اور آؤ کرتے ہیں اسے سی پی سے ذرا بات۔“ اس نے سب کو لے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو لوگوں نے جہاں کی طرف دیکھا۔ تب ہلیر سنگھ بولا۔

”ہم ان کے پاس سے ہوا آئے ہیں۔“

”کیا کہتا ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”وہی دلا سہ دیا کہ کرتے ہیں کچھ؟“ ہلیر سنگھ نے جواب دیا تو بہت دھول سے بولا۔

”میں کرتا ہوں بات۔“ یہ کہہ کر اس نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ جہاں نے سرد سے لہجے میں کہا۔

”گنڈ سنگھ۔ اس اے سی پی کو یہاں بلاؤ۔“

اس کا دلنا گنڈ رسی کو نہیں وہاں ہر بندہ نے محسوس کیا۔ بھی اس نے چونک کر پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”جو کہتا ہے وہ کرو۔“

جہاں نے اسی لہجے میں کہا تو ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا پھر بولا۔

”ہم اندر جا کر بات کرتے ہیں۔ آؤ تم بھی آؤ؟“

اس نے کہا تو جہاں نے ضدی لہجے کہا۔

”تم سے یہاں بلاؤ۔“

”اے تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ سردار جی کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس کے ایک مصاحب نے تیزی سے کہا تو جہاں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے دور جانے کو کہا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر پیچھے ہٹ گیا۔ تب وہ گنڈ سنگھ کے

پاس آیا اور جھمی سی آواز میں کہا۔

”تم وہی کرو، جس کے کرنے کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے۔ اب میں آگیا ہوں یہاں تمہاری بیٹی بھی نچ جائے گی۔ ہسپال سنگھ ہے میرا نام۔“ اس نے کہا ہی تھا کہ گجندہ سنگھ نے متوجہ نہ ہونے سے اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، پھر اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اس اے سی پی کو ادھر ہی بلاؤ، سب کے سامنے بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے ہسپال کا ہاتھ تھام لیا اور ایک جانب کے جا کر بولا۔ ”تم کیا جانتے ہو کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔“

”اگر میں تمہاری بیٹی کے بارے میں جان سکتا ہوں تو کیا یہ نہیں جانتا کہ تمہیں یہاں کیا کرنے بھیجا گیا ہے؟“ وہ سب غلط فہمی میں ہو گیا۔ اب میں طریقے سے سب ٹھیک کر رہا ہوں۔ میں نے انکیشن۔“ اس نے کہنا چاہا تو ہسپال بولا۔

”لو نہیں، جو کہا گیا ہے وہی کرو۔“ یہ کہہ کر ہسپال وہاں سے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی اندر گیا ہوا تھا کہ اس دوران پولیس کی کئی گاڑیاں وہاں آن رہیں۔ گجندہ سنگھ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ وہ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہاں سہتا کرتے کرتے وہ خود پھنس گیا ہے۔ اے سی پی باہر آ گیا۔ ان سب کو دیکھ کر بولا۔

”جی سردار جی آپ، یہاں کیسے؟“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا ہسپال نے ہتھ پائی غصے میں کہا۔

”اصل میں تم جیسے کرپٹ وچر کرشمے نے ان عوامی فرائیڈوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ تم لوگ خوشامد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اتنے لوگ آئے، مگر تم نے ان کی ایک نہیں سنی اور محض دلاسہ دے کر انہیں اس آفس سے نکال باہر کیا، جو اسی عوام کے پیسے سے بنا ہے اور اس کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس گجندہ سنگھ نے بھی وہی کہنا ہے جو ہم تمہیں کہہ رہے آئے

ہیں۔ اب تم باہر کیا سننے آئے ہو؟“

اسے سی پی نے باہر کھڑے تمام لوگوں کی طرف دیکھا، اس نے اپنی بے عزتی قطعاً محسوس نہ کی اور ہسپال کو نظر انداز کرتے ہوئے گجندہ سنگھ کی طرف دیکھ کر سکون سے بولا۔

”آئیں اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اس پر گجندہ سنگھ نے ہسپال کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے اپنی بات منوانا چاہتا تھا، جس طرح وہ سوچ کر آیا تھا۔ جب ہسپال نے فوراً سا بھی ریسپانس نہیں دیا تو وہ بڑھ کر ہسپال کے پاس آیا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔

”تم اگر چاہو تو ہم ابھی سکون سے کوئی معاملہ طے کر لیتے ہیں۔“ ”کڑی تو وہاں نہیں مرنی ہے وہ بات تو ہوئی۔ میں صرف اس شرط پر تم سے سارا معاملہ طے کر لیتا ہوں۔“ ہسپال نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”کہو کیا کہتے ہو؟“ ”اس کے بیٹے کو تو تم واپس نہیں کر سکتے ہو، وہاں اس کے بدلے اپنی بیٹی دے دو۔“ ہسپال نے سکون سے کہا تو گجندہ کا چہرہ دیکھ باری سر ہو گیا جیسے کسی اسے گالی دے دی ہو۔

”ہسپال۔! میں اگر سکون سے بات کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی کمزور ہوں۔ میں معاملے کو حل کرنا چاہتا ہوں، وہ کر لو۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”تو پھر کیا کرو گے؟“ ہسپال نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”میں تم سب کو دیکھ لوں ابھی اور اسی وقت؟“ اس نے غصے میں کہا تو اس کی آواز خاصی بلند ہوئی۔ جو وہاں کھڑے لوگوں اور پولیس تک جا پہنچی۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اب تمہیں شتم ہونا ہے۔“ ہسپال نے کہا اور اس کی کوئی بات سننے بغیر بطور سنگھ کے پاس آ گیا۔

”چلیں۔“ بطور سنگھ نے پوچھا تو ہسپال نے اسے سی

”ہاں! مجھے پتہ ہے۔ آپ مجھے گرفتار کرو۔ وہ بندہ بھی یہیں ہے، وہ بھی گرفتاری دے گا۔“ اس نے کہا تو پیچھے سے ایک شخص آگے آگیا۔ اسی وقت ارد گرد کھڑے پولیس والوں نے اسے ہتھ کڑی لگا دی۔ یہ سب کچھ پولیس کے سامنے ہوا۔ تصویریں بن گئیں۔ ایسے میں گنبد رنگھ کا فون بج اٹھا۔ اس کا ایک مضاہب آگے بڑھا اور فون سے دے دیا۔

ایسے میں جہاں کا بھی فون بج اٹھا۔ نوٹن کو رستے بتایا کہ اس وقت لڑکی گنبد رکی ہی ایک فیکٹری میں موجود ہے۔ پولیس سے کہا جائے کہ وہ اسے وہاں سے بازیاب کرے۔ پورے پولیس کے ساتھ۔ جہاں نے یہی بات اسے سی پی سے کہی تو پولیس من رہا تھا۔ دوسب لوگ اس جانب بھاگے۔ پولیس کو بھی وہاں جانا پڑا۔ جہاں بھی وہاں جا پہنچا۔ یہی ہوئی لڑکی کو وہاں سے بازیاب کرایا گیا۔ وہیں سے جس وقت سب واپس نکور تھانے آئے تب لڑکی کا بیان لکھا گیا۔ جس وقت وہ اوگی واپس آ رہے تھے اس وقت نوٹن نے بتایا کہ گنبد رنگھ کی بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے گھر جا چکی ہے۔

راتے میں لڑکی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی بات چل رہی تھی۔ اس نے ملے کو کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ جس پر اس لڑکے نے ضد بنائی کہ وہ اسے اٹھا لے گا۔ وہ لڑکا گنبد رنگھ کے پاس کام کرتا تھا اور اسی دھندے میں ملوث تھا۔ دراصل وہ لڑکیوں کو آگے اسمگل کرتے تھے۔ یہی اس کا بڑا دھندہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے اور اپنے پاس سے بات کی۔ اس نے لڑکی اٹھانے کو کہہ دیا کہ چند دن اسے اپنے پاس رکھنا، پھر آگے بھیج دینا۔ اس دوران لڑکی کا بھائی مل ہو گیا۔ یہی سرزدی ہوئی تھی۔ وہ اس لڑکی کی آگے بات نہیں کر پائے۔ لڑکا اسے رام کرتا رہا، لیکن جس کا بھائی اس کے لیے قتل ہو چکا ہو، اسے کہاں ہوش تھا۔ وہ تو اپنے بھائی کے قاتلوں کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ گنبد اور اس کے لوگ لڑکی کا قتل بھی سوچ رہے تھے کہ اس کی بیوی انہو ہو گئی۔ گنبد کے گمان میں

پی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہاں! اب کچھ اور سی کرنا ہوگا۔ یہاں کے لوگ بھی کر پٹ لگے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ لڑکی کو کس نے اغوا کرایا ہے۔ چلو۔“ یہ کہہ کر جہاں جانے لگا تو اسے سی پی نے پولیس کی طرف دیکھتے ہوئے نکتے میں کہا۔ ”اُنو جوان۔! ارکو، یوں بیان دے کر نہیں جاسکتے ہو، بتاؤ کون ہے وہ؟ ارکو۔“

”تم مجھے روک بھی نہیں سکتے ہو۔“ جہاں نے کہا۔ ”میں تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔“ اسے سی پی نے کہا۔ ”تم مجھے گرفتار بھی نہیں کر سکتے، کیوں گنبد رنگھ بولتے کیوں نہیں ہو؟“ وہ نوٹن سے بولا تو سبھی گنبد رنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ ابھی گرفتاری دینے لگا ہو۔ وہاں کھڑا ہر بندہ حیران تھا کہ گنبد رنگھ جیسا شخص اس کے سامنے خاموش کیوں ہے؟ کافی مہرنگ جب کوئی نہیں بولا تو گنبد رنگھ آگے بڑھا اور اس نے اسے سی پی سے کہا۔

”جہاں ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ اغوا اور قتل میرے ایک بندے سے ہوا۔ میں اسے آج ہی پیش کر دیتا ہوں۔“ یہ کہنا ہی تھا کہ وہاں موجود ہر بندہ چونک گیا۔ پولیس نے جلدی سے تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ ایک اپیل سی پی کی تھی۔ اسے سی پی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”لڑکی لاؤ کہاں ہے؟“ اس بار ظہیر رنگھ سچے سچے تیزی سے کہا۔

”وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں پیش کر دوں گا۔“ اس نے کہا تو جہاں نے اسے سی پی سے کہا۔ ”اب اگر تم نے کچھ نہ کیا تو حیر سے لیے بہت برا ہوگا۔ میں تمہیں صرف دو گھنٹے دیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور اپنے لوگوں کو چلنے کا اشارہ کر کے کار کی جانب بڑھا تو اسے سی پی نے کہا۔ ”ارکو جہاں! یہ کہہ کر وہ گنبد رنگھ کی طرف دیکھ کر بولا۔“ آپ کو پتہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

انہیں لے کر چاندھر فارم ہاؤس پر جا رہے ہیں۔ رات تک وہیں آ جاتا۔ میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جسپال کو کافی حد تک سکون مل گیا تھا، لیکن ایک بے چینی اس کے اندر بڑھ گئی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ رات ہی کو پتہ چلنا تھا، جب وہ ان لوگوں کو ملتا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور گھر کی جانب جانے کے لیے رفتار تیز کر دی۔

اس وقت سورج مغرب میں ڈوب رہا تھا، جب وہ اونگ پند سے نکل کر چاندھر کی جانب رواں تھا۔ اس کے ذہن پر وہ فی ویں رپورٹ چھائی ہوئی تھی، جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھی تھی۔ وہ اسے بہت بڑا سوسل ورکر قرار دے رہے تھے۔ وہ یہ واقعہ خریب کاری اور سیاسی مخلصیت سے بھی سے جوڑ رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اسے سیاسی رنگ دے کر وہ انوجیت یا خود جسپال کی راہ کو روکا جاتا۔ سیاست کے اس کھیل میں اس بندے کا زیادہ فائدہ ہونے والا تھا، جو اس کی جگہ پارٹی ٹکٹ لے کر انکیشن کے میدان میں اترتا۔ اس کا پہلا بدمذہب انوجیت۔ نگلہ ہوتا۔ وہ اس سارے کھیل کو سمجھ رہا تھا اور اس کا توڑ بھی کرنا چاہتا تھا۔ انہی سوچوں میں الجھا وہ فارم ہاؤس جا پہنچا۔ وہاں سب آچکے تھے۔ وہ ان سے بڑے بھر پور انداز میں ملا۔

”بلد یو، تم نے تو اس کا قصہ ہی ختم کر دیا۔“ کو کیسے ہوا یہ سب جسپال کے صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”اصل میں جس وقت میں پتہ چلا تو کچھ ہی دیر بعد یجن کور نے مجھے بتایا کہ یہ انوار خیر وادی وادرات سے ہو رہی ہے اس کی تفصیل تمہیں یہ چکن کور ہی بتا سکے گی۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا: ”خیر ہم وہاں سب کچھ دیکھنے گئے۔ ہمارے وہاں پہلے ہی کافی سارے سورتھ تھے۔ ایک گھنٹے میں ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ کس کا کام ہے اور وہ کیوں کر رہا ہے۔ پھر اس کی تصدیق ہوئی چلی گئی۔ جیسے ہی کنفرم ہوا میں نے سوچ لیا کہ اس کا علاج کیا ہونا ہے۔ اور وہ ہو گیا۔“

”وہ تو وہاں بڑا طاقتور سمجھا جا رہا تھا۔“ جسپال نے

بھی نہیں تھا کہ کوئی اتنا سر پھرا بھی ہوگا جو اس کے گھر تک جا پہنچے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ بات بہت بڑھ جائے گی، وہ اس معاملے کو اپنے طریقے ہی سے حل کر لینا چاہتا تھا۔ مگر اسے پولیس کے سامنے اقرار کرنا پڑا۔ حالات ہی ایسے بن گئے۔ اس کے لیے فراہمی کوئی راہ نہیں تھی۔

جس طرح یہ سب ہو گیا تھا، جسپال کا دماغ نہیں مان رہا تھا کہ بات انہی ختم ہوئی ہے۔ یہ اتنا سادہ اور سیدھا معاملہ نہیں تھا کہ وہ ختم ہو جاتا، وہ بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ بھی خیال تھا کہ کاش اس کے دوست بھی یہی سوچ رہے ہوں۔

وہ لوگ اونگ پند پہنچ گئے۔ وہ لڑکی اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ سہ پہر تک وہاں کی پندرہویں میں رہا۔ وہیں لوگوں کے درمیان اس کا سارا وقت گزار گیا۔ بہت سارے سوال اٹھے، جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کے والدین ہی لوگوں کو مطمئن کرتے رہے۔ سہ پہر کے بعد جس وقت جسپال اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ رستے میں نوٹن کا فون آگیا۔

”وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔“ جگند سنگھ نے بیٹی کے گھر پہنچنے ہی اپنا بیان بدل دیا ہے۔ اس نے پولیس کو یہی بیان دیا کہ یہ سیاسی مخالفین کی چال تھی۔ اس کے ویسوں نے اس کی ضمانت مردانی ہے اور اب وہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہے۔ یہ پولیس کا نفرس اس نے اپنے گھر کی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہی کرے گا۔ اس نے جگند سے کہا بھی تھا۔ وہ... ”نوٹن کور نے کہنا چاہا تو جسپال نے بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”بلد یو اتنا ہی نامکھ ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اب اسے میں دیکھوں گا، ان لوگوں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اب تک اسے شوت ہو جانا چاہیے تھا۔“ جسپال نے غصے اور مایوسی میں کہا۔

”وہ شوت ہو گیا ہے۔“ نوٹن نے کہا۔

”کیا...؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”اس کے وہ خاص بندے ہم نے پکڑے ہیں۔“

پوچھا تو کرم سٹکھ نے جیسے ہوئے کہا۔

خوش تھی۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکی نے بچن کور کو بتایا کہ اس نے فورس جو ان کمری ہے۔ اور ٹریڈنگ سے گذرنے کے بعد اس کی پوسٹنگ ہونے والی ہے۔ یہ پوسٹنگ کسی بارڈر پر ہوگی۔ بچن کور نے اسی وقت پوچھ لیا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور وہاں کیوں نہیں گئی وغیرہ۔ لڑکی نے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا اور اس کا فون نمبر لے لیا کہ وہ اس کا کال کرے گی۔ چند دن بعد اس لڑکی نے بچن کور کو کال کی اور اسے اپنے اسٹینڈیٹ میں بلا لیا۔ جہاں وہ لڑکی ٹریڈنگ لے رہی تھی۔

”تم باری اس کہانی کا ہمارے گاؤں کی لڑکی سے کیا تعلق؟“ جہاں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”ہے، بہت گہرا تعلق ہے، تم صبر سے سنو۔“ بچن کور نے سختی سے کہا تو وہ خاموشی سے سننے لگا۔ ”میں ایک ماہ اس کے پاس جاتی رہی۔ اس سے ملتی رہی۔ میری سسلی وہ نہیں رہی تھی۔ وہ معصومیت ختم ہو چکی تھی اس میں، اس کی جگہ ایک پختہ کار ایجنٹ بن گئی تھی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید اندازہ نہ کر پاتا۔ مگر میں بھانپ گئی۔ وہاں بہت ہی خاص قسم کی ٹریڈنگ وی جاری ہے۔ میں نے اس میں دل جمعی لی اور پتہ چلا کہ یہ کوئی معمولی تربیت نہیں ہے۔“

”کیا ہے وہ، کیا اب بھی جاری ہے؟“ جہاں نے پوچھا تو وہ بولی۔

”ہاں اب بھی جاری ہے اور اس کی پہلی کھیپ، جس میں میری سسلی شامل ہے وہ مختلف مکوں میں پہنچا دی گئی ہیں۔ اگلی کھیپ تیار ہو رہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر تیزی سے بولی۔ ”اس تربیت کے لیے لڑکی کا خوبصورت ہونا لازمی ہے، باقی کمی وہ پوری کر لیتے ہیں۔ اب تم جانتے ہو کہ تمہارے گاؤں کی لڑکی کچھ نہیں بہت خوبصورت ہے۔ پنجاب میں بہت سارے ایسے دلال ہیں جو ایسی لڑکیاں اس ادارے کے لیے تلاش کرتے ہیں۔ شادی کا بہانہ بنا کر یا بھاگ کر یہاں پہنچا دیتے اور وہ یہاں باہر کے مکوں کے لیے حیار ہوتی ہیں۔ ان دالوں میں یہ ایک گنبد رستگہ بھی تھا۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا

”ان کی اولاد اتنی ہی سر پھری ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی کو پتہ ہے کہاں سے اٹھایا، ایک کلب سے جہاں وہ تاج گانے میں مصروف تھی۔ ان لڑکوں کو خواہ کواہ کواہ ہم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر پر راج کر رہے ہیں۔“

”ہمیں پتہ تھا کہ اس نے پھر جانا ہے اسی لیے اس کے بارے میں پوری طرح جان لیا۔ یہ اپنی کمران کور اور سر جیت بڑے سکون سے گئے، وہ پرنس کا نفرنس کے بعد آرام کرنے اسے کمرے میں گیا تھا۔ انہوں نے وہیں اس کا کام کیا اور سکون سے باہر آ گئے۔ اس وقت وہاں رش لگا ہوا تھا، کون کس کو جانتا تھا۔ یہ جس وقت وہاں سے آ گئے تو انہیں پتہ چلا، ہم اس وقت تیرے پنڈ کے قریب تھے۔ سوچا ادھر چلیں، پھر جانہ ہر کی طرف نکل گئے۔“ بلہ پو نے سکون سے کہا۔

”یہ سب ہوا کیوں، وہ انہوں کیوں کرتا تھا؟“

”اسی بات کا تو تمہیں پتہ نہیں۔ میں بتاتی ہوں۔“

بچن کور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ کہتی رہی اور وہ سنتا رہا۔

بچن کور کی ایک بچپن کی سسلی اس کے ساتھ کالج تک پہنچتی رہی۔ دونوں کی آپس میں بہت محبت تھی۔ گہری دوستی ہونے کے باعث ان کا آپس میں کوئی راز نہ رہا تھا۔ وہ کالج میں بھی کہ ان کی ایک رشتہ سے کافی گہری دوستی ہوئی تھی۔ یہ تعلق پروان چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ لڑکے والوں نے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ یہ رشتہ کی وجہ سے آگے نہ چل پایا۔ پھر ایک دن وہ لڑکی گھر سے غائب ہو گئی۔ کسی کو چھ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔ فطری طور پر پہلا شک اسی لڑکے پر گیا۔ وہ دوسرے دن میں موجود نہیں تھا اور نہ ہی اس کے گھر وائے۔ لڑکی کے گھر والوں نے لڑکی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک بچن کور بھی مزید پڑھنے کے لیے امرتسر آ چکی تھی۔

یہ کوئی دو ماہ پہلے کی بات تھی۔ وہیں ایک دن اس کا آتما سامنا اس لڑکی سے ہو گیا۔ وہ بہت با اعتماد تھی اور

”یہی، تم اس لڑکی کے بارے میں بتا رہی تھی، میرا مطلب سندھپ کے بارے میں۔“
”جی، وہ اس کے بارے میں بتانے لگی۔“

وہ ایک ننھی سی شام تھی۔ جس وقت ہم لاہور پہنچے۔ اس وقت تک مجھے یہ شدت سے احساس ہوا کہ اب سارے لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اگرچہ ایسے ہی کسی وقت کے لیے میں نے بہت سارے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ لیکن جس طرح ایک جھٹکے سے یہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا، اس نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قریبی طور پر میرے ذہن میں ولید کا خیال آیا۔ وہ کہاں ہوگا؟ میں نے اسے فون ملایا تو اس نے ریسو کر لیا۔ ”جی، بہت دنوں بعد آپ نے مجھے یاد کیا۔“
”کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”اپنے آبائی گاؤں۔ آپ فرمائیں، میں حاضر ہو جاتا ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”کب تک پہنچو گے؟“ میں نے پوچھا۔
”زیادہ سے زیادہ دو ماڑھائی گھنٹے لگیں گے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے کل آنے کے لیے کہہ دیا۔
کوئی آدھے گھنٹے بعد ہم ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں جا پہنچے۔ پھر اگلے چند منٹ میں ہم اسی سیف ہاؤس میں آچکے تھے، جو چار کنال کی کوٹھی میں تھا۔ یہاں پر بھی گیت نے اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانا تھا۔ وہاں پر چند لوگ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کار گیرانج میں کھڑی نہیں کی بلکہ اسے یوں پورچ میں کھڑی کی کہ اگر ایک دم سے بھی ٹھنڈا پڑے تو نکل جائیں۔ ہم اوپر ایک گھڑی قسم کے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں ہر طرح کی سہولت تھی۔ میں یہاں خود کو خاصا محفوظ سمجھ رہا تھا۔

اگرچہ باقیات کور میرے ساتھ سارے راستے ہاتھ کرتی ہوئی آئی تھی۔ لیکن وہ ساری باتیں ہمارے اپنے متعلق تھیں۔ وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی اور میں اپنے بارے میں کہتا رہا۔ وہ بیڈ پر پھیل کر لیٹ چکی تھی۔ اور میں

تو میں نے جلد یو کو ساری بات بتادی۔ میں نے ایسے ہی دو دلال پہنچے ہی پھر کاویئے ہوئے ہیں۔“
”تمہارا کیا خیال ہے یہ بھی اسی ادارے میں جانے والی تھی؟“ جیپال نے پوچھا۔

”ہاں یہ وہیں جانے والی تھی۔ اگر اس کا بھائی قتل نہ ہوتا تو یہ اب تک وہاں جا چکی ہوتی۔“ یچن کور نے بتایا۔
”کیا وہ کوئی ذہنی تبدیلی کرتے ہیں جس سے.....“

جیپال نے پوچھا چاہا تو یچن کور بولی۔
”وہ کچھ بھی کرتے ہیں، لیکن لڑکی پوری کی پوری بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں یہ تو وہی لڑکی بتا سکتی ہے، جس نے تربیت لی ہو یا پھر وہ تربیت دینے والے۔ مگر یہ ایک بہت بڑا ایمان ہے۔ اب وہ ادارہ، بکند رکے معاملے میں ذرا بھی دل چسپی نہیں لے گا۔ پہلے دو کے بارے میں بھی نہیں لی۔ لیکن جس ادارے کے تحت یہ سب چل رہا ہے، وہ دلچسپی ضرور لے گا۔“

”چلو، وہ جو ہوگا سو ہوگا۔ اب کیا کرنا ہے۔“ جیپال نے پوچھا تو جلد یو نے کہا۔

”کوئی نہیں، ادھر رہتی ہیں۔ جو بھی سرائٹھائے گا، اسے دیکھ لیں گے۔ اور ہاں، تیرے پنڈ والا تھا نیدار، اسے کچھ سبق دیں گے۔ تاکہ وہ تمہیں ہی پروٹوکول دے۔“
اس پر سب نے قہقہہ لگا دیا۔ پھر باتیں کرنے لگے۔
تب جیپال سنگھ نے ایسے ہی یچن کور سے پوچھا۔

”تمہاری وہ سہیلی کہاں ہے اس وقت؟“
”پاکستان میں، شاید لاہور میں۔“ یچن کور نے بتایا تو نوٹن کور نے کہا۔

”اس کے بارے میں تفصیل معلوم ہو تو بتاؤ، پتہ کر لیں گے۔“ اس پر یچن کور نے سر ہلاتے ہوئے کہنا چاہا تو جیپال نے پوچھا۔

”نکو رو رو بندے لائے ہو یا ابھی وہیں ہیں؟“
”ہیں، ادھر سرورنٹ کوارٹر میں، ان سے بہت کچھ اگھوتا ہے، وہ ذرا ٹھیک ہو جائیں بتانے کے لیے۔“
کرن کور بولی تو نوٹن نے پھر یاد دلایا

نریس نہیں کر پایا۔ یہ بات مجھے اس وقت سمجھ میں آئی ہے جب سندر لعل نے اس مہک کا تھوڑا سا بقیہ جانو، یہ بھی رتب کی طرف سے ہے۔ میں باس کی نگاہوں سے چھپ گیا، اس کا تعلق اس خوشبو سے ضرور ہے۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ میں نے کہا بائیتا کور ایک دم سے مسکرا دی پھر بولی۔

”یقین جانو جمال، آج صبح سے میرے دماغ میں یہ خیال کئی بار آیا ہے۔ لیکن میں تم سے اس لیے نہیں کہہ پائی کہ شاید تم میرا مذاق اڑاؤ۔ چل اب کچھ نہیں ہوتا۔ رتب ہمارے ساتھ ہے تو پھر کیا پروا۔ اب یہ دیکھ کہ اس باس کے بچے کو تلاش کیسے کرتا ہے؟“

”وہ بھی ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور روند کو فون ملا دیا۔ اس نے چند منٹ بعد فون دسیو کر لیا۔ تو میں نے پوچھا۔ ”باس سنا، کچھ پتہ چلا؟“

”ہم نے سوفٹ ویئر بنا لیا ہے۔ اس کا تجربہ جاری ہے۔ یہ نمبر کبھی ایسسرڈم میں ملتا ہے اور کبھی دہلی میں۔ اس کی لوکیشن مختلف جگہوں سے مل رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف ایک دو دن میں اسے تلاش کر لوں گا۔“

اروند نے کسی حد تک شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ”چلو کوئی بات نہیں، تم کو شش تو گزر رہے ہو، ہونا، سہانا کو کسی ہلکے مارکیٹ سے بھی نہیں ملا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ تو بہت کوشش کر رہا ہے، لیکن نہیں ملا۔ بہر حال اگر ہم خود کوئی سوفٹ ویئر بنا لیں گے تو اس کا توڑ بہت مشکل ہوگا، یہ ہمارے ہی کام آئے گا۔ کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوگا۔“ اس نے امید افزا انداز میں کہا تو کچھ دیر پوچھی گپ شپ لگانے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

میں نے فون بند ہی یا تھا کہ اشفاق چوہدری کا فون آ گیا۔ میں نے کل رسیو کی تو اس نے بتایا۔ ”یار وہ لوگ مسافر شاہ کے تھڑے سے چلے گئے ہیں، سارے کے سارے، وہ ملنگ بھی انہی کے ساتھ چلا گیا ہے۔“

”چلو اچھا ہوا۔ اب ان کی طرف سے کوئی ٹینشن

اس کے پاس ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ تبھی اس نے گہرے سچے میں پوچھا۔

”جمال، یہ اچانک تمہارے ہاتھ سے سب کچھ کیے نکل رہا ہے، وہ سب لوگ جو تمہارے ارد گرد تھے چلے گئے۔ اب کیا کرو گے؟“

”وہی جو میرا دل چاہے گا۔ جو میں نے سوچ لیا ہے اور اس کی گواہی میرے دل نے دے دی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ خاموش رہی، اب میں کہتا چلا گیا، ”وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئے، بلکہ میں نے انہیں خود سے الگ کیا ہے۔ کیونکہ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ حالات بدلتے گئے ہیں۔ تمہیں کے لیے نوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ میں شاید اب کسی دوسرے دائرے میں جا رہا ہوں۔“

”مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ مجھو۔ سب لوگ جو یہاں سے چلے گئے، کیا تم نہیں سمجھتی ہو کہ میرا دائرہ پھیل گیا؟“ میں نے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”باس پتہ ہے۔“

”اور دیکھو! وہ باس جو ایک ناویدہ قوت کی طرح سے وہ آیا اور تو ٹکس حالات بدل گئے۔ وہ ناویدہ قوت جو ہمیں ختم کرنے کے ورے تھی، وہ نہیں توڑ پائی، بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ رتب کی مرضی یہی ہے کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کر پائے۔ ابھی اپنی اپنی جگہ محفوظ ہو گئے۔ ہوتا یوں کہ انسان اپنے سوچنے، فیصلہ کرنے اور عمل میں آزاد ہونے کے باوجود جب رتب تعالیٰ کے نظام میں داخل ہوتا ہے، اس کی منشا اور مرضی کے خلاف جاتا ہے تو پھر بے بس ہوتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔

”اس نے اتنے ایک کیے اور تم بچی گئے۔ اب دوئم تک نہیں پہنچ پایا اور نہ ہی تم اس تک پہنچ سکے ہو، ایسا کیا ہے، کچھ سمجھ میں آیا؟“

”ہاں، اور کچھ ہوتا ہو، یہ جوکل پر فیوم کی شیشی ٹوٹی ہے، اس خوشبو کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ وہ کل سے مجھے

نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔

میں تفصیل بھی درج ہے کہ یہ کیسے استعمال کرنا ہوگا۔ اگر ضرورت پڑے تو مزید بتا سکتے ہیں۔ ورنہ میں تو حاضر ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امن، صرف طاقت کے توازن ہی میں پوشیدہ ہے۔ امید ہے میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا یہ اچھا بدلہ ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ خط اس لیے دیر سے دیا ہے کہ تم مجھے اب روک نہ سکو۔ بنگلان کے لیے روکنا ابھی نہیں۔ میں نہیں، بیوٹہ یاد رکھوں گا۔ رابطہ کروں گا۔“

”میں نے ان کے پاس بندے چھوڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت تک وہیں رہے جب تک وہ چلے نہیں گئے۔ جس وقت وہ چل دیے تھے، اس وقت سندھل نے ایک خط دیا ہے تمہارے نام، جاتے ہوئے انہی دو بندوں کو تھما گئے تھے۔ وہ ابھی لائے ہیں میرے پاس۔“

میں خط پڑھ چکا تو کچھ دیر تک اس کے اثر میں رہا۔ پھر باغیہ گور کی آواز پر چونکا

”کاش میں اتنا پڑھا لکھا ہوتا۔ یہ عمر بڑی میں ہے۔ میں ایسے کرتا ہوں، اس خط کی تصویریں تمہیں ابھی بھیج دیتا ہوں، تم اسے پڑھ لو۔“ اس نے کہا۔

”ہوں، دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ مجھے اب بھی کیسٹ کو تلاش کرنا تھا جو بہت زیادہ بھر بے کار ہو اور وہ اس فارمولے کے مطابق کام کر سکتا ہو۔ اس وقت میرے ذہن میں دو رنگ کوئی ایسا بندہ نہیں تھا۔ میں نے سمجھ اس بارے میں معلومات کا سوچا اور سونے کی تیاری کرنے کے لیے اٹھ گیا۔ اسی وقت جہاں کا فون آگیا۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

”چلو شیخ دو۔“ میں بولا تو اس نے فون بند کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے وہ خط تصویروں میں بھیج دیا۔

”یار، تمہارے لاہور میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ یہاں تو اس کا نام سندھپ کور تھا، اسے پکڑنا ہے، اس کے چیتھے لوگوں کو پکڑنا ہے، میں اس کا پتہ اور تصویر بھیج رہا ہوں، وہ ہماری ایک بہت اچھی دوست کی بہن ہے۔“

”کیا لکھا ہے۔“ باغیہ گور اٹھ کر بیٹھ گئی تو میں پڑھا ”محترم جمال! میں نے کہا تھا کہ میرے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر میں اس احسان کا بدلہ دوں گا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ میرے جائے کے بعد آپ میرے احسان مند ہوں گے تو میں ایک اہم بات بتا رہا ہوں، جس سے انسانیت کا بہت بھلا ہونے والا ہے۔ میں نے جو پہلی دوا تیار کی تھی، اس وقت میرے ذہن میں یہ تھا کہ وہ لوگ جو عادی مجرم ہیں اور انسانیت کے لیے قاتل ثابت ہو رہے ہیں، ان کا ذہن بدلنے کے لیے دوا استعمال کرائی جائے۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے ذہن لوگوں کو اور زیادہ ذہین بنایا جائے۔ لیکن ہوا کیا اس کے الٹ۔ میری اس دوا کے بل بوتے پر ایک ایسی فورس تیار کی جا رہی ہے، جو دوسرے ملکوں میں جا کر تخریب کاری کریں۔ میرے ملک میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور اس فورس کی تیار کردہ کچھ لڑکیاں تمہارے ملک میں بھی آچکی ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ مقامی بندہ کون ہے۔ لیکن یہ تو کر سکتا ہوں کہ سہمیں آگاہ کر دوں۔ میں نے جو دو شیشیوں کے ساتھ خط تمہیں دیا ہے، اس میں ان دو لوگوں کا فارمولا تمہیں لکھ کر دے دیا ہے۔ یہ فارمولا پہلی دوا کے ساتھ ہی دوسری دوا کا بھی لکھا ہوا ہے۔ ان کے بارے

”تمہاری دوست کی بہن، ویسے کون ہیں وہ لوگ؟“ میں نے پوچھا تو اس نے اختصار کے ساتھ وہ ساری کہانی سنائی۔ پھر کہا۔

”یہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں، اس کی آڑ میں کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں دیکھ لیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون سے تصویر دیکھنے والا آپشن کھولتے ہوئے کہا۔ اس پر باغیہ گور نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”گناہ سے کوئی کام نکل ہی آیا۔“

”ہاں گناہ تو ایسے ہی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے

”میں نے ان کے پاس بندے چھوڑے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت تک وہیں رہے جب تک وہ چلے نہیں گئے۔ جس وقت وہ چل دیے تھے، اس وقت سندھل نے ایک خط دیا ہے تمہارے نام، جاتے ہوئے انہی دو بندوں کو تھما گئے تھے۔ وہ ابھی لائے ہیں میرے پاس۔“

اسے وہ سب بتا دیا جو چہال گنجھ نے مجھے بتایا تھا۔ اس نے بیڈ کی پشت گاہ کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
”اسر تھر وہاں کہاں؟ میری نگاہ میں تو ایسا کوئی ادارہ نہیں، کہاں ہو سکتا ہے؟“

”یہ تم جانو اور تمہاری یادداشت۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ اس نے بے پروائی کے سے انداز میں کہا اور اس لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی۔ سندھ پ کور انجمنی خاصی حسین لڑکی تھی۔ بھرا بھرا جسم، گول چہرہ، مہنی نیلی آنکھیں، تلوار ناک اور پتے پتے ریلے لب۔ چند لمبے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے طارق نذیر کو فون کیا۔ وہ شاید میرے ہی انتظار میں تھا۔

”وہ ناؤن میں جو حادثہ ہوا، اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوا ہوگا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
”صرف اتنا کہ چند لوگ آئے اور حملہ کر کے غائب ہو گئے۔“

”چلو، اب تم ایسا کرو، اپنے چند لوگ ساتھ لو، جب تیار ہو جاؤ تو مجھے بتانا، بہت ہی اہم مشن تمہارے ذمے لگا رہا ہوں۔“

”جی میں تیار ہوں جہاں کہیں گے پہنچ جائیں گے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

”میں وہیں تمہیں ملوں گا۔ میرے ساتھ میری ایک ساتھی بھی ہوگی، ہوگی کا مطلب ہوگی۔“

”جی میں سمجھ گیا، میں نکل رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ ہمیں وہاں سے نکلنے میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت لگا۔

نمبر کا پل پار کرتے ہی میں نے طارق کو فون کیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں نے ایک پوائنٹ پر اسے رُک جانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم آپس میں جا ملے۔ اس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ وہیں ساتھ میں ایک مارکیٹ تھی۔ وہاں موجود ایک ریسٹوران میں ہم جا بیٹھے۔ وہ بندے اس گھر کی جانب بھیج دیئے

تاکہ ایک چکر لگا آئیں۔ طارق بار بار ہانپتا کوری طرف دیکھ رہا تھا۔ جس پر وہ محض ہنس کر رہ گئی۔

”میں اصل میں یہاں اس لیے رکا ہوں کہ پلان کے بارے میں بات کر کے کھینچا ہو جائیں۔“ یہ کہہ کر میں ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”اس علاقے میں تم لوگ گھروں کے بارے میں جانتے ہو، سیکورٹی بھی ہوگی اور اندر سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔“

”اس کا میں نے بندوبست کیا ہے۔ پولیس فورس کی مدد لی ہے، اگر آپ کہیں تو انہیں بلوالیں۔“ طارق نے پوچھا تو میں نے کہا۔

”اگر اندر سے مزاحمت ہوگی تو ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہوگا۔“

”میں کہتا ہوں، آخر اس آپریشن کے بارے میں جواب بھی تو دینا ہوگا۔“ اس نے فون سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن یہ لڑکی ہر حال میں زندہ چاہئے۔“ میں نے سیل فون پر اس کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ سب نے تصویر دیکھ لی۔ ایسے میں ان دو بندوں کی طرف سے کال آگئی، جنہیں گھر دیکھنے کو بھیجا تھا۔ طارق نے وہ کال سنی، پھر بتایا

”وہاں مکمل خاموشی ہے۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں ہو سکتا ہے۔ اندر ہو۔ وہ کوئی صرف سامنے سے کھلی ہے، باقی تین اطراف میں گھر ہیں۔“

”چلو نکلیں۔“ میں نے کہا تو ہم سب وہاں سے نکلنے چلے گئے۔

وہ سڑک مین روڈ سے دائیں جانب نکلی تھی۔ دور تک جاتی ہوئی اس سڑک پر اسٹریٹ لائٹ کی کچلی روشنی تھی۔ وہ کوئی آگے جا کر دائیں جانب آنکھوں تھا۔ وہ ایک کنال پر تھی، جس کے وسط میں رہائشی عمارت تھی۔ میں نے اس کو کھینچ کے مین سامنے جا کر کاررو کی سرب تک ہم دونوں اسلحہ سے لیس ہو چکے تھے۔ ہم نے جو نکلیں پہنی تھیں۔ اس میں سب کچھ تھا۔ ہم دونوں نکلے اور گیٹ پر

اچھا خاصہ زلیخہ، بڑی تعداد میں نوٹ، ایک ڈائری، لپ، ناپ، اس کے علاوہ دوسرا ایسا کوئی سامان نہیں ملا جس سے وہ مشتبہ ثابت ہو سکیں۔ جہاں نوٹ تھے، وہاں سے دو پاسپورٹ بھی ملے، سندھپ کور کا نام اس پاسپورٹ پر سناڑو تھا، اور اس کے شوہر کا نام خرم اقبال تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ادھر ہی ہے۔

رات کے دو بجے کو آگئے لیکن ان کا پتہ نہ تھا۔ تقریباً سوادو بجے کے قریب باہر سے اشارو مل گیا کہ وہ آگئے ہیں۔ سچی الرٹ ہو گئے۔ گھر کے اس ملازم کو بتادیا تھا کہ انہوں نے ہمارے کہنے کا ذرا سا بھی انکار کیا تو موت کے حوالے ہو گا۔ اس کی بیوی بیمار سے پاس تھی۔ باہر اس نے کارروائی اور بارن دینے لگا۔ سچی الرٹ اسی ملازم نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ تو باقی گاڑی سمیت اندر آگیا۔ اس وقت تک ہم داخلی دروازے کے پیچھے آگئے تھے۔ وہ نشے میں تھا۔ اس لیے جلدی سے اندر آنا چاہتا تھا۔

سندھپ کور تصویر سے زیادہ حسین تھی۔ اس نے جو لباس پہنا ہوا تھا، اس میں وہ آدھی سے زیادہ برہنہ تھی۔ بلاشبہ اس نے بھی پی رکھی تھی۔ وہ جیسے ہی جھوٹکی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ اندر آئی، ان کی کٹلی پر ہاسٹل دکھ دیا گیا۔ ان کے لیے یہ جاننا کف تھا، خرم کو کوئی مزاحمت نہ کر سکتا لیکن سندھپ نے انصراری طور پر اپنا پی ڈاکر کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے وہ تربیت یافتہ تھی۔ تین باغیتہ کور نے اسے مردن سے پکڑا اور ذرہ سے قالین پر پھینک دیا، پھر ہاسٹل اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے سر دھبے میں کہا۔ ”اب کوئی حرکت مت کرنا سندھپ کور۔ ورنہ تیرا بدن چھلنی مروں گی۔“

اس کے یوں کہنے پر وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ تب تک دوسرے لوگ بھی آگئے۔ انہوں نے تیزی سے دونوں کو باندھا اور خرم کو باہر کھڑی باقی ایس دین میں ڈال دیا۔ جبکہ سندھپ کور کو ہم لے گئے۔ بعد والوں نے ان دونوں ملازمین کو قاضی اٹھایا۔ وہ اسی کارروائی میں تھے کہ ہم وہاں سے نکل پڑے۔

چلے گئے۔ اس دوران ایک لڑکا باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ اس نے اندر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ باغیتہ کور نے اسے اشارہ کیا کہ اندر سے جانا کر گیٹ کھول دے۔ وہ اندر کود گیا۔ پچھلی دیر بعد اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ باقی میرے پیچھے آگئے، دو بندہ سے گیٹ کے پاس رک گئے۔

میں داخلی دروازے پر پہنچا اور اسے کھولا، وہ کھل گیا۔ سامنے صوفے پر دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک عورت تھی اور دوسرا مرد تھا جو سامنے دیوار پر لگنی وی میں کھوئے ہوئے تھے۔ جہاں کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ میں اور باغیتہ کور دہے قدموں ان کے سر پر جا پہنچے اور ہاسٹل کی مال ان کے سروں پر رکھ دی۔ وہ ایک دم ہی سے سہم گئے۔ عورت کی تو کھلی بندھائی۔ وہ دونوں گھر کے مالک نہیں لگ رہے تھے۔

”جی جی، خدا کے لیے ہمیں کچھ نہ کہیں۔“ مرد ہمت کر کے بولا۔

”گھر میں اور کون کون ہیں؟“ باغیتہ کور نے پوچھا۔
”کک۔ کک۔ کوئی نہیں، صاحب اور بیگم پادری میں گئے ہوئے ہیں۔“ مرد نے کہا۔

”کب آئیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”پتہ نہیں جی، سب آتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے

کہا تو میرے ساتھ کھڑے ایک بندہ نے میرا اشارہ پا کر انہیں باندھنا شروع کر دیا۔ پھر انہیں کمرے میں لے گئے۔ طارق سمیت اب سب انفارم ہو گئے کہ اندر کیا ہوا۔ میں جلدی سے بیڈروم میں گیا۔ وہاں سامنے دیوار پر شادی کی تصویر تھی۔ سندھپ کور عروسی جوزے میں غصہ ڈھاری تھی۔ باغیتہ کور کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں نے فوراً طارق کو بتایا اور قی ہدایت دے دیں۔ جس سے ان کی آمد کو بالکل فطری کر دیا گیا تھا۔ جیسے انہیں احساس ہی نہ ہو کہ اندر کوئی ہے۔ یہ سب کرنے کے بعد گھر کی تلاشی لی جانے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی بھرپور تلاشی کے بعد ایک کمرے سے چھوٹا سا ملا،

آدھے گھنٹے میں ہم اسی سیف باؤس میں آچکے تھے۔ سندھپ کو کو ایک کمرے میں لے جا کر ایک کمری پر بٹھا دیا۔ وہ ہمارے سامنے تھی۔ اس کی آنکھوں میں رتی بھر خوف نہیں تھا۔ یوں جیسے وہ مجھے انتہائی غرور سے دیکھ رہی ہو۔ مجھے اس کی آنکھیں دیکھ کر وہ لوگ یاد آنے لگے، جنہوں نے ریستوران میں مجھ پر حملہ کیا تھا اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہے تھے۔

”کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“
”کچھ نہیں، ہم نے تو تجھے بچا لیا ہے۔“ بانیتا کو نے کہا تو وہ غرور سے بولی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ سر مارتے ہوئے بولی۔
”کیوں، ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟“ بانیتا کو نے کہا۔
”پھر مجھے اس طرح ہاندا جائیوں ہو، ہاں ہے، مگر تم لوگ میرے ہمدرد ہو تو مجھے کھول دو۔“ وہ طنز سے لہجے میں بولی۔
”کھول دو۔“ میں نے کہا تو بانیتا کو نے ایک نگاہ میری طرف دیکھی اور پھر برا سامنے بنا کر اسے کھولنے لگی۔ اسے کھولنے کی دیر تھی۔ وہ انتہائی تیزی سے یوں لگی جیسے بجلی کو گدگدائی ہو۔ اس نے ایک ہاتھ بانیتا کو کی ٹھوڑی کے نیچے ٹروٹ پر رکھا اور اسے پرے دھکیل دیا۔ بانیتا لڑکھڑائی، اس نے اسی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھایا اور اپنا جھنڈا اس کے پیٹ میں مارا، وہ دہری ہو گئی، سندھپ نے اپنی تہی اس کے سر پر ماری اور اسے مڑا دیا۔ بانیتا کو گواہ میدان میں تھی کہ وہ ایسا کرنے کی پائرسکتی ہے۔ اسی لمحے سندھپ نے پہلا ٹک لگائی اور دروازے کی جانب بڑھنا چاہا۔ تب تک بانیتا کو راتھ تھی اور وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس پر چبھتی، میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سندھپ یوں اس کی پیچھے سے لگی کہ وہ اس چھوٹھی نہنگی بانیتا کو راتھ میں آئی تھی اور یہی غصہ ایک فائبر کے لیے جان لیوا ہوتا ہے۔

سندھپ گھوٹی اور اس نے بانیتا کو بڑھا ہوا ہارڈ پکڑ لیا۔ پھر ایک جھک کا دیا وہ پھر لڑکھڑائی۔ اس بار سندھپ نے حملہ نہیں کیا بلکہ مجھے نگاہ میں رکھتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھی۔ اس نے میرے اور دروازے کے فاصلے کا تعین کر

لیا تھا۔ اسی مناسبت سے وہ آگے بڑھی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ باہر نکل جائے گی، میں اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے مجھے دور رکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو یوں بڑھایا کہ جیسے وہ مجھ پر حملہ کرے گی۔ میں جیسے ہی اس کے قریب گیا اس نے پوری قوت سے کھڑی پھٹکی میرے منہ پر مارنا چاہی، میں اسے جھکائی دے گیا۔ لیکن اس کی انگلیاں میرے چہرے کو چھو گئیں۔ بھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ وہ جھپکے کی طرف زور لگانے لگی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بڑھک کر فرش پر گر گئی، پھر جیسے ہی جب لگا کر اٹھی اور باہر کی طرف کھڑکی کو دے ہوئے پوری قوت سے پٹخا میرے منہ پر مارا۔ بھی میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گرفت میں لے لیا۔ یہ سب کچھ انتہائی تیزی سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا۔ میں نے محسوس کیا جیسے سندھپ کی جان ہی نکل گئی ہو۔ اس کا جسم ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یوں میرے ساتھ لگ گئی جیسے میرے بدن میں گھس جانا چاہتی ہو۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ یوں خمار آلود انداز میں میرے ساتھ چپٹ کی جیسے وہ بھرپور نشے میں ہو۔ میں چونک گیا کہ اسے کیا ہوا۔ اس وقت تک بانیتا کو راتھ تھی اور تیزی سے سندھپ کی طرف آئی، اس نے آتے ہی اسے ٹروٹ سے پکڑا اور پیچھے کر چبھنے کی طرف لے گئی، سندھپ نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی، بانیتا کو بھی اس کے ڈھیلے اور بے جان جسم کو محسوس کر کے حیران ہو گئی۔ اس نے سندھپ کو مارا نہیں بلکہ اسے چھوڑ دیا۔ وہ ایک لٹھ کو یونہی پیچھی رہی، پھر یوں لگی جیسے نشے میں ہو۔ اس نے میری جانب دیکھا اور میری طرف آئی۔ میں کھڑا رہا۔ وہ میرے ساتھ لٹک گئی۔ پھر اپنا چہرہ آہستہ آہستہ میرے سینے سے رٹنے لگی۔ چھوٹی ٹھون بعد اس کے منہ سے سسکاراں نکلتے لگیں جیسے وہ بے تحاشانہ ت محسوس کر رہی ہو۔ میں اس کی یہ حرکت قطعاً نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اس کو دونوں کانڈھوں سے پکڑا اور اسے

بدن میں رچ چکی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی مہک لگا ہے۔ جس نے مجھے ایک نئے جہان سے آشنا کیا۔ یہی مہک میرا بدن مہکا دیتی ہے، آگ لگ جاتی ہے مجھے، آؤ اب دیر مت کرو، مجھے سمجھو ڈالو.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بدن پر ہتھ بونی تختصری شرت زور سے پکڑ کر پھاڑ دی۔ وہ پورے سینے سے ہر ہند ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نرمی سے کہا۔

”ابھی وقت نہیں،“ پھر باہر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ”میں اسے بھیج دوں، اتنے میں تم فریش ہو جاؤ۔ پھر بیدار ہو میں چلتے ہیں۔“

میرے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے مان گئی۔ وہ اٹھی اور کسی رپورٹ کی طرح ہاتھ روم کی جانب چل دی۔ اس نے دروازہ کھلا رہنے دیا۔ اتنے میں بائیتا کور نے جھانک کر دیکھا تو میں نے اشارے سے اسے بلا یا اور اس کی جانب اشارہ کر کے چپ چاپ نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔

آخر یہاں آدھے گھنٹے بعد وہ پورا لباس پہنے آ گئی۔ وہ کافی حد تک ہوش میں تھی۔ میں نے اسے خود سے پرے رکھا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں کو کچھ کھانے کے لیے کہا۔ تھا، وہ کافی کچھ پھل، بسکٹ اور کیک کے ساتھ چائے دے گئے۔ ہم ڈائننگ ٹیبل کے اطراف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے میری جانب دیکھا اور شرمندہ سے انداز میں کہا۔

”سوری، میں پاگل ہو گئی تھی۔“
”دیکھو! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، بلکہ تمہارے دوست ہیں۔ ہم تمہیں قطعاً نقصان نہیں پہنچانے والے بلکہ ہم تو بچن کور کے.....“

”بچن کور، تم جانتے ہو اسے؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، میں جانتا ہوں اور اسی کے کہنے پر یہاں آئے ہیں، اور اب تمہیں واپس لے کر جانا ہے، تم غلط باتھوں میں پھنس چکی ہو، یہی تمہیں بتانا تھا، ٹھہرو، میں تمہاری

لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ یوں میری جانب دیکھنے لگی، جیسے کسی پیاسے کے منہ سے پانی کا پیالہ بنا لیا جائے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی بجائے ایسی قربان ہونے والی جاہت جھانک رہی تھی کہ میں ایک لمحے کے لیے ہلکا گیا۔ اسے ہوا کیا ہے؟ یہی سوال میرے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ بھی بائیتا کور نے اس کے منہ پر زبانی دار پھنسا رہے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں، اب جو چاہو کرو، میرا بدن حاضر ہے۔“ سندھپ نے میری طرف یوں دیکھ کر کہا جیسے اس نے اپنا آپ مجھے سوپ دیا ہو۔ بائیتا کور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس سے پھر پوچھا لیکن میری سمجھ میں سندھپ کی بات گونج گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ مہک صنف نازک کو پاگل کر دینے والی ہے۔ کیا سندھپ اس قدر پاگل ہو گئی ہے؟ بائیتا کور بھی تو صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے، اس کچھ کیوں نہیں ہوا؟ میں نے بائیتا کور کو اشارہ کیا، وہ باہر نکل گئی۔ میں اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے محبت پاش نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”کوئی اتنی جلدی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا، میرا اپنا ہی کوئی مجھے پہچان سکتا ہے۔“

”میں تو تمہارا اپنا نہیں ہوں، تمہارے کیسے جان لیا کہ میں تمہارا اپنا ہوں۔“ میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ بھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ مہک دنیا میں کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ یہ صرف ہمارے ہی لوگ لگاتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں سندھپ اور جہاں سنگھ کی باتیں میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ میں نے اسی لمحے جیترا بدلتے ہوئے کہا۔

”تو پھر یہ بہت بڑی کمزوری ہوئی۔ کیا اتنا اثر لینے ہو تم لوگ؟ کیا باقی نزکیاں بھی اسی طرح مد ہوش ہو جاتی ہیں؟“

”نہیں، ایسا نہیں ہے، شاید دوسری ایسی مد ہوش نہ ہوتی ہوں لیکن میں ہو جاتی ہوں۔ یہ مہک میرے تن

بچن کور سے بات کراتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سہل فون پر بچن کور کے نمبر لائے۔ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ وہ ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہیلو۔“

کیا ہوا، وہ ٹھیک تو ہے۔“

”اب قدرے نارمل ہے۔ بچن کور سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”یہ سنا تھو ہی بیٹھی ہے۔“ اسی نے کہا تو بلاشبہ اس نے فون بچن کی جانب بڑھا دیا۔ ابھی اس نے ہیلو کہا تو میں نے فون سندھپ کور کی جانب بڑھا دیا۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ سندھپ کور رونے لگی۔ آخر میں اس نے یہی کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے تم کہو، میں وہی کروں گی۔“ یہ بہ کر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس سے بات کر کے فون بند کر دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ میں نے فون پیپ میں رکھا اور اسے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کھانے لگی اور اس دوران رونی رہی۔ میں نے اسے روکنے دیا۔ پھر لکھت ہوئی۔

”پوچھیں، کیا یہ چھنا ہے آپ لوگوں نے؟“

”جہاں کی نہیں۔ تم چھنا کھاؤ۔“

وہ سنوں سے کھانے لگی۔ پھر خود ہی بتانے لگی۔

”میں امرتسر سے ہوں۔ اور وہیں سے آئی ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہارا وہ انسٹیٹیوٹ کہاں ہے امرتسر میں؟“ پانچ کور نے پوچھا تو وہ بتانے لگی۔ سندھپ کور جروہ بات بتانی چلی گئی جو ابھی اس سے پوچھا گیا۔ میں نے کبھی بار کسی کو ایسے دیکھا تھا، جس نے اتنی نفرت دکھائی اور پھر اس قدر تا بعد ارمی سے سب کچھ بتائے چلی جا رہی تھی۔ اس وقت صبح کے آثار واضح ہونے لگے تھے۔ جب ہانپا کور اسے ایک کمرے میں چھوڑتی۔

میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ اس پر اعتبار کروں یا نہ کروں اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ خوشبو نے مجھے پکرا کے

رکھ دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کا آپس میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ اور وہ اس بھی اس سے کہیں الگ نہیں تھا۔ یہ راز کب نکلتے گا، مجھ اسی کا انتظار تھا۔ میں جلد از جلد باس تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں سو یا نہیں، بلکہ میں نے سب سے پہلے اروند سے رابطہ کیا۔ اسے ایسے ہی ادارے کے بارے میں بتایا۔ اروند نے اسی وقت کراچی سے فہیم کو آن لائن لے لیا۔ وہ ابھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے تھوڑی سی غینہ لیتے کے بارے میں کہا اور اپنے کمرے میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مجھے غینہ نہیں آئی۔ میں بیڈ پر لیٹنا سوچ رہا تھا کہ مجھے سندھپ کے خط کا خیال آیا۔ میں اٹھا اور اپنے سلمان کی طرف گیا۔ وہاں سے وہ بیکٹ لیا جس میں دو انیاں اور لفافہ تھا۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں دو پرچے تھے۔ ایک پر قلمرو لے کی زبان تھی اور دوسرے میں ان دونوں دوانیوں کے بارے میں درج تھا۔ وہ دو جو پہلی دوانی کا اثر توڑنے والی تھی۔ سندھپ کور کے بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے درج ہدایات کے مطابق وہ دوانی اور سندھپ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ایک گلاس پانی میں ایک قطرہ ریٹا تھ۔ وہ میں پانی کے گلاس میں ڈالا اور اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سونے کی کوشش میں تھی۔ میں وہ پانی اسے پینے کو دیا۔ وہ پانی پی گئی۔ میں وہاں سے آ گیا۔ بونے سے پہلے میں اس سیف ہاؤس کے بیڈ کو امرتسر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر غینہ لے لوں۔

جہاں اس وقت واپس آئی

جہاں اس وقت واپس آئی وہی کی جانب چل پڑا تھا، باقی سب میں سے آدھے چاندھری کی جانب چلے گئے اور آدھے واپس کور چلے گئے۔ نو تن کور کو فارم ہاؤس پر رہی رہنے کو کہا گیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ چھوٹا دن تک اس انسٹیٹیوٹ کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔ پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔ اس دوران انکیشن مہم میں کسی کو بھی ضرورت پڑنی ہے تو اس میں مدد کی جائے گی۔ جہاں کو مہم تیز کرنے کے بارے میں جلد یا گیا

تھا۔ اسی لیے وہ اوگی پنڈ کی طرف چل پڑا تھا۔

جسپال اس وقت اوگی پنڈ سے تھوڑی ہی فاصلے پر تھا جب اسے ہر پریت کی کال ملی۔

”وہ کہاں ہے؟“ اس نے اچھے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ لیکن لہجہ کسی پریشانی کی بجلی کھا رہا تھا۔

”خیریت تو ہے ہاریتو؟“ اس نے خوشگوار انداز میں کہا، جس پر وہ قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اوگی تھا نے سے پولیس آئی ہے، ان کے ساتھ گورد کی بھی پولیس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ اور.....“ اس کے ساتھ ہی ہر پریت کی آواز آنا بند ہو گئی لیکن فون کال نہیں کٹی تھی، اگلے ہی لمحے کسی

بھاری آواز واسے نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”اور اگر تم نہیں آئے تو ظاہر ہے ہمیں یہیں سے کسی کو لے کر جانا ہوگا۔ تم کب تک پہنچ رہے ہو۔“

”دیکھو۔! گھر کی کسی عورت سے بدسنی نہ ہو۔ اور تم لوگ گھر سے باہر نکل کر میرا انتظار کرو، میں دس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔ میں گھر کے قریب ہی ہوں۔“

”ارے، تم بھاگ کیوں نہیں جاتے، ہم تمہیں ہار پہنانے نہیں، گرفتار کرنے آئے ہیں، اور ادھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ دس منٹ ہی ہیں تمہارے پاس۔“ یہ

کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

جسپال نے وقت دیکھا اور سب سے پہلے فون کوڈ کر کے انتہائی اختصار سے ساری بات بتا دی، پھر فون بند کر کے انوجیت سے رابطہ کیا، اس نے فون رسو کیا تو

پتہ چلا کہ اسے ابھی پتہ چلا ہے اور وہ گھر کی طرف آ رہا ہے۔ جسپال نے بلبر سنگھ پنچ کو فون کرنے کا کہا اور فون بند کر کے جیب میں رکھنے کی بجائے ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی پنڈلی کے ساتھ رکھا ہوا سفل نکال

کروا جس رکھ دیا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گھر کی جانب چل پڑا تھا۔

اس نے دور سے ہی دیکھ لیا۔ اس کے گھر کے سامنے کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جسپال کو یہ اندازہ ہو گیا

کہ وہ یونہی نہیں آئے ہیں، بلکہ کوئی پکا کاغذ لے کر ہی آئے ہوں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اس لیے اس نے کار لے جا کر گیٹ پر روک دی۔

پھر بڑے سکون سے اتر کر اندر چل دیا۔ راستے میں جا بجا پولیس والے کھڑے تھے۔ بھی پورچ میں وہی اسے سی پی دکھائی دیا۔ جسپال چلتا ہوا اس کے پاس جا ٹھہرا۔

”ویل کم، جسپال سنگھ ویل کم، دیکھو، میں تمہیں تمہارے گھر پر ہی تمہیں ویل کم کہہ رہا ہوں۔ خیر! میں تمہیں مجند سنگھ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک ذمہ دار آفیسر ہیں، بنا کسی گیدڑ بچکی کے آپ نہیں آئے ہوں گے۔ دکھائیں گے مجھے وہ گیدڑ بچکی؟“ جسپال نے کہا تو اسے سی پی نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اور طنز یہ لہجے میں کہا۔

”یہ لو۔“

جسپال نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔ اسے شک میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اس نے وہ کاغذ اپنی جیب میں رکھا اور اسے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ گھر سے باہر رہنا، مگر تم پھر بھی اندر آ کر بیٹھ گئے۔ کس کی اجازت سے؟“

”بہت ہوگی اخلاقی گفتگو، اب چلو۔“ پھر اپنے کسی ماتحت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”گرفتار کر لو اسے؟“

اگلے ہی لمحے ایک پولیس مین آگے بڑھا اور اس کے ساتھ کڑی لگا دی گئی۔ جسپال نے دیکھا، دروازے کی اوٹ میں سے ہر پریت اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھایا اور پلٹ پڑا۔ انہی لمحات میں انوجیت کی کار اندر داخل ہوئی۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور تیزی سے بولا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ لوگوں کو خبر نہیں کہ.....“

”بھی اسے سی پی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”تم اگر انکیشن میں امیدوار ہو تو صرف امیدوار ہی

نہیں افق

125

مارچ ۲۰۱۵ء

”ولید! خیر تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”خیر ہی ہے، آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو بتاتا ہوں
 ناجی میں۔“ وہ اسی لہجے میں ہی بولا۔
 ”کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں کل سے یہیں لاہور ہی میں ہوں۔ آپ کی
 فون کال کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے بتایا
 ”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

میں نے ایک دم ہی اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر
 لیا۔ میں فون بند کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس وقت سندھ
 کو اپنے کمرے میں تھی اور پانچ گھنٹے جاگ گئی تھی۔ میں
 نے اپنے چھ دیوہاں جانے کے لیے کہا اور کارے کرنگل
 گیا۔ میرا رخ علامہ اقبال ٹاؤن کی جانب تھا، جہاں ولید
 میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں جس وقت نہر کے پل پر پہنچا اس وقت مغرب ہو
 چکی تھی۔ میں نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسی وقت
 میرے من میں نجانے کیوں شاہ جمال کے مزار پر مٹے
 والے وہی سفید ریش بزرگ مجھے یاد آنے لگے۔ میں سمجھ
 رہا تھا کہ یہ یاد یونہی نہیں ہے۔ اس لیے جیسے میں فیروز پور
 روڈ پر چڑھا تو پھر چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ بابا شاہ جمال
 کے مزار تک جا پہنچا۔ میں نے کار پارک کی اور اندر چلا
 گیا۔ میں نے دیکھا وہی بزرگ انہی قبروں کے درمیان
 سفید کپڑا بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں مسکراتے ہوئے
 ان کے پاس چلا گیا، انہوں نے میری طرف دیکھا اور
 گہری سنجیدگی سے کہا۔
 ”آؤ بیٹھو۔“

میں ان کے سامنے جا بیٹھا۔
 ”کیا میں نے تمہیں دیا نہیں دکھایا تھا، اسی کے
 بارے میں بتانا نہیں، کیا تم اسے نہیں سمجھتے ہو؟“
 ”حضور! اگر میں نہیں سمجھا تو آپ پھر سے مجھے سمجھا
 دیں۔“ میں نے عاجزی سے کہا تو چند لمحوں میری طرف
 دیکھتے رہے، پھر بولے۔
 ”جیسی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کثرت جو ہے یہ

رہو، قانون کے راستے میں مت آؤ۔ ہم نے اسے ہر
 قیمت پر لے کر جانا ہے سمجھے، اس لیے خاموش ہو جاؤ۔“
 ”تم غلط کر رہے ہو، میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔“
 ”تم کچھ بھی نہیں جانتے ہو۔ پرے ہٹ جاؤ۔“ اسے
 سی پی نے حقارت سے کہا تو سیال نے سر دھکے میں کہا۔
 ”اے سی پی، اپنی بکواس بند رکھو، اور کتے کی طرح
 بھونکنے بند کرو۔“

اس پر اے سی پی نے حیرت اور غصے سے اس کی
 طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا تو وہ بولا۔ ”شٹ اپ۔“ جب
 میں حیرے ساتھ چارباہوں تو چارباہوں، کسی بھول میں
 مت رہنا کہ تم مجھے گرفتار کر کے لے جا رہے ہو۔ میں
 چاہوں تو اب بھی حیرے ساتھ جانے سے انکار کر سکتا
 ہوں۔ جاتا ہے یا ادھر ہی رہتا ہے۔“

غصے میں اے سی پی سے بولا نہیں گیا۔ اس نے گھور کر
 دیکھا اور اپنے لوگوں کو اشارہ کیا۔ وہ اسے لے کر چل
 دیے۔ سیال چلتا ہوا پولیس وین میں جا بیٹھا۔ اس کے
 بیٹھے ہی وین چل دی۔

نہ..... نہ..... نہ.....

سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں نہایا تو وہی بھنی بھنی مہک پھر
 سے تازہ ہوئی۔ بھوک کا احساس ہونے کے باوجود میرا
 کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں لان میں چلا
 گیا۔ وہیں مجھے چائے دے دی گئی۔ میرا ذہن باس میں
 الجھا ہوا تھا۔ اس کی فون کال نہیں آئی تھی۔ اردو اور فہم بھی
 اسے تلاش نہیں کر پائے تھے۔ تھوڑا بہت اگر کامیابی فی
 بھی تھی تو پھر بھی کفر نہیں کر پائے تھے۔ میرا اضطراب
 بڑھنے لگا۔ میں اب اردو یا فہم کو بار بار فون کر کے شک
 نہیں کرتا چاہتا تھا۔ میں چائے لی رہا تھا کہ ولید کی کال آ
 گئی۔ میں نے رسیو کرتے ہوئے کہا۔

”سوری۔ میں دوبارہ رابطہ نہیں کر سکا، میں۔۔۔۔۔۔“
 ”نہ، آپ مصروف ہوں گے، بھی رابطہ نہیں کیا، میں
 اب بھی نہ کرتا اگر مجھے آپ سے ایک اہم کام نہ ہوتا۔“
 اس نے کافی الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

وحدت سے ہے اور وحدت ہی سے ساری کثرت ہے۔ ہر انسان ایک دوسرے سے جدا ہوا ہے۔ کوئی تم سے جدا ہے تو کیوں نہیں تم اس سے جڑ جاتے ہو۔ بس ذرا سا دھیان دو۔“

”کیسے؟ کیسے دھیان دوں باباجی؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔
”اچھا تمہیں پھر ایک اور بات بتاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ ”تمہارے خیال میں دینے کی حقیقت کیا ہے؟“

”مصور آپ بہتر سمجھتے ہیں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”دینے کی حقیقت روشنی ہے۔ روشنی نہ ہو تو دیا بھی نظر نہیں آتا۔ میں تمہیں کھول کر فی جان کر دوں، ویسے تو روشنی نے وجود پایا ہوا ہے۔ دینے کو جسم سمجھ لو اور جسم میں روشنی نہ ہو تو کسی کی بھی پہچان ممکن نہیں ہے۔ روشنی کی حقیقت سمجھ میں آئی تو سمجھ لو کوئی بھی تم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”روشنی کی حقیقت کیا ہے؟“ میں نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔ تو بولے۔

”جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو اس کے سامنے زمان و مکاں ظاہر ہو جاتا ہے۔ دن، رات اور دن رات کے اندر انقلابات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور جو حقیقی زمانہ ہے وہ اس کے اندر ہے اور یہ اس کی ایک جھلک ہے۔ یہ سلسلہ دروزو شب ہی ہے جس میں زندگی اور موت دیکھی جا رہی ہے۔ مطلب پیدا ہونا اور مر جانا۔ یہ تغیرات کی نشانی ہے۔ تغیرات اور انقلابات اسی زمانہ کی مسلسل حرکت سے پیدا ہو رہا ہے۔ چونکہ ذات، تغیرات اور انقلابات سے مزہ ہے، اس لیے وہ زمان و مکاں سے بالاتر ہے۔ یہ سلسلہ دروزو شب اس کی تخلیق سے سمجھو کہ فیکون کا سلسلہ ہے۔ ازل کے سارے ایک نذر نکل رہا ہے یعنی زمانہ ذات کی تخلیقی فعالیت کا مظہر ہے اور بقید زمان و مکان میں عالم وجود میں چلی آ رہی ہیں۔ زمانہ بلاشبہ کائنات میں سب

سے بڑا کھرا کھولنے کا پر کھنے والا ہے، چنانچہ جو افراد اور معاملات خالص ہوتے ہیں۔ زمانہ انہیں فراموش کر دیتا ہے۔ سلسلہ دروزو شب کی اصل حقیقت یا اصل زمانہ جس میں نہ دن ہے نہ رات محض حال ہی حال ہے، نہ ماضی سے اور نہ مستقبل۔ یہ زمان خالص ایک رو ہے، جس میں مسلسل حرکت ہے۔ زمانہ زندگی ہے اور زندگی زمانہ ہے۔ اگر زمانے کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو دل میں غوطہ لگاؤ، عشق اختیار کرو کہ عشق اصل حیات ہے اور زمانے کی دستبرد سے بالاتر ہے۔ عشق ہے اصل حیات، موت سے اس پر حرام۔“

”عشق کا زمان کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے؟“ میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

”عشق مومن کے اعمال میں رنگ دوام پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ عشق اصل حیات ہے۔ اس پر فنا طاری نہیں ہوتی۔ اگر چہ زمانہ تیز تر ہند اور انتہائی رفتار رکھتا ہے۔ لیکن عشق اس سے بھی بڑھ کر سبک رفتار ہے۔ اس لیے وہ زمانے پر غالب آ جاتا ہے اور اسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ عشق بڑی کامیابی سے زمانے کا مقابلہ کرتا ہے۔ زمانہ ہر شے کو فنا کر دیتا ہے مگر عشق کو فنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ زمانہ عشق کے سامنے بے بس ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب باباجی یہ بھی فرمادیں کہ روشنی اور عشق میں کیا تعلق ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”وحدت کی روشنی عشق ہے۔ دینے کی مثال سے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح ظاہری روشنی کے بغیر کچھ بھی دیکھنا ناممکن ہے۔ اسی طرح عشق کی باطنی روشنی کے بغیر کسی شے کی حقیقت کو دیکھنا اور جاننا ممکن نہیں ہے۔ اور جان لو کہ روشنی روشنی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔“ انہوں نے خود اطف لیتے ہوئے کہا تو میں نے تجسس سے پوچھا۔

”باباجی یہ کیسے، اس بات کو کھولیں؟“ میرے پوچھنے پر وہ بے ساختہ بولے۔

”اتباع..... اتباع محبوب۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکا سا مسکرائے پھر مجھ کو کہنے لگے۔ ”اللہ کا رنگ کیا ہے، صدف اللہ۔ اللہ کا رنگ، اتباع ہی سے چڑھتا ہے۔ یہ رنگ وہیں سے ملتا ہے۔ اب سنو۔ ایسے کیسے چڑھتا ہے۔“

”حضور فرمائیں۔“ میں نے شوق سے کہا۔

”قطرہ آب نیساں جو صدف کی آغوش میں چھپ جاتا ہے۔ جب اس قطرہ کو خلوت نصیب ہوتی ہے، پردہ میں چلا جاتا ہے خلوت میں گوہر بن کر جلوت یعنی عالم ظاہر میں ظہور پا جاتا ہے۔ جب پانی کی بوند خودی کا عرف یاد کر لیتی ہے، اس میں خودی کی روشنی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بے حقیقت وجود کو موتی بنا لیتی ہے۔“

”واہ، سبحان اللہ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اور وہ جذب میں کہہ رہے تھے۔

”عشق و مستی سے، یگی بے خودی سے، جسم و جان، موت و حیات، مکان و زمان سے گذر کر، دل میں ڈوب کر، خلوت میں، حق سے محکم ہو کر، اپنی خودی کو پا کر پھر کائنات میں ظاہر ہو کر، اپنے جان و جسم کو تسخیر کر کے کائنات کو مسخر کر لو۔“

”عشق کی اس منزل خودی تک فوری طور پر رسائی کیسے ممکن ہے۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”خودی ایک آنکھ سے اپنی خلوت کا مشاہدہ کرتی ہے اور دوسری آنکھ سے جلوت یعنی کائنات کا تماشا کرتی ہے۔ اگر ایک بند ہو جائے تو گناہ ہے اگر دونوں آنکھوں سے دیکھتی ہے تو عین راہ سلوک ہے، یہی طریقت قلندر ہے۔“

”کیسے باباجی۔“ میں نے انتہائی تجسس سے پوچھا۔

”وہی..... جیسے دیے کو روشن ہونے کے لیے اپنے وجود یعنی تیل کو جلاتا پڑتا ہے ویسے ہی قلندر اپنے محبوب سے عشق کی آگ میں جلتا ہے تو خودی کی روشنی حاصل کرتا ہے۔ یہ وہی روشنی ہے جو رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کو دی اور انہوں نے پوری کائنات میں تقسیم فرمادی۔ سن لو۔! خودی کیا ہے، غلامی محبوب ﷺ اور عشق رسول ﷺ ہے۔“

انہوں نے کہا۔ اور جذب سے شعر پڑھنے لگے۔

مقام مصطفیٰ در دل مسلمان است
آبروئے ما از نام مصطفیٰ است
موت و حیات نہیں الثقات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود
پسند روح و بدن کی ہے ذاعلمہ اس کو
کہ نہایت مومن ہے خودی کی عریانی
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کی پیچھے نہ حد سامنے
خودی کی خلوتوں میں کبریا کی
خودی کی جلوتوں میں مصطفیٰ ﷺ
زمین و آسمانوں و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ساری خدا کی
”واہ۔ قلندر راہوری نے خودی کو کیسے بیان کیا۔“

میں نے جذب میں کہا۔

”بس اتنا سمجھ لو، اقا، جب حضرت اقبالؒ کے ہاتھوں میں آئی تو خودی بنی۔“

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اٹھے، سفید کپڑا سمیٹا اور ایک جانب چل دیئے۔

میں نے غور کیا، میرے سامنے سب کچھ کھل گیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں ہاتھ بڑھاؤں گا اور خودی کا جوہر میرے ہاتھ میں ہوگا۔ مجھے خود پر رشک اور اپنے دشمنوں پر پیار آ رہا تھا۔ جن کی کوششوں سے آج میں اس عالی قدر راز تک رسائی حاصل کر گیا تھا۔

میں اٹھا اور چل پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں یہ کائنات تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میرے سامنے ایک نئی دنیا ظور ہو رہی تھی۔

(بانی ان شاء اللہ ستمبر ماہ)



اللہ بخش

انور گریوال

کبھی کبھی انسان کے ساتھ ایسے حالات اور واقعات پیش آتے ہیں جنہیں وہ تاحیات فراموش نہیں کر سکتا۔ قیام پاکستان کے وقت بھارت سے ہجرت کرنے والوں کے ساتھ بھی ایسی ہی کچھ ناقابل فراموش واقعات پیش آئے جو انہوں نازندگی یاد رہیں گے۔ بھارت سے ہجرت کرنے والے ایک شخص کا احوال 'وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، تھا تو معمولی بڑھا لکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی خاص مہربانی سے اپنے ہاتھ ہونے صراطِ مستقیم کی پہچان عطا فرما دی تھی۔

میں نے ملک پاکستان اپنے خاندان سمیت چلا آیا۔ ہجرت کی خیتوں نے یوں آگاہی اس کے جھم میں آئی کہ راستے میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی، خاندان کے باقی افراد چلے آئے مگر وہ سفر کی سہولتیں برداشت کرتا ہوا کئی ماہ بعد اپنے خاندان سے آکر ملا۔ پاکستان میں مختلف شہروں میں قیام کرتے ہوئے آخر گوجرہ (فیصل آباد) میں مستقل قیام پذیر ہو گیا۔ اس نے اپنی اصول پرستی اور فطرتِ سلیم کی بنا پر ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ وہ فلاسٹک و بیورو کے کاموں میں پیش پیش ہوتا تھا۔ دوائی محمد دسی دنیا کا اہم رکن بن گیا۔ اس کی دوسری کامعیار دینداری تھا۔ اند کی قدرت ہے کہ ایک نظریہ کے لوگ اسے بوجھنا کرتے ہیں، خواہ وہ بڑا اچھی ہو یا بری طبیعت۔ یہی دوا قوتیں نظریہ بات ہیں۔ اس نے دیکھا کہ شہر میں بہت سے لوگ اسی نظریہ کے حامی ہیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا اور ان کے شانہ بشانہ چلنے لگا۔ ان لوگوں کا طریقہ تھا کہ دوائی تربیت کے لیے کچھ عرصہ بعد اکٹھے ہوا کرتے تھے، ایک دفعہ اس نے بھی پروگرام بنایا کہ وہ بھی اس اجتماع میں شریک ہو، جہاں دعوتِ حق کے علمبردار اشاعتِ دین کے لیے پورے ملک سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس غرض کے لیے اس نے رنج سفر باندھا، اپنی بیوی کو ساتھ لیا اور اجتماع میں شرکت کرنے کے لیے لاہور پہنچ گیا۔

ان لوگوں کے لیڈر کا قول تھا کہ "آخر تم لوگوں کے راستے میں رکاوٹ نہ آئے، تو سمجھ لو کہ تمہارا راستہ مشکوک ہے۔"

گوجرہ سے مغرب کی جانب کوئی گیارہ کلومیٹر دور ایک گاؤں کا ایک ویران سا چھوٹا قبرستان ہے، جس نے پہاڑی کیکڑوں، سرکنڈوں اور جھاریوں وغیرہ کی بھرمار کی وجہ سے خوفناک سی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ قریبی کھانوں میں مسلسل نہری پانی چلنے کی وجہ سے بھل کے بہت بڑے بڑے ٹیلے بھی ماحول کی ویرانی اور فساد کی میں اضافہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے قرب و جوار میں کوئی آبادی بھی نہیں۔ کئی برس قبل اس قبرستان میں تیس سے زیادہ قبریں تھیں، مگر اب وہ حالات کے بے رحم پھیڑوں کی نذر ہو چکی ہیں۔ اب وہاں صرف تین قبریں باقی ہیں، سال میں ایک دوسرا اس قبرستان کی صفائی کر دی جاتی ہے، پھر چند ہی ماہ بعد ماحول جنگل کا روپ اختیار کرتا ہے۔ زمین شور زدہ اور بکرا بھی ہونے کی وجہ سے قبریں بھی مھر سے لپکتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی مرمت بھی کر دی جاتی ہے۔ یہی ہوئی ان تین قبروں میں دو پیلو پہ پہلو ہیں، ایک میں ماں انجاس برس سے اور دوسری میں بیٹا باؤن سال سے بچہ خواب ہے۔ تیسری قبر ماں کے قدموں کی طرف ہے، اس میں بیٹے کی زوجہ اور ماں کی بہو چوبیس نومبر ۲۰۰۲ء سے تہہ خاک ہو کر راحت ہے۔

دوائی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، تھا تو معمولی بڑھا لکھا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی خاص مہربانی سے اپنے پاسے ہوئے صراطِ مستقیم کی پہچان عطا فرمادی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی ابتدائی چوبیس بہاریں بھارت (لہریاں) میں گزاریں۔ اور اسی سال وہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہندہ کرنے کے لیے حاصل

بہر حال اب کے ایسی رکاوٹ آئی کہ ان کے راستے کے درست ہونے کا واضح ثبوت مل گیا۔ یہ قصہ ۱۹۶۳ء کا ہے، ملک پر ایوب خان کی حکومت تھی، آمریت اپنی پوری آگ و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ تاریخ نویس اکتوبر اور دسمبر ۱۹۶۳ء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حکومت نے اجلاس کو کون کون سا کام بنانے کے لیے لاؤڈ اسپیکر پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کا متبادل بندوبست یہ کیا گیا کہ ایک طرف سٹیج تھا، تو چھ چوکھٹے پر میز رکھے گئے، جن پر افراد نے کھڑے ہو کر اپنے لیڈر کی آواز کو سنے ہوئے تھا۔ ان کا لیڈر ایک یا دو جملے بولتا تھا، وہی جملے ایک میز پر کھڑا مقرر ادا کرتا تھا اور اسی طرح دوسرا اور آگے سے آگے۔ یوں آخر تک قائد کا پیغام پہنچتا تھا۔ اجلاس شروع ہوا تو ایک طرف سے شور مابلند ہوا، ہنگامہ بڑھا تو تشویش بڑھی۔ کتابوں کے مسائل اٹھنے لگے، بحثاتوں کی رسیاں کٹنے لگیں، خواہشیں کے کیپ میں بولیں برسنے لگیں۔ ایک طرف لاؤڈ اسپیکر نہیں کہ اس قسم کی صورت حال کا کیا نیک پر اعلان کیا جائے، دوسری طرف معاملہ بڑھ رہا تھا۔ کرائے کے حکومتی غنڈے تھے، جنہیں ہر قسم کے سرکاری تحفظ کا یقین دلا کر اجتماع لانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہنگامہ آرائی اور ہوائی فائرنگ کے دوران ایک ٹولی خواہش کے غمبے پر تعینات اسی دیہاتی کے سینے پر لگی اور چند ہی لمحوں میں وہ اپنا فرض زندگی چکا گیا۔ پائیز و مصفا، سفید پوش، سیاہ پوش دیہاتی خون سے لست پت ہو کر ہر ملک پر گرا، تڑپا اور اس فانی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت تک اس نے عمر عزیز کی چالیس بہاریں دیکھی تھیں۔ لوگوں نے غمبید کی میت کو ساتھ واسلے کیپ میں رکھ دیا، اجتماع کی کارروائی معمولی اٹھل کے بعد جاری ہوئی۔

قاضی آزاد تھا، پکڑنے والا قانون خاموشی کی پٹری میں منہ چھپائے کسی کونے میں بیٹھا تھا۔ ایک کارکن نے قاتل کو پکڑ لیا، اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ بعد میں پولیس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اجتماع میں آئے ہوئے صوبہ خیر بختونخوا (تب سرحد) کے کارکنوں نے اپنے قائد سے قائدوں سے بدلہ لینے کی اجازت چاہی یا نہیں جواب ملا کہ میں تو حکومت چاہتی ہے کہ ہم جذباتی ہو کر بدلہ نہیں

رحالات خراب ہوں اور حکومت کو ایکشن کرنے کا موقع ملے۔ فائرنگ کے دوران یہی وہ موقع تھا جب قائدین نے سید مودودی کو بیٹھ جانے کے لیے کہا، اس موقع پر انہوں نے تاریخی الفاظ کہے، ”اگر میں بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا؟“ وہ مقتول جب گاؤں سے گیا تھا تو عام دیہاتی تھا، مگر جب لوگ تو اندہ بخش شہید تھا، اس کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی (جو کہ اس کے ساتھ تھی) ایک عام دیہاتی بچے تھے، مگر اپنے باپ کی واپسی پر وہ میم تو ہو چکے تھے، مگر ایک شہید کی اولاد قرار پائے۔ تین تین برس قبل آبادی بہت کم تھی، اس وقت تیز رفتار ٹریک تھی اور نہ ہی برقی رفتار میڈیا۔ اس کے گاؤں میں بجلی کا گزر بھی نہ ہوا تھا، ٹیلی فون کا تو تصور بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ بہت جلد سو جایا کرتے تھے۔ گاؤں میں کھیتوں میں کام تو مغرب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے تھے، لوگ گھر پہنچ کر کھانا کھاتے اور عشاء کی نماز کے بعد تو بہت ہی کم لوگ جاگتے تھے۔ جب گاؤں کو مکمل خاموشی نے اپنے دامن میں ڈھال رکھا تھا، جب سارا عالم کو خواب تھا، فطما میں نکلتی اور آئی تھی، ایسی نکلتی جس سے پلٹیں ہو جانا کرنی ہیں۔ جب دن بھر کے تھکے ماندے کسان نیند کے ہاتھوں بے بس ہو چکے تھے۔ ایسے میں لوگوں نے گھر گھر کی آوازیں سنیں، بہت سے لوگ بڑبڑا کر اٹھے، جھوٹا سا گاؤں ایک من خاموشی کی صورت رہتا تھا، بڑے دیکھنے کو آئے، خواہشیں آجکل سننے والے دروازوں کے پاس آگئیں بڑے کے ہاتھ میں جاک گئے، یہ کسی آواز ہے، یہ کیا منظر ہے؟ ان کے گاؤں میں ایک ٹرک آیا تھا، انہوں نے اس سے مل اپنے گاؤں میں ٹرک نہ دیکھا تھا، ان کے لیے یہ نہایت اہم واقعہ تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس ٹرک پر انہی کے گاؤں کا سب سے نمایاں شخص القاد بخش سوار ہے، مگر اب وہ شہادت کے تحفے کے ساتھ واپس لوٹا تھا۔

گاؤں کا سونا ہوا ماحول جاگ اٹھا، صبح ملاقات میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دیہاتیوں نے لیے یہ ایک انوکھا واقعہ تھا، بعض لوگوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا، ”اس کام میں کیا رکھا تھا، وہاں نہ جاتے نہ یہ حادثہ ہوتا۔“ وغیرہ وغیرہ۔ وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ یہ

دل کی ٹنگی کا کوئی اچانک یا بے اختیار فیصلہ نہیں آئے والا واقعہ نہ تھا۔ وہ شخص دعوتِ حق کی ہادی پر خار میں تھیں۔ کمر نہ لایا گیا تھا، بلکہ وہ پارے شعور، سوچ بچار، یکسوئی اور صدیقی دل کے ساتھ اس میدان میں اتر ا تھا۔ تمام گھر والوں اور جماعتِ اسلامی کے احباب کا رویہ دیکھ کر بھی وہ لوگ حیران و پریشان تھے کہ اتنے بڑے حاشے اور صدے کے بعد کہ جس میں ایک بوڑھی ماں، ایک بیوی اور چھ کمسن بچوں کا واحد نفیل انہیں ہے، ہمارا چھوڑ گیا، ان کا کیا ہے گا، کون ان کی سرپرستی کرے گا، کون ان کی دیکھ بھال کرے گا، کون ان بچوں کے جوان ہونے تک ان کا سہارا بنے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے گھر والوں کو اطمینانِ قلب نصیب فرمایا، صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائی، یقیناً وہی سب سے بہتر وارث ہے۔

اللہ بخش اپنے والدین کی اعلیٰ اولاد ہونے کے ناتے ایک مربع زمین کے واحد مالک تھے۔ اس علاقے میں ایک مربع زمین کافی بھی جانی تھی، وہاں عموماً دو، چار، چھ ایکڑ والے کسان ہی تھے۔ اس لیے مربع کا مالک چوبدری کہلاتا تھا۔ انہیں بھارت سے آئے ہوئے دو ایک سال ہی ہوئے تھے کہ اپنے ایک عزیز کے توجہ دلانے سے جماعتِ اسلامی کی دعوت کی طرف رجوع کر لیں۔ پھر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں، دینیات، خطبات وغیرہ ان کے زیر مطالعہ آئیں۔ ایسا اور ترجمان القرآن بھی باقاعدہ ان کے پاس آئے۔ لگے۔ وہ جماعتی مصروفیات میں روزانہ گاؤں سے شہر (گوجرہ) جاتے۔ کسی پروگرام سے ناگہانہ کرتے۔ لائل پور سے پروگراموں کے لیے لوگ آتے تو یہ اس میں لازمی شرکت کرتے۔ مقامی سطح پر جماعت کو جتنے فنڈز کی ضرورت ہوتی، اس سے بڑھ کر دیتے۔ بعض اوقات اگر ہنگامی طور پر فنڈز کی ضرورت پڑی یا کسی معاملے میں پیسے کی کمی ہو جاتی تو وہ اللہ بخش پوری کر دیتے تھے، کیونکہ وہ اس وقت کے دیگر ساتھیوں سے مالی طور پر مستحکم تھے۔ عجیب بات تھی ا لاہور کے اجتماع میں ملک بھر سے لوگ جمع تھے، مگر یہ شہادت کا اعزاز دور دراز کے اس دیہاتی کے نام لکھا تھا۔

اللہ بخش شہید کی ایک بی بی تھیں، جو اس سفر میں

اپنے والد کے ساتھ تھیں، نے بتایا کہ... جب اجتماع پر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، تو حالات کی کمی کی خبریں بھی گرم تھیں، ہر طرف دسواں تھے، حالات کشیدہ تھے، کوئی نہ جانتا تھا کہ کیا ہوگا؟ والد محترم نے پوچھا کہ اگر وہاں کوئی چل گئی تو...؟ کہنے لگے وہاں اتنے لوگ ہوں گے، عام لوگوں کو کس نے پوچھنا ہے۔ انہی دنوں میں وہ شہادت کو زیادہ یاد کرنے لگ گئے تھے، وہ صحابہ کی شہادتوں کے واقعات پڑھتے تھے اور روتے تھے۔ اگر کوئی کہے کہ کوئی دیہاتی لاہور اجتماع میں گیا، ہنگامہ ہوا، فارنگ ہوئی تو اچانک ایک گولی اسے لگ گئی، تو یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں ہو گیا۔ وہ بروقت با وضو رہتے تھے۔ میں نے ان سے زیادہ طہارت و پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام کرتے ہوئے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کی شہادت دراصل ان کے ارمانوں کی تکمیل تھی۔ وہ شہادت کی روداد کر آرزو کرتے تھے... ان کی بی بی اجتماع میں ان کے ساتھ گئی تھیں، مگر انہیں اس واقعہ کی خبر نہ ہوئی۔ اجتماع کے آغاز میں ہی ہنگامہ شروع ہو گیا تھا، فنڈز کے خواتین کے کپ میں بوتلیں پھینک کر بھگدڑ مچانا چاہتے تھے۔ خواتین کے خیمے میں یہ خبر بھی پہنچی کہ لائل پور کا ایک شخص شہید ہو گیا ہے، وہ نہ تھے، اس ہنگامہ خیر صورت حال سے دل ٹھہرا رہا تھا، مگر یہ خیال نہیں تھا کہ وہ خیمہ ہو چکی ہیں۔ اگلے ہی روز اجتماع اوتھورا چھوڑ کر چند عزیز رشتہ دار خواتین شہید کی بی بی کو لے کر واپس روانہ ہو گئیں، راستے میں ہزار دوسووں نے حیرانہ لے رکھا، ہم واپس کیوں جا رہے ہیں؟ یہ خواتین ساتھ کیوں جا رہی ہیں؟ اگلے روز گاؤں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہ باپ کی شفقت سے محروم ہو چکی ہیں۔ وہ مزید کہتی ہیں... اس زمانے میں اخلاقی اقدار بہت تھیں۔ والد صاحب اپنے گاؤں کے غیر اعلانیہ سربراہ تھے، مگر وہ گاؤں کی چھوٹی سی مسجد میں نماز بھی پڑھاتے اور بچیوں کو قرآن پاک بھی۔ خواتین کو سرفہائے کی تلقین کرتے۔ ان معاملات میں حکمت سے سب شب کے انداز میں اور مذاق مذاق میں اصلاح کرتے، پھر وہ وقت آیا کہ جب خواتین دور سے ہی والد صاحب کو آتا دیکھتیں تو احتراماً سرفہائے لیتی تھیں۔

اپنے اہل خانہ جن میں ہماری دادی، والدہ و شامل تھیں، کے علاوہ مزید اقارب کی خواتین کو بھی نماز کی تلقین کرتے۔ انہوں نے گاؤں کی بہت سی بچیوں کو قرآن پاک مع ترجمہ پڑھایا۔ قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے پر بہت زور دیتے تھے، وہ مجھے کتابوں میں سے عنوانات دیکھ کر بتاتے تھے، یہ پڑھو، یہ پڑھو۔“

قدرت کا کرشمہ تھا کہ اللہ بخش اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کی زوجہ کی بھی صرف ایک بہن تھیں، جو کہ ہندوستان میں ہی انتقال کر گئی تھیں، جن کا ایک بیٹا تھا، جسے انہوں نے بی پالا، پڑھایا اور اس کی شادی بھی انہوں نے ہی کی۔ وہ چونکہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے، اس لیے انہیں اللہ بخش کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی براہ راست تربیت کا سب سے زیادہ فائدہ بھی انہیں کو ملا۔ انہوں نے بتایا کہ ”مرحوم سے بھی پیچیدہ بھی فقہانہ ہوتی تھی۔ وہ سب سے زیادہ توحید اور زور نماز پر دیا کرتے تھے، وہ چونکہ خود نہایت خشوع و خضوع سے غماز ادا کرتے تھے، اس لیے جب وہ کسی دوسرے کو نماز کی تلقین کرتے تو اس پر مثبت اثرات مرتب ہوتے تھے۔ انہوں نے جھنگ سے باقاعدہ ایک مولوی صاحب کا انتظام کیا تھا، اس سے قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ مولوی صاحب کی بہت خدمت کیا کرتے تھے، ان کی بر ضرورت اور خوشی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنا کوئی کچھ بغیر تعمیری اور ضروری گفتگو کے ضائع نہ کرتے تھے۔ وہ عشر اور نو کوۃ کی نہایت جتنی سے پابندی کرتے تھے۔ ایک روز صبح کے بعد شہر جانے کی تیاری کرنے لگے تو میں نے اتنی تاخیر سے شہر جانے کی وجہ دریافت کی، کیونکہ آبادی کم اور راستے خراب ہونے کی بنا پر لوگ سرشام ہی دیہات کو لوٹ جاتے تھے، سائیکل پر گورو آئے جانے پر تقریباً دو گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ خانو نے بتایا کہ جس آڑھت پر ہم ذرقی اجناس وغیرہ بیچتے ہیں، وہ آڑھتی سخت خسارے سے دوچار ہو گیا ہے، اور اب سخت بیمار بھی ہے، میں نے اس سے چھ ہزار روپے لیے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں اسے چھ ہزار روپے معاف کر آؤں، ایسا ہی ہوا، وہ اپنا کام کر کے واپس آئے تو رات کے اندھیرے گہرے ہو چکے تھے۔ اگلے ہی روز انہیں اطلاع

ملی کہ رات اس آڑھتی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تربین برس قبل چھ ہزار کھنے کے برابر ہوں گے۔“

اللہ بخش چالیس برس کی عمر میں چھ بچوں کو اللہ کے حوالے چھوڑ کر خود اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچ گئے۔ جب ان کے شہید ہونے کی خبر جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تک پہنچی تو انہوں نے اپنی لکھی ہوئی تقریر روکی، مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی اور اعلان کیا کہ ”ہم یہ مقدمہ کسی عدالت میں درج نہیں کروائیں گے، میں نے یہ مقدمہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں درج کروا دیا ہے، وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔“ انہوں نے حکمت اور تحمل سے ماحول کو ایک بڑے ہنگامے اور سانحے سے بچالیا تھا، جو کراؤ کی صورت میں رونما ہو سکتا تھا۔ حکمران اپنے چند روزہ اقتدار کے نشے میں کیسے کیسے کام کر جاتے ہیں، بے تصور اور بے نوا لوگوں کا دل اپنے سر لے جاتے ہیں۔ گن و گیسرو بھی کرتے ہیں اور اس کا احساس بھی ان کو نہیں ہوتا۔ یہ قتل ناحق کسی کی گردن پر ہو گا، اس کا ذمہ دار کون تھا، تب کا فوجی سربراہ مملکت یا تب کا گورنر مغربی پاکستان یا صرف وہ وقت جس نے گولی چلائی تھی۔ اگر پاکستان کی کسی عدالت میں اس کا مقدمہ درج نہیں ہوا، تو کیا، فیصلے کے دن تو اس مقدمے کی سماعت ہو کر ہی رہے گی، کیونکہ ہر انسان کو اپنے کئے کا حساب دینا ہے، جس کے اعمال میں سچی کا ذرو بھی ہو گا اس کے سامنے آجائے گا اور جس نے ذرو بھر بھی برائی کی ہوگی سامنے آجائے گی۔ تب نہ کسی قاتل کو اس کی دنیاوی حکمرانی بچا پائے گی، نہ کالاباش کی چاگیریں کسی کے کام آئیں گی۔



ننگ و طر

عصر فاروقی ارشد

سیاست دان چاہے دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتا ہو پوتا وہ سیاست دان ہی ہے۔ بٹے افق قارئین کے لیے سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص مصر اور اسرائیل کی جنگ کے پس منظر میں لکھی تحریریں ایک ہوائی جہاز کے اغوا کی داستان جب اغوا کاروں نے قاہرہ کسی سینٹرل جیل اپنے ایک ساتھی کی رہائی کی خاطر جہاز کے مسافروں اور عملے کے افراد کی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

قاہرہ ایئر انٹرنز کا طیارہ ایس کیو 117 ترکی کے استنبول ایئر پورٹ سے ازان بھر کرفضا میں بلند ہوا اور چند جھٹکوں کے بعد اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی پرواز کی اطلاع قاہرہ ایئر پورٹ پر موصول ہوئی تھی یہ معمول کی اطلاع تھی جو ایک ہوائی اڈے کا عملہ دوسرے ہوائی اڈے کے عملے کو دیتا ہے۔ طیارے کو اڑے ہوئے ابھی پچیس منٹ ہوئے تھے کہ اچانک طیارے کی عقبی نشستوں سے چار نوجوان چیزی سے اٹھے اور آگے بڑھتے نظر آئے۔ تین نوجوانوں کے چہروں پر نقاب تھے اور چوتھے نے ہاتھ میں کچھ پکڑ رکھا تھا چوتھا نوجوان سیدھا کاک پت میں داخل ہو گیا۔ باقی تین نوجوانوں نے جہاز کے مختلف حصوں میں اپنی پوزیشن سنبھال لی انہی میں سے ایک نے زوردار آواز میں بولنا شروع کیا۔

”آپ لوگوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جہاز اغوا ہو چکا ہے اپنی اپنی سیٹوں پر موجود رہیں۔ کسی نے کوئی حرکت یا شرارت کی تو جان لیوا ثابت ہوگی“

آپ لوگوں کی آواز بھی نکلی تو ہمارے ہاتھ اور ہتھیار چلنا شروع ہو جائیں گے۔ ہائی جیک کرنے اپنی بات کا ثبوت بھی فوراً مہیا کر دیا اس نے اپنے نزدیک بیٹھے آدمی کو زانے دار پھنر رسید کیا جس کی آواز طیارے میں گونجی۔

کے عقب تک صاف سنائی دی۔ پورے طیارے میں خوف اور سراسیمگی پھیل گئی۔ مسافروں نے ایک دوسرے کی طرف بڑے کرب سے دیکھا چند ایک نے بولنے کی کوشش کی لیکن ہائی جیکر کی دہار سے سب سہم گئے۔

طیارے میں موت جیسا سکوت طاری ہو گیا کاک پت کی طرف جانے والا ہائی جیکر کیسٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور ایئر ہوسٹس کو باہر دھکیل دیا۔ طیارے کا پائلٹ اور معاون پائلٹ ہکا بکا رہ گئے لیکن ان پر ڈیڑھ سو سے زائد مسافروں کی سلامتی کا بوجھ تھا اس لیے انہوں نے اپنے اوسان بحال رکھے لمبے قد کے دبلے پتلے نوجوان ہائی جیکر کے ایک ہاتھ میں کوئی گرنیڈ نما چیز تھی اور دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا شکاری اس نے انتہائی خوفناک نظروں سے دونوں کو کھور چند لمحوں کے لیے کیسٹ میں مکمل خاموشی طاری رہی۔

کیسٹ سے باہر کی فضا پر بھی تینوں ہائی جیکروں نے مکمل قابو پار رکھا تھا اور سکوت طاری تھا پھر دبلے پتلے ہائی جیکر نے خاموشی توڑی اس کی آواز بھاری بھر کم اور گونج اتر تھی اس نے پائلٹ اور معاون پائلٹ کو خبردار کیا۔

”طیارہ اغوا کر لیا گیا ہے اب صرف ہمارے

میں مصر کے علاوہ باقی عرب دنیا محض قربانی کا بکرا بنائی گئی تھی۔ مصر کے بہت دھرم اور خود پسند صدر جمال عبدالناصر نے نہایت بے وقوفی کے ساتھ اپنے ذاتی مفادات اور ضد کی خاطر عرب دنیا کو جنگ کی بھیجی میں جھونک دیا تھا اور اسی لیے مصر فرنٹ لائن پر اسرائیل کا مقابلہ کر رہا تھا۔

دار الحکومت قاہرہ میں جنگی سرگرمیاں عروج پر تھیں اسی دوران وزارت خارجہ کے حکام کو عراق سے مصری ہائی کمشنر نے اطلاع دی کہ قاہرہ ایئر لائنز کا ایک مسافر طیارہ جس میں ڈیڑھ سو سے زائد مسافر موجود ہیں، ہائی جیک ہو چکا ہے جب سیکرٹری خارجہ یہ خبر لے کر وزیر خارجہ کے پاس پہنچا تو اسے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی وزیر خارجہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شراب و شباب کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ ایک منہکتی ہوئی انگریز حسینہ اس کی آغوش میں دھکی پڑی تھی اس نے اطمینان کے ساتھ خبر سنی اور وہ فائل دیکھنے لگا جس میں ہائی جیکرز کے مطالبات لکھے ہوئے تھے چند لمحے بعد اس نے سر اوپر اٹھایا سرخ سرخ آنکھوں سے اپنی سیکرٹری کو گھورا۔

”ہائی جیکرز کا یہ مطالبہ ماننا پڑے گا ڈیڑھ سو مسافروں کی زندگی کے لیے اگر ہمیں ایک مجرم کو چھوڑنا پڑتا ہے تو اس میں اتنے گھائے والی کوئی بات نہیں۔“ سیکرٹری خارجہ کے لیے یہ جواب غیر متوقع نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اہم عہدوں پر تعینات مصری حکام جنگ کے ان دنوں میں امریکہ کی طرف سے بھیجی گئی حسینہاؤں سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔

ان کی سوچے سمجھے کی صلاحیتیں کھلے ہوئے شباب کے سامنے مفلوج ہوئی پڑی ہیں اور وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ جنگ کا رسوا کن نتیجہ بڑی

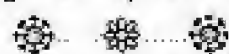
احکامات پر عمل کیا جائے گا۔“ دونوں نے کوئی بات کیے بغیر سر تسلیم ختم کر دیا ہائی جیکر نے حکم دیا۔ ”تم معمول کی پرواز جاری رکھو یہ پو پو پر کسی کو ہائی جیکنگ کی اطلاع نہیں دی جائے گی۔ پہلے بصرہ وائرس پورٹ پر لینڈنگ ہوگی اس کے بعد ہم خود کنٹرول ٹاور سے بات کریں گے۔“ رات کے سو گیارہ بجے تک ہائی جیکرز نے طیارے میں اپنی تمام کارروائی مکمل کر لی تھی۔ بصرہ کے کنٹرول ٹاور سے بار بار رابطے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

اب رات کے بارہ بج کر چیس منٹ ہو چکے تھے پائلٹ نے ہائی جیکر کے کہنے پر اس کا رابطہ کنٹرول ٹاور سے کر دیا۔ دوسری طرف سیکرٹری خارجہ کی نرم آواز سنائی دی۔

”آپ لوگ ہمیں اپنی شناخت کروائیں اپنے نام بتائیں یہ بہت ضروری ہے۔“ طیارے سے جواب آیا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں آپ ہمارے مطالبات ٹوٹ کریں۔“ جواب دونوں اور واضح تھا۔

”ٹھیک ہے آپ اپنے مطالبات پیش کریں ہم کوشش کریں گے کہ کم سے کم وقت میں انہیں پورا کر سکیں۔“ اب طیارے سے ہائی جیکر نے بولنا شروع کیا۔

”قاہرہ کی سینٹرل ہیل میں ہمارا ایک آدمی ولیم ڈیوڈ قید ہے تین گھنٹے کے اندر اس کی رہائی کا بندوبست کیا جائے اس کے بعد ہم مسافروں کو رہا کر دیں گے۔ ہمیں دو بجے تک بتا دیا جائے کہ ہمارے مطالبات پر عمل شروع ہوا ہے یا نہیں۔“ اس کے ساتھ ہی جہاز سے رابطہ منقطع ہو گیا۔



عرب اسرائیل جنگ کا یہ تیسرا روز تھا اس جنگ

تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ سیکرٹری خارجہ نے اپنی فائل اٹھائی اور اسے قدموں واپس لوٹ گیا۔ دشمن کے لیے مصری فضائیہ سب سے بڑا مسئلہ تھی زمینی جنگ میں تو ان کا پلہ کسی قدر بھاری تھا مگر ہواؤں میں مصر نے اسرائیل کو ایسا پچھاڑا کہ اس کی پشت پر موجود امریکہ چونک اٹھا اور تب ہی امریکہ نے دو محاذوں پر اسرائیل کی خاموش مدد کا سلسلہ شروع کیا پہلے مرحلے میں ہوشربا حسن کی مالک دوشیزائیں عیاش مصری سیاستدانوں اور فوجی حکام کی غلطیوں میں پھنچائی گئیں ان کے ذریعے وہ سب ممکن ہو گیا جو عام حالات میں بڑے سے بڑا جاسوس اور سیکرٹ ایجنٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرے مرحلے میں مصری فضائیہ پر ایک کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا پروگرام بنایا گیا جس میں پہلے منصوبے کے تحت اس خاص اسرائیلی ایجنٹ کی ضرورت پیش آئی جو دوران جنگ مصری فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد قاہرہ کی سنٹرل جیل میں قید تھا اس کے سینے میں مصر کے ایسے فوجی راز تھے کہ اسرائیلی فوجی حکام انہیں حاصل کرنے کو بے چین تھے اور اس کے لیے کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھے۔

قاہرہ انٹرنل سز کی فلائٹ انیس کیو 117 کا انواء اسی مقصد کو پانے کی ایک کوشش تھی زمین مزاج اور نظریات میں مدہوش وزیر خارجہ بغیر کسی قومی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ انتہائی حساس معاملہ اپنی دانست میں حل کر پکے پھر جام و سرور میں گم ہو گیا۔ اس کے احکامات کی نیکل میں وزارت خارجہ کی جانب سے ہائی جیکرز سے رابطے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ابھی انہیں یہ اطلاع دی جانی تھی کہ ناعاقبت اندیش مسلمان ان کا مطالبہ تسلیم کر چکے ہیں مگر یہ اہم خبر

اقتدار کے نچلے ایوانوں میں سے کسی تہی کی طرح اڑتی ہوئی اعلیٰ غلام گردشوں میں پہنچ گئی۔ صدر ناصر جو کہ عالم اسلام کا نام نہاد ہیرو بننے کے لیے یہ سب جتن کر رہا تھا اس نے ہائی جیکرز کا مطالبہ ٹھکراتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ اسرائیلی ایجنٹ کی رہائی کسی بھی صورت ممکن نہیں اور اس سلسلے میں ہائی جیکرز وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ مذاکرات کے ذریعے ہائی جیکرز کو الجھا کر کوئی حل نکالا جائے چونکہ مصری صدر اسرائیل سے پھدالے کر پھنس چکا تھا اس لیے وہ پوری طرح جنگ میں مصروف عمل تھا مگر بے خبر تھا کہ دیگر مصری سیاسی قیادت جام پر جام لٹ دھانے میں مصروف ہے اور قاہرہ کسی بازار حسن کا منظر پیش کر رہا ہے۔



جہاز میں موجود ہائی جیکرز کی برہی اور گام گلوج سے مسافروں نے اندازہ لگا لیا کہ ان کا مطالبہ دوسری طرف سے مسترد کیا جا چکا ہے۔ مسافروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہائی جیکرز پوری طرح دباؤ رہے تھے اور شدید رد عمل کی دھمکیاں دے رہے تھے چند لمحات کے بعد چاروں ہائی جیکرز جہاز کی عقبی سمت میں اکٹھے ہوئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

بصرہ کے ہوائی اڈے پر اس وقت صبح سحری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ انٹرپورٹ کی انتظامیہ اس بات سے خفا تھی کہ مصر کی طرف سے بالکل غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا گیا تھا اگر وہ چاہتا تو کمانڈو ایکشن کے ذریعے کامیابی کے امکانات کافی روشن تھے مگر چونکہ تقریباً تمام مسافر فلسطین اور دیگر غیر معروف عرب ریاستوں کے باشندے تھے اس لیے مصر کو کچھ خاص پریشانی نہیں تھی۔

کیا کر سکتے تھے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد جہاز نے زمین کا رخ کیا تو مسافروں میں بے چینی پھیل گئی وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ ہائی جیکر زاب جہاز کو کہاں لے لے رہی ہیں جب جہاز نے رن وے کو چھوا تو ہوائی اڈے پر ہونے والی اناؤنسمنٹ مسافروں کو کچھ یوں سنائی دی۔

”وکیلیم ٹوٹل ایئر پورٹ۔“ مسافروں نے دیکھا کہ جہاز کو اسرائیلی آرمی نے گھیر رکھا ہے۔



لیار وائی جیننگ کا منصوبہ کامیاب ہونے کے باوجود اسرائیلی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا اس کو اگر کوئی کامیابی ملی بھی تو وہ یہ بھی کہ اسرائیلی حکام مصر کے ذمہ داران کو عیاشی کی دلدل میں دھکیل چکے تھے اور یہی چیز مستقبل قریب میں اسرائیل کی فتح میں تبدیل ہونے والی تھی۔

اپنے گرفتار ایجنٹ کو رہا کروانا اس کی بقا کا مسئلہ تھا اور پھر اس مقصد کے لیے دوسرا پلان تیار کیا گیا اس کے لیے انہوں نے قاہرہ سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا انتخاب کیا۔

”یہ جیل سپرنٹنڈنٹ تھا اس کا نام تھا“۔ جو اپنی قوم کی تاریخ کا ایک سیاہ باب رقم کرنے جا رہا تھا۔ ابتدائی چند راتوں میں ہی یہ غدار وطن چاروں شانے جیت ہو گیا اس نے یورپی عورتوں کی خود پسندی اور جنسی میلان سے متعلق عجیب عجیب کہانیاں سن رہی تھیں جب اسے ان کہانیوں کا کردار بننے کی پیشکش ہوئی تو وہ بھلا کیونکر روک رہا اور جس رات وہ بدلی حید کے جسمانی نشیب و فراز اپنے میں مصروف تھا۔ قاہرہ کی سنٹرل جیل کا دروازہ کھلا اور لمبا ترنگ اسرائیلی ایجنٹ گردن اکڑاتے ہوئے باہر نکل گیا گویا

دوسری طرف اسرائیل کے سخت انتظامات اور میڈیا پر کنٹرول کی وجہ سے دنیا اس واقعہ سے بے خبر تھی۔ آخر طویل اعصابی کشمکش کے بعد مسافروں نے دیکھا کہ ہائی جیکرز کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ گریڈ پروڈارنو جوان واپس کا کہہ بیٹ میں داخل ہو گیا جبکہ باقی تینوں نے اپنی سابقہ پوزیشن سنبھال لی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی جہاز زمین کو چھوڑ کر فضا میں اڑان بھر چکا تھا۔ مسافروں کے چہرے زرد پڑ گئے تھے ہنسنوں کی ذہنی جنگ سے بعض کمزور دل مسافروں کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔

ایسا ہی ایک اوجیر عمر آدمی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا ہائی جیکرز نے اس پر گن تان لی۔

”اے بڈھے..... بیٹھ جاؤ“ مگر وہ مسافر مسلسل ہائی جیکر کو گھورتا رہا۔

”ہمارا قصور کیا ہے؟ تمہارے مطالبات پورے نہ ہونے میں ہماری کوئی غلطی نہیں خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔“

”میں کہہ رہا ہوں بیٹھ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ ہائی جیکر دباڑا۔

اچانک ہی اس شخص نے اپنی سیٹ سے جست لگائی شاید وہ ہائی جیکر سے گن چھیننا چاہتا تھا مگر گن اپنی خوفناک آواز میں گرجی اور اوجیر عمر شخص اچھل کر ساتھ بیٹھی ہوئی ایک خاتون کے قدموں میں جا کر اوہ دہشت زدہ ہو کر چلائی۔

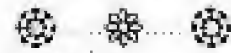
گولیوں نے اس شخص کے سینے کو چھید دیا تھا ابو کا جیسے فوارہ سانچوت پڑا طیارے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد اس شخص کا جھٹکے لیتا جسم ساکت ہو گیا ہائی جیکر نے گن لہرائی۔

”کسی اور کے دل میں اگر بیرو بننے کی خواہش ہے تو سامنے جاؤ۔“ خوفزدہ مسافر خاموشی کے سوا اور

زبان حال سے کہہ رہا۔

”مسلمانو! تمہارے اندر سے میرے جعفر و صادق کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور جب تک یہ موجود ہیں ہمارے قدموں میں پڑا رہنا تمہارا مقدر بن چکا ہے۔“

دوسری طرف غیر ملکی حسینا میں قاہرہ کے سیاستدانوں کے لبو میں کس طرح سرائیت کر چکی تھیں اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ سنٹرل جیل سے یہودی ایجنٹ کا فرار جنگ کے خاتمے تک منظر عام پر نہیں آ سکا کیونکہ نجلی سطح سے لے کر ہر اعلیٰ افسر و سیاستدان کے بستر پر رات کو ایک یورپی و امریکی حسینہ ضرور موجود ہوتی تھی۔ سرحدوں پر لڑنے والے فوجی اپنے سیاستدانوں کے یہ کارنامے مسلسل سن رہے تھے اور اپنے حوصلوں کو پست ہوتا محسوس کر رہے تھے۔ دوسری طرف اسرائیل اپنی تمام چالوں کو سمیٹ کر ایک فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاری کر چکا تھا مگر اس کے لیے بھی چند ننداروں کی ضرورت تھی اور بالآخر وہ بھی مل گئے۔



دارالحکومت قاہرہ سے بالکل باہر انصامن فوجی انٹرپورٹ واقع تھا یہ صرف فوجی ہوائی اڈہ ہی نہیں بلکہ مصری فضائیہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں فضائیہ کا ہیڈ کوارٹر تھا اس کے علاوہ مایہ ناز اور اعلیٰ کارکردگی کے حامل جنگی طیارے یہیں سے اڑان بھر کے میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑا کرتے تھے۔ اس کی حد درجہ اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے سیکورٹی کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے مگر دشمن کی نظروں میں اس کو بے وقعت بنانے کے لیے یہ تمام تر انتظامات خفیہ تھے۔

اسرائیل اپنی تمام تر اشیائی جنس استعمال کرنے

کے باوجود یہ نہیں جان پایا تھا کہ مصری فضائیہ کی طاقت کا سرچشمہ کون سا ہوائی اڈہ ہے۔ یہ بات وہ ایجنٹ بخولی جانتا تھا جو قاہرہ جیل سے فرار کے بعد تل ابیب پہنچ چکا تھا۔ اسرائیل کو مصری صفوں سے نندار خریدنے میں صرف سات گھنٹے لگے تھے اور وہ فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے تیار تھا اس ضرب کے جس کے بعد جنگ کا بجٹا ہوا ٹھیل رک جاتا اور عرب دنیا کے لیے ذلت و رسوائی کی شکست مقدر ہوتی جو جنگ وطن اسرائیل کے ہاتھوں سے وہ کچھ یوں گئے۔

”انصامن ہوائی اڈے کا سیکورٹی چیف ابن المرشد آرمی طیاروں کے ہدف اور روس ترتیب دینے والی پندرہ رکنی ٹیم کا سربراہ الکبیر طاکن اور تیسرا ٹنک ملت تھا مصری ریڈار سسٹم کا انچارج لقیب الکرمی یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دشمن کو اپنا ضمیر بیچ دیا تھا انہیں جنگ کے بعد یورپی شہریت دینے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا پوری دنیا میں خصوصاً مسلم ممالک کا یہ المیہ رہا ہے کہ غریب قوم اپنے نمائندوں کو سب سے پہلے سیاستدان کا روپ عطا کرتی ہے اور پھر ان کو اقتدار کے ایوانوں میں بھیجتی ہے صرف اس امید پر کہ شاید ان غریبوں کی مسیحائی ہو جائے مگر تاریخ گواہ ہے کہ طاقت اور اقتدار والے یہی لوگ بڑے بڑے ایوانوں میں بیٹھ کر وطن کی مٹی تلک بیچ دیا کرتے ہیں۔“

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد دو رات آگنی جنس رات ذلت آمیز شکست کے ہادل مصر کے دروازے پر ڈیرے ڈالنے والے تھے۔



انصامن ہوائی اڈے پر جیسے ہی تاریکی نے اپنے پنکھ پھیلائے تو خلاف معمول چہل پہل شروع ہو گئی۔ لمبی لمبی گاڑیوں میں لوگ آنے لگے اخیر

مارے جاتے ہیں۔ اب دشمن کے جنگی طیاروں کا رخ اس عمارت کی طرف ہوا جہاں شراب و شباب کیجا ہو کر سب کچھ بھلا چکے تھے۔ ایک اور کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا، برہنہ جسم چتھڑے بن کر اڑ گئے۔ ام انجناٹ کی خوب صورت بوتلوں کی کھٹک ایک دم سے ختم ہو گئی ذرا سی دیر میں ہولناک خاموشی چھا چکی تھی۔ طیاروں کی گز گز اہٹ آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ قوم کی غیرت کا سودا کرنے والے اور اس کے لیے استعمال ہونے والی حسینا میں یہ بات بھول گئے کہ بازی جیت جانے کے بعد مہروں کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ انعام و اکرام کا لالچ دیکھنے والی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

گھلے دن کا سورج اپنے دامن میں لاتعداد رسوائیاں لیے مصر کے افق میں نمودار ہوا جس وقت بد قسمت ملت کے سیاستدان ہتھیار ڈال کر عرب علاقوں کی بندر بانٹ میں مصروف تھے عین اس وقت تل ابیب کی ایک جیل میں اغوا شدہ طیارے ایس کیو 117 کے مسافروں کو قطار میں کھڑا کر کے گولیاں سے چھلکی کیا جا رہا تھا۔

آہ... شاید کہ کسی اور نے بہایا ہو اتنا اسے سیاست تیرے دامن میں جتنا ہو ہے



پورٹ سے کافی ہٹ کر ایک شاندار عمارت میں ان لوگوں کے استقبال کا پورا انتظام ہو چکا تھا۔ چیف سیکورٹی کی طرف سے ارسال کیے گئے دعوت نامے میں یہ لکھا گیا تھا اور چونکہ ہماری افواج ہرمجاز پر دشمن کو نیست و نابود کر رہی ہیں اور فتح قریب ہے اس خوشی میں آج رات ایک خصوصی محفل کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ہوائی اڈے کے مختلف حساس مقامات پر ڈیوٹی دینے والے اہلکار بھی محفل کی رنگینیوں سے پوری طرح واقف تھے اس لیے دوسرے لوگوں سے علیحدگی کی گئی تھی۔ گوری چمڑی والی حسینا میں ایسے جلوے بکھیر رہی تھیں کہ کسی کی نظر چوکنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔

شراب کے جام چھلکے تو ہر حدوث گئی، حسین زن کی سرگوشیاں اور لذت بھری سسکاریاں نشتے کو دو گنا کیے جارہی تھیں۔ عالم یہ تھا کہ ایک سرور کی آغوش میں کتنی کئی حسیناں لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ کہیں دور کھڑا ہوا الیمس اپنی جیت پر مسکرا رہا تھا اور پھر فضا ایک خوفناک گز گز اہٹ سے گونج اٹھی۔ درجنوں اسرائیلی طیارے ہوائی اڈے کو گھیرے میں لے چکے تھے۔ چند لمحوں کا کھیل کھیل گیا طیاروں نے ہوا میں قلا بازیاں کھاتے ہوئے ان گنت بموں کا بیند برسایا۔ بارود کی بے رحم بارش نے زمین پر پھڑپھڑے مایہ ناز مصری طیاروں کو پلے میں تبدیل کر دیا مطلب بننے والے ان بد قسمت ہوائی جہازوں کے رکھوالے تھوڑی دور ایک عمارت میں داخل ہو کر رہے تھے۔

مصر کا سارا فضائی اور دفاعی نظام ملیا میٹ ہو چکا تھا۔ اخیر پورٹ کی بلند و بالا عمارت زمین بوس ہو چکی تھی مگر ابھی ایک کام ہونا باقی تھا جس سے ہر خدا و وطن کو سبق سیکھنا چاہیے ملک و ملت سے غداری کرنے والے اپنے بیرونی آقاؤں کے ہاتھوں

یارب

غلام صیراں

عدم ادراک سے ادراک تک کی داستان، ایک مجرم کی روداد جسے
اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔ کسی برگزیدہ ہستی کی
نظر کا کرشمہ، ایک بے وفا کی بے وفائی کا نسلہ۔
کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی،
ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جو موت کی ادیت بھلا کر
اخبار کے گرد آلو لٹکے پر معاف لکھتا رہا۔
ایک بلند حوصلہ باپ کی بھنا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند
رہا۔

سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن،
آشفقہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا
جانے والا ناول۔

آج پندرہ سالوں بعد میں اپنے دیش کی
فضاؤں میں لوٹ رہا تھا کچھ ہی کے میں ہم ملازم
اقبال انٹرنیشنل ائر پورٹ کے رن وے پر اترنے
والے تھے۔ ہوائی جہاز کی میزبان حفاظتی بیلٹ
باندھنے کے لیے اعلان کر رہی تھی۔ میں نے
بائیں جانب گردن گھما کر دیکھا میرے دونوں
بچے تانیا اور آریان اعلان سنتے ہی اپنے اپنے
حفاظتی بیلٹ باندھ رہے تھے۔ یہ تسلی ہو جانے پر
کہ دونوں نے اپنے سے حفاظتی بیلٹ باندھ لیے
تھے میں نے دائیں جانب میرے ساتھ بیٹھی یومند
کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد پر مسرت دکھائی دے
رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح ڈرتے ہوئے اس نے
میرے ایک بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں
لے رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر کو
اپنے کاندھے سے لگا لیا اور وہ نگاہیں اٹھائے
مسکاتے ہوئے وارثی سے میری جانب دیکھتی

رہی اور میں سوچ رہا تھا کہ ان پندرہ سالوں میں،
میں نے ایسا وہ سب کچھ پایا تھا جو میں نے کبھی
خواب و خیال میں نہ سوچا تھا اور ایسا کچھ اتنا کھویا
تھا کہ جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ آج
برسوں بعد میں پھر سے عجب سیمائی کیفیت میں
بتلا ہو رہا تھا جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے
یہ احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے جڑے خواب، خیال
اور یادیں میرا پیچھا پیچھے لے کر تیار نہ تھے۔ یہ وہی
ائر پورٹ تھا جہاں میں عیرہ کو راحت عبدالغنی سے
ملوانے لایا تھا راحت میرے لیے وہ ہستی تھی جس
لہجے مجھے عشق و افتخار کا مضمون سمجھایا تھا جس
ذات سے میں نے عشق کے آداب و تقاضے سیکھے
اور میرا عشق فقط ایک بساط کا تھیل، دھیرے
دھیرے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں
اپنے ماضی میں پکچھ پکچھ تھا۔
اس روز گھر میں عجب تلاطم پایا تھا بڑے ابا کو میں

نے پہلے بھی اتنا شدید غصے میں نہ دیکھا تھا انہوں نے جوہلی کے وسیع محکم میں سبھی چھوٹے بڑوں اور ملازموں کو جمع کر رکھا تھا جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا کی رعب دار اونچی آواز سن کر میں بھی ایک جانب سے بیڑھیاں اترتے ہوئے ان کے قریب جا کھڑا ہوا تھا وہ میرے انتظار کیا کرنے والے بڑے ابا تھے کہ کبھی جو جوش و خروش سے میں غصے سے آ کر انہیں اپنی ہانپوں کے دھار میں لے کر لٹکایا کرتا تو وہ پھر چپو مٹے ہی کیسے لائیں اٹھائے میرے او قلوب میں دوڑتے تھے اور میں جو اپنے دونوں بازوؤں کو احوال بنا کر نہ زمین پر بیٹھ جایا کرتا تھا تو پھر میرے قریب پہنچ کر بجائے مجھے مارنے کے لائیں پھینک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا کرتے تھے۔ گویا میں آج بھی ان کے لیے وہی دو چار سال کا نٹ کھٹ سا طے عالم تھا۔

آج انہی بے پناہ محبت دینے والے بڑے ابا کے سامنے مجھے لگا ہیں اٹھانے کی جرأت نہیں ہو پا رہی تھی اور اب جو وہ بول رہے تھے اس نے میری ہمت اور بھی پست بنا دی تھی مجھے فقط ان کا ایک ہاتھ دکھائی دے رہا تھا جس ہاتھ سے انہوں نے لائیں تھام رکھی تھی جو پینڈو لم کی طرح مسلسل مل رہا تھا اور دوسرا ہاتھ جو میری جانب اٹھا تھا اسے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

”پوچھو اس سے کہ اس گھر کی دلیہز پار کرتے ہوئے جسے اپنے والدین کی عزت کا خیال تک نہیں آیا وہ اس وقت کہاں ہے؟ کہاں چھپا رکھا ہے جو بددی عبد الغنی کی بیٹی کو؟ میں کہتا ہوں اسے میرے سامنے لاؤ میں اس سے خود پوچھتا ہوں کہ اسے اُتر اپنے خاندان کی عزت غیرت کا پاس لگاؤ باقی نہیں رہا تو ہماری عزت کو تو یوں داغ دار نہ

کر تھی پھرے۔“ آخری بات کہتے ہوئے بڑے ابا کی رعب دار آواز میں قدرے پستی اور ملال تھا اور میں جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس سارے معاملے سے بے خبر ہوں بڑے ابا کہ مجھ سے سوال اٹھانے پر اب بھی کار د عمل دیکھنے کو بڑی ہمت جٹا کر میں نے اک لمحہ بھر کو نگاہ اٹھا کر دیکھا سب سے پہلی نگاہ جو چچا مرزا پر پڑی وہ شدید غصہ میں لگ رہے تھے۔ ان کی آگ بر سائی لگا ہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میری نظر ساتھ ہی کھڑی ہاں پر پڑی وہ مجھے متعجب لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں ان گنت سوال تھے۔ میرے قریب ہی میرے ابا خورشید عالم کھڑے تھے میری نگاہ جو ان سے ملی تو جیسے گلستان میں پیاسے کو پانی مل گیا ہو۔ وہ مجھے فقط چپ رہنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ وہ دو ایک قدم چل کر ذرا سا میرے قریب ہوئے وہ مجھے کانہ دھم سے تھامے مجھے بھنجوڑتے ہوئے مخاطب کیا۔

”میں یہ سب کیا سن رہا ہوں تمہارے بڑے ابا یہ کیا بول رہے ہیں، طے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے وہاں خڑے گھر کے سبھی لوگ اسے میرے ابا کی طرف سے سرزنش سمجھ رہے ہوں گے۔ انہیں ایسا ہی محسوس ہوا ہو گا لیکن فیصلہ میں یہ بات جانتا تھا کہ درحقیقت انہوں نے مجھے پھینک لگائی تھی۔

وہ جو بددی عبد الغنی جو ابا کے مقابلے میں ہر سال ایکشن جیت جایا کرتے تھے جو ابا کے سیاسی حریف تھے۔ راحت عبد الغنی انہی کی بیٹی تھی اور میرے ابا خورشید عالم جانتے تھے کہ جو میرا ان کے ہاتھ لگا تھا وہ سیاست کی بساط میں کسی بھی لمحے بازی چلنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ اسی مقصد سے مجھے پھینک لگا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ بڑے ابا

میں نہ تھی کہ خوشی محمد کے محلے کی عزت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے ایسی بزدلانہ حرکت کوئی رات کی تاریکی میں ہی کر سکتا تھا بڑے اہل دن بھر سونے اور رات پہرے دار بنے مورچے میں سپاہی کی طرح چاک و چوبند حفاظت کے لیے کھڑے رہتے۔ یہ بڑے ابا کی جرات و لیری ہی تھی کہ دشمنوں تک بھی یہ خبر جا پہنچی تھی کہ موسیٰ بھائی کی بیٹی کی طرف کوئی نگاہ اٹھانے کی بھی جرات نہ کرے ان کی عزت کی رکھوالی خود خوشی محمد کر رہے تھے۔ کئی روز تک بڑے ابا پہرا دیتے رہے اور ایک روز موسیٰ بھائی کی بیٹی آنکھوں کے ساتھ بڑے ابا کے پاس آئے انہوں نے اپنی دختر کو کسی اچھے سے گھرانے میں عزت کے ساتھ رخصت کر دیا تھا وہ بڑے ابا کے بے حد مشکور تھے۔

”یہ کیا بتائے گا بھی کسی چور نے بھی کہا ہے کہ چوری میں نے کی ہے یہ ساری تمہاری ذہین کا نتیجہ ہے خورشید عالم۔“ میں چچا مرزا کی بات سن کر ایک دم سے خیالوں کے دائرے سے پلٹا وہ میرے ابا سے بات کرنے کے بعد بڑے ابا سے مخاطب تھے۔

”ات باہر دوٹ اکٹھے کرنے سے فرصت ملے تو دیکھتے ہاں کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے ہماری اپنی بچیاں بھی تو کل کو جوان ہوں گی ان کے ذہنوں پر کیا اثر ہوگا۔“ ایسا کہتے ہوئے چچا کا غصہ اور ندامت سے سر جھک گیا وہ بڑے ابا کے سامنے سر جھکا کر ان کے فیصلے کے منتظر تھے لیکن فیصلہ تو تب ہونا تھا جب یہ ثابت ہو جاتا کہ واقعتاً چوہدری عبدالغنی کی بیٹی آج اس حویلی میں موجود تھی۔

راحت عبدالغنی سے میری پہلی ملاقات اکیڈمی میں ہوئی تھی۔ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا تھا

کے رعب و دبدبے کے سامنے بے حد ڈرے ہوئے بھی لگ رہے تھے انہیں خوف اس بات کا تھا کہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ واقعتاً ان کے سیاسی حریف چوہدری عبدالغنی کی دختر اور ان کے بیٹے طے کے درمیان کوئی معاملہ ہے تو پھر آج ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ ہاتھ لگا موقع ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا ان کے ہاتھ ایسا تاش کا پتلا لگا تھا جسے وہ موقع آنے پر ہی پھینکنا چاہتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اگر یہ بات دہی رہے کہ ان کا چراغ کیا گل کھلا رہا ہے۔ نجائے کس بد بخت نے بڑے ابا کے کان میں پھونک دیا تھا کہ آج چوہدری عبدالغنی کی بیٹی کا لٹا ہوا اور ہم ان کے گھر داخل ہوئی تھی اور پھر میرے اور راحت کے درمیان چل رہے عشق کے کھیل کا بھی انہیں پتا لگ چکا تھا وہ خود دوسروں کی عزت پر سایہ کیے رہتے وہ اپنی عزت اٹھائے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ مجھے اچھے سے پادے جب ہمارے ہمسائے ماس جائے موسیٰ بھائی کی بیٹی کو کسی نے اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی تو موسیٰ بھائی بڑے ابا کے پاس یہ کہنے بھی نہ آئے تھے کہ خوشی محمد میری عزت کو بچالے تیرا تو زور بھی چلتا ہے انہیں تو فقط نہیں سے یہ بھٹک گئی تھی کہ جہاں کہیں ان کی دختر کا لگن طے ہوا تھا وہ بعد میں معلوم پڑا کہ کوئی اچھے لوگ نہ تھے موسیٰ بھائی نے لگن توڑ دیا اور وہ ایسا کرتے ہی انہیں اوقات دکھانے آ گئے جس روز بڑے ابا کو اتنا معلوم پڑا انہوں نے اسلحہ کی پٹیاں گھر میں ذخیرہ لگائی۔ اوپر چھت کا تختی حصہ جہاں سے موسیٰ بھائی کے گھر داخل ہونے لگتے کے سبھی راستوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی بڑے ابا وہاں مورچہ لگا کر بیٹھ گئے وہ جانتے تھے کہ دن کے اجالے میں ایسی جرات کسی

تب تک میں نہیں جانتا تھا کہ وہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی تھی۔ میں تو بس اسی جنون میں رہتا تھا کہ مجھے بھی مصطفیٰ عالم کی طرح صوبے بھر میں پوزیشن لینا تھی۔ ہم دونوں مختلف کالجز سے ایف اےس کی کر رہے تھے لیکن وہ شہر کی واحد اکیڈمی تھی جس کی فیکلٹی بہت عمدہ تھی سبھی ٹاپ پوزیشن ہولڈرز اس اکیڈمی سے رخصت ہوتے تھے خود بڑے بھائی مصطفیٰ عالم بھی اسی اکیڈمی سے فارغ التحصیل تھے اس روز معمول کے مطابق میں اکیڈمی پہنچا لیکن مجھے کچھ تاخیر ہو چکی تھی پروفیسر پکچر کا آغاز کر چکے تھے پہلی دو قطاروں میں لڑکیاں بیٹھا کرتی تھیں اور اس کے بعد بال کے نیچے جیسے تک لڑکے بیٹھے ہوتے تھے ظاہر سی بات تھی مجھے پچھلی ہی کسی نشست میں جگہ ملا کرتی تھی لیکن آج جب مجھے اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہو چکی تھی تو وہاں بال میں پہنچ کر میں نے نظر دوڑائی پچھلی ساری نشستیں پر ہو چکی تھیں میں نے اگلی قطاروں میں دیکھا ایک نشست خالی پڑی تھی اس سے پہلے کہ میں بال کے عقبی حصے کی جانب بڑھتا اور آج کھڑا ہو کر پکچر سنا مجھے ہمارے استاد نے اشارے سے لڑکیوں کی قطار میں موجود پہلی خالی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں کچھ جھجکتا شرماتا اس خالی کرسی پر جا بیٹھا۔ بیٹھتے ہی میں نے اک نگاہ اٹھا کر اپنے بائیں جانب میٹھی لڑکی کی طرف دیکھ میں اسی لمحے اس نے بھی میری جانب ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی اور پھر وہ بھی ٹیپھر نوٹ کرنے میں لگ گئی اور میں نے بھی جھٹ سے اپنی نوٹ بک نکالی اور ٹیپھر سننے ہوئے جہاں کوئی خاص بات ہوئی اسے میں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا۔ مختصر دور لے کر یہ پیریڈ یوں ہی اپنے اختتام کو پہنچا اور میں نے

جھٹ سے نوٹ بک اپنے بیگ میں رکھی تیز تیز قدم بڑھاتا بائیک اسٹینڈ تک پہنچا اور بیٹھتے ہی کک لگا کر دوسری اکیڈمی کی جانب چل پڑا بس یہی معمول تھا میرا نہ تو کوئی لڑکا یہاں اس اکیڈمی میں میرا دوست تھا اور نہ ہی مجھے اتنی فرصت تھی کہ میں چوری چوری نگاہوں ہی نگاہوں میں کسی لڑکی سے تعلق بنانے کی جہد کرتا۔

اگلے روز میں معمول کے مطابق وقت پر اکیڈمی پہنچا تھا لیکن اس روز میرے ساتھ ایک خلاف معمول واقعہ پیش آیا تھا اس روز راحت عبدالغنی کو اکیڈمی پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی سبھی پہلی قطاریں پر تھیں اور آج فقط میرے ساتھ والی نشست خالی پڑی تھی مجھے نہیں علم وہ کیب میرے پاس پڑی خالی نشست پر آ کر بیٹھ چکی تھی۔ پیریڈ کے اختتام پر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا

”مجھے راحت عبدالغنی کہتے ہیں اور آپ۔“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا وہ مسکراتے ہوئے بے حد حسین لگ رہی تھی اور اس کا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا الاحمال میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”جی مجھے طے عالم کہتے ہیں۔“

”ٹائمس ٹو میٹ یو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور چلی گئی اور میں جیسے دھیرے دھیرے کچھ سوچتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھاؤ دروازے سے باہر جا رہی تھی جب ایک بار پھر سے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

”ہائے۔“ اس نے دہریں کھڑے، ہاتھ کے اشارے سے مجھے الوداع کیا اور جواباً میں نے فقط اپنا سر بلانے سے ہی کام چلایا پھر میں بھی بائیک اسٹینڈ تک باہر آ پہنچا تب تک وہ بی ایم ڈ بلیو سے

نہیں اٹھتے

لے کر آگے بڑھ چکی تھی۔

بندوق سے ننھی ننھی جڑیوں کا شکار ہوا نہر کنارے
سارا دن کا نما ڈالے پھلنے لگنے کا انتظار بگو کے گھر
سے پیر اور امرود چرانے ہوں یا سائیکل کی ریس وہ
بر کام میں مجھ سے دو ہاتھ آگے ہی رہتا تھا لیکن
اب اس کے دو ہی شوق باقی تھے۔ ڈور، دھاگہ
چنگ اور ون ویلنگ اور میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اس
وقت کہاں مل سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا
اور سیدھا چھت پر جا پہنچا اگلے نیلے آسمان پر کہیں
کہیں دودھیا سفید بادل دکھائی دے رہے تھے
بلکی بلکی ہوا چل رہی سرد ہوا سورج کی کرنوں سے
دھبہ کر نرم گرم سی محسوس ہو رہی تھی اور میری نگاہیں
آسمان کی دستوں پر ہی مرکوز تھیں۔ ضیا مجھے اپنی
چھت پر دکھائی کہیں دیا تھا لیکن اس کی موجودگی یا
غیر موجودگی کا پتا آسمان پر اڑتی چنگ سے ہی لگایا
جاسکتا تھا اور اگلے ہی لمبے مجھے اوپر بہت اوپر
بادلوں سے بھی آگے پڑی کی طرح اڑتی اس کی
چنگ دکھائی دی اور میرا من اس لمحے چاہا میں
پھلتا نکلتا ہوا جاؤں اور ضیا جس ڈور سے
چنگ اڑا رہا تھا اس ڈور سے جڑا میں بھی اوپر بہت
اوپر بادلوں سے بھی آگے پہنچ جاؤں اور جب نیچے
دیکھوں تو مجھے راحت عبادت اپنے گھر کی چھت پر
کھڑی دکھائی دے جائے۔ راحت کا خیال آتے
ہی میں نے ہوا سے اڑتے بے ترتیب ہوتے
اپنے بالوں کو ہاتھ بڑھا کر اپنی جگہ بٹھانے کی
نا کام کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے گھر کی چھت
پھلانگ کر میں ضیا کے گھر کی چھت پر جا پہنچا وہ
چھت پر پڑی چار پائی پر لیٹا ہاتھ میں چنگ کی ڈور
تھا سے ننھی ننھی دھوپ میں جیسے اونٹھلنے والا ہی تھا
جب میں دبے پاؤں چپکے سے جا کر اس کے پاس
چار پائی پر جا بیٹھا ایک اس نے اپنے قریب کسی

آج بائیک کو گنگ لگا کر میں اڑا ہی جا رہا تھا
دل تھا کہ سینے سے پھٹ کر باہر آنے کو بے تاب
ہوئے جا رہا تھا۔ فروری کی سرد ہوا مجھ میں نرم گرم
کوسا کوسا احساس جگا رہی تھی۔ چلتی بہار، میٹھی
میٹھی دھوپ پورب سے چلتی پروانی جی کچھ اتنا
بدلا بدلا سا کیوں لگ رہا تھا گلے میں سردی سے
بچنے کے لیے لگے رومال کو کھول کر ہوا میں لہرانے
کوئی چاہ رہا تھا۔ اس روز میں دوسری اکیڈمی نہیں
گیا ویسے بھی دوسری اکیڈمی میں نے فقط میسٹ
دینے کے لیے ہی جوائن کر رکھی تھی۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا
اور دیر تک آئینے میں کھڑا خود کو دیکھتا رہا ابھی خود کو
ہی دیکھ کر مسکراتے لگتا تو ابھی بال بنائے لگتا۔
”مجھے راحت عبادت کہتے ہیں۔“ مجھے اپنی
جانب بڑھا اس کا ہاتھ گویا پھر سے دکھائی دے رہا
تھا جی مجھے طے عالم کہتے ہیں میں نے آئینے کے
سامنے اپنا ہاتھ بڑھایا اور پھر اسی ہاتھ کو اپنے بالوں
میں گھما کر اچھل کر بند پر چھلانگ لگا دی۔

”کون سے وہ؟ مسرطہ عالم۔“ میں خود سے
ہی مخاطب تھا بی ایم ڈیو سے تو لگتا ہے کوئی بات
بن سکتی ہے کسے بتاؤں اکیڈمی میں تو میں نے کوئی
دوست بھی نہ بنایا تھا ابھی پڑھائی سے سرائٹھانے کی
فرصت ہی نہ ملی تھی کہ دوست بنانا اور البتہ نے
ذہن بھی ایسا عطا کیا تھا کہ مجھے ضرورت نہ تھی کہ
میں کسی سے مدد حاصل کرنے کے لیے دوہتی کرتا
پھر یکا یک مجھے ضیا کا خیال آیا میرے خمر سے
ایک گھر چھوڑ کر تیسرا گھر اس کا تھا۔ وہ میرا قریبی
ہمسایہ اور بچپن کا دوست بھی تھا بچپن میں کی جی
شرارتوں کا ماسٹر ماسٹر وہی ہوا کرتا تھا چہرے والی

ہوں لیکن جیسے ہی ٹیکر ختم ہوا مجھے ایک ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔

”راحت آپنی جلدی آ جائیں۔“ اس آواز پر میں ہی نہیں سمجھی نے گردن گھما کر ہال میں داخل ہونے والے دروازے کی جانب دیکھا جہاں ایک بہت پیارا سا بچہ اسکول یونیفارم میں کھڑا تھا وہ اس آواز پر جھٹ سے اٹھی اور پھر ہال سے باہر نکل گئی میں بھی اس کے تعاقب میں تیز قدم بڑھاتا ہوں کی جانب بڑھا ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ ہی رہی تھی گاڑی میں پہلے سے ایک چھوٹی بچی موجود تھی۔ مطلب وہ دو نہیں اور ایک ہی اس کا بھائی تھا جب تک اس کا ذرا نیور گاڑی آگے بڑھتا میں اپنی بائیک پر بیٹھا ہیلمیٹ پہن رہا تھا میں نے پہلے بھی ایسی حرکت نہ کی تھی اور کبھی ایسا واقعہ بھی تو پیش نہ آیا تھا جب میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس سے پہلے کہ ان کی گاڑی میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی میں نے اپنی بائیک اس کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ اب میں اس کی گاڑی کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ میری بائیک اور اس گاڑی کے درمیان فاصلہ نہ تو بہت کم تھا اور نہ ہی بہت زیادہ لیکن کبھی سنسنل پر رکتے ہوئے مجھے یہ احساس ضرور رہتا کہ میں اس کی گاڑی سے قریب ہی رہوں۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے کچھ حیرت کا احساس ہو رہا تھا کہ جس راستے سے میں گھر لوٹا تھا یہ وہی راستہ بالآخر ایک جگہ پہنچ کر اس کی گاڑی رک گئی اور مجھے ابھی تھوڑا اور آگے جانا تھا۔ اس کی گاڑی تو رک گئی لیکن میں نے تدوینی رفتار کم کی اور نہ ہی میں نے رک کر یہ چا کر کرنے کی کوشش کی کہ بالآخر وہ گاڑی کون سے گھر میں داخل ہو گئی اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا

کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کے لیے وہ آنکھیں موندے پڑا تھا آنکھیں کھلتے ہی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ شہزادے آج میری یاد کیے آگئی اس نے چنگ کی ڈور کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود سے ذرا قریب کر لیا اور پھر راز دارانہ انداز میں اسے بیٹے دونوں کی ساری رواد سنا دی۔ میری باتیں سن کر جیسے اس کی آنکھوں کی چمک ذرا بڑھ گئی تھی وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے سب کچھ بتانے کے پیچھے میرا کیا مقصد تھا مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ تم اسے جانتے ہو وہ کون ہے۔ کہاں رہتی ہے لائسنس کا اظہار کرنے پر وہ مجھے بتانے لگا کہ یہی پہلے یہ پتہ لگاؤں کہ وہ کون ہے، خاندان کونسا ہے رہتی کہاں ہے اور حسب ضیا سے یہ ساری باتیں جان کر میں گھر واپس لوٹ رہا تھا تو مجھے ضیا بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ایک ایسا دوست جسے میں اپنی ساری کہی ان کہی کہہ سکتا تھا۔

اسکے روز کا اس میں پھر ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ راحت عبدالغنی آج کسی مجبوری سے نہیں بلکہ خود اپنی منشا سے میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر ٹیکر شروع ہو گیا۔ کل اکیڈمی سے لوٹ کر میں نے اپنا بیک تک نہ کھولا تھا اتنی وجہ سے مجھے ٹیکر کو سمجھنے میں چھ دشواری کا احساس ہو رہا تھا اور میں یہ بھی چاہ رہا تھا کہ ٹیکر جلد سے جلد ختم ہو تو میں راحت سے کوئی بات کر سکوں اور شاید وہ بھی جانتا چاہتی تھی کہ میں کہاں سے ہوں کون سے خاندان سے

”یہ تو آپ جانتے ہی ہیں بندی کو راحت
عبدالغنی کہتے ہیں اور اگر آپ کچھ نہیں جانتے تو
شاید وہ یہ ہے کہ میں چوہدری عبدالغنی ایم این اے
ہیں کی صاحبزادی ہوں۔“

”کیا۔“ اس کی بات سن کر حیرت سے جیسے
میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور بے ساختہ میرے منہ
سے حیرت کے اظہار میں ”کیا“ نکل گیا۔

وہ اب متعجب سی میری جانب دیکھ رہی تھی اور
پھر میرے حیرت زدہ ہونے پر چوتھے ہوئے مجھ
سے دریافت کر ہی لیا۔

”کیا آپ کو یہ جان کرا چھا نہیں لگا میرے ابا
کوئی ایسے ویسے ایم این اے نہیں ہیں وہ تو بالکل
غیر سیاسی ہیں انہیں تو سیاست آتی ہی نہیں۔ اہل
علاقہ نے انہیں کیسے اس منصب پر فائز کر دیا ہے
ایسا میں نہیں جانتی اور اگر انہیں کچھ آتا ہے تو وہ ہے
احساس کرنا شاید یہی وہ جذبہ ہے کہ ڈیڈی کو خدا
نے آج یہ مقام دیا ہے میں آپ کو ان سے ملواؤں
گی۔“ اس نے بات کرتے ہوئے ایک دم سے
میرے چہرے کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے
کہا۔ آپ کو ان سے مل کر بہت اچھا لگے گا۔

”یقیناً اور آپ یہ تو جان ہی چکی ہیں کہ اس
ناچیز کو طے عالم کہتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتی
ہوں گی کہ بندہ خورشید عالم کا بیٹا ہے۔“ میں نے
اس کے ہی انداز میں اسے جواب دیا اور اب وہ
بھی میری بات سن کر حیرت زدہ سی مسمیٰ بیٹھی تھی
پھر ذرا توقف کے بعد وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھتے
ہوئے بولی۔

”طے آپ کے دادا خوش محمد تو کسی تعارف اور
تعریف کے محتاج نہیں ہمارے گھر میں اکثر ان کا
تذکرہ رہتا ہے خود ڈیڈی انہیں بہت عزت کی نگاہ

کہ میں ایسا کیوں کر رہا تھا۔

اگلے روز اکیڈمی میں لیکچر کے اختتام پر جب
ابھی کلاس سے نکل رہے تھے تو فقط میں اور راحت
عبدالغنی اپنی اپنی نشست پر بیٹھے رہے مجھے تعجب
اس بات پر ہو رہا تھا کہ ہم ساتھ بیٹھے تھے اور اپنی
نوٹ بک قلم بیگز میں رکھتے ہوئے ایک دوسرے
سے کوئی بات ہی نہ کر پارہاتے تھے لیکن پھر راحت کی
بات پر میں ایک دم سے چونکا وہ مجھ سے ہی
مخاطب تھی۔

”سمال ہے آپ اکیڈمی سے میرے گھر تک
میری گاڑی کا پیچھا کرتے آئے اور جب آپ
سے ملنے کے لیے میں نے ڈرائیور سے کہہ کر
گاڑی رکوائی تو جناب رکے ہی نہیں۔“ وہ اتنا کہہ
کر اب سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی
تھی۔ اس کی پہلی بات پر تو جیسے میں جھرا گیا تھا
جیسے میرا اوپر نیچے کا سانس رکنے لگا تھا۔ مجھے لگا وہ
یہ جاننے کے بعد کہ میں کل اکیڈمی سے نکلنے کے
بعد اس کی گاڑی کے تعاقب میں رہا تھا وہ کہیں
میرے بارے میں غلط رائے نہ قائم کرے اس کی
اگلی ہی بات پر کہ اسے جب پتا چل گیا تھا کہ میں
اس کی گاڑی کے تعاقب میں ہوں اور اس نے خود
ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی رکوائی تھی مجھے یہ سن کر
بہت اچھا لگا اور میری ہمت بندھ گئی کہ میں اس سے
بات کر سکوں وہ ابھی تک جواب کی منتظر سوالیہ
نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جب میں
نے اسے جواب دیا۔

”آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی
نہیں۔“ میں فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا اور میری
یہ بات سننے ہی بال نما کمرے میں ایک مترنم سا
قہقہہ گونجا اور ساتھ ہی وہ اب مجھ سے مخاطب تھی۔

بھائی دے رہی تھی اور میرے ابا کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔ چچا مرزا جائیداد میں موجود اپنا حصہ لے کر الگ ہو جانا چاہتے تھے اور میرے ابا کو بھٹک لگ چکی تھی کہ چچا جائیداد میں ملنے والا حصہ فروخت کر کے گاؤں منتقل ہونا چاہتے ہیں وہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد خاندان سے باہر کسی غیر کے ہاتھوں فروخت ہو اور اتنا پیسہ ان کے پاس موجود نہ تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم چچا مرزا کو ادا کر کے ان کا حصہ بھی اپنے نام کر لیتے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی وہ انکیشن ہارے تھے اور انکیشن ہارنے کا مطلب جوا بار جانے کے مترادف تھا انہوں نے اپنا بھی کچھ بیع پونجی اس انکیشن پر لگا دی تھی اور وہ سبھی کچھ ہار گئے تھے۔ میں اکثر اپنے بڑے ابا کی زبانی اپنے ابا کو مرزائش کرتے سنتا تھا وہ انہیں کہا کرتے تھے۔

”خورشید عالم سو در پیسہ نہ دیا کر یہ تیرے باقی پیسے کو بھی کھا جائے گا نہ لوگوں کی مجبوریوں سے کھیلا کر یہ وقت اور پیسہ کسی کے ساتھ سدا نہیں رہتا؟“ لیکن ابا بڑے ابا کی بات کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے آج بوئے فساد کو لے کر بڑے ابا بہت پریشان تھے وہ چچا مرزا کو ایک طرف لے گئے اور نجی گھنٹوں کی نشست کے بعد وہ چچا مرزا کو جائیداد فروخت نہ کرنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتی گئے اور اسی روز شام کو انہوں نے دونوں بھائیوں کی صلح بھی کرا دی۔

اگلے روز کالج اور اکیڈمی بند تھی۔ چھٹی ہوئے کی وجہ سے گھر پر ہی موجود تھا اور ضیاء سے ملنے کے لیے بے تاب بھی میرے لیے یہ بات جس قدر حیران کن تھی کہ راحت جو بہری عہد انہی کی بنی تھی ضیاء بھی یہ خبر سن کر چونکے والا تھا۔ دس بجے کے قریب اچھے ہی میں چھت پر جا پہنچا سورج کی

سے دیکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ بھی ہمارے گھر ڈیڑی سے ملنے آ جایا کرتے ہیں مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ایسے انسان کے پوتے ہیں۔ وہ اپنی بات کہہ چکی تھی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے میرے ابا کے بارے میں ایک بات تک بھی نہ کہی تھی نہ تو اس نے یہ کہا کہ وہ جانتی ہے کہ خورشید عالم اس کے ابا کے سیاسی حریف ہیں اور نہ ہی اس نے کوئی اچھے یا برے کلمات کہے وہ تو فقط بڑے ابا خوشی محمد کے ہی گن گاتی رہی اور مجھے اپنا موہاں نمبر دے کر رخصت ہوئی ہمارا رشتہ تو بننے سے پہلے ہی سیاست کی جھینٹ چڑھ گیا مجھے اس کی یہ بات ذرا ناگوار گزری تھی کہ اس نے میرے ابا کا ذکر تک نہ کیا تھا کیا وہ اتنے ہی برے تھے۔

اس روز گھر پہنچ کر ایک اور منظر میرا منتظر تھا گھر داخل ہونے سے ذرا پہلے میں ٹھٹھک کر رہ گیا گھر کے بیرونی دروازے پر لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ ایسی بھیڑ سیاستدانوں کے گھروں کے باہر ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن انکیشن گزر چکے تھے اور کوئی نئی مہم شروع ہوئی ہو ایسا بھی میرے قلم میں نہ تھا پھر یہ بھیڑ کبھی تھی میں بھی گھر سے باہر کھڑی ان گنت گاڑیوں کے بیچ اپنی بایک کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوا تو مجھے جان کر شدید صدمہ ہوا کہ فساد تو اپنے گھر میں ہی پھا تھا۔

چچا مرزا اور میرے ابا خورشید عالم کے درمیان جائیداد کو لے کر جو جھگڑا شروع ہوا اور جس کی جھڑپیں اکثر وحشت چلتی رہی تھیں آج نوبت اسلحہ تک آن پہنچی تھی میری نظر بڑے ابا پر پڑی وہ کسی قدر رنج و غم میں شہنائے لگ رہے تھے انہیں گویا ان دونوں بھائیوں میں مغایرت کی کوئی راہ ہی نہ

سہری کروں نے مجھے خوش آمدید کہا مارچ کی ایک اجلی ٹکھری صبح دھل رہی تھی لیکن مینا، چیزیا، کوا ابھی تک خوشی کے ہیٹ سنار رہے تھے۔ بہار سے مہکتی فضا میں پھولوں کی عجب سی باس رچی بسی ہوئی تھی لیکن ضیا چھت پر موجود نہ تھا اور نہ ہی اس کی چٹنگ مجھے فلک سے ہوس وکنار کرتی دکھائی دی۔

میں چند لمحوں تک یونہی کھڑا اس کی چھت پر آمد کا انتظار کرتا رہا جب وہ مجھے ہاتھوں میں ڈور اور بہت سی چٹنگیں لیے چھت پر آتا دکھائی دیا اسے دیکھ کر میری خوشی دیدنی تھی میں اس کے بعد اپنے گھر کے درمیان کی چھت پھلانگ کر اس تک جا پہنچا ابھی میں نے وہاں پہنچ کر اسے سلام کیا ہی تھا کہ اس کے عقب میں موجود سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی دادی ماں بھی چھت پر آ پہنچی تھی۔ مجھے ضیا کے ساتھ کھڑا دیکھ کر وہ اپنی سینک سنبھالتی دونوں بانہیں پھیلائے یوں میری جانب بڑھی کہ مجھے اپنی جگہ سے ہٹنے کا موقع ہی نہ ملا جب انہوں نے یوں میرے پاس آ کر مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

”پتر طے بڑے دنوں کے بعد دیکھا تجھے کہاں ہوتے ہو۔“ وہ اپنے تھریوں سے بھرے ہاتھ جن پر موٹی موٹی سہولیوں سی رکیں ابھری ہوئی تھیں میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے بولیں۔

”دادی ماں میں تو آپ کے پاس ہی ہوتا ہوں۔“ میں نے ان کی بات کا جواب دیا میری دادی ماں اب اس دنیا میں نہ تھی۔ وہ میرے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے سے اس جہان فانی سے رخصت ہو چکی تھیں اور میں بچپن سے ضیا کی دادی ماں کو اپنی دادی ماں کی طرح ہی سمجھتا تھا وہ انہیں یاد بھی بہت کرتی تھیں۔ میں جب بھی ان کے

پاس موجود ہوتا وہ ان کا ذکر چھیڑ دیا کرتی تھیں لیکن آج تو وہ ضیا نامہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ پاس ہی رکھی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا تب تک ضیا چٹنگ کی تلا میں ڈال کر اسے اڑانے لگا تھا اور مجھے دادی کے چنگل میں پھنسا دیکھ کر مجھ پر ہنس رہا تھا اس کے پاس یہ نعمت تھی میرے پاس نہیں تھی ناں میں ادیب سے بیٹھا ان کی باتیں سننے لگا وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

”اچھا بواطہ جو تم مجھے مل گئے پتر اپنے دوست ضیا کو بھی سمجھایا کرو تم لوگ تو بڑھ لکھ گئے تمہاری ماں نے تم لوگوں پر بڑی محنت کی ہے۔ مصطفیٰ کو دیکھتی ہوں وہ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے بڑی خوشی ہوتی ہے پر مینا اپنے اس نالائق دوست کو بھی ساتھ لے کر چلو سارا دن چٹنگ بازی کرتا رہے گا تعلیم تو ادھوری چھوڑ دی ساتھ ہی اپنی جان کی بھی پروا نہیں اسے۔“

ایسا کہتے ہو اچانک دادی نے ایک دھپا میرے بازو پر لگا یا اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”وہ کیا ہوتا ہے پتر جو پیہ اٹھاتے ہیں۔“ دادی کی اس بات پر اپنی ہی کودہاتے ہوئے میں نے کہا۔

”جی دادی ماں دن وینک۔“

”آہو، آہو پتر مجھے اس کی ماں بتاتی ہے بڑا خطرناک خیل ہوتا ہے جان کا خطرہ ہوتا ہے سمجھایا کر اپنے دوست کو پتر یہ کہتے ہوئے وہ چار پائی سے اتر کر اپنا جوتا ڈھونڈنے لگیں۔ میں نے چھت سے جوتا اٹھا کر ان کے آگے کر دیا وہ دعا میں دیتے ہوئے انہیں اور بولی۔

”پتر جی آپ نے اسے سمجھانا ہے میں ذرا تمہارے کھانے کو کچھ بھیجتی ہوں۔“ ایسا کہہ کر وہ

عقبی جانب سے جہاں ہم لوگ کھڑے تھے دیکھا جائے تو وہ بہت دور نہ تھا ابھی میری نگاہیں اس پرستان کا طواف ہی کر رہی تھیں کہ جب ضیا بولا۔

”یار تم نے اس سے کوئی رابطہ نمبر ہی لے لینا تھا۔“ ضیا کی بات سنتے ہی میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور راحت کے نام سے جو نمبر محفوظ کیا تھا اسے ڈائل کیا یہ دیکھ کر ضیا نے میرے کانڈھے پر ہتھکی لگا کر جیسے مجھے داؤدی اور اب ہم دونوں ہی دوسری جانب سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگے ہم دونوں ہی جس قدر بے تابی سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کر رہے تھے دوسری جانب سے اتنی ہی تاخیر سے کال ریسیو کی گئی۔

”ہیلو کون بول رہا ہے؟“ کال ریسیو کرتے ہی کسی ننھے سے بچے کی آواز سنائی دی۔ جسے میں فوراً ہی پہچان گیا تھا اس روز اکیڈمی میں، میں یہ آواز سن چکا تھا۔

”راحت آپلی جلدی آجائیں۔“ یہ آواز سنتے ہی ساری کلاس نے جو مز کر دروازے کی جانب دیکھا تھا تو وہاں اسکول یونیفارم میں ایک پیارا سا بچہ کھڑا تھا۔

”ہیلو کون ہے؟“ موبائل کے کھلے اسپیکر سے پھر آواز سنائی دی جب میں سوچ رہا تھا کہ میں اس بچے کو کیا جواب دوں اور ضیا مجھے مسلسل ٹھو کے لگا کر بات کرنے پر اصرار کر رہا تھا جب اسپیکر پر پھر سے ننھے بچے کی آواز ابھری۔

”انکل آپ طہ بات کر رہے ہیں۔“ اس کی بات سن کر جیسے ہم دونوں نے یوں حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور میں نے فوراً جواب دیا۔

”جی بیٹا میں طہ بات کر رہا ہوں۔“ ابھی فقط

سیڑھیاں اترنے لگیں اور میں نے پلٹ کر ضیا سے پتنگ چھیننے کے لیے اس پر ایک کر دیا۔ ہم لوگ دیر تک داؤدی ماں کی باتوں پر قہقہے لگاتے رہے پتنگ اوپر بہت اوپر آکاش کا طواف کر رہی تھی جب ایک دم سے مجھے راحت کا خیال آیا آج چھٹی تھی پھر آج وہ کیا کر رہی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں ضیا سے مخاطب ہوا۔

”جانتے ہو راحت کون ہے؟“ میری یہ بات سن کر وہ جھٹ سے بولا۔

”اگر مجھے علم ہوتا تو تمہیں اس کا پتا کرنے کو کیوں کہتا۔“ اس کی بات ختم ہوتے ہی میں بھی سرعت سے بولا۔

”تو پھر سنو راحت چوہدری عبدالغنی کی بیٹی ہے۔“ میری بات سنتے ہی اس کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور چھوٹ گئی اور وہ اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتا ہوا یوں حیرت سے بولا۔

”کیا وہ چوہدری عبدالغنی ایم این اے کی بیٹی ہے۔“ ضیا نے ایم این اے لگا کر جیسے مجھ سے تصدیق چاہی۔

”جناب وہ انہی ایم این اے کی بیٹی ہے۔“ میری یہ بات سن کر اس نے میرا ایک بازو تھاما اور مجھے جیسے ٹھسٹا ہوا ایک طرف کو لے گیا اور اسے ایسا کرتے دیکھ کر میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا جب چھت کے پردے کے پاس پہنچ کر جہاں سے شہر بھر کی ٹھارتوں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا وہ ایک ہاتھ اٹھا کر مجھے انگلی کے اشارے سے بتانے لگا۔

”طہ وہ جو نیلی ٹالموں والی کوٹھی دکھائی دے رہی ہے نا وہ ہے، چوہدری عبدالغنی کا گھر۔“ میں نے اس کی بات سن کر اس گھر کی جانب دیکھا اگر

میں نے اتنا ہی بولا تھا جب دوسری جانب سے مجھے وہی مترنم آواز سنائی دی۔

”جی السلام علیکم طے میں راحت بول رہی ہوں۔“

”علیکم السلام، میں نے پہچان لیا آپ کیسی ہیں۔“ اس کی آواز سننے ہی میں نے جھٹ سے جواب دیا اور ضیا میرے قریب کھڑا کچھ عجیب سی حرکتیں کرنے لگا جو ذرا دیر سے مجھے سمجھ میں آ گئیں کہ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اسے کہوں کہ وہ اوپر چھت پر چلی آئے جہاں اس طرح میں بھی چھت پر کھڑا تھا جب میں نے یہ بات راحت سے کہی تو وہ فون کان سے لگائے فوراً ہی چھت پر چلی آئی۔

ایک ہاتھ سے اپنے سارے بالوں کو جو میری آنکھوں تک جھک آئے تھے اٹھا کر ہاتھ کو سر کے اوپر لگاتے ہوئے میں نے اس نیلی ٹائلو والی کوٹھی کی جانب دیکھا وہ اسی پرستان کی کوئی ننھی چری ہی لگ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے اپنی

موجودگی کا احساس دلایا اسے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ ہمارے گھروں کی چھتیں اتنا قریب تھیں پھر میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے یہ کہتے ہوئے میں نے ضیا کو پتنگ نیچے اتارنے کو کہا ضیا نے سرعت سے دوڑ نیچے کھینچنا شروع کر دی میں نے ضیا سے قلم مانگا وہ پتنگ

میرے ہاتھ میں تھا کر قلم لینے چلا گیا جب تک ضیا قلم لے کر لوٹا میں راحت کو بتانے لگا کہ ابھی ایک پتنگ اس کی چھت پر آ کر گرے گی اس پر کچھ تحریر ہوگا وہ یہ سب سن کر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی اور اس طرف میری یہ حالت ہو رہی تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پونہ اپنی مترنم آواز سے ہنستی رہے اور میں اسے پونہ کی سنتا ہوں جب ضیا قلم لے

کر میرے پاس پہنچا تھا میں نے قلم اس کے ہاتھ سے لیا اور پتنگ پر لکھنے لگا۔

”راحت اچھی بیگنی ہے اور کل دوپہر میں درگاہ پر مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔“ میں پتنگ پر اپنے دل

کی بات لکھ چکا تھا اور میرے لکھتے ہی ضیا کو مجھے کچھ سمجھانا بھی نہیں پڑا۔ جب وہ تنگ ہوا میں تیرنے لگی تھی ہم دونوں ہی دھڑکتے دل کے ساتھ اوپر فضاؤں میں بلند ہوتی پتنگ کو دیکھ رہے تھے ہوا خاصی تیز تھی ابھی پتنگ یوں پھڑ پھڑانے لگتی کہ مجھے لگتا وہ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی تار تار ہو کر گر نہ جائے میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ یا رب یہ پتنگ اس تک پہنچ جائے ضیا نے میری

جانب اشارہ کیا۔ وہ پتنگ بازی میں جو مہارت رکھتا تھا اب اس کا کمال دکھانا چاہتا تھا پتنگ اب فضاؤں میں اس قدر بلند ہو چکی تھی کہ اگر اسے نیچے جھکاؤ دیا جائے تو وہ راحت کے سر کے اوپر سے اسی کے قدموں میں جا کر سے ضیا پتنگ کو اتار

جھکا رہا تھا کہ اب وہ پتنگ اس کے چھت سے سین اوپر تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ پھر ضیا نے اسے اس کے سر کے پاس یوں جھکا کر اوپر اٹھالیا کہ ایک بار پھر سے اس کے قہقہے مجھے فون پر سنائی دینے لگے۔ وہ اپنے سر پر پل سنبھالتی کبھی چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی نگاہیں

اٹھائے پتنگ کے چھت پر گرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب میرا اشارہ پا کر ضیا نے پتنگ کو چھت پر گرادیا۔ وہ پتنگ پر کبھی عبارت پڑھنے کے لیے جھکی اور میں اسے پھر سے دیکھنے کے لیے بے چینی سے اس کی چھت کی طرف دیکھنے لگا وہ اب مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ پتنگ اپنے سامنے رکھے اس پر درج عبارت کو

دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہی ہوگی کہ اسے مجھ سے ملنے کے لیے درگاہ پر آنا چاہیے کہ نہیں پھر فون پر بھی مسلسل خاموشی پا کر میں نے ضیا کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اس نے مجھے اشارتاً انتظار کرنے کو کہا۔ ابھی چند لمحوں ہی بیتے تھے جب ہمیں اچانک سے راحت دکھائی دی۔ پتنگ اس کے ہاتھوں میں تھی اور اب وہ ہمیں پتنگ واپس کھینچنے کا اشارہ کر رہی تھی ضیا نے اشارہ پاتے ہی دور کو مخصوص انداز سے کھینچا اور پتنگ راحت کے سر کے اوپر سے فضا میں تیرنے لگی۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی چھت پر کھڑی ننھے بچوں کی طرح خوشی سے اٹھتے ہوئے تالیاں بجا رہی تھی۔ میں نے فون ابھی تک کان سے لگا رکھا تھا۔ جب ضیا کی گونگائی آواز میرے کانوں سے مکرانی۔

”میرے ننھے مجنوں دوست فون رکھ دے پیغام پتنگ پر ہواؤں میں تیرتا ہوا آ رہا ہے۔“ ضیا کی بات سن کر میں نے اس پر ایک کر دیا اور اب میں مسلسل اس سے پتنگ چھیننے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا ہمیں یوں لڑتا جھڑتا دیکھ کر راحت اب واپس نیچے جا چکی تھی بٹا خراس کا پتنگ پر لکھ کر بھیجا جواب مجھ تک پہنچ ہی گیا اس نے میری عبارت کے بالکل نیچے لکھا تھا۔

”آپ بھی بہت اچھے ہیں طے، میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔“ راحت کا لکھا جواب پڑھ کر اب کی بار جو ضیا نے مجھ پر ایک کیا تو اب اس سے بچنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا جب میں اسی وقت داؤی ماں چھت پر آ پہنچی اور ہمیں یوں جھٹم گھما دیکھ کر بولی۔

”میں اسی لیے کہتی تھی کچھ سمجھاؤ تو بندہ خود ہی برا بنتا ہے۔“ داؤی کی بات سن کر ہم لوگوں نے

انھد کر کپڑے بھاڑتے ہوئے اس قدر تھکے لگائے کہ داؤی کھانے پینے کی چیزیں رکھ کر اسے پیروں واپس لوٹ گئیں۔

اس رات نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور کہیں جا بیٹھی تھی۔ میں سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا تو پھر سے ضیا کے ساتھ اس کے گھر کی چھت پر جا پہنچا تھا ابھی مجھے داؤی ماں کے پاس بیٹھا دیکھ کر ضیا کا کھلکھلاتا چہرہ دکھائی دیتا تو ابھی میرے فون کرنے پر راحت کے چھت پر چلے آنے کا منظر میری نگاہوں میں ٹھہر جاتا تھی میں پھر سے پتنگ پر لکھ رہا ہوتا۔ ”راحت اچھی ہوگی ہے اور کل درگاہ پر مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔“ اور ابھی مجھے اچلے خراسان پر مسکرائی ہوئی پتنگ دکھائی دیتی جواب راحت کا جوابی پیغام میرے نام لائی تھی اور ضیا اور اس میں اس پتنگ کو حاصل کرنے کے لیے کیسے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے پتنگ کی ڈور ابھی میرے ہاتھ آ جاتی تو ابھی ضیا اسے چھین کر چھت کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مجھے اپنے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر اس کا جوابی پیغام میری نگاہوں میں جم کر رہ گیا تھا میری لکھی عبارت کے تین نیچے اس نے لکھا تھا۔

”آپ بھی بہت اچھے ہیں طے میں آپ سے ملنے درگاہ ضرور آؤں گی۔“ میں یونہی سوچتا کر دیکھ بدلتا رہا اور پھر نہ جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح میری آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی آنکھ کھلتے ہی میں نے نیند کے گہرے اثرات کو مٹانے کے لیے اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا اور پھر جیسے ہی میری نگاہ ٹھری پر پڑی میں اچھل کر اٹھ بیٹھا گیارہ بج رہے تھے اور

ابھی مجھے تیار ہو کر ضیا کو بھی ساتھ لینا تھا ہاتھ روم جانے سے پہلے ہی میں نے ضیا کو بھی کال کر دی تاکہ وہ وقت مقررہ پر تیار ہو جائے اور پھر میں تیاری میں لگ گیا۔

جب میری تیاری مکمل ہوئی تو پونے بارہ ہو رہے تھے پھر جھٹ سے جو کمرے سے باہر پہنچا تو سامنے ماں کھڑی تھی چھٹی والے روز میں گیارہ بارہ بجے تک ہی سو کر اٹھتا تھا اور اب وہ مجھے بگانے آئی تھیں لیکن اب اپنے سامنے مجھے خوشبو میں مہکتا سوٹ بٹ پہنے کھڑا دیکھ کر وہ مسکرائی اور ان کے مسکراتے ہی میں نے ان کی پیشانی چوم لی۔ ویسے یہ کام وہ کرنے والی تھیں اور اب وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

”بیٹا جی آج ماں پر بڑا پیارا رہا ہے۔“ ان کی بات سن کر میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ماں پلیز آج کچھ وقت کے لیے لبا کی گاڑی کی چابی چاہیے۔“ ماں نے میری بات سن کر ہاتھ بڑھا کر میرے گال کو سہلایا اور پھر بولی۔

”بس، چلو میرے ساتھ آؤ۔“ ان کی بات ختم ہوتے ہی ایک قدم ان کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے کاندھے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”ماں یہ ہوئی نا بات۔“ اپنے کمرے میں پہنچ کر ماں نے مجھے گاڑی کی چابی دی اور ایک بار پھر سے ماں کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر گاڑی لے کر ضیا کے گھر جا پہنچا پہلے ہم دونوں ہی اپنی اپنی بالیکس پر درگاہ چائے والے تھے لیکن اب میری منی پجارو اپنے گھر کے سامنے کھڑی دیکھ کر ضیا بھی میری طرح خوش دکھائی دے رہا تھا پھر ضیا کو ساتھ لیے میں

درگاہ کی طرف چل پڑا۔ درگاہ شہر سے چند کوس مسافت پر تھی۔ شہر کی بھینٹ بھار سے نکلتے ہی ہم لوگ جلد ہی درگاہ تک پہنچ گئے تھے پہلے پہل یہ درگاہ آبادی سے کافی مسافت پر ہوئی تھی لیکن پچھلے کئی برسوں سے آبادی کے بڑھتے تناسب سے اب یہ درگاہ آبادی سے قریب ہی لگ رہی تھی۔ درگاہ سے قریب ہی درگاہ میں داخل ہونے والے راستے میں ایک نہایت بلند قامت آدم کا بیڑا تھا جس کے گھنے سیائے تلے ہم لوگوں نے اپنی گاڑی روک دی تھی اگرچہ اس درگاہ پر فقط جمعرات کے روز ہی میلے کا سماں دکھائی دیتا تھا لیکن آج اتوار کا دن تھا شاید تعطیل ہونے کی وجہ سے خاصے زائرین یہاں موجود تھے ضیا کو وہیں گاڑی کے قریب کھڑا کر کے میں درگاہ کی سڑکیاں چڑھتا ہوا اندر کھلے احاطے میں داخل ہو گیا۔ سامنے کھلے احاطے میں بڑا سا برگد کا بیڑا تھا جس کے عین نیچے کئی اینٹوں کا تنہا بنا ہوا تھا۔ بہت سے بوڑھے اور بچے اس تنہے پر بیٹھے درگاہ میں آتے جاتے لوگوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ بچے برگد کی لنگی لمبی لمبی ڈالیوں سے جھول رہے تھے مزار پر حاضری کے بعد چند لوگ ساتھ لایا تبرک بھی تقسیم کرتے دکھائی دے میں نے وہاں کھڑے ہو کر چار سو نظر دوڑائی مگر مجھے راحت کہیں دکھائی نہ دی آگے بڑھ کر میں نے مزار کے اندرونی حصے میں بھی جھانک کر دیکھ لیا لیکن وہ وہاں نہ ملی، مطلب ہم راحت کے پہنچنے سے پہلے پہنچ چکے تھے یہ سوچتے ہوئے میں ضیا کے پاس واپس چلا آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ راحت ابھی درگاہ پر نہیں پہنچی تھی اور اب ہم اسی راستے پر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے جہاں سے

پر بھی گئی تھیں وہ سبھی لمس احساس مجھے کسی الگ ہی دنیا میں لے گئے تھے۔

وہاں آم کے پتھر کی گھنی چھاؤنی تلے کھڑے ہمیں کافی وقت بیت چکا تھا لیکن راحت ابھی تک نہ آئی تھی اور اب میں ضیا سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں واپس چلنا چاہیے لیکن اسی کے اصرار پر میں مزید وہاں کھڑا موہوم سی امید کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا لیکن پھر وہ موہوم سی امید بھی نوٹ گئی جب وہ مزید وقت گزرنے کے باوجود نہ پہنچی تھی۔ اب کی بار جو میں نے ضیا کو واپس چلنے کو کہا تو اس نے میری بات نہ مانی اور ہم دونوں ہی بچھے ہوئے دل کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔

اگلے روز میں اسے اکیڈمی میں ملا تو میں اس سے سخت خفا تھا اور اسے بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کلاس ختم ہوتے ہی اب وہ معذرت پیش کر رہی تھی۔

”ظہر گھر پر کوئی بھی نہ تھا فقط چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ میں تنہا تھی اور انہیں تنہا چھوڑ کر میں نہیں آ سکتی تھی میں جانتی ہوں تمہیں بہت برا لگا لیکن میں بھی تو کتنی مجبور تھی۔“ اس کی مجبوری والی بات سن کر میں نے جو پلٹ کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو وہاں آنکھوں کے ساغر اس کی زبان کی صداقت کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کی معصومیت پر مجھے پیارا آنے لگا تھا اور پھر مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ جھٹ سے اپنا بیک کھول کر اس میں سے ہتھ نکالنے لگی۔

”ظہر میں کل آتے ہوئے آپ کے لیے یہ گفٹ لا رہی تھی اسے رکھ لیجیے۔“ اس کا میری جانب بڑھا ہاتھ ہوا میں ہی معلق تھا جب اس کے ہاتھ سے گفٹ لیتے ہوئے میں نے فوراً اسے اس

زائرین کے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا اور ساتھ ہی میں بچنی اور بے یقینی جیسی صورت حال کا شکار ہو رہا تھا جو وقت ہم لوگوں نے مقرر کیا تھا وہ بیت رہا تھا لیکن وہ آئے گی بھی یا نہیں یہی سوچ کر میرا یقین ڈگمگانے لگا تھا جب مجھے ضیا کی آواز سنائی دی وہ پاس سے گزرتے ایک بچی اور بچے سے مخاطب تھا جو بہن بھائی لگ رہے تھے۔

”پیارے بچوں ہمیں بھی تھوڑا تبرک کھلا دو۔“ بچی کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس پر ایک ریشمی کپڑا پڑا تھا ضیا کی بات سن کر بچی نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے بھائی کی طرف دیکھا جو اس سے بھی زیادہ شرملا رہا تھا ضیا ان بچوں کے روکتے ہی میری جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے ذرا اور ان کے قریب چلا گیا۔ اس کے قریب ہوتے ہی بچی نہایت احترام سے بولی۔

”بھائی جان یوں تو اب یہ باقی بچا تھوڑا سا تبرک ہم اپنے گھر کے لیے لے جا رہے ہیں لیکن اب آپ نے روکا ہے تو آپ کو ضرور کھلا میں گے۔“ یہ کہتے ہوئے بچی نے ریشمی کپڑا جو تھال پر دھرا تھا اسے بٹایا تو نیچے شکر، گھی، آنے سے بنی روٹی کے چند ٹکڑے پڑے تھے۔ دو ٹکڑے اٹھا کر اس نے ضیا کی جانب بڑھا دیے۔ جب میں نے عقب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ضیا یہ بچے تو بہت ذہین ہیں۔“ میری بات سن کر بچوں نے پلٹ کر ایک بار مجھے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ضیا نے پلٹ کر اک ٹکڑا مجھے دیا اور ایک اس نے خود کھالیا میں نے جو ضیا کے ہاتھ سے تبرک کا ٹکڑا لے کر اپنے منہ میں رکھا تو کیا عجب احساس تھا۔ مجھے لگا جن ہاتھوں نے اسے بنایا تھا اور پھر جو آیت مبارک

دو، دو ہو گئیں۔ یوں ایک حصہ میں نے اس کی کلائی پر باندھ دیا اور دوسرا خود رکھ لیا۔ وہ میری اس حرکت سے کافی محفوظ ہو رہی تھی جب وینٹر کھانا لے آیا چائیز رائس سے اثری بھاپ اور خوشبو نے ہماری بھوک اور بڑھادی تھی میں نے راحت کو شروع کرنے کی دعوت دی تو کالج کی بھاری نفیس پلیٹ جس پر ہوں کالوگو بھی لگا تھا راحت اس میں رائس ڈالنے لگی اور ساتھ ہی وہ پلیٹ اس نے میری جانب بڑھا دی شکر یہ کہہ کر میں نے وہ پلیٹ اس کے ہاتھ سے لی اور پھر وہ اپنے لیے رائس پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ جب وہ ایسا کر رہی تھی میں نے کانٹا اور چمچ ہاتھ میں تھامتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”راحت آپ کو دیر تو نہیں ہو رہی۔“ میری بات سن کر اس نے پلیٹ جس میں ابھی اس نے رائس ڈالے تھے اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”طہ میں نے کبھی کوئی بات اپنے ڈیڑی سے نہیں چھپائی ہماری پہلے روز ہوئی ملاقات سے آج اس شبل پر کھانا کھانے تک وہ سب جانتے ہیں۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور میں ان کے اعتماد کو کبھی نہیں پہنچاؤں گی اسی لیے میں کہوں گی کہ میں تو آپ سے ملنے آپ کے گھر بھی آ سکتی ہوں۔“ آخری بات کہتے ہوئے وہ واقعی پر اعتماد لگ رہی تھی اور میں جو حیرت زدہ سا ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا آخری بات پر چونکتے ہوئے بولا۔

”یار ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنا میرے گھر والے ذرا پرانے خیالات کے ہیں۔“ میری بات سن کر اس نے وہی مترنم سا قہقہہ لگایا اور ہم لوگ ریسٹورنٹ میں بج رہی ہلکی ہلکی موسیقی میں کھانا کھانے لگے کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ

کے ہی بیگ میں رکھ دیا وہ حیرت زدہ سی سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی جب میں نے اسے جواب دیا۔

”آپ کا یہ تحفہ میں آپ قبول کروں گا جب آپ میرے ساتھ کھانا کھانے کسی ریسٹورنٹ چلیں گی ابھی اسی وقت۔“ وہ میری بات سن کر کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو چلیں۔“ اس کے اس جواب پر میں نے بھی حیرت سے اٹھتے ہوئے ایک سوال پوچھا۔

”راحت اگر آپ میرے ساتھ ریسٹورنٹ چلی گئیں اور ڈرائیور آپ کو لینے یہاں آیا تو آپ کیا جواب دیں گی۔“ یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی تھی جسے سن کر وہ فوراً بولی کہ آج وہ ڈرائیور کے ساتھ نہیں آئی اور وہ ابھی وہ رکشہ پر نئی جانے گی اس کی یہ بات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور یوں اس روز میں پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا تھا۔

راستہ بھر وہ مجھے اپنی پسند کے ریسٹورنٹ بتاتی رہی اور میں اسے اپنی پسند بتاتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ پر ہم دونوں ہی متفق ہو گئے اب ہم اسی ریسٹورنٹ میں موجود تھے وہاں بیٹھتے ہی میں نے مینوراحت کی جانب بڑھایا دیا تاکہ وہ اپنی پسند کا آرڈر دے اور جب وہ آرڈر دے چکی تو اس نے پہلے وہ تحفہ اپنے بیگ میں سے نکالا جو میں نے واپسی اسی کے بیگ میں رکھ دیا تھا میں نے وہ تحفہ راحت کے ہاتھ سے لے کر اسی کے سامنے کھولا اور اس میں ایک فرینڈ شپ بینڈ تھی اور ایک خوشبو جو مجھے بہت پسند آئے اور میں نے اس کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے فرینڈ شپ بینڈ کو یوں دو حصوں میں الگ کر لیا کہ جو چار کڑیاں ملی ہوئی تھیں اب وہ

ریسٹورنٹ سے لنگے میں نے اسے رکشہ پر بٹھایا اور خود بانٹیک پر گھر چلا آیا۔

میرے گھر پہنچنے تک دن دھل چکا تھا اپنے کمرے میں پہنچ کر بیگ و بال رکھنے کے بعد اب میں ضیا سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ آج راحت سے ہوئی ملاقات ریسٹورنٹ میں کھانا، فرینڈ شپ بینڈ، خوشبو کا تحفہ میں اسے بھی کچھ بنانا چاہتا تھا۔ اسی مقصد سے میں گھر سے نکلا اور ضیا کے گھر جا پہنچا میری دوسری ہی دستک پر چھوٹی نے دروازہ کھولا اور مجھے سامنے کھڑا پا کر وہ خوشی سے بے ساختہ اپنی تو قلمی زبان سے بولی۔

”مما ملے بھائی آئے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھ کر گود میں اٹھا لیتا وہ شرمناک بھاگ گئی اور اب آئی میرے سامنے کھڑی تھیں۔

”السلام علیکم؟“ میں نے سلام میں پہل کی تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے چند سیکنڈ میں مجھ سمیت میرے سارے شجر و نسب کا حال پوچھ ڈالا۔

”آئی ضیا گھر پر ہی ہے۔ میں ضیا سے ملنا آیا تھا۔“ آئی نے مجھے ہنسنے کو کہا جب میں نے کھڑے کھڑے ان سے ضیا کے بارے میں دریافت کیا تو آئی جیسے بے زاری سے بولیں۔

”ہاں جینا اوپر چھت پر ہے۔ آج چودھویں کی رات ہے تا آج رات بھی وہ دیر تک چٹنگ ہی اڑاتا رہے گا۔“ آئی کی بات سن کر شکر یہ ادا کرتے ہوئے میں میٹر حیاں چڑھتے ہوئے جا پہنچا۔ فروری کے درمیانی دنوں کی ایک صاف شفاف رات شروع ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی رات کی دانی کی پر اسرار محو رکن سی خوشبو سے بھری رات، چودھویں کا چاند، ننھے منے تاروں سمیت

اپنے پورے اہل و عیال کے ہمراہ اب و تاب کے ساتھ جھمکا رہا تھا اور میرا راضیا، سفید رنگ کی چٹنگ اپنے پاس ڈھیر لگائے آسمان پر کسی کے ساتھ بیچا پھنسا لے کھڑا تھا۔ جب مجھ دیکھتے ہی وہ چلا یا۔

”طے ادھر آ دیکھ یہ میری ڈور سے تیری چٹنگ ہو کا نا ہوگی۔“ اس کی بات ختم ہونے تک میں اس کے قریب جا پہنچا تھا لیکن میرے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھنے تک اس کی اپنی ہی چٹنگ کٹ چکی تھی اور اب وہ برا سامنہ بناتے ہوئے ڈور کھینچ رہا تھا۔ جب میں نے راحت کی دی فرینڈ شپ بینڈ اس کے سامنے کر دی۔ یہ دیکھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈور ایک طرف پھینکی اور میرے ہاتھ سے بینڈ لیتے ہوئے جھٹ سے بولا۔

”تم راحت سے ملے تھے اور آج اس نے تمہیں یہ فرینڈ شپ بینڈ دی اور تم نے لے لی اور اس دن جو اس نے ہمیں سارا دن ڈیل و خوار کیا اس کا کیا ہوا۔“ اس کی یہ ترش بات سن کر میں مسکراتا ہوا اس کا بازو تھامے اسے چارپائی تک لے گیا جہاں بیٹھے میں اسے بتانے لگا کہ وہ کیا مجبوری تھی جو اس اس روز ہمیں ملنے لگا۔ پر نہ آئی بھی پھر میں نے ریسٹورنٹ میں کھائے کھانے اور اس سے ہوئی باتوں کی ساری تفصیل اسے بتائی جسے سنتے ہی وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا وہ میرا بازو تھامے مجھے نیچے لے گیا اس نے اپنی بانٹیک نکالی اور اب وہ میرے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس کا سارا پیمانہ سمجھ گیا تھا میں بھی تیزی سے اپنے گھر داخل ہوا اور جب لوٹا تو میں اپنی بانٹیک کے ساتھ تھا۔ میری خوشی تو دیدنی تھی ہی ضیا آئیے سے باہر لگ رہا تھا ہم لوگوں کا رخ راحت کے گھر کی طرف ہی تھا۔ جب راحت کے گھر سے ذرا پہلے ضیا نے اپنی

سبب

۱۔ نہ اتنا مینھا ہوں کہ لوگ تمہیں نگل لیں، نہ اتنا کمزور ہوں کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو جتنا تم اس کے محتاج ہو۔

۳۔ آخرت کی اتنی ہی تیاری کرنا جتنا تم نے وہاں جا کر رہنا ہے۔

۴۔ گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ ہو۔

۵۔ جب کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرے تو پھر ایسی جگہ تلاش کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ نہ دیکھ سکے۔

۶۔ زمین المدینہ صدیقی۔۔۔ کراچی

بھی یہی وجہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایسبولینس آپہنچی تھی میں ضیا کے ساتھ ہی ایسبولینس میں بیٹھا تو ایسبولینس کا نملہ ابتدائی طبی امداد دیتے ہوئے اسپتال کی جانب بڑھ چکا تھا راستہ بھر میں ضیا کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرتا رہا لیکن اسپتال پہنچنے تک بھی اسے ہوش نہیں آیا راستے میں ہی میں نے بڑے بھائی مصطفیٰ عالم کو ضیا کو پیش آنے کا ارادے کی اطلاع کر دی تھی اور پھر ہمارے ضیا کو ایسبولینس سے ایمرجنسی وارڈ میں لے جانے تک سبھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا جو ضیا کے اماں اور ابا کے ساتھ دوا کی ماں نہیں آئی تھی وہ شاید یہ برداشت نہ کر پائی اس لیے وہ انہیں اپنے ہمراہ نہ لائے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں ان کے سوالوں کے جواب انہیں ہرگز دے پاتا۔ میرے ماں بڑے ابا اور مصطفیٰ عالم بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ ضیا کے ماں اور ابا کو دلا سے دے رہے تھے اور میں با مشکل چھلکتی آنکھوں کے

بانٹک کی رئیس بڑھائی اور ساتھ ہی اگلا وکیل اٹھا لیا اب وہ ٹریفک کے درمیان ون ویٹنگ کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے بھی اپنی بانٹک کی رئیس بڑھائی میں اس تک پہنچ کر اسے ایسا کرنے سے روکنا چاہتا تھا ابھی چند روز پہلے ہی دوا کی ماں نے ضیا کی شکایت لگاتے ہوئے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ میں اسے اس خطرناک جان لیوا کھیل سے باز رہنے کو کہوں اور آج جبکہ میں اس کے ہمراہ ہی تھا وہ بے تحاشہ ٹریفک کے درمیان ون ویٹنگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچتا اور اسے ایسا کرنے سے منع کرتا میرے دیکھتے ہی دیکھتے ضیا کا توازن بگڑا بانٹک اس کے پیچھے سے نکلی اور ٹرک چلتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی اور ضیا فٹ پال کی طرح اچھلتا زمین سے رڑٹا فٹ پاتھ کے پاس جا رہا اسے یوں لگتا دیکھ کر جیسے میرا دل دھک سے رو گیا رات کی تاریکی میں جیسے میرے ذہن میں آنے لگیں سی چلنے لپس تھیں۔ میں نے بانٹک کو روکتے ہی کھڑا بھی نہ کیا اور اسے وہیں پھینک کر ٹریفک کے بیچ میں سے پھتا پھتا فٹ پاتھ تک جا پہنچا جہاں چند لوگ مجھ سے بھی پہلے ضیا کے پاس موجود تھے۔ میں نے اس کے پاس پہنچتے ہی ضیا کا سراپتی گود میں رکھا اور اس کے گال چھپھپھاتا ہوا اسے ہوش میں لانے کو آوازیں دینے لگا۔ میں نے اس کے سر کا معائنہ کیا اسے بظاہر نہیں چوٹ لگائی تھی اس کے بازو ہاتھ نہیں سے کوئی خون بہتا دکھائی نہیں دیا تھا لیکن ہاتھ پہلے چند سیکنڈ گزرنے کے باوجود وہ ہوش میں نہ آیا تھا کوئی میرے پاس کھڑا اس کی نبض دیکھ رہا تھا اور کوئی میری طرح سر کا معائنہ کر رہا تھا پھر کسی نے ایسبولینس کو کال کر دی

ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔
 ”لطائف نے اسے روکا کیوں نہیں۔“ ضیا کی ماں کی
 یہ بات سن کر میں انہیں کوئی جواب نہیں دے پایا۔
 ”یا اللہ میرے بچے کی حفاظت فرما۔“ ان کے
 منہ سے دعا لگی تو میں نے اپنی نرزدلی زبان سے
 دل ہی دل میں آمین کہا۔
 ضیا کہ پاس زیادہ لوگوں کو رکھنے کی اجازت نہ
 تھی اس کے پاس اندرا میر جنسی میں اس کے اماں
 ابا اور مصطفیٰ عالم تھے اور میرے ماں باپ اور بڑے
 ابا ہم بھی باہر وارڈ میں کھڑے تھے اور ضیا کے ہوش
 میں آنے کی دعا میں بائیک رہے تھے پچھلے پون
 گھنٹے سے وہ بے ہوش پڑا تھا ڈاکٹر نے ابھی تک
 یہی بولا تھا کہ ہوش میں آنے تک وہ کچھ نہیں کہہ
 سکتے۔ پھر ہماری دعائیں اللہ نے سن لیں اور بھائی
 مصطفیٰ عالم ہمیں یہ بتانے کے لیے دیر جنسی سے
 باہر آئے کہ ضیا کو ہوش آ گیا ہے۔ ہم بھی جو اس
 سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس کے پاس
 پہنچے تو جہاں اس کے ہوش آنے کی بے حد خوشی تھی
 وہیں ایک بڑی خبر بھی ہماری منتظر تھی۔
 ”ماں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ابا میں کچھ
 نہیں دیکھ پا رہا۔“ اس کے قریب پہنچتے ہی ہمیں ضیا
 کی ایسی حالت دیکھ کر شدید دھچکا پہنچا چہروں پر
 چھائی خوشی اب زردی میں بدل گئی تھی۔ میں بے
 ساختہ ضیا کے سامنے جا پہنچا اور اسے آوازیں
 دینے لگا۔
 ”ضیا میں یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہوں وہ
 ہاتھ بڑھائے بے بسی سے مجھے پکارنے لگا۔
 ”لطیف میں کچھ نہیں دیکھ پا رہا مجھے تم دکھائی نہیں
 دے رہے میں دیکھ کیوں نہیں رہا لطیف۔“ اس کی
 باتوں نے وہاں موجود سبھی کو رلا دیا تھا میں نے

آگے بڑھ کر ضیا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے
 کر چوم لیا۔
 ”تم ٹھیک ہو جاؤ گے ضیا تم فکر مت کرو ہم
 سب ہیں نا تمہارے پاس۔“ میں تو فقط اسے
 دلا سہ دے سکتا تھا۔ اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ
 ٹھیک ہو جائے گا وہی ضیا جو چند گھنٹوں پہلے
 چودھویں کی رات میں سفید پتنگ اڑائے پھیلا رہا
 تھا تاروں سے جھمکاتے آسمان تک خوش و خرم
 دکھائی دے رہا تھا اور پھر میری اور راحت کی
 ریسٹورنٹ میں ہوئی ملاقات کا احوال جان کر مجھ
 پر فریفت ہوا جا رہا تھا اور کیسے پھر اس نے بائیک
 نکالی اور شہر کی جھلکائی روشنیوں کے بیچ وہ سڑک پر
 دن دینگ کرتا ہوا اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا
 بیٹے چند لمحوں نے ہی اسے کہاں سے کہاں لا چٹھا
 تھا۔ وہی ضیا جو آج مجھ سے گریڈ پارٹی لینے والا
 تھا۔ اب دیر جنسی میں ہمارے سامنے بے بسی
 سے چلا چلا کر ہمیں پکار رہا تھا کہ اسے دکھائی نہیں
 دے رہا۔ وہ کیوں کچھ نہیں دیکھ پا رہا؟ اس سوال کا
 جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا اس کے اس
 سوال کا جواب ڈاکٹر ہی دے سکتا تھا۔ ضیا کے
 ہوش میں آتے ہی ڈاکٹر بھی اس کے پاس ہی
 موجود تھا اور اب وہ ضیا کی آنکھوں کا معائنہ کر رہا
 تھا جب اس نے ضیا کے سامنے ہی بھی کو بتایا کہ ضیا
 کی آنکھیں بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھیں
 اور مزید تفصیلات جاننے کے لیے انہیں ضیا کے سی
 ٹی اسکین اور ایم آر آئی اور مزید کچھ ٹیسٹ کرنے
 ہوں گے ڈاکٹر یہ سبھی ٹیسٹ لکھ کر ہمیں دے گیا تو
 تھوڑی ہی دیر میں ہم ضیا کو ٹیسٹ کے لیے
 لیبارٹری لے گئے۔
 اسپتال کی لیبارٹری میں ہی ضیا کے سبھی ٹیسٹ

تک ٹھیک تھا کہ پہنچنی چاہیے وہ اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اب وہ ان سب باتوں کو سمجھ سکتا ہے اس گھڑی میں ضیا کے ساتھ جی بیٹھا تھا جب اس کی ماں اور ابا کے بجائے بھائی مصطفیٰ عالم نے نیوروسرجری والی بات ضیا کو بتائی وہ اسے یوں سمجھا رہے تھے جب اچانک ضیا نے ایک سوال پوچھ لیا۔

”مصطفیٰ بھائی نیوروسرجری میں نیچنے کا چانس کتنے فیصد ہوتا ہے۔“ ضیا کا یہ سوال سنتے ہی کمرے میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ اس کے اس سوال پر مجھ سمیت سچی کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ ضیا کی ماں خود کو سنبھال نہیں سکی وہ اپنے چہرے کو آئینل میں چھپائے باہر چلی گئیں ضیا کے ابا بھی ان کے پیچھے ہی چلے گئے میں نے جو ہاتھ بڑھا کر ضیا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں نے دیکھا مصطفیٰ بھائی بھی کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گئے تھے۔

اب فقط میں ہی ضیا کے پاس موجود تھا جب وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔
”طے میں زندگی بھر تم سے کھیل کے ہر میدان میں آگے رہا ہوں اور اب.....!“ وہ کچھ سوچتے ہوئے رک گیا۔

”اور اب ضیا۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا اور اب..... میں دنیا سے بھی تم سے پہلے.....!“ میں نے اگلی بات سننے سے پہلے ہی اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔

اسی روز مجھے راحت کی کال آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اکیڈمی کیوں نہیں آیا میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو پھر وہ بھی فوراً ہی اسپتال آ پہنچی تھی۔ جب وہ کمرے میں

لیے گئے تھے اور واپسی تک ضیا کے ابا اس کے لیے وی آئی پی روم تک بک کر اچھے تھے اب ہم اسے سیدھا وہیں لے آئے تھے۔ ایک دم سے اپنی آنکھوں کی بینائی کھو جانے پر وہ صدمے میں لگ رہا تھا اور بار بار مجھے اپنے لیے دما میں کرنے کو کہہ رہا تھا اور میں اسے تسلی اور دلاسا دیتا رہا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا اور ہم لوگ پھر یہ اس کے گھر کی چھت پر کھڑے رنگ برنگی پینٹیں اڑائیں گے۔ میں اس کے ذرا قریب بیٹھا اسے کہنے لگا ضیا ہم ایک اتنی بڑی پینٹ اڑائیں گے جس کے ایک طرف ضیا اور دوسری طرف طے لکھا ہوگا۔ وہ میری یہ بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا نہیں طے اب ضیا نہیں اب پینٹ کے ایک طرف طے اور دوسری طرف راحت لکھا ہوا میں وہ پینٹ ضرور اڑاؤں گا طے اور پھر اسے ہم راحت کے گھر کی چھت پر گرا دیں گے۔

اگلے روز صبح ہی تمام رپورٹس آ گئیں تو ڈاکٹر نے ہمیں ایک اور بری خبر سنا دی۔ ضیا کو کھانسی نہ دینے کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی دماغی چوٹ تھی۔ خون اس کے سر سے باہر نکلنے کی بجائے اس کے دماغی غلیوں میں ہی جم کر رہ گیا تھا اور ڈاکٹر اب اس کا واحد علاج نیوروسرجری ہی بتا رہے تھے۔

ضیا کے ماں اور ابا یہ بات جان کر سکتے میں لگ تھے وہ یہ بات ضیا سے چھپائے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ضیا کو معلوم پڑے کہ چند روز بعد ہی اسے نیوروسرجری جیسے خطرناک آپریشن سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن پھر بھائی مصطفیٰ عالم نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں یہ بات ضیا سے ہرگز نہیں چھپانا چاہیے نہیں تو یہ اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کے مترادف ہوگا جو بھی بات ہے وہ ضیا

اگلے روز صبح ہم سبھی ضیا کے پاس موجود تھے ہم اسے حوصلہ اور یقین دلارہے تھے کہ اس آپریشن کے بعد وہ بالکل ٹھیک اور تندرست ہو جائے گا وہ پھر سے اپنی آنکھوں سے اس دنیا کی خوب صورتی کو دیکھ سکے گا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے ارد گرد موجود تھے اور چھوٹی جوا بھی اتنی چھوٹی تھی کہ وہ یہ سبھی باتیں ابھی نہ سمجھتی تھی وہ بھی ضیا کے قریب سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ میں اسے بار بار کہہ رہا تھا۔

”چھوٹی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو ضیا بھائی جلدی ٹھیک ہو کر گھر چلے جائیں۔“ وہ میری بات سن کر اسے دہرا رہی تھی۔

”اللہ تعالیٰ ضیا بھائی جلدی ٹھیک ہو جائیں۔“ اب پونے دس ہو رہے تھے جب ضیا کو آپریشن تھینر لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ جب اچانک اس نے یوں بچوں کی طرح چلانا شروع کر دیا تھا وہ یہ آپریشن کرانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی چند لمحوں پہلے تک ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ضیا جسے ہم ایک روز پہلے سے امید دلارہے تھے اسے حوصلہ رکھنے کی ٹھنک کرتے رہے تھے اب آپریشن سے ذرا پہلے وہ اتنا خوف زدہ ہو جائے گا کہ آپریشن کرانے سے ڈرنے لگے گا۔ ضیا کے ابا اسے ایسا کرتا دیکھ کر اس پر جھکے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں چومتے ہوئے بولے۔

”میرے بیٹے ہم تمہیں تندرست دیکھنا چاہتے ہیں۔“ قریب ہی کھڑی ضیا کی ماں یہ سب دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھی اور میری ماں انہیں دلاسہ دے رہی تھی دادی ماں عینک کے پیچھے ٹپ ٹپ کرتے موتیوں کی لڑی کو اپنے آنکھ میں

چپٹی تو اس وقت ضیا کے پاس کمرے میں فقط میں ہی موجود تھا میں ضیا کے سر ہانے بیٹھا تھا اور راحت پھولیوں کا بو کے اٹھائے ضیا کے پیروں کی سمت کھڑی تھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کمرہ خوشبوؤں سے مہک اٹھا تھا۔ جب میں نے دھیرے سے ضیا کے کان میں کہا۔

”ضیا تم سے کوئی ملے آیا ہے۔“ ضیا یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھا وہ اس کھڑی بالکل بھی بیمار نہیں لگ رہا تھا یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ بیٹھا ہو اس کے چہرے پر ایک پیاری سی مسکراہٹ تھی تھی اور پھر اس نے یہ بتا کر کہ اس کے سامنے راحت کھڑی ہے۔ اس نے ہم دونوں کو ہی حیران کر دیا تھا۔ راحت کی موجودگی تک کمرہ قہقہوں سے گونجتا رہا پھر میرے ماں اور ابا بھی کمرے میں آ پہنچے تھے۔

یہاں آج پہلی بار میں نے انہیں راحت کا تعارف کرایا تھا اس روز بڑے ابا ان کے ہمراہ نہ آئے تھے بہن وجہ تھی کہ وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ راحت اور میں ایک ساتھ اکیڈمی میں پڑھتے تھے اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک میں اسے اپنے دوست ضیا کے لیے دعا نہیں کرنے کو کہتا رہا۔ پھر اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا اور میں پلٹ کر واپس ضیا کے پاس چلا آیا تھا۔

اسی روز ضیا کے ابا ڈاکٹر سے ملے تھے جب ڈاکٹر نے انہیں اگلے دن صبح دس بجے آپریشن کا وقت دے دیا تھا۔ وہ چند روز تک ادویات دیتے رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ ادویات سے ہی کچھ بہتری آجائے لیکن اب ڈاکٹر مزید دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

سموتی جا رہی تھی۔ ضیا کے ابا انہیں ذرا سہارا دے کر ضیا کے پاس لے آئے اور وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

”ضیا پتر تھے کچھ نہیں ہوگا، کبر اند پتر۔“ وہ ابھی اتنا ہی بول سکی تھی جب اسپتال کا عملہ ضیا کو آپریشن تھیمز لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آپریشن تھیمز کی لال بتی جل اٹھی۔ اس کا مطلب تھا آپریشن کا آغاز ہو چکا تھا ہم بھی دل ہی دل میں ضیا کی صحت کے لیے دعائیں کرنے لگا۔ میرے قریب ہی ضیا کی دادی ماں بیٹھی سر جھکائے سنبھل پڑھ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی میں نے جگہ بدل لی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں دادی کی نگاہوں میں اٹھتے سوالوں کے جواب دے پاتا ابھی چند روز پہلے ہی تو انہوں نے ضیا کی شکایت لگاتے ہوئے میری ایک ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں ضیا کو دن ویلنگ جیسے خطرناک کھیل سے روکوں اور پھر دن ویلنگ کرتے ہوئے پیش آئے حادثہ کے وقت میں ہی تو اس کے ہمراہ موجود تھا اس سے پہلے کہ میں اسے ایسا کرنے سے روکتا ضیا کو حادثہ پیش آچکا تھا۔

اب جس جگہ میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اس جگہ دیوار کے مخالف سمت میرے سینے بالکل سامنے اسلامک کیٹی گرائی کا ایک کافی بڑا فن پارہ نصب تھا جس پر اسماء الحسنیٰ اور اسامہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوب صورتی سے لکھے گئے تھے اللہ تعالیٰ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صفاتی نام کی نسبت اور تاثیر کی مناسبت سے مختلف رنگوں کا استعمال اس فن پارے کو بنانے والے کے دل میں اللہ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ عشق کا ثبوت تھا۔ دی کھڑے کھڑے

نہ جانے کیسے میرے دل میں اس آرٹ کو سیکھنے کی خواہش نے جنم لیا اور میں سوچنے لگا کہ جب ضیا اچھا ہو جائے گا اور مجھے فرصت کہ کچھ لمحے میسر آئیں گے تو میں اسلامک کیٹی گرائی کے اس فن کو ضرور دیکھوں گا اور ساتھ ہی ساتھ میں اسماء الحسنیٰ اور اسامہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا درو کرتے ہوئے ضیا کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ بالآخر ایک طویل آپریشن کے بعد جب آپریشن تھیمز کی لال بتی اچانک بجھی تو ڈاکٹر کو باہر آنا دیکھ کر سبھی جو بیٹھے تھے وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کی زبانی یہ الفاظ سن کر کہ ضیا اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا، وارڈ چیف وپکار سے گونج اٹھا عین اس لمحے مجھے لگا کہ میں نے دیوار کا سہارا نہ لیا تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پاؤں گا میں دیوار سے پیشانی ٹکائے بے بسی سے روتا رہا میرے غصے میں ضیا کے ماں ابا، دادی اور خود میرے گھر والوں کا بھی یہی عالم تھا ضیا ایک ہی پل میں ہم سے بچھڑ کر عالم برزخ میں جا بچھا تھا جہاں سے پھر پلٹ کر کوئی نہیں آتا ہم چاہے کتنا ہی رو پیٹ لیں کتنی کئی روز تک ان کو یاد کرتے کھانا پینا چھوڑ دیں نہیں اسے خالق کی رضا یا رضا ہی ہونا پڑتا ہے۔

ضیا سے چھڑنا میرے لیے اس لیے قدر شہید صدقہ تھا کہ پھر کئی روز تک میں نے خود کو گھر میں ہی قید کر لیا تھا۔

ایک روز مجھے راحت کی کال آئی وہ بھی ضیا کی اچانک ہوئی موت پر بے حد غم زدہ تھی اور اب مجھ سے ملنا چاہتی تھی اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آ رہی ہے۔

چچا مرزا کی بات سن کر میں ایک دم سے

خیالوں کے دائرے سے پلانا اور با آواز بلند مجھ پر ہی برس رہے تھے۔

”یہ کیا بتائے گا لڑکی کہاں ہے کبھی کسی چور نے بھی اپنی چوری قبول کی ہے لڑکی اگر گھر میں آئی ہے تو اسے ہم خود ہی کھول لیں گے۔ چلو عبدالقادر اور مائیکل تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ چچا اتنا کہہ کر آگے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور بڑے ابا غصے کے عالم میں مجھے خستہ لگیں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جب ماں میرے پاس آتے ہی بولی۔

”ٹھہر یہ سب کیا ہو رہا ہے میں یہ سب کیا دیکھ رہی ہوں بیٹا؟“ ماں حیرت زدہ سی میرے قریب آ کر مجھ سے سوال کر رہی تھی۔ جانے یہ مرزا کیوں میرے اور میرے بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ مجھے ٹھوکا سا لگا کر اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے اور اب ہم دونوں باپ بیٹا چچا مرزا کے پیچھے ہو لیے ہمارے ان تک پہنچنے تک وہ ایک کمرے کا معائنہ کر چکے تھے اور پھر وہ بابا عبدالقادر اور مائیکل کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے میرے کمرے کی جانب بڑے انہیں اپنے کمرے کی جانب بڑھتا دیکھ کر میں نے اپنے ابا کی جانب دیکھا وہ میرا چہرہ دیکھتے ہی سارا معاملہ سمجھ گئے تھے وہ چچا کو میرے کمرے میں جانے سے روکنے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے چچا سے مخاطب تھے۔

”رک جاؤ مرزا۔“ لیکن ابا کے انہیں آواز دینے تک وہ میرے کمرے میں داخل ہو چکے تھے ابا نے بابا عبدالقادر اور مائیکل کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور پھر چچا کے پیچھے ہی میں اور ابا بھی کمرے میں پہنچ گئے چچا نے ابھی ایک پردہ بنایا

ہی تھا جب وہ ابا کی آواز پر وہی رک گئے۔

”مرزا یہ سب تم بہت غلط کر رہے ہو۔ کیا ٹھہ یا مصطفیٰ تمہارے بچوں جیسے نہیں۔“ چچا مرزا جو ابا کی بات سن کر رک گئے تھے اور جو غصے سے بے قرار ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور خستہ لگیں لگا ہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرے بچوں جیسے ہیں اسی لیے تو انہیں مرزا دینا چاہتا ہوں کہ نہیں یہ تم جیسے نہ ہو جائیں خورشید عالم۔“ چچا اتنا کہہ کر غصے سے ہاتھ ملتے باہر نکل گئے اور ابا کچھ دیر تک ساکت کھڑے چچا کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اتنے میں، میں نے راحت کو باہر آنے کو کہا اور وہ ہمارے عقبی جانب لگے پردے کے پیچھے سے باہر چلی آئی۔ ابا نے اسے دیکھتے ہی جیسے اپنا مزاج درست کیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار دیتے ہوئے تسلی دینے لگے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اس کے گھر چھوڑ کر آئیں گے۔

ابھی ابا وہاں کھڑے اسے تسلی دے ہی رہے تھے کہ جب ماں بھی ہمارے تعاقب میں میرے کمرے تک آ پہنچی اور پھر جیسے وہ ایک بار پھر سے میرے اور ابا کے درمیان کالا عیاں پہنے کھڑی راحت کو دیکھ کر ششدر سی ہو کر وہ کئی راحت نے انہیں سلام کیا تو جیسے انہیں یقین آیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی بلکہ ان کے سامنے واقعی بی چوہدری عبدالغنی کی بیٹی راحت عبدالغنی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ماں سارا ہی کھیل سمجھ چکی تھی۔

بڑے ابا کے شدید غصے سے بھرے کلمات، چچا مرزا کی سارے گھر میں چھان بین اب یہ راز ان پر عیاں ہو چکا تھا پچھلے کئی لمحوں سے وہ باہر لگی پگھری میں کھڑی جو کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی اب وہ

مٹنے گھر آئیں گے۔

گاڑی واپس موڑتے ہوئے اپنے گھر پہنچے
تک ابا نے جو بھی باتیں مجھ سے کہیں ان باتوں
نے ساری ہی رات مجھے جگائے رکھا میرے ابا کی
انہی باتوں کی وجہ سے ان لمحوں کو بھی بھول گیا تھا
جب بڑے ابا اور چچا مرزا مجھے خطا وار ثابت کرنے
کی کوشش میں لگے تھے اور چچا تو واقعتاً ایسا کر
گزر رہے تھے اگر ابا ان کے تعاقب میں میرے
کمرے میں پہنچ کر انہیں روکتے تو اور میرے وہی
سبے حد اچھے ابا راحت کو اس کے گھر پہنچا کر راستہ
میں مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ اگر ان کا بیٹا اور
راحت ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں تو پھر وہ
چوہدری عبدالغنی سے ان کی بیٹی کا ہاتھ اپنے بیٹے
ٹھ کے لیے مانگ لیتے ہیں۔“

ابا کی یہ بات سن کر چند لمحوں تک تو مجھے اپنی
سماعت پر ہی یقین نہیں آیا کہ میرے ابا جو
چوہدری عبدالغنی کے سیاسی حریف تھے وہ اتنی بات
کہہ سکتے تھے کہ وہ خود چوہدری عبدالغنی کے گھر جا
کر اپنے بیٹے کے لیے ان کی دختر کا ہاتھ مانگیں
گے پھر راستہ بھر ابا اور میں اسی موضوع پر بات
کرتے تھے اور اب اپنے کمرے میں پہنچ کر یہی
سوچتے ہوئے جیسے میری خیمہ بنی اڑ چکی تھی ابھی تو
فقط ابا نے مجھ سے اس سلسلے میں بات ہی کی تھی
لیکن میں جیسے ابھی سے راحت کو پالنے کی خوشی
میں پھولے نہ سار ہا تھا۔ جب ایک دم سے مجھے ضیا
کا خیال آ گیا آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اسے یہ سن کر
کتنی خوشی ہوتی ضیا کا خیال آتے ہی میں مضطرب
سا ہو کر اس کی مغفرت کے لیے سو بنے رب کے
حضور دعا میں کرنے لگا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ماں میرے کمرے

عقدہ ان پر کھل چکا تھا میں نے اور ابا نے انہیں
اس بات سے بے خبر رکھا تھا اس بات کو محسوس
کرتے ہوئے ماں جیسے کمرے میں داخل ہوئی تھی
اب راحت کو میرے اور ابا کے ساتھ کمرے میں
موجود پا کر لائے پیروں لوٹ گئی۔ ماں کے راحت
سے بات کیے بغیر باہر نکل جانے پر راحت نے
حیرت سے میری جانب دیکھا وہ تو فقط مجھ سے میرا
حال دریافت کرنے آئی تھی اور پھر اس کے
میرے کمرے میں آتے ہی میں نے پہلے اسے
پردے کے پیچھے چھپا دیا پھر دیر تک وہ وہیں چھپی
میرے لوٹنے کا انتظار کرتی رہی پھر چچا مرزا جو
اسے ڈھونڈتے کمرے میں آ پہنچے تھے وہ باتیں بھی
اس نے سن لی تھیں اور اب ماں کا رویہ بھی اسے
عجب لگ رہا تھا لیکن اس سے پہلے جب سبھی
میرے مخالف ہو گئے تھے۔ میرے ابا نے جو میرا
ساتھ دیا تھا اور بڑے ابا کی نگاہ میں مجھے کرنے
سے بچا لیا تھا۔ میں ان کا یہ احساس بھی نہیں بھول
سکتا تھا چاہے اس وقت میرا ساتھ دینے کے پیچھے
ان کے کتنے ہی مفاد چھپے تھے لیکن اس سب کے
باوجود ان کا وقار میری نظر میں بہت بڑھ گیا تھا پھر
ابا کچھ دیر تک مجھے اور راحت کو کمرے میں چھوڑ کر
چلے گئے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں جب وہ لوٹے
تو انہوں نے مجھے اور راحت کو اپنے ساتھ باہر
آنے کو کہا باہر پورج میں آنے تک میں نے دیکھا
ابا نے ساری ہی بتیاں بجھا دی تھیں پھر وہ خود ہی
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور انہوں نے گاڑی
چوہدری عبدالغنی کے گھر سے ذرا پہلے ہی روک دی
راحت گاڑی سے اتر کر مجھے اور ابا کو گھر چلنے کے
لیے اصرار کرتی رہی لیکن ابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ
کر دعا دیتے ہوئے بولے کہ وہ جلد ہی اس سے

بات کرنے لگے تھے کہ وہ چوہدری عبدالغنی کے ہاں طے کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے جانا چاہتے ہیں پھر ماں میرے ساتھ شادی کی تیاری تک کی باتیں کر کے چلی گئی اور میں اپنے بستر پر پڑا سوچنے لگا کہ جب میرے ابا خورشید عالم بڑے ابا سے میرے اور راحت کے رشتے والی بات کریں گے تو کیا وہ اس رشتے پر راضی ہوں گے یہ خیال ذہن میں اٹھتا ہی اب میں عجب سیمائی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا ایک رات پہلے میں نے بڑے ابا کو کس قدر رشید غیبی میں دیکھا تھا جب کسی نے انہیں یہ اطلاع کر دی تھی کہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی چوری چھپے ان کے پوتے سے ملنے ان کے گھر موجود تھی لیکن پھر میرے ابا خورشید عالم کی مداخلت پر وہ یہ ثابت نہیں کر پائے تھے کہ راحت واقعتاً گھر میں موجود تھی یا نہیں اور پھر یہ سوچ کر مجھے کچھ سکون ملا اور ساتھ ہی میں دعائیں کرنے لگا کہ یا اللہ میرے بڑے ابا کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہو کیونکہ ایک وہی تھے جن کے راضی ہونے پر بات آگے بڑھ سکتی تھی تھوڑی دیر تک میں یونہی خیالوں میں لم بستر پر پڑا رہا اور پھر بستر سے نکل کر تازہ دم ہو کر میں نے اپنے کمرے سے ایک قدم باہر رکھا ہی تھا کہ جب میں نے دیکھا ابا میری طرف ہی بڑھ چلے آ رہے تھے انہوں نے قریب آتے ہی مجھے اپنے گھر سے لگا لیا وہ بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے انہی کی زبانی مجھے معلوم پڑا کہ بڑے ابا کو میرے اور راحت کے رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ انہیں تو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی جوان اولاد غلط راہ پر چل نکلے ابا یہ خوش خبری سنا کر چلے گئے اور میں جو یہ خوش خبری سن کر چھوٹے نے سنا رہا تھا مجھے ایک بار پھر اپنے

میں آئی وہ جو رات غصے کے عالم میں راحت سے ملے بغیر ہی کمرے سے چلی گئی تھی۔ اب کمرہ بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں پہنچتے ہی پہلے مجھے یوں پیار سے جگانے لگی جیسے میرے بچپن کی ہر صبح وہ میری پیشانی چوم کر مجھے جگایا کرتی تھی۔ میں نے جاگتے ہی اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا اور وہ پیار سے میرے بال سہلاتے ہوئے بولی۔

”میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اب وہ مجھ سے اپنی باتیں بھی چھپانے لگا ہے۔“ میں ماں کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھ سے کس بات کے چھپانے کا شکوہ کر رہی تھی بس میں کچھ دیر تک یونہی خاموش رہا اور پھر بولا۔

”ماں میں نے آپ کو راحت سے ملوایا تھا جب ضیا اسپتال میں تھا وہ اس سے ملنے آئی تھی دیتیں آپ اور ابا کو میں نے راحت سے ملوایا تھا۔“ میری یہ بات سنتے ہی ماں جھٹ سے بولی۔

”ہاں بیٹائی یاد ہے مجھے تم نے اسے اپنے ابا کو اس سے ضرور ملوایا تھا اور میں پوچھے بنا ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ راحت تمہارے ساتھ اکیڈمی میں پڑھتی ہے۔“ اور پھر اگلی بات کہنے سے پہلے ماں نے میرے گال پر اپنے ہاتھ سے ایک چپت لگائی اور بولی۔

”بیٹائی آپ نے یہ بات تو ہم سے چھپائے ہی رکھی کہ آپ اور راحت ایک دوسرے سے بے پناہ محبت بھی کرتے ہیں۔“ ماں کی یہ بات سن کر میں شرمناک ماں کی گود میں اور بھی سمٹ گیا تھا۔ جب اگلی بات سن کر میرا پیچھا رہا تھا کہ میں ماں کی گود میں سر رکھے یونہی پڑا رہوں اور ماں میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولتی رہی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میرے ابا، بڑے ابا سے اس سلسلے میں ہی

دوست ضیا کا خیال آگیا اور میں وہیں سے اٹھے
بیروں اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

اگلے روز جب ماں، مصطفیٰ عالم لبا اور بڑے ابا
چوہدری عبدالغنی کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے
تھے عین وقت پر چچا مرزا نے ساتھ جانے سے
انکار کر دیا۔ چچی جو ابھی ابھی اپنے کمرے سے تیار
ہو کر باہر آئی تھی وہ بھی چچا کا انکار سن کر حیرت زدہ
سی رہ گئی کہ اچانک سے یہ انہیں کیا ہو گیا تھا وہ بار
بار یہی کہہ رہے تھے کہ باقی سب جاتے ہیں تو
جائیں لیکن وہ نہیں جائیں گے بلکہ وہ بڑے ابا کو
بھی ساتھ جانے سے روکتے رہے پھر میرے ابا
کے استفسار پر کہ وہ ان کے ہمراہ کیوں نہیں جانا
چاہتے انہوں نے یہ کلامی سے جواب دیتے
ہوئے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ چوہدری عبدالغنی بھی
اس رشتے کو قبول نہیں کریں گے اور وہ وہاں جا کر
اپنی سب عزتی نہیں کرانا چاہتے۔ اس سے پہلے کہ
چچا کے ایسے جواب کا میرے ابا کوئی جواب دیتے
بڑے ابا نے انہیں اشارہ کیا کہ ان سے روک دیا
اور پھر وہ ابا سے کہنے لگے کہ اگر مرزا نہیں جانا چاہتا
تو یہ ان کا اپنا فعل ہے وہ خاندان بھر کی خوشیوں
میں اگر شریک نہیں ہونا چاہتا تو نہ ہو ہم کسی کے
ساتھ کوئی زور زبردستی کا معاملہ نہیں رکھیں گے اگر
چوہدری عبدالغنی اس رشتے سے انکار کرنا چاہتے تو
پھر وہ ہمیں گھر بلاتے ہی کیوں، وہیں کھڑے
کھڑے چچا نے بڑے ابا کی یہ باتیں سن کر چچا کو
اشارہ کیا اور پھر وہ ساتھ چلنے کے لیے راضی
ہو گئے یہ دیکھ کر ماں، ابا، بڑے بھائی، مصطفیٰ عالم
اور بڑے ابا ہم سبھی خوش ہو گئے کہ ایسے موقع پر
سب کو ایک ساتھ ہی ہونا چاہیے تھا۔

جب بھی چوہدری عبدالغنی کے ہاں بات طے

کرنے کو چلے گئے تو میں اب گھر پر تنہا ہی تھا اور
میرا وقت گزارنا بے حد دشوار ہو رہا تھا میں نے
راحت سے گپ شپ لگانے کو جو کال کی تو چند
ایک باتوں کے بعد اس نے بھی یہ کہہ کر کال کاٹ
دی کہ وہ بے حد مصروف ہے یوں وہ ایک ایک ٹل
میں نے گن گن کر گزارا اور پھر جو رات گئے سبھی
واپس لوٹے تو مبارک باد یوں اور بیٹھے بیٹھے قہقہوں
سے ساری حویلی جھوم اٹھی۔ چوہدری عبدالغنی نے
مہمان نوازی اور خاطر مدارت میں کوئی کسر اٹھانہ
رکھی تھی چچی اور چچا مرزا جن کو ہمراہ لے جاتے
ہوئے کلامی بھی ہو گئی تھی اب گاڑی سے
اترتے ہی انہوں نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے
مبارک باد دی تو حویلی کے کسی کونے میں دیکھی بیٹھی
چچا مرزا کی دونوں صاحبزادیاں آمنہ اور یومنہ بھی
یہ آوازیں سن کر وہاں پہنچ گئیں یومنہ تو اس وقت
بہت چھوٹی تھی آمنہ نے بھی مجھے مبارک باد دی۔
وہ بھی بہت خوش لگ رہی تھی اور جب میں نے
ماں سے منگنی کی رسم کے حوالے سے دریافت کیا تو
گویا انہوں نے مجھے یہی بتا کر حیران کر دیا کہ ابھی
تو چوہدری عبدالغنی نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت
طلب کی تھی لیکن ساتھ ہی وہ مجھے بتانے لگی کہ سبھی
دہاں دونوں خاندانوں کے جڑنے سے اتنا خوش
تھے کہ سمجھو کہ رشتہ تو پکا ہو ہی چکا ہے پھر ان کی یہ
بات سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

اگلے روز یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ
کی طرح پھیل چکی تھی میرے وہ دوست جن سے
ابھی میں نے راحت کا ذکر کیا تھا وہ بھی مجھے
کال کر کے مبارک باد دے رہے تھے باہر طرح
طرح کے تبصرے ہو رہے تھے کوئی اس بات پر
یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا اور کوئی اس فیصلے کو

درست قرار دے رہا تھا۔ کئی جوار یوں نے تو جوا لگا دیا تھا اور میں ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ جیت کسے ملنے والی تھی ہارنے والا کون تھا میں تو فقط اس نشے میں ڈوبا مست ہوا رہتا تھا کہ راحت میری ہونے جا رہی تھی میری پہلی چاہت میرا اسکھ چھین راحت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو رہی تھی۔

ابھی اس بات کو چند روز ہی بیتے تھے کہ گھر میں پھر ایک نیا فساد برپا ہو گیا میرے ابا خورشید عالم اور چچا مرزا کے درمیان پھر سے جھگڑا شروع ہو گیا تھا اور اس جھگڑے کی شروعات وہاں سے ہوئی جب چچا مرزا نے بڑے ابا سے آمنہ اور میرے بڑے بھائی مصطفیٰ عالم کے رشتے والی بات کی وہ چاہتے تھے کہ اگر میرے ابا نے میرا رشتہ خاندان سے باہر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر اپنے بڑے بیٹے مصطفیٰ عالم کے لیے ان کی بیٹی آمنہ کا رشتہ قبول کر لیں اور جب طہ کی منگنی ہو تو پھر ساتھ ہی ان کی بیٹی اور مصطفیٰ عالم کی منگنی بھی ایک ساتھ ہو جائے لیکن جب بڑے ابا نے چچا مرزا کی خواہش ابا کو بتائی تو ماں نے ابا سے یہ بات سن کر فوراً ہی اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا جو ایم فل کر رہا تھا پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے تو پھر وہ اس کی شادی کے حوالے سے سوچیں گے لیکن ماں کی کہی یہ بات فقط رشتے کو ٹالنے کا ایک جواز تھا درحقیقت تو اس رشتے سے انکار کی وجہ آمنہ کی تعلیم تھی وہ ایف اے کے بعد تعلیم چھوڑ چکی تھی اور یوں چچا یہ انکار برداشت نہ کر سکے تھے انہوں نے پھر سے جائیداد کا مطالبہ اٹھا لیا۔

میرے ابا اور چچا مرزا کے درمیان ابھی یہ سرد جنگ جاری ہی تھی کہ جب ایک روز بڑے ابا نے

سبھی کو اپنے پاس طلب کر لیا مجھ سمیت سبھی کا خیال یہی تھا کہ شاید بڑے ابا چچا مرزا اور خورشید عالم کے درمیان چل رہی رخصت کو منانے اور دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے سبھی کو اکٹھا کر رہے تھے لیکن جب سبھی وہاں جمع ہو گئے تو بڑے ابا نے نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات بتائی کہ چوہدری عبدالغنی نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ بڑے ابا کی زبانی یہ بات سن کر مجھ سمیت سبھی نے تاسف سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا جیسے انہیں بھی میری طرح اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا پھر بڑے ابا ذرا تفصیل سے بتانے لگے کہ چوہدری عبدالغنی نے فون پر ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اب وہ مجبور تھے انہوں نے جب اپنے خاندان والوں سے بات کی تو انہوں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان کے خلاف نہیں جانا چاہتے تھے بڑے ابا ابھی یہ ساری تفصیل بتا رہی رہے تھے کہ جب چچا مرزا اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اور ڈھول پینے پھر سارے شہر میں کہ ہم لوگوں نے چوہدری عبدالغنی کے ہاں رشتہ پکا کر لیا ہے۔“ وہ عجیب بھکے خیر انداز میں بات کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

(بائی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

(13)

لارنس آف افغانستان

زیریں قمر

زیریں قمر کا نام نئے افغان قارئین کے لیے نیا نہیں ہے، آپ اکثر ان کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔ چڑیا کا گھونسلہ، ادھورا خواب، انجانے فیصلے، بددعا، غزہ کی سسکیاں اور پناہ گزین جیسی ان کی متعدد لازوال کہانیاں رسالے کی زینت بن چکی ہیں، وہ ہر موزوں ہر قلم اٹھانے کی قدرت رکھتی ہیں، ان کے کردار ہمیں اپنے معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، سیاسی کرائم نمبر کے لیے اس ہار انہوں نے بطور خاص افغانستان کے سیاسی پس منظر کو اپنا موزوں قلم بنایا ہے۔ ایک امریکی فوجی کمانڈر کا احوال، جسے عراق سے براہ راست بلا کر افغانستان میں تعینات کیا گیا تھا تاکہ افغان جنگ جو امریکا کے ہاتھ سے نکل رہی تھی اس پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے، لیکن وہ ایک جنگی رپورٹر کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔

سرخ و سفید رنگت، پھورے بال، ملکہ سرخی رنگ کی شلوار قمیض میں لمبوس ایک براؤن مگرنگی بڑی سی چادر کا اندھوں پر ڈالے ہاتھوں میں کھٹکھٹ پکڑے وہ بڑی پھرتی سے ایک پہاڑی کی اوت سے نکل کر دوسری پہاڑی کے پیچھے روپوش ہو گیا تھا۔ اس نے میٹھی گے اوپر جو واسکت کبھی ہوئی تھی اس میں بہت سی بیٹیاں تھیں جن میں گولیاں بھری تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی واسکت کے ساتھ پٹیس کی پیٹیاں بھی لٹک رہی تھیں اس کی آنکھوں میں ہلا کی زبانیت جھٹک رہی تھی اس نے پشاور کی چیل اور پشاور کی ٹوٹی پھٹی ہوئی تھی۔ بیروں میں موز سے اور چیرے پر دائر تھی پہلی نظر میں وہ کوئی مقامی افغان لگتا تھا لیکن دراصل یہ امریکی ٹوٹ کا بہادر کمانڈر رنیم گیٹ تھا جسے عراق سے براہ راست بلا کر افغانستان میں تعینات کیا گیا تھا تاکہ افغان جنگ جو امریکا کے ہاتھ سے نکل رہی تھی اس پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے اور جہاں اس کی خدمات سمجھا رہا تھا کہ وہ امریکی فوجیوں کے لیے افغانستان میں سازگار فضا پیدا کر لے گا اس نے عراق میں بھی بڑے کارنامے سرانجام دیے تھے اور ”بہادری“ کے کئی حریف حاصل کیے تھے۔ اس کی چال میں چیتے جیسی پھرتی

آنکھوں میں ٹومڑی جیسی عیاری تھی اور اس کا ذہن منصوبے بنانے اور دشمن کے خلاف جال بننے میں ماہر تھا اس نے افغانستان آتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہر حالت میں اس باری ہوئی جنگ کو امریکا کی فتح میں تبدیل کر دے گا اور اس کے لیے اس نے سب سے پہلا قدم یہ اٹھا لیا تھا کہ افغانستان میں آتے ہی اپنا حلیہ تبدیل کر دیا تھا اور مقامی لوگوں جیسا لباس اور حلیہ بنالیا تھا اسے جو فوجی دیکھ گئے تھے وہ امریکا سے حال ہی میں بھجوائے گئے تھے جو عمر اور نہ تجربہ کار تھے اور گیٹ نے انہیں تربیت دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کام میں اس کا ایک دوست پٹیر پٹیر اس کے ساتھ تھا جو امریکی آرمی میں کمانڈر کے عہدے پر فائز تھا اور افغانستان میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ اسی کی درخواست پر گیٹ کو عراق سے افغانستان بلا لیا گیا تھا کیونکہ گیٹ کے بہادری کے کارنامے پٹیر پٹیر کے پاس پہنچ چکے تھے اور اس نے گیٹ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

گیٹ پھر فرائیگ کرتا: وہ پہاڑی کی اوت سے نکلنا تھا اور تیزی سے بھاگتا ہوا پتھو فاصلے پر لگی جھانپوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے ارد گرد پہاڑیوں میں اس کے ساتھی بھی اسلحہ سے لیس موجود تھے اس وقت ان

کا مقابلہ دور پہاڑیوں میں چھپے طالبان سے ہو رہا تھا۔
میکٹ اپنی فوجی اسطلاح میں اپنے ساتھیوں کو ہدایت
بھی دیتا جا رہا تھا۔

اس نے ایک مخصوص سمت اشارہ کر کے اپنے ایک
فوجی کو فائرنگ کا آرڈر دیا اور اس فوجی نے اس سمت
نشانہ لے کر فائرنگ کر دی۔ اس سمت سے آتی ہوئی
گولیاں کچھ دیر کے لیے رگ گئی تھیں۔ جس سے اندازہ
ہوتا تھا کہ دوسری طرف سے فائرنگ کرنے والا یا تو زخمی
ہو گیا ہے یا اپنی پوزیشن بدل چکا تھا۔

نیم میکٹ کا طالبان سے یہ مقابلہ ایک جنگی مقابلہ
ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فوجیوں کی ٹریننگ بھی تھی۔
وہ انہیں راتوں رات ٹرینڈ کرتا چاہتا تھا کیونکہ اسے جن
حالات کا سامنا تھا اس میں اس کے پاس اتنی سہولت
نہیں تھی کہ وہ الگ سے وقت دے کر انہیں تربیت دے
اسے تو ہر وقت دشمن کا سامنا تھا۔

”تمہیں عراق سے آئے ہوئے ابھی زیادہ وقت
نہیں ہوا ہے۔“ اس کے دوست پیٹریو نے ایک دن
اس سے کہا۔ ”اور تم نے اپنا حلیہ بالکل مقامی لوگوں جیسا
بنالیا ہے آخر تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟“
”میں چاہتا ہوں کہ طالبان مجھے مقامی باشندہ
سمجھیں۔“ میکٹ نے جواب دیا۔

”لیکن طالبان اتنے احمق نہیں کہ انہیں یہاں
ہماری موجودگی کا احساس نہ ہو صرف حلیہ بدل لینے سے
ہم افغان نہیں بن سکتے۔“ پیٹریو نے کہا۔
”میں جانتا ہوں ابھی اس سلسلے میں بہت کام کرنا
ہے۔“ میکٹ نے کہا۔

”لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان باتوں
میں وقت ضائع کریں۔ ہمیں ہر وقت دشمن کا سامنا
ہے۔“ پیٹریو نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں جانتا ہوں اور کسی چیز سے بے خبر نہیں ہوں
جب مجھے یہاں بھیجا گیا ہے تو میں اپنے افسروں کی
امید پر پورا اتروں گا اور انہیں بالیوس نہیں کروں گا۔“

دراصل میرا کام کرنے کا طریقہ بہت مختلف ہے۔“ نیم
میکٹ نے اسے سمجھایا۔

”تمہیں جو فوجی دیے گئے ہیں وہ بھی نا تجربہ کار
ہیں تم یہ جنگ کیسے جیتو گے؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو“ اس جیسے میں کہتا جاؤں ویسے
کرتے جاؤ میرا طریقہ کار مختلف ہے اور میں اپنے اس
طریقے کی مدد سے سب کر لوں گا اور سب کو حیران
کر دوں گا۔“ میکٹ نے کہا اور واقعی اس نے بہت کم
مہر سے میں ان نا تجربہ کار فوجیوں کو تربیت دے کر اپنی
مرضی کے مطابق تیار کر لیا تھا۔ اس نے ان سب کو فوجی
دروہوں کے بجائے مقامی لباس پہنا دیا تھا اور۔ کی نہیں
بلکہ ان کو مقامی زبان بھی سکھائی تھی خود بھی سیکھی تھی اور
وہ بات کرنے کے لیے زیادہ تر مقامی لوگوں سے ان ہی
کی زبان میں بات کرتے تھے ان کا اٹھنا بیٹھنا ان کی
بول چال ان کا پہننا اور چھنا سب کچھ مقامی لوگوں جیسا
تھا اور دور سے انہیں دیکھ کر کوئی بھی دھوکا کھا جاتا تھا۔

پہاڑیوں میں طالبان سے ان کی پھڑپھڑی معمول کی
بات تھیں۔ اس روز بھی کچھ دیر کی جھڑپ کے بعد وہ
خاموشی سے اپنے فوجی میں میں واپس آ گئے تھے۔ ان کا
یہ فوجی ہمیں چاروں طرف سے اوپن اپنی پہاڑیوں
میں گھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ کوئٹہ کے کنارے واقع تھی اور
کوئٹہ صوبے کا حصہ تھی جو پاکستان کے بارڈر کے ساتھ
واقع تھا اور افغانستان کی خطرناک ترین پوسٹوں میں
سے تھا اور مشرقی افغانستان میں واقع تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں کسی مقامی اہم
شخصیت سے تعلقات پیدا کیے جائیں۔ ایک شام
میکٹ نے اپنے دوست کمانڈر پیٹریو سے کہا تو وہ اسے
حیرت سے دیکھنے لگا۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”اس طرح ہمیں اپنے کام میں ان کی مدد حاصل
ہو جائے گی۔“ میکٹ نے جواب دیا۔

”بھلا وہ ہماری مدد کیوں کریں گے؟“

”کیونکہ ہم ان کے دوست بن جائیں گے۔“ گھیسٹ نے مسکراتے ہوئے کہا وہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کو سہارا ہاتھ۔
”لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ مسلمان کسی کے دوست نہیں ہوتے وہ کسی دوسرے مسلمان کے مقابلے میں ہماری مدد نہیں کریں گے۔“ کمانڈر پیٹریو نے یقین سے کہا۔

”تم درست کہہ رہے ہو لیکن تم دیکھتے جاؤ میں جس طریقے سے ان کے قریب ہوں گا اور جو ہاتھ ان سے کہوں گا وہ میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“ اس بار گھیسٹ کے سچے میں پیٹریو سے زیادہ یقین جھٹک رہا تھا۔

”تمہاری بات پر مجھے یقین نہیں ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ میں تمہاری مدد کر سکوں اور کسی دہم شخصیت سے رابطے میں آ جاؤں۔“ کمانڈر پیٹریو نے کہا۔
پھر چند ہی روز میں پیٹریو نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ افغانستان کے مہمند قبیلے کے سردار نور افضل رسائی ہوئی ہے وہ اس ملائے کا بہادر ترین سردار ہے اور اسے سینکڑوں مل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پھر گھیسٹ نے اس سے ملنے میں دیر نہیں کی تھی وہ اپنی درودی کے بجائے مقامی لباس میں ہی اس سے ملنے گیا تھا جب وہ اپنے دوست کمانڈر پیٹریو کے ساتھ نور افضل کے ڈیرے پر پہنچا تو اسے اپنا منتظر پایا تھا۔ نور افضل نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا تھا لیکن اس کے چہرے پر کچھ بے چینی سی تھی اور اس کی آنکھیں بار بار کمانڈر گھیسٹ کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔ نور افضل کے ڈیرے پر اس کے کچھ قریبی دوست بھی موجود تھے جو اس قبیلے کے انتظامات میں اس کا ہاتھ ہلاتے تھے۔ نور افضل بہت محتاط انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے ڈیرے کے باہر اس کے اپنے مسلح افراد تعینات تھے جو بہت ہی چاق و چوبند تھے۔

”یو ایس آرمی تو 2001ء سے اس علاقے میں

سرگرم ہے۔ اس طرح پہلے تو کسی نے مجھ تک یوں رسائی کی کوشش نہیں کی۔“ نور افضل نے تنقیدی نظروں سے گھیسٹ کو دیکھتے ہوئے براہ راست سوال داں ڈیا۔ وہ ایک دوسرے سے مصافحہ کرنے کے بعد زمین پر بچھے قاتلین پر بیٹھ گئے تھے جس کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤں کی گلیے لگے ہوئے تھے اور کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ ساتھ ایک پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر افغانی طرز کا بستر تھا نور افضل اس پر ہی بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے گھیسٹ اور پیٹریو کے ساتھ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے سردار کی باتوں پر آہستہ آہستہ سر ہلاتے جا رہے تھے۔

”ہاں تم درست کہہ رہے ہو۔“ گھیسٹ نے کہا۔
اس نے افغانستان آنے کے بعد جلد ہی مقامی زبان سیکھ لی تھی کیونکہ اسے جس انداز سے کام کرنا تھا یہ اس کا ایک ضروری حصہ تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت نور افضل سے افغانی میں بات کر رہا تھا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ اس سے پہلے کسی نے تم سے اس طرح رابطہ نہیں کیا لیکن ان کا طریقہ کار مختلف تھا۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہوں۔“ گھیسٹ نے دل کی بات کہہ دی اور نور افضل چونکہ کراس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم اپنی اس بات کی وضاحت کر دو گے؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں تمہارے یا تمہاری قوم کے خلاف لڑنے نہیں آیا یہاں پر یہی تصور لیا جاتا ہے کہ امریکی فوجیں افغانستان میں اپنی برتری جاتے آتی ہیں یا وہ یہاں پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔“ گھیسٹ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی وہ سوچتا جا رہا تھا کہ اپنی بات کی وضاحت کس طرح کرے کہ اسے نور افضل کی مدد بھی حاصل ہو جائے اور امریکی فوج پر لگا ہوا جارہ داری کا ایک دھبہ بھی مٹ جائے۔

دوں گا۔“ نور افضل نے کہا اور کمرے میں باادب کھڑے ایک شخص کو ہاتھ سے اشارہ کیا وہ فوراً ہی باہر چلا گیا اور چند لمحوں میں ان لوگوں کے سامنے دسترخوان بچھا کر کھانا رکھ دیا گیا تھا یہ خاص افغان کھانا تھا جس سے بہترین خوشبو میں اٹھ رہی تھیں۔ افغانوں نے اپنی مہمان نوازی کا ثبوت دے دیا تھا۔ گیٹ اور اس کے ساتھیوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا جس کے بعد انہیں گرم گرم قہوہ پیش کیا گیا تھا۔

”میں آپ کے پاس پھر آؤں گا اور آپ کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات پر آپ کو مطمئن کرنے میں مجھے خوشی ہوگی۔“ گیٹ نے رخصت ہوتے ہوئے نور افضل سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں بھی امید کرتا ہوں کہ جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔“ نور افضل نے اپنی ہنسی سرخسہ دازھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جس کے بعد گیٹ پینیرو کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ ابھی اس کے ذہن میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بہت سے پوائنٹ موجود تھے لیکن وہ تمام برف آئیں ہی نشست میں حاصل نہیں کر سکتا تھا اور یہ مناسب بھی نہیں تھا۔ استقامتاً بہت موقع کے حساب سے جب جب لوہا گرم ہو جب جب اس پر چوٹ لگانا تھی تاکہ اس کے منصوبے کی ناکامی ممکن ہی نہ ہو اور اسے سو فیصد کامیابی نصیب ہو۔ جس مشن پر تھا اس پر ذرا سی بھی غلطی نہ صرف اس کے منصوبے کو ٹھیک کر سکتی تھی بلکہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا اس صورت میں اسے طالبان اور القاعدہ سے متعلقہ کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کا بھی سامنا کرنا پڑتا کیونکہ اگر انہیں یہ یقین ہو جاتا کہ وہ ان سے ہمدردی صرف اور صرف اس لیے حاصل کر رہا ہے کہ ان کی مخالفت سے بھی بچ جائے اور ان کی مدد بھی حاصل کر لے تو اس کا کام بہت مشکل ہو جاتا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا نور افضل تمہاری مدد

”دیکھو ہم سمجھتے ہیں کہ افغان مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے یہاں القاعدہ اور طالبان کے دہشت گرد برسرِ پیکار ہیں اور افغان عوام ان تربیت یافتہ دہشت گردوں کا مقابلہ تنہا نہیں کر سکتے ہم لوگ آپ کی مدد کرنے آئے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“ گیٹ نے کہا اور نور افضل نے گیٹ کے انداز سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ کیسے مان لوں کہ امریکا ہم سے ہمدردی رکھتا ہے۔“ نور افضل نے پوچھا۔

”امریکا آپ کی مدد نہ کرنا چاہتا تو ہمیں یہاں کیوں بھیجا جاتا اور اس جنگ میں اتنا پیسہ اسلحہ اور فوجی کیوں لگائے جاتے۔ امریکی فوجیوں کی جانوں کو بھی خطرہ ہے یہاں۔ اب تک کتنے ہی امریکی فوجی مارے گئے ہیں یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“ گیٹ نے وضاحت کی اور نور افضل سوچ میں پڑ گیا۔

”ہوں..... اس..... اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اگر تمہاری بات کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں صرف اور صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ہماری مدد کریں ہماری لڑائی صرف طالبان اور القاعدہ کے ساتھ ہے ہم آپ لوگوں کو ان سے تحفظ دلوانے آئے ہیں اور ان کا قتلِ قمع کرنے آئے ہیں۔ اس میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہوگی۔“

”اس قسم کی مدد؟“ نور افضل نے پوچھا۔

”ویسے تو ہم خود بھی طالبان کے ساتھ جنگ میں مصروف ہیں اور ان کے ساتھ ہماری ٹیمز ہیں ہوتی رہتی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں آپ کو آپ کے لوگوں نے Sitting Bald سٹنگ بل کا لقب دیا ہے۔ آپ بہت بہادر ہیں اور ان کا مقابلہ جو اندر ہی سے کرتے ہیں۔“ گیٹ نے نور افضل کی تعریف کی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ٹھیک ہے میں اس بار سے میں سوچ کر جواب

کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ پیٹریو نے واپسی میں راستے میں اس سے پوچھا وہ دونوں اپنی فوجی جیب میں بیٹھے اپنے فوجی بیس کی طرف جارہے تھے۔ رات کا وقت تھا اور جیب اپنی بیٹ لائٹس کی روشنی میں ہا ہموار زمین پر جھکولے کھائی آگے بڑھ رہی تھی اس وقت بھی لفظا میں گرمی کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا تھا جو سورج غروب ہونے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔

”ہاں مجھے امید ہے اگر اس میں ذرا بھی تسک ہے تو وہ اس پیش کش کو ضرور قبول کرے گا۔“ گلیٹ نے کہا۔

”لیکن ایسا وہ اس صورت میں ہی کرے گا جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ ہم واقعی اس سے ہمدردی کر رہے ہیں۔“ پیٹریو نے کہا۔

”ہاں یہ یقین دلانے کے لیے ہمیں مواقع کا انتظار کرنا ہوگا اور ان سے فائدہ اٹھانا ہوگا اس کے لیے شاید ہمیں کچھ قربانیاں بھی دینا پڑیں۔“

”قربانیاں؟“ پیٹریو نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ میں اس کی وضاحت ابھی نہیں کر سکتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مواقع آئیں گے جب ہم انہیں اپنا ہمدرد بنا سکیں گے۔“ گلیٹ نے کہا اور پیٹریو نے ہاتھ نہ سمجھتے ہوئے بے پروائی سے کانٹہ سے اچکائے اور جیب کی گھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ گلیٹ بھی خاموش ہو گیا تھا اور سگریٹ سلگا کر اس کے بلکے بلکے کٹر لگا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے مشن کو کامیاب کرنے کے منصوبے سر اٹھارہ تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ انہیں کیسے ملے گی جامد پہنائے۔

کچھ ہی دیر میں وہ اپنے کیمپ میں پہنچ گئے تھے۔

”اچھا گلیٹ! صبح ملاقات ہوگی۔“ پیٹریو نے جیب سے اترتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور فوجی کیمپ میں واقع اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ کیمپ کے باہر اور اندر امریکی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ گلیٹ نے ایک جائزہ لیا اور پھر وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا

ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

رات کا پچھلا پہرہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا اور خاموشی تھی۔ کبھی کبھی دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ جاتی تھیں یا پھر گشت کرتے ہوئے فوجیوں کے جوتوں کی آہٹ محسوس ہوتی تھی۔ گلیٹ بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک اندھیرے میں ایک سایہ نمودار ہوا جو چپکے چپکے چلتا ہوا گلیٹ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر وہ سایہ ایک لمبی راہداری سے گزر کر گلیٹ کے کمرے کے دروازے پر رک گیا تھا اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ آہستہ گلیٹ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

گلیٹ کی آنکھ اپنے سر کے بالوں میں کسی کے انگلیاں پھیرنے سے کھلی تھی اندھیرے میں اسے کچھ نظر تو نہیں آیا تھا صرف ایک سیاہ بولا سا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ صرف اور صرف اس کی محبوبہ این اسکیٹ ٹائسن ہے کیونکہ وہی اس طرح اس سے ملنے آتی تھی۔ این ٹائسن واشنگٹن کے ایک اخبار کی رپورٹر تھی اور افغانستان میں رپورٹنگ کرنے آئی ہوئی تھی وہ گلیٹ کی بہادری سے بہت متاثر تھی۔ 2010ء سے جب سے گلیٹ افغانستان میں تعینات ہوا تھا وہ اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ یہ اس کے ساتھ ہر محاذ پر جاتی تھی۔ جنگ کی وینڈیو زبانی تھی اور رپورٹ لکھتی تھی جسے واشنگٹن میں اپنے اخبار کو بھیجتی تھی لیکن اس کے اور گلیٹ کے دل میں اٹھنے والے محبت کے طوفان کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کیونکہ یہ گلیٹ کی فوجی ذمہ داریوں کے خلاف تھا چنانچہ دونوں نے اس کو راز ہی رکھا تھا۔

”تم کہاں تھیں؟“ گلیٹ فینڈ سے بھرے لہجے میں ٹائسن سے پوچھا۔

”میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ ٹائسن نے کہا۔

”مجھے آئے ہوئے تو بہت دیر ہوگی۔“ گلیٹ نے نارنج کی روشنی میں گھڑی پر نظر ڈالا۔

”ہاں لیکن تمہارے پہرے دار تو جاگ رہے

ٹائسن نے اپنی صحافیانہ مہارت سے مکینٹ کو وہ معلومات دینے کی کوشش کی جو وہ پہلے سے جانتا تھا کیونکہ کمانڈر پیٹریو نے اسے تفصیل سے نورافضل کے بارے میں بتا دیا تھا۔

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ مکینٹ نے کہا۔
 ”پھر بھی تم اس سے ملنے گئے؟“ این نے کہا۔
 ”ہاں یہ ضروری تھا۔“ مکینٹ نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس میں تمہارے لیے خطرہ ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے اس کے آدمی کتوں کی طرح امریکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔“ این نے کہا۔

”میں سب جانتا ہوں۔۔۔ لیکن اگر ان کا سردار ہی میری مدد میں آجائے تو وہ اس کے احکامات کے خلاف نہیں جاسکتے۔“ مکینٹ نے ہنستے ہوئے کہا اور این اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

”تم بہت چالاک اور موقع شناس ہو۔“ اس نے تعریفانہ انداز میں کہا۔

”ہاں! یہ تو ہے۔“ مکینٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں نے تمہاری محبت سے بھی تو فائدہ اٹھایا ہے۔ ابھی تم بھی خوبصورت بہادر اور ہوشیار صحافی میری ہانپوں میں ہے۔“ مکینٹ نے کہا اور ٹائسن اس سے چپٹ کی۔

دوسری صبح ناشتے پر مکینٹ کی ملاقات پیٹریو سے ہوئی تھی وہ بہت پریشان لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر سوئے نہیں ہے۔

”کیا بات ہے پیٹریو۔۔۔ تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔“ مکینٹ نے پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت مکینٹ کے کمرے میں موجود تھے اور ناشتے پر تھکے تھے۔

”ہاں۔۔۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔۔۔ تم یہاں طالبان سے جنگ کے لیے جو طریقہ اپنانا چاہتے ہو وہ بہت خطرناک ہے۔۔۔ اگر امریکی افسران کو اس کا پتہ چل گیا کہ تم لوگوں میں عمل مل رہے ہو تو وہ خطرناک ہوگا۔“ پیٹریو

ہیں۔“ ٹائسن نے مسکراتے ہوئے کہا اور مکینٹ نے اس کی طرف غور سے دیکھا نارنج کی مدھم روشنی میں اس کے بھورے ہتھکڑیاں لے ہاں اس کے شانوں پر بکھرے بہت اچھے لگ رہے تھے اس نے یہاں آتے وقت جو چادر اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی وہ اتار کر کمرے میں رکھی تھی پر ڈال دی تھی اور اس وقت مکینٹ کی ہدایت کے مطابق مقامی خواتین کی طرح کاشٹواریٹس پہنا ہوا تھا جس کے ساتھ دو پٹہ بھی تھا جو اس نے گلے میں ڈالا ہوا تھا وہ مکینٹ کے ساتھ بستر پر بیٹھ گئی تھی۔

”تم شام کو پیٹریو کے ساتھ کہاں گئے تھے؟“ اس نے مکینٹ سے پوچھا۔

”میں مہمند قبیلے کے سردار نورافضل سے ملنے گیا تھا۔“ مکینٹ نے جھجک اسے بتایا حالانکہ اپنے فوجی راز وہ کسی کو بھی بتانے کے لیے پابند تھا اسے اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی سے بھی ان کا ذکر کرتے اسی طرح اس کی جو فوجی دستاویزات تھیں جن میں اس کے آئندہ منصوبے اور یو ایس آرمی کے حکام سے اس کی خط و کتابت اس کی ملاقاتوں اور افغانستان میں ان افسران کے دوروں کی تفصیلات درج تھیں وہ بھی اس کی تحویل میں تھیں اور بروقت اس کے کمرے میں اس کے پاس ہوتی تھیں اور ان تمام دستاویزات تک این ٹائسن کی رسائی تھی اسے آزادی تھی کہ وہ جو دستاویز چاہے اور جب چاہے دیکھ سکتی تھی چھ سکتی تھی اس کی کاپی تک محفوظ کر سکتی تھی کیونکہ مکینٹ کو اس پر بھرپور اعتماد تھا اور وہ اس کی شدید محبت میں گرفتار تھا۔ این کے اپنے پاس بیٹھتے ہی وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور مکینٹ کی انگلیاں این کے بالوں سے کھیلنے لگی تھیں۔

”تم مہمند قبیلے کے سردار سے ملنے کیوں گئے تھے۔۔۔ وہ تو کٹر مسلمان ہے اور بہت بہادر ہے۔ اسے سینک مل کے نام سے شہرت حاصل ہے۔ وہ اور اس کے لوگ امریکیوں پر بھروسہ نہیں کرتے اور انہیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ این

نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں سب جانتا ہوں پیٹرلو۔“ گینٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو میں نے افغانستان آنے سے پہلے عراق میں چچا اس ماد تک جنگ لڑی ہے اور وہاں کامیابی حاصل کی ہے مجھے اس کا سلور ایوڈ بھی ملا جو بہت کم فوجیوں کو نصیب ہوا ہے اور امریکی حکومت میری مدد ہے۔ میری تعریف کرتی ہے اور میرے طریقہ کار کو پسند کرتی ہے۔“

”ہاں..... ہاں میں یہ سب جانتا ہوں۔“ پیٹرلو نے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا میں نے ہی..... تمہیں یہاں بلوایا ہے اور میں نے ہی امریکی فوجی افسران کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ افغانستان کی باری ہوئی جنگ جیتنا چاہتے ہیں تو تمہیں عراق سے یہاں بلوائیں اور یہاں کی کمانڈ تمہیں دے دیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“
”تو پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر تم امریکی افواج کے اصولوں کی خلاف ورزی کر دو گے تو مجھے بھی ذمہ دار سمجھا جائے گا۔“ پیٹرلو نے قدرے برہمی سے کہا۔
”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھتے جاؤ۔ میں نے سوچ لیا ہے میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلے افسران سے ملوں گا ان سے اپنے منصوبے کی تحریری اجازت لوں گا پھر کام کروں گا۔“ گینٹ نے پیٹرلو کو سمجھایا اور دو پراٹھینان انداز میں سر بلانے لگا اسی وقت این ٹائسن ہنستی ہوئی گینٹ کے کمرے میں داخل ہوئی اس نے سر می رینگ کا مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور گھٹے میں سفید چادر پڑی تھی جسے اس نے پشت کی طرف ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں حسب معمول ویڈیو کیمرہ تھا جسے وہ ہر وقت ساتھ رکھتی تھی۔

”اچھا تو تم وہ فوٹو ابھی ناشتہ کر رہے ہو؟“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور قریب رچی خالی کرتی پر بیٹھ گئی اسے دیکھتے ہی گینٹ کی آنکھوں میں پیار بھری چمک آگئی تھی جسے پیٹرلو محسوس نہیں کر سکا تھا وہ اب تک یہی سمجھ

سہکتی کلیاں

جو شخص نگاہ کی التجا کو نہ سمجھے اس کے سامنے زبان کو مت شرمندہ کرو۔
تم اس شخص کو تو بھول سکتے ہو جس کے ساتھ جیسے ہو لیکن اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے جس کے ساتھ روئے ہو۔
مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔

دوسروں کے حال پر غور کرنے سے نصیب ملتا ہے۔
جو لوگ زندگی کو مقدس فریضہ سمجھ کر بسر کرتے ہیں وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوتے۔

فیاض اسحاق مہمان..... سلا نوالی

رہا تھا کہ این صرف ایک صحافی کے طور پر یہاں تعینات ہے اور ذمہ داری سے اپنا کام کر رہی ہے وہ ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتی ہے اور خبر اور ویڈیو بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

”ہاں ہم ابھی سو کر اٹھے ہیں۔“ گینٹ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا اسے حیرت تھی کہ اسے افغانستان آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا اور وہ یہاں آتے ہی این کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا لیکن اس کے کسی ساتھی کو بھی اس محبت کا علم نہیں ہوا تھا اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ این کو بھی فوجی تربیت دی تھی وہ بھی کبھی کبھی فوجی وردی میں اس کے ساتھیوں میں موجود ہوتی تھی یہ اور بات تھی کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھیاروں کے بجائے کیمرے ہوتے تھے لیکن یہی اگر ضرورت پڑے تو وہ رائل بھی اٹھا لیتی تھی۔ گینٹ اس سے بہت خوش تھا اور گینٹ کے علاوہ بھی اینہا دوسرے فوجیوں کا خیال رکھتی تھی ان سے بے تکلف کھی چنانچہ کسی کو بھی گینٹ اور اس کے معاشقے کا شک نہیں ہوا تھا۔

”پیٹرلو! تم تو سیس لڑتے لڑتے بوزھے

ہو جاؤ گے۔“ این نے جیسے ہوئے پیٹریو کو پھینکا۔

”کوئی بات نہیں یہ تو میرا پیشہ ہے میں اپنے وطن کے لیے جوانی کیا اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“ پیٹریو نے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں..... ٹھیک ہے..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ این نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اس وقت دور سے فائرنگ کی آواز آتی سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک فوجی بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے تخت میں سلوٹ کیا تھا۔

”سرا یہاں سے تھوڑے فاصلے پر طالبان نے ہماری پیٹریو لنگ پارٹی پر فائرنگ شروع کر دیا ہے وہ پیٹریو سے فائر کر رہے ہیں۔“ اس نے تیزی سے بتایا اور اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پیٹریو گھٹ گھڑے ہو گئے تھے پھر انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے تھے اور کمرے سے نکل گئے تھے۔ این بھی اسی تیزی سے ان کے ساتھ باہر آگئی تھی اور پھر چند فوجیوں کو لے کر گھٹ بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر اس سمت روانہ ہو گیا تھا جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا این بھی اس کے ساتھ تھی اور بہت چاقی دھو بند نظر آ رہی تھی۔

جائے وقوع پر پہنچ کر اس نے فوجیوں کو مختلف سمتوں میں ڈیوٹیز پر لگا دیا تھا۔ جنہوں نے فوراً ہی اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور موقع پر موجود دوسرے فوجیوں کے ساتھ حملے کا جواب دینے لگے تھے۔ این نے بڑی مہارت سے اس لڑائی کی دیکھ بھان شروع کر دی تھی لیکن گھٹ نے اس کو ایک قدر سے محفوظ چٹان کے پیچھے چھپ کر یہ کام کرنے کی ہدایت کی تھی اسے ہمیشہ ہی این کی حفاظت کا خیال شدت سے رہتا تھا اور کیوں نہ رہتا وہ اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ پیٹریو گھٹ کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا اور فائرنگ کا جواب دیتا ہوا گھٹ کے ساتھ ہی ایک محفوظ پناہ کی لوث میں چلا گیا تھا۔

”پتہ نہیں ان طالبان نے ان پہاڑیوں میں کیسے

ٹھکانے بنائے ہوتے ہیں کہ اچانک ہی غائب ہو جاتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گئے۔“ گھٹ نے فکر مندہ کچے میں کہا۔

”یہاں جگہ جگہ پہاڑیوں میں غار بنے ہیں اور اکثر کی چھت میں قدرتی طور پر سوراخ بنے ہیں وہ ان سوراخوں کی مدد سے ان غاروں میں اتر جاتے ہیں ان کے پیچھے ان غاروں میں اترتا خطرناک ہے کیونکہ وہاں ان کا تمام اسلحہ و جہاز سہاگھی موجود ہوتے ہیں اور نیچے اترنے والے فوجی کو زندہ نہیں چھوڑتے بلکہ بڑی اذیت سے مار رہے ہیں تمہارے یہاں آنے سے پہلے ہمارے کئی فوجی اس طرح مارے جا چکے ہیں۔“

”ہوں..... اسی لیے میں نے ان سے لڑنے کے لیے اپنا طریقہ بدل دیا ہے..... ہمارے پاس اتنی فوج نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکیں چنانچہ مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ضروری تھا۔ اور میں اس پر بھی کام کر رہا ہوں وہ بھی طالبان اور القاعدہ کی کارروائیوں سے پریشان ہیں اور آئے دن ان کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے ہیں وہ بڑی آسانی سے ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“ گھٹ نے کہا۔

”لیکن وہ مسلمان ہیں..... وہ ہمارا ساتھ شاید نہ دیں۔“ پیٹریو نے ایک بار پھر اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں تم نے یہ نہیں سنا کہ مسلمان اور خاص طور سے افغان بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور اپنی پناہ میں آئے ہوئے شخص کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہیں۔“

”تو اس بات سے ہمارا کیا تعلق ہے؟“

”ہم بھی تو ان کے مہمان ہو سکتے ہیں۔“ گھٹ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور دشمن کی طرف سے آنے والی ایک گولی کے جواب میں اس سمت ایک فائر داغ دیا اس کے ساتھ ہی برابر دشمن کے فائر کا جواب دے رہے تھے۔

”اور ہمارے ان کی پناہ میں بھی اپنے آپ کو دے سکتے ہیں۔“ گھٹ نے اوجھری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

پیٹریو کے نزدیک بلا جواز تھی۔

”تمہیں یہ بات بعد میں سمجھاؤں گا۔“ اس نے پیٹریو کی حیرت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ لیکن این نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ویڈیو کیمرے کو الٹ پلٹ رہی تھی۔

پھر دو دن بعد ہی پیٹریو نے گھنٹ کی ملاقات نور افضل سے طے کر دی تھی اور اس بار گھنٹ اس سے ملنے نہیں گیا تھا بلکہ نور افضل اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کے آرمی بیس پر آیا تھا اس خواہش کا اظہار نور افضل نے خود ہی کیا تھا کہ اس بار وہ گھنٹ کا مہمان ہوگا شاید دو اس کی فوجی ساکھ کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔“ گھنٹ نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا تو نور افضل مسکراتے لگا۔

”ہاں جب ہم دوست بن ہی گئے ہیں تو پھر تم مجھ سے ملنے آؤ یا میں تم سے ملنے آؤں ایک ہی بات ہے۔“ نور افضل نے ہنستے ہوئے کہا اس کے لہجے میں بہادریوں کے لہجے والی بے باکی جھلک رہی تھی اس روز گھنٹ اور نور افضل کی ملاقات خاصی طویل ہوئی تھی اور اس ملاقات میں گھنٹ نے اس کا تعارف این سے بھی کروایا تھا۔ این بھی نور افضل کے ساتھ بڑے تپاک سے بیٹھی تھی۔

”تم بہت بہادر جوان بنے وطن سے اتنی دور اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر صرف اپنے بیگزین کے لیے خبریں جمع کرنے یہاں آئی ہو۔“ نور افضل نے تعریفی انداز میں کہا لیکن اس کے لہجے میں حسرت بھی پائی ہوئی تھی۔

”ہاں یہ میری ملازمت کا حصہ ہے اور میں یہاں افغان عورتوں سے بھی ماننا چاہتی تھی میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ بہادر عورتیں کس طرح زندگی گزارتی ہیں اور کس طرح اپنے شوہروں اور بیٹوں کے ساتھ طالبان کے ساتھ جنگ میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔“ این نے گھنٹ کے روتے ہوئے الفاظ بڑی مہارت سے اڑا دیے۔

”لیکن اس کے لیے ان کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہوں گی۔“ پیٹریو نے سانسے پہاڑیوں کی طرف فائر کرتے ہوئے اپنی جگہ بدلی تھی اور اسی لمحے اس پہاڑی سے ایک طالبان لڑھکتا ہوا نیچے آگرا تھا۔ شاید گولی لگنے سے اس کی موت واقع ہوئی تھی پھر تھوڑی ہی دیر میں طالبان کے کئی ساتھی مارے گئے تھے اور ان کی طرف سے آنے والے فائر بھی بند ہو گئے تھے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد گھنٹ کو وائرلیس پر اطلاع ملی تھی کہ طالبان کا گروہ پیچھے ہٹ گیا تھا پھر گھنٹ نے بھی اپنے ساتھیوں کو وائرلیس کا اشارہ کیا تھا اور اس پوسٹ پر کچھ مزید فوجیوں کی ویڈیو لگا دی تھی۔

”میں نے ان طالبان کے گولی کھا کر گرتے ہوئے مناظر کی ویڈیو بنائی ہے۔“ این نے وائرلیس پر بتایا۔

”لٹھک ہے یہ ویڈیو نہ صرف تمہارے لیے تمہارے بیگزین کے لیے نئی انفارمیشن ہے بلکہ یہاں پر میری کارکردگی کے ریکارڈ میں رکھے جانے کے لیے ایک بہترین ثبوت بھی ہے۔“ گھنٹ نے کہا تو این ہنسنے لگی۔ پیٹریو اس وقت بھی ان کے ساتھ موجود تھا اور اعلیٰ سے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

”یہاں بہت خطرہ ہے ہم کس طرح یہاں سے بچ کر نکلیں گے۔“ پیٹریو نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”ہم ضرور کامیاب ہوں گے مجھے یقین ہے میری کوشش ہوگی کہ میرے فوجیوں کو کم سے کم نقصان اٹھانا پڑے۔“ گھنٹ نے کہا پھر اچانک وہ چونکا جیسے اسے کوئی خاص خیال آیا ہو۔

”پیٹریو تم ایک دور دراز میں ہی نور افضل سے ملنے کا بندوبست کرو تمہیں اپنے کام میں تیزی آنا ہوگی یوں ہم طالبان کے حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے اس بار این بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔“ اس نے کہا تو پیٹریو چونک کر ابستے دیکھنے لگا اسے حیرت اس بات پر نہیں تھی کہ وہ نور افضل سے ماننا چاہتا تھا بلکہ اس بات پر نہیں کہ اس نے این کو ساتھ لے جانے کی فرمائش کی تھی جو

”ہاں..... ضرور..... ضرور..... میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گا۔“ نور افضل نے جیسے کہے کہا اور مکیٹ کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے اسے افغانوں کے گھروں میں گھس بیٹھنے کے منصوبے میں کامیابی کی پہلی کرن نظر آئی تھی اس روز کی ملاقات میں نور افضل نے مکیٹ کو پیش کش کی تھی کہ وہ ان کے گھر کے قریب ہی ایک گھر میں اس کے ساتھ رہائش رکھ سکتا ہے اس طرح وہ افغانوں کے ساتھ ہوگا اور زیادہ محفوظ ہوگا۔ مکیٹ کے دل کی مراد پوری ہو گئی تھی اور اس نے جلد ہی اس گھر میں منتقل ہونے کا وعدہ کر لیا تھا اس روز مکیٹ نے بھی نور افضل اور اس کے ساتھیوں کی خوب تواضع کی تھی اور انہیں قیمتی تحائف بھی دیئے تھے۔ جس سے اس کی دوستی اور مضبوط ہو گئی تھی۔

چند روز بعد وہ اس جگہ منتقل ہو گیا تھا جو نور افضل نے اس کے لیے منتخب کی تھی یہ جگہ افغانستان کے سب سے بوئے میدان میں بکوالک کوٹا روڈ یا کے کنارے پہاڑوں کے دامن میں تھی پہلی کی اینٹوں کا بنا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں دو کمرے اور پانچ روم بنا ہوا تھا اس گھر کے باہر کوئی چہار دیواری نہیں تھی اور پھر میدان میں جگہ جگہ خود رو جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے زیادہ تر سوکھی ہوئی تھی دور دور تک کوئی اور گھر نہیں تھا بظاہر وہ جگہ بڑی پرسکون لگ رہی تھی لیکن یہاں بھی طالبان کی کارروائیوں کا ڈر تھا کیونکہ چاروں طرف پھیلی پہاڑیاں ان کا مسکن تھیں۔

”ویسے تو میں زیادہ وقت اپنے فوجیوں کے ساتھ ہی گزاروں گا کیونکہ میں اپنی فوجی ذمہ داریوں کو نہیں بھول سکتا لیکن ابھی ابھی آرام کرنے کے لیے یہ جگہ بہت اچھی ہے۔“ مکیٹ نے اس جگہ کی تعریف کی تو نور افضل مسکراتے لگا ان اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی۔

”ہاں جب تمہارا دل چاہے تو تم میرے ذمے پر بھی آ سکتے ہو۔“ نور افضل نے کہا اور مکیٹ اثبات میں سر ہلانے لگا اسے معلوم تھا کہ نور افضل کا گھر اس

ذمے کے قریب ہی ہے اور اس طرح این کی رسائی وہاں تک حاصل ہو سکتی ہے۔

”ہاں کیوں نہیں ضرور..... اور جب میرے یہاں آنے کا مقصد ہی آپ لوگوں کی مدد اور حفاظت کرنا ہے تو ہماری ملاقاتیں تو ہوتی رہیں گی ہمیں یہ جنگ مل کر ہی لڑنا ہے۔“ مکیٹ نے کہا اور نور افضل کے چہرے پر اپنی بات کے رد عمل پر آنے والے تاثرات تلاش کرنے لگا۔

”ہاں..... مجھے تمہاری بات سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔“ نور افضل نے کہا اس کے چہرے پر یقین بھری مسکراہٹ تھی جس کو دیکھ کر مکیٹ کو احساس ہوا کہ اس نے آدھا معرکہ ہار کر لیا ہے۔

”ہمارا اور تمہارا دشمن مشترک ہے۔ القاعدہ اور طالبان کا ہاتھ ناگین الیون کے امریکی حادثے میں ہے یہ بات ثابت ہو چکی ہے اور وہی تمہارے بھی دشمن ہیں جو تمہارے ملک میں چھپے ہیں اور تمہارے لیے ایک نئی جنگ چھیڑ دی ہے۔“ مکیٹ نے نور افضل کو سمجھانے والے انداز میں کہا اور نور افضل اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”ہاں..... میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور مکیٹ کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

پھر متواتر ان کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور وہ آپس میں ایک دوسرے پر جرمہ کرنے لگے تھے۔ اب این کی پہنچ نور افضل کے گھر کے اندر تک ہو گئی تھی۔ اس نے نور افضل کی بیوی اس کی چڑھی عورتوں اور بچوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا وہ اکثر ان میں تھپے اور تحائف تقسیم کرتی تھی ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھی اور وہ اسے مقامی لباس رسم و رواج کے بارے میں بتاتی تھیں اور اس پر بہت بھروسہ کرنے لگی تھیں اب وہ لوگ مکیٹ اور اس کے ساتھیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے۔

نور افضل اور مکیٹ کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک روز مکیٹ کے فوجیوں کا سامنا پھر طالبان کے ساتھ ہو گیا۔ مکیٹ کو اطلاع ملی تو وہ بھی ہمیشہ کی طرح

شدید قسم کی برین انجری کا سامنا ہے اور وہ کافی عرصے تک ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔

”کیا ہوا تھا؟“ اس نے ہوش آتے ہی اہن سے پوچھا تھا جو اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ کافی فکرمند محسوس ہو رہی تھی۔

”راستے میں سڑک کے کنارے ایک ہم نصب تھا جس سے تمہاری گاڑی ٹکرائی تھی گاڑی کے پرچے اڑ گئے تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئے۔ تمہیں شدید زخم آئے ہیں خاص طور سے سر میں۔ اہن نے اسے بتایا۔

”باقی لوگ... اور طالبان کا حملہ... وہ سب لڑ رہے تھے کیا ہوا؟ کوئی مارا تو نہیں گیا؟“ گھیسٹ نے پوچھا۔

”نہیں... کچھ فوجی زخمی ہوئے ہیں ان کو طبی امداد دی جا رہی تھی ہم نے اس معرکے میں طالبان کو مار بھگا دیا تھا۔ نور افضل بھی ہماری مدد کر رہا تھا۔“ اہن نے کمر سے میں موجود نور افضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ آگے بڑھا۔

”ہاں... تم فکرمند کرو گھیسٹ... ہم تمہارے ساتھ ہیں... میرے ساتھی اپنی جان دے کر بھی تمہاری مدد کریں گے... ہم تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے تم بھی تو ہماری خاطر آئے ہو... ہماری مدد کرنے۔“ نور افضل کے منہ میں گھیسٹ کی زبان بول رہی تھی اور گھیسٹ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اسے ساتھ ہونے والے حادثے کا اسے افسوس ضرور تھا لیکن وہ فوجی طور پر تیار تھا کہ افغانستان میں اپنی فوجی کے دوران اسے خطروں اور حادثات سے دوچار ہونا ہی تھا۔

”میں تمہارا مشکور ہوں۔“ گھیسٹ نے کہا۔

”تمہیں پتہ ہے اس بار کی جھڑپ میں القاعدہ والوں کے ساتھ اسامہ بن لادن بھی دیکھا گیا انہوں نے جگہ جگہ راستوں میں بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں ایسی ہی ایک بارودی سرنگ سے تمہارا ترک بھی ٹکرا کر حادثے کا شکار ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی جانی

ان کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا اس بار بھی اس کے ساتھیوں کی خاصی تعداد اس کے ساتھ تھی ان کی گاڑیاں جو اسلحے سے لیس تھیں اہن اپنے موبائی فون سے اس کے ساتھ موجود تھی اس بار طالبان کا حملہ کافی شدید تھا۔ گھیسٹ کے ساتھی مقامی لباس میں تھے لیکن ان کے ہتھیار ان کی گاڑیاں جن پر لوہے کا نصب تھا ان کے امریکی ہونے کی چھٹی کھارہی تھیں گھیسٹ کا قائلہ اس جانب تیزی سے سفر کر رہا تھا جہاں طالبان کے ساتھ اس کے فوجی معرکہ رانی میں مصروف تھے نور افضل کو بھی اس حملے کی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھیسٹ کی مدد کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

دشمن کی طرف سے شدید فائرنگ اور گول پاری ہو رہی تھی جس کا جواب گھیسٹ کی آرمی کی طرف سے دیا جا رہا تھا۔ گھیسٹ کی گاڑی تیزی سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے ساتھ چلنے والی دوسری گاڑی میں اہن اپنے کیمروں اور ہتھیاروں کے ساتھ سوار تھیں اچانک چلتے چلتے گھیسٹ کی گاڑی سڑک کے کنارے سے نصب ایک ہم سے ٹکرائی جو بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے وہاں بڑی مہارت سے نصب کیا گیا تھا اور وہ ایسی جگہ تھا کہ کوئی بھی گزرنے والی گاڑی اس سے ٹکرا سکتی تھی۔ اچانک ہی زوردار دھماکا ہوا تھا اور گھیسٹ کی گاڑی الٹ گئی تھی۔ اس کے پرچے اڑ گئے تھے اور گھیسٹ کو گرتے ہوئے سر اور اپنی سیدھی ٹانگ میں شدید زبرد کی ٹبر محسوس ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک مقامی اسپتال میں بینہ پر موجود تھا اور اہن کے علاوہ نور افضل بھی وہاں موجود تھا اسے بے انتہا سیکورٹی میں رکھا گیا تھا اور نور افضل کے لوگ اسے سیکورٹی دے رہے تھے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کو کئی دن گزار چکے تھے۔ اس حادثے میں اس کی ٹانگ کے ساتھ ساتھ اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں جس کی وجہ سے اس کے سر کا آپریشن بھی کیا گیا تھا اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اسے

اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے۔
 ”تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ اچانک ہی اس نے
 این سے پوچھ لیا اور وہ حیران رہ گئی اسے گھنٹ سے توقع
 نہیں تھی کہ وہ این کے ساتھ اپنی رومانی داستان کو کوئی
 حقیقی رشتہ دے گا۔

”کیا...؟“ اس نے حیرت سے کہا۔
 ”ہاں جب ہم ایک دوسرے کو اتنا پسند کرتے ہیں تو
 پھر شادی کرنے میں کیا حرج ہے؟“ گھنٹ نے کہا۔
 ”نہیں... میں ایسا نہیں کر سکتی... تم جانتے ہو
 میرا ایک شوہر ہے... چار بچے ہیں... وہ مجھ پر بہت
 اعتماد کرتا ہے اس نے مجھے ہر طرح کی آزادی دے رکھی
 ہے۔ میری خواہش پر اس نے مجھے افغانستان جیسے
 خطرناک ملک میں رہنا تسلیم کرنے کی اجازت بھی
 دے دی اور میں... میں اسے بدلے میں دھوکا دوں
 ؟“ این نے کہا۔

”تو پھر ہمارا انجام کیا ہوگا؟ کیا ہم یونہی چھپ
 چھپ کر رہیں گے؟“ گھنٹ نے کہا۔
 ”کیا کروں...؟ میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور
 ہوں میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چار بچے ہونے کے
 بعد مجھے اپنے خوابوں کا حقیقی شہزادہ مل جائے گا۔“ این
 کے کنبے میں غمتی کے ساتھ ساتھ حسرت بھی تھی۔
 ”ہاں... میں نے بھی کبھی ایسا نہیں سوچا تھا...“

مجھے اپنی بیوی اور بچوں سے بہت ہی پیار ہے... میں
 انہیں بھی چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتا اور تمہیں بھی۔“
 گھنٹ نے این کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔
 ”اور میرا حال بھی بالکل یہی ہے گھنٹ...“ این نے
 بے بسی سے کہا۔ ”میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں نہ
 انہیں چھوڑ سکتی ہوں اور نہ تمہیں اور ہم لوگ شادی بھی
 نہیں کر سکتے۔“

”لیکن شادی تو میں تم سے ضرور کروں گا۔“ گھنٹ
 کے لہجے میں ارادے کی پختگی جھلک رہی تھی۔
 ”نہیں گھنٹ یہ ممکن نہیں۔“ این اس کے قریب

نقصان نہیں ہوا۔ کچھ فوجیوں کو زخم آئے ہیں۔ انہیں طبی
 امداد دی جا رہی ہے لیکن تمہارے سر کی انجری بہت
 خطرناک تھی۔ آپریشن کرنا پڑا اور تمہارے جسم پر بھی غیر
 معمولی زخم آئے ہیں۔“ فوراً فضل نے اسے بتایا تو
 گھنٹ نے مسکرا کر این کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں
 میں این کے لیے بے پناہ محبت جھانک رہی تھی اور این
 بھی اس سے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے بہانہ
 ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر اسی رات انہیں قدرت نے ایک
 موقع دیا تھا۔ اسپتال میں دن کی تمام مصروفیات سے
 فارغ ہو کر تمام لوگ اپنے اپنے کمروں اور اپنی اپنی
 ڈیوٹیوں پر چلے گئے تھے۔ این گھنٹ کے کمرے میں
 موجود تھی یوں تو شروع ہی ہے اس کی دیکھ بھال کر رہی
 تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب حادثے کے بعد گھنٹ
 ہوش میں آیا تھا۔

”گھنٹ! میں تمہارے لیے بہت فکر مند تھی۔ ہم لوگ
 ناامید ہو چکے تھے تمہارے سر کی انجری بہت خطرناک تھی۔“
 این کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔
 ”خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گیا ہوں۔“ گھنٹ نے
 محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں اور نہ میں کبھی تمہارے ساتھ ہی مر
 جاتی۔“ این نے دوسرے ہاتھ سے اس کے سر میں
 انگلیاں پیچھرتے ہوئے کہا۔

”پھر تمہارے چاروں بچوں کا کیا ہوتا جو دانشمندان
 میں تمہارے منتظر ہیں۔“ گھنٹ نے شرارت بھرے
 لہجے میں کہا۔
 ”تمہیں میرے بچوں کی فکر ہے اور اپنے بچوں کے
 بارے میں تمہارا کیا خیال ہے وہ بھی تو چار ہیں اور
 تمہاری وابستگی کا شدت سے اظہار کر رہے ہیں۔“ این
 نے کہا۔

”ہاں! ان کی ماں بہت اچھی ہے وہ ان کا بہت
 خیال رکھتی ہے۔“ گھنٹ کے کنبے میں چٹو افسردہ تھی۔
 شاید یہ احساس اسے ستا رہا تھا کہ این سے محبت کر کے وہ

اس کے ہنسنے پر ہنسی و راز ہوئی اس نے اپنا سر گھٹ کے
بیسے پر رکھ دیا تھا۔

”اس بار سے میں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے این۔۔۔۔۔
تم اچھی طرح سوچ لو۔“ گھینٹ نے کہا۔

”گھینٹ تم ہمیں پتہ ہے جب تمہارا حادثہ ہوا تو میں
بہت روئی۔۔۔۔۔ میں بہت پریشان تھی تو نور افضل کی
بیوی نے مجھے بہت دلاسا دیا وہ مجھے اپنے گھر لے گئی
اس نے مجھے کئی دنوں تک اپنے ساتھ رکھا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔

میری حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ میں تم سے کتنی
قریب ہوں اور تمہاری محبت میں بھی گرفتار ہوں۔۔۔۔۔

پھر اس کے پوچھنے پر میں نے اسے سچ بتا دیا وہ بہت
خوش ہوئی اور اس نے مجھے بہت سے خوبصورت
کپڑے دیے جن کے ساتھ مقامی طرز کے زیورات
بھی تھے۔ وہ اکثر ضد کر کے مجھے وہ پہناتی ہے اس نے
مجھے کئی افغانی کھانے پکانا سکھائے ہیں اور میں نور افضل
کی فیملی کے ساتھ بہت محل مل گئی ہوں۔“

”بہت خوب“ گویا میری انگریزی کی وجہ سے تم نے
میری غیر حاضری میں میرا کام سنبھالا ہوا ہے تم نے
میرے پلان کے مطابق نور افضل پر اعتماد قائم کر لیا ہے
اور تمہاری سچائی اس کی فیملی تک ہوئی ہے۔“ گھینٹ کے
چہرے پر خوشی کا آثار نظر آ رہے تھے۔

”لیکن اس کے لیے مجھے زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑی
کیونکہ کچھ تو حادثے کی وجہ سے نور افضل کی بیوی کو مجھ
سے بدردی ہوئی تھی اور پھر اس کے خیال میں ایک
عورت کا اپنے مرد کے بغیر جتنے فوجیوں میں اکیلے رہنا
ٹھیک نہیں تھا چنانچہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر ہی میں
ہوں اس کے بچے مجھے بہت پسند کرتے ہیں میں انہیں
انگریزی سکھاتی ہوں اور وہ مجھے افغانی سکھاتے ہیں۔“

”بہت خوب! مجھے خوشی ہوئی تمہارا کام کرنے کا
طریقہ وہی ہے جو میں چاہتا ہوں۔“ گھینٹ ابھی تک
فوجی انداز ہی سے سوچ رہا تھا وہ اسے اتفاق ماننے کو
تیار نہیں تھا۔

رست

چاندی کے ورق میں لپٹی خوشیاں دل کے نہاں
خانے سے چھلکھڑی کی مانند پھوٹی ہیں اور جب یہ فضاؤں
میں جلیترنگ کی طرح نکھر جائیں تو پھر رست چاہے کوئی
بھی ہو صرف دل کا منظر گلابوں سا کھلا کھلارست کی رانی
سامنے کا مہر کا ہو جاتا ہے سچ سچ۔۔۔۔۔ خوشی کی کوئی خاص وجہ
ہوتی ہے اور نہ ہی اسے کسی ناپ تول کی اکائی سے ناپا
جا سکتا ہے۔ کبھی پانی کی روانی دیکھ کر دل کی ویرانی میں
خوشی کے غنچے کھل اٹھتے ہیں تو کبھی آسمان پر بھراتے
پرندے مسکرو شادماں کرتے ہیں۔ خوشی کسی خاص شے
احساس سے قطعاً مشروط نہیں کبھی تو بچوں کی سرسراہٹ
چڑیوں کی چہکارتاب شماروں کا شور۔ چاند چاندنی
ستارے شبنم جگنو ستاریاں رنگ برنگے پھول بارش کی
نسخی نسخی بوندیں چوڑیوں کی کھلک رنگ کی دھنک
مبندی کے رنگ مٹی کی خوشبو اور گھر کے کی مہک تک دل
کے پور پور میں مہک خوشی کی بھر جاتی ہے اور پھر من خود بہ
خود ہی گنگنائے سچے مسنورے کو بھٹکے لگتا ہے۔
پر دین افضل شاہین۔۔۔۔۔ بہاؤنگر

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ گھینٹ نے
کچھ دیر بعد اس سے پوچھا۔

”کس بات کا؟“

”یہی کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔“
”میں ذرتی ہوں۔۔۔۔۔ کیسا کرنا بتا رہے لیے
خطرناک ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی وجہ سے تمہارا اور میرا
تکیر پڑتا ہو جائے گا ہمارے گھروں میں ہمارے
لیے جگہ نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ ہم پوری طرح برباد ہو سکتے
ہیں۔“ این نے خدشات کا اظہار کیا۔

”میں بھی یہ سب جانتا ہوں۔“ گھینٹ نے
کہا۔ ”لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں ہے میں ان چیزوں
سے ذرا نہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”بکھو گئیٹ، مجھے وقت دو..... میں اس بارے میں سوچوں گی۔“ این نے اس وقت اس کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گھٹت بھی خاموش ہو گیا اس رات بہت عرصے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا اور محبت کی دو بے قرار رو میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئیں۔

کافی عرصہ اسپتال میں گزارنے کے بعد گھٹت کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تو نور افضل اسے وہی گھر میں لے گیا جو پہاڑوں کی وادیوں میں اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ سب سے اگلی تھلگ تھا اور گھٹت کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ وہاں ایک چھوٹی ٹیمپل کے رہنے کے لیے تمام انتظامات تھے گھٹت نے سوالیہ نظروں سے نور افضل کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ نور افضل اتنا نادان نہیں ہے اسے ایک فوجی کی ضروریات کے درمیان تمیز نہ ہو اس کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر نور افضل مسکراتے لگا تھا۔

”مجھے معلوم ہے تم این سے محبت کرتے ہو اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتے پھر ابھی تمہیں خاص دیکھ بھال کی ضرورت بھی ہے اور اس کے لیے این سے بہتر کوئی نہیں تم یہاں اس کے ساتھ سکون سے رہ سکو گے چاروں طرف تمہارے فوجی اور میرے قبیلے کے لوگ تمہاری حفاظت کے لیے پہاڑوں میں موجود ہیں۔“

”لیکن میں نے کسی پر بھی اپنی محبت کو ظاہر نہیں ہونے دیا یہ این اور میرے درمیان ایک راز ہے۔۔۔ ہم چھپ کر ملتے ہیں۔۔۔ ویسے تو دو سارا دن میرے ساتھ ہوتی ہے لیکن محض ایک رپورٹر کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے کسی کو پتہ نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“ گھٹت نے وضاحت کی۔

”میں جانتا ہوں۔۔۔ اس کا اظہار کرنے میں تمہارے لیے بھی خطرہ ہے اور این کے لیے بھی۔۔۔ اس کی فوری جاسکتی ہے اور تمہاری بھی یہ فوجی اصولوں کے خلاف ہے لیکن..... اس سلسلے میں تمہارا دوست

ہونے کے ناطے میں تمہاری مدد کروں گا اور کسی کو بھی اس راز کا پتہ نہیں چلے گا سب یہی سمجھیں گے کہ این محض تمہاری تیمارداری کے لیے یہاں ہے۔“ نور افضل نے وضاحت کی۔

”تھیک ہے۔“ گھٹت نے مطمئن ہو کر کہا اور اس کے بعد وہ این کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔ آرمی میں سے اس کے کمرے کا کافی سامان وہاں منتقل کر دیا گیا جس میں اس کی خفیہ دستاویز کا بیگ بھی تھا ان دستاویز میں وہ تمام منصوبہ بندیاں تحریر تھیں جو گھٹت نے افغانستان میں آزمائی تھیں۔ ان میں وہ خطوط بھی تھے جن میں اس نے افغانستان میں جنگ لڑنے کی نئی ترکیب اختیار کرنے کی اجازت امریکی افسران سے لی تھی اور امریکی افسران کا وہ جواب بھی تھا جس میں اسے یہ نئی ترکیب آزمانے کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ افغانوں میں حملے مل جائے اور ان کی مدد سے طالبان اور القاعدہ کا مقابلہ کرے اس مقصد کے لیے اس نے اجازت مانگی تھی کہ اسے اپنے فوجیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر افغانوں میں شمس پٹھن کی اجازت دی جائے اور انہی کا مذاق میں وہ اجازت بھی موجود تھی۔ پھر مختلف موقعوں پر افغانستان میں اس سے ملنے امریکی حکام آتے رہتے تھے اس کا ریکارڈ بھی موجود تھا اور یہ ساری دستاویزات گھٹت کے بعد صرف این کی دسترس میں تھیں وہ جب چاہے انہیں دیکھ سکتی تھی جبکہ یہ فوجی اصولوں کے خلاف تھا اور گھٹت کے علاوہ ان خفیہ دستاویزات تک کسی کی رسائی ممکن نہیں تھی لیکن گھٹت این کے معاملے میں بہت رعب پر وادار تھا ہوا تھا شاید یہ اس کی محبت اور این پر بے حد اعتماد کا نتیجہ تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ گھٹت کی حالت بہتر ہوتی گئی اور وہ دوبارہ سے اپنی روزمرہ فوجی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گیا تھا لیکن اب اس نے ایک اور ذمہ داری کا اضافہ کر لیا تھا کہ وہ اکثر این کے ساتھ افغان قبیلوں میں نکل جاتا تھا وہ ظاہر یہ کرتا تھا کہ وہ

والے انداز میں کہا۔

”تم نے کہا تھا کہ تم اس بارے میں سوچو گی اب کافی دن گزر گئے ہیں۔ بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا؟“

”میں اپنے بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔“ این نے کہا۔

”اور میں بھی..... لیکن ہمیں شادی کر کے بچوں کو چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے ہم ان سے ملنے رہیں گے۔“ گیٹ نے کہا۔

”لیکن لوگ ہمارے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گے۔“ این نے کہا۔

”وہ کوئی نئی بات نہیں ہے..... سب پیار کرنے والوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔“ گیٹ نے ہاتھ میں پکڑی شراب کی بوتل سے کئی ٹھونٹ بھر لیے۔

”تم بہت زیادہ پینے لگے ہو۔“ این نے تشویش سے کہا۔

”ہاں..... اس کی وجہ تم ہو..... میں تمہاری بے رخی برداشت نہیں کر سکتا۔“ گیٹ نے کہا۔

”لیکن میں تو تم سے ملنے آتی ہوں۔“

”ہاں لیکن یہ خیال تو میرے دل میں رہتا ہے کہ تم کچھ عرصے بعد مجھ سے پھڑ جاؤ گی۔ تم میری نہیں ہو۔ تمہیں میری محبت کی پروا نہیں ہے۔“

”کیسا مت کہو۔ گیٹ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر مجھ سے شادی کر لو۔“ گیٹ نے کہا۔

”ابھی نہیں..... ابھی صدمہ کرو۔ ابھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔“ این نے کہا اور گیٹ بے بسی سے بستر پر لیٹ گیا وہ خاصہ دل برداشتہ نظر آ رہا تھا اور بہتر زیادہ نشے میں تھا۔ این کچھ دیر وہاں رکھنے کے بعد واپس کمپ میں چلی گئی تھی۔

دوسرے روز این کو گیٹ کے ساتھ افغان کی ایک بستی میں جا کر لوگوں سے ملنا تھا اس نے نور افضل کی بیوی کا دیا ہوا مقامی لباس زیب تن کیا تھا اور اس کے ساتھ افغان جیولری بھی پہنی تھی وہ ایک خوبصورت

این کے ساتھ سیر کے لیے نکلا ہے لیکن اس کا مقصد مقامی لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنا اور ان میں کھل مل جانا تھا اس کے لیے وہ ان کے مسائل بھی سنتا تھا اور انہیں کسی حد تک حل کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا لیکن اسے اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ عام افغانوں میں یوں بغیر سیکورٹی کے گھومے اس سے اس کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا لیکن اس نے بھی اس کی پروا نہیں کی اور اسی طرح اس نے امریکن آرمی کے ایسے ہی بہت سے قوانین بھی توڑے وہ سب سے الگ انداز میں کام کرتا چاہتا تھا اور عراق میں حاصل ہونے والی فتح اس کے لیے کامیابی کی ضمانت تھی جاری تھی امریکی اعلیٰ حکام کا بھی خیال تھا کہ اس کی جنگ کی نئی ترکیب اسے کامیابی سے ضرور ہمکنار کرے گی اب اسے کئی حلقوں میں لارنس آف عربیہ کے کردار سے مماثلت دی جا رہی تھی اور کئی موقعوں پر اسے لارنس آف افغانستان کا خطاب بھی دیا گیا تھا خود امریکی حکومت نے بھی ایک موقع پر اسے لارنس آف افغانستان کے نام سے پکارا تھا وہ اس کامیابی پر بہت خوش تھا اور اسے بھی پختہ یقین تھا کہ کامیابی ضرور اس کے قدم چومے گی۔

”این تم نے سوچ لیا جو میں نے پیش کش کی تھی اس کے بارے میں؟“ اکیب رات اس نے این سے پوچھا جو اس کے ساتھ موجود تھی اور اپنی والہانہ محبت کا اظہار کر رہی تھی۔

”ہوں۔ کون سی پیش کش؟“ این نے انجان ہفتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے شادی کی پیش کش۔“ گیٹ نے کہا۔

”تم جانتے ہو گیٹ یہ بہت خطرناک ہے۔“ این نے کہا وہ واقعی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں..... کیا ہم ہمیشہ یونہی مل سکیں گے؟ یہاں سے واپس جانے کے بعد بھی؟ کیا ہمیں موقع ملے گا یہ راز تو پھر بھی فاش ہوگا ہم کب تک ڈرتے رہیں گے؟“ گیٹ نے اسے سمجھانے

افغان عورت لگ رہی تھی جب وہ کیٹ سے ملے پہنچی تو وہ اس کو دیکھتا رہ گیا اس لباس میں اس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔ کیٹ نے بھی اس وقت مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے کاندھے پر ایک بڑی سی چادر پڑی ہوئی تھی ہاتھ میں گن تھی۔

”تم تیار ہو؟“ این نے اس سے پوچھا۔

”ہاں..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ کیٹ نے کہا پھر وہ دونوں گھر کے باہر کھڑی اس جیب میں بیٹھ گئے تھے جس میں این اس سے ملنے آئی تھی۔

وہ افغانوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی یہاں کچے مکان بنے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ خاصے غریب ہیں۔ ان کے لباس دوران کے گھر اس بات کا اظہار کر رہے تھے۔ کیٹ سے پہلے اس کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی اور وہ لوگ کیٹ کے منتظر تھے۔ کیٹ نے وہاں جاتے ہی ان لوگوں میں ضرورت کی چیزیں، کپڑے اور مختلف تحائف تقسیم کیے تھے۔ بستی کے لوگوں کے چہروں پر اطمینان اور خوشی کی جھلک نظر آ رہی تھی خاص طور سے بچے بہت خوش تھے پھر کیٹ نے ان سے چھوٹا سا خطاب کیا تھا جس کی ویڈیو این نے بنائی تھی۔

”ہم یہاں آپ لوگوں کی مدد کرنے آئے ہیں۔ ہم بیماری کے خلاف جہالت کے خلاف اور طالبان کے خلاف ہیں ہم سلسلے میں آپ کی مدد کریں گے اگر آپ پسند کریں گے تو ہم آپ کے بچوں کو تعلیم بھی دیں گے۔ ہم آپ کے دوست بننا چاہتے ہیں اور آپ کے مہمان ہیں۔“ کیٹ نے مہمان کا لفظ خاص طور سے استعمال کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں میں مہمان کو کیا درجہ دیا جاتا ہے اور مسلمان مہمان کی جان کی حفاظت ہر چیز سے بڑھ کر کرتے ہیں اور پھر ایسا مہمان جوان کی حفاظت کرنے آیا ہوگیٹ کو اپنی سوچ سے بھی زیادہ پڑائی ملی تھی ہر افغان کی خواہش تھی کہ کیٹ ان کا مہمان بنے اور این کو تو بچوں نے گھیر لیا تھا وہ بچوں

میں ہر اعزیز ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کی دلچسپ باتیں اور مسکراہٹ بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی اور وہ اس کے گردیدہ ہو جاتے تھے اس نے عادت کے مطابق یہاں بھی بچوں میں مٹھائیاں، کیک اور کھانسیوں کی بالخصوص کٹائیں تقسیم کی تھیں۔ جنہیں حاصل کر کے سارے بچے خوش تھے اس بستی کا ان کا یہ دورہ مزید کامیاب یوں ہوا تھا کہ انہوں نے بیماروں کے لیے ایک مفت کیٹ لگا دیا تھا جہاں فوجی ڈاکٹر موجود تھے لیکن سب پر ڈگرام کے مطابق مقامی لباس میں تھے اور مقامی بولی بول رہے تھے انہوں نے بستی کے لوگوں کا معائنہ کیا تھا اور انہیں مفید دوا میں فراہم کی تھیں وہ کیٹ کئی روز تک لگا رہا تھا اور اس کی وجہ سے کیٹ کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اس کی پڑائی بڑھی تھی۔

اس رات جب کیٹ اپنی رہائش گاہ میں این کے ساتھ موجود تھا تو بہت خوش تھا۔

”این آج مجھے ایک اور کامیابی ملی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی شراب کی بوتل موجود تھی جواب اس کی عادت بن چکی تھی۔

”نہیں تمہارے ساتھ کام کرتی رہی ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم یہاں طالبان سے لڑنے آئے ہو..... انہیں ختم کرنے آئے ہو اور اس کام سے زیادہ تم یہاں کے لوگوں سے دوستیاں کرنے میں مصروف ہو یہ بات امریکی قانون کے خلاف ہے۔“

”ہونہ..... امریکی قانون۔“ کیٹ کے لہجے میں موجود حقارت کو این نے محسوس کر لیا تھا۔

”کیوں؟ کیا بات ہے تم اپنے ہی ملک کے قانون کو ایسا کیوں کہتے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ان لوگوں کو لڑنے کی صحیح اسٹریجی نہیں آتی یہ دشمن پر واضح کر دیتے ہیں کہ ہم تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں ختم کرنے آئے ہیں اس طرح انہیں کہیں بھی ہمدردی نہیں ملتی اور وہاں کی فوج کے ساتھ ساتھ وہاں کے عوام

بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں پھر انہیں دو محاذوں پر لڑنا ہوتا ہے۔" گلیٹ نے کہا۔

"لیکن دشمن کے ساتھ دوپٹی؟" این نے سوال کیا۔

"یہ ضروری ہے۔ تم دیکھو ویت نام میں اتنے

سال جنگ کے بعد امریکہ کو شکست ہوئی اور بھی جیسوں

پر انہیں منہ کی کھائی پڑی۔ افغانستان ان کے حلق میں

انکا ہوا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کا طریقہ جنگ

غلط ہے اور وہ کھل کر مقابلے پر آ جاتے ہیں اس سے

انہیں نقصان ہوتا ہے جبکہ میں نے یہ طریقہ بدل دیا

ہے۔ دیکھو عراق میں ہمیں فتح ہوئی ہے اس

کا سہرا میرے سر ہے میں نے امریکہ کے روایتی طریقے

نہیں اپنائے اور اب میری بہادری اور میرے لڑنے

کے نئے انداز ہی کی وجہ سے مجھے یہاں تعینات کیا گیا

ہے تاکہ میں افغانستان میں امریکہ کی باری ہوئی جنگ کو

فتح میں بدل دوں یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔" گلیٹ

نے کہا وہ ہستا ہستا شراب کے گھونٹ لیتا جا رہا تھا اور

زیادہ پی لینے کی وجہ سے اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں

دے رہی تھی۔ الفاظ بھی صاف ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"بس کرو گلیٹ۔۔۔۔۔ تم نے بہت پی لی ہے۔" این

نے اس کے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔۔۔ رہنے دو۔۔۔۔۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ بار

کو جیت میں کیسے بدلتے ہیں۔" اس نے این کو سمجھنے کر

اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے میری وہ ٹیبلٹ

دے دو میں سکون چاہتا ہوں۔"

"تم بہت زیادہ نشہ کرنے لگے ہو یہ شراب کیا تم تھی

کہ اب تم نشے کی دوا میں بھی لے رہے ہو۔"

"تم بس دے دو۔ مجھے سکون چاہیے تم دیکھنا۔۔۔۔۔

یہ افغان۔۔۔۔۔ یہ سب سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی مدد کرنے

آئے ہیں اور یہ اس جنگ میں طالبان اور القاعدہ کے

خلاف ہماری مدد کریں گے۔ ہم جیتیں گے۔" گلیٹ

نے لڑکھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

این نے اسے بستر پر لٹا دیا تھا اور اس کی نشہ آور

گوئیاں اسے دے دی تھیں۔

"ہمیں دو محاذوں پر لڑنا نہیں پڑے گا اب افغان

ہمیں دشمن سمجھ کر ہم سے لڑنے کے بجائے ہمیں دوست

سمجھ کر ہماری مدد کریں گے۔" گلیٹ نے کہا آخری

جملہ ادا کرتے کرتے اس پر غنودگی چھا گئی تھی اور این

اس کے قریب بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ

اس جنگ میں گلیٹ نے بہت سے فوجی قوانین توڑے

ہیں اگر وہ یہ جنگ نہ جیت سکا تو اس کا کیا انجام ہوگا؟

اگلے دن گلیٹ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ این اس کے

قریب اس کے بستر پر ہی موجود تھی۔

"تم ذات بہت بہک رہے تھے۔" این نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔۔۔ لیکن میں افغانوں کے دل جیتنے میں

کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا اگر میں

موقع پر انہوں نے تمہارا ساتھ دیا اور تمہیں کامیابی بھی

نصیب ہوئی تو شاید تمہیں کئی امریکی قوانین توڑنے کی

وضاحت نہ کرنی پڑے۔"

"ہوں۔۔۔۔۔ دیکھا جائے گا۔" گلیٹ نے بے

پروائی سے کہا۔

"فی الحال تو میرا مقصد افغانستان میں امریکہ کی

باری ہوئی جنگ کو جیتنا ہے۔" گلیٹ نے کہا اور پھر این

کی طرف دیکھنے لگا۔

"این! تم نے کیا سوچا؟ مجھ سے شادی کے بارے

میں۔۔۔۔۔؟" اچانک ہی اس نے این سے سوال کر دیا۔

"تم ابھی تک اسی بات پر اڑے ہوئے ہو۔" این

نے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں

کر سکتا۔۔۔۔۔ تم میرے دل دو مارے پر چھا گئی ہو تمہیں پتہ

ہے میں اپنی ذہنی بھی پورے طور پر ادا نہیں

کر پار رہا ہوں کیونکہ تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے

ذہن سے نہیں نکال سکتا۔"

کر دیا۔۔۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔“ اس نے والہانہ انداز میں کہا۔

”لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟ ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔“ این کی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔

”نہیں۔۔۔ میں پوری رازداری رکھوں گا۔ میں اس کام میں اپنے دوست پیٹر یو اور نور افضل کی مددوں گا۔“

مگیٹ نے کہا اور پھر ہوا بگی یہی تھا اس نے نور افضل کو یہ خوشخبری سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوا وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور اب وہ

شادی کر کے رشتہ از دوام میں بندھنا چاہتے ہیں تو اس نیک کام میں وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھا۔

پھر اسی شام نور افضل کدو پرے پر یہ کام کیا گیا تھا۔ شادی کی اس مختصر سی تقریب میں مگیٹ اور این کے علاوہ

نور افضل اس کے گھر والے مگیٹ کا دوست پیٹر یو شامل تھے۔ نور افضل کی بیوی نے این کو افغان دہن کا لباس پہنایا تھا اور اسے تیار کیا تھا اس شادی کی رسومات

ادا کرنے کے بعد وہ رات مگیٹ اور این نے نور افضل کے ڈیرے پر ہی گزاری تھی اور اس شادی کا علم اس میں

شریک ہونے والوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوا تھا۔ شادی ہونے کے بعد بھی مگیٹ اور این وہی معمول

کی زندگی گزارتے رہے تھے جو شادی سے پہلے گزار رہے تھے اسی طرح مگیٹ اپنے فوجیوں کے ساتھ

طالبان کے مقابلوں کے لیے جاتا تھا این اسی طرح کیمروں کے ساتھ ان مقابلوں کی رپورٹنگ کر کے

دانشمن اپنے میگزین کو بھیجتی تھی اور معرووں کے موقع پر اپنا کام کرنے کے ساتھ ساتھ مگیٹ کی مدد بھی کرتی تھی

اس کا کام رپورٹنگ کے علاوہ مگیٹ کے فوجیوں کو اگلے امور چوں پر اسلحہ فراہم کرنا بھی تھا اس کے ساتھ ساتھ

دو دونوں پہاڑیوں کے درمیان بہنے نور افضل کی طرف سے تھے میں دیئے گئے گھر میں ایک شادی شدہ بھرپور

زندگی گزار رہے تھے لیکن ڈیوٹی کے اوقات میں مگیٹ کبھی بھی اپنے فوجی کیمپ سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا ان

”تم جانتے ہو۔۔۔ میں شادی شدہ ہوں۔۔۔ میرے چار بچے ہیں۔“ این نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”میں جانتا ہوں۔۔۔ میں بھی شادی شدہ ہوں اور میرے بھی چار بچے ہیں لیکن یہ عشق و محبت۔۔۔ میں اس کا کیا کروں یہ دل میرے بس میں نہیں ہے۔“

”تم اپنے لیے خطرناک مسائل پیدا کر رہے ہو تمہارا قوانین کو توڑنا۔۔۔ افغانوں سے بے تکلفی۔۔۔

نہ کرنا اور میرا عشق تمہیں برباد کر دے گا۔ عقل کے ہاتھں لو۔۔۔ اور صرف اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دو۔“

”میں نہیں کر سکتا۔۔۔ ہرگز بھی نہیں کر سکتا“ میرا ذہن میرے ساتھ نہیں ہے۔۔۔ اگر تم میرا ساتھ دینا

چاہتی ہو اور یہ چاہتی ہو کہ مجھے کامیابی نصیب ہو تو مجھیں میری بات ماننا ہوگی۔“ مگیٹ نے کہا این اسے

حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ”تم بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟“ مگیٹ نے پوچھا۔

”جگرتی ہوں۔۔۔ تم میرے سپنوں کے شہزادے ہو۔ میں نے ہمیشہ ایسے ہی بہادر آدمی کی خواہش کی تھی لیکن

۔۔۔“ این خاموش ہو گئی اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔ ”لیکن کیا۔۔۔ لیکن کیا این؟“ مگیٹ نے اسے

کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”میں ڈرتی ہوں۔“ این کی آنکھوں میں آنسو

جھلما رہے تھے۔ ”درد نہیں۔۔۔ کوہ پڑو۔۔۔ اسٹیپ آن۔ اس نے فوجی اصطلاح میں کہا اور این چند لمحوں تک اسے محبت

بھری نظروں سے دھمتی رہی پھر جیسے بارمان گئی تھی اور اس نے مگیٹ کے کاندھے پر سر رکھ کر آکھیں بند کر لی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں تیار ہوں۔“ این نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی اور مگیٹ خوشی سے پاگل

ہو گیا تھا۔ ”اوہ۔۔۔ تھینک یو این۔۔۔ تم نے مجھے خوش

تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ غلطیاں سب ہی کرتے ہیں تم ان کی غلطیوں سے فائدہ اٹھانا۔" وہ باتیں کرتے ہوئے نسوار بھی کھاتا جا رہا تھا جو اس نے نور افضل سے سیکھا تھا تاکہ اصل افغان دکھائی دے۔

"اپنی طرف سے لڑائی میں پہل مت کرنا لیکن اگر کوئی تم سے لڑنا چاہے تو بہادری سے اس کا مقابلہ کرنا اور اسے مار دینا ورنہ تمہارا دشمن تمہیں مار دے گا۔۔۔۔۔ یہ جان لو کہ مقامی لوگ بھی تمہاری مدد جب کریں گے جب تم اپنے دفاع یا ان کے دفاع کے لیے لڑ رہے ہوں گے تم نے لڑائی کرنے میں پہل کی تو ان کی ہمدردیاں تمہیں نہیں ملیں گی۔"

"لیکن رابرٹ کی وجہ سے ہم پریشان ہیں۔" ایک فوجی نے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں وہ ہمارا اسٹاف فوجی سارجنٹ روبرٹ ہیلٹر تھا اس کی حماقت کی وجہ سے ہم زیادہ خطرے میں ہیں جنگ بڑھ جانے کی وجہ سے وہ فرار ہو گیا ہے۔ اور اس نے گاؤں کے سولہ لوگوں کو ذبح کر دیا ہے لیکن ہمیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ طالبان کی کارروائی ہے۔۔۔۔۔ ہمارے فوجی نے ایسا نہیں کیا۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں کسی کو جواب دینے کی ضرورت نہیں میں یہ معاملہ خود دیکھ لوں گا۔" سمیٹ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"دیکھو آج رات تمہیں خود کو محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔" اس نے ایک ایک فوجی کی طرف اشارہ کیا۔

"تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ میں تم سب کو کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ اس کی فکر مت کرو کہ وہ بھیڑیے کس پوزیشن میں ہیں۔۔۔۔۔ تمہیں ساری رات پیرونگ کرنا ہے۔۔۔۔۔ اوکے۔۔۔۔۔ جاگتے رہنا۔۔۔۔۔ اور کل سہ پہر تک چھپے رہنا اس کے بعد ان بھیڑیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہے۔۔۔۔۔ صورت حال خراب بھی ہو سکتی ہے پتہ چلا ہے کہ اسامہ بن لادن کو بھی یہاں دیکھا گیا ہے۔۔۔۔۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح پھر رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ کوئی موقع نہیں چھوڑے گا۔"

دونوں کی ملاقاتیں رات کے وقت ہوتی تھیں پھر ان کی زندگی میں ایک اور گھنٹہ وقت آیا جب امریکی فوجیوں نے کوئٹہ جیل میں ایک آپریشن کے دوران غلطی سے قرآن پاک جلا دیا۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ کوئٹہ جیل میں کچھ طالبان چھپے ہوئے ہیں اور انہیں وہاں تحفظ دیا جا رہا ہے فوجیوں نے وہاں آپریشن کیا اور اس موقع پر غلطی سے قرآن پاک جلا دیا گیا اس پر افغان عوام اور طالبان میں بھی نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی اور امریکیوں کے خلاف ان کی کارروائیوں میں شدت آ گئی کیونکہ جب اطلاع ملی تو اس نے اپنے اہم فوجی حکام کو فوجی کیمپ میں اپنے آفس میں طلب کیا اور انہیں کچھ اہم ہدایات دیں اس موقع پر وہ بہت چاق و چوبند نظر آ رہا تھا اور یہ میسنگ رات کے وقت کی گئی تھی۔ انہیں برائے طالبان کے حملے کا ذکر تھا کیونکہ کسی بھی وقت وہ جوانی کا ردوائی کر سکتے تھے کیونکہ کاہلنگ روم چٹانوں پر بنا ہوا تھا اس کی بنیادیں سیمنٹ کی اینٹوں کی تھیں جن کے اوپر چٹانوں نے دیواروں کی صورت اختیار کی ہوئی تھی جب وہ اپنے فوجیوں کو ہدایات دے رہا تھا اس وقت وہ خود اور اس کے فوجی بھی اپنے فوجی وردی ہی میں تھے ان کے ہاتھوں میں ہندو قیس تھیں۔

"تمہیں بہت ہی محتاط رہنا ہوگا۔" اس نے اپنے فوجیوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں پانی کی ایک خالی بوتل بھی جسے وہ آہستہ آہستہ اپنی پٹیلی پر مارتا جا رہا تھا۔

"اپنے سامان کو بچانا۔۔۔۔۔ وہ تمہارے سامان پر قبضہ کریں گے اور تمہیں نہتہ کر دیں گے۔۔۔۔۔ انہیں شکست دینا آسان ہے۔۔۔۔۔ اپنے چاروں طرف نظر رکھنا۔۔۔۔۔ چاہے تم کچھ بھی کر رہے ہو چوکے رہنا اپنے اطراف سے باخبر رہنا۔۔۔۔۔ زیادہ دسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے تمہیں نقصان ہوگا۔ باتیں کرنے کے لیے آواز اور الفاظ کا استعمال کرنے کے بجائے اشاروں کا استعمال کرنا تمہاری ذرا سی غلطی

اس مینٹنگ کے بعد گھنٹ نے نور افضل کے دیر سے پر مقامی لوگوں سے بھی مینٹنگ کی۔ وہاں سارے اہم افغان لیڈر موجود تھے۔

”طالبان سے اپنے گھروں کی حفاظت کرو اپنے بچوں کی حفاظت کرو۔۔۔۔۔ میں یہاں لڑتے نہیں آیا تمہاری مدد کرنے آیا ہوں اگر ہم پر حملہ کیا گیا تو ہم تیار ہیں ہم ان کے حملوں کا جواب مل کر دیں گے۔۔۔۔۔ ہم بھی لڑنے میں پہل نہیں کریں گے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس بہترین ماڈرن اسلحہ ہے۔۔۔۔۔ تربیت یافتہ لوگ ہیں۔۔۔۔۔ بہترین گاڑیاں ہیں جن میں ضرورت کے مطابق اسلحہ بھی ہے اور ان پر ریڈار بھی لگے ہوئے ہیں جو مل جل کر ہمیں دشمن کے ٹھکانوں کی نشاندہی کریں گے۔“ مینٹنگ بڑی مہارت سے افغانوں کو سمجھا رہا تھا۔

پھر دوسرے دن اس کے خدشہ کے مطابق ان کے فورس میں پر طالبان نے حملہ کر دیا تھا رات کا وقت تھا وہ سب اپنے کیچھوں میں آرام کر رہے تھے ایک فوجی دستہ کیپ کے باہر یہ رہ رہے رہا تھا اور کچھ فاصلے پر مقامی لوگ جن کی کمانڈ نور افضل کر رہا تھا موجود تھے اور ایسے ہی کسی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے فورس کیپ میں اسلحہ سے بھری ہوئی فوجی گاڑیاں موجود تھیں جیسے ہی حملہ ہوا تمام فوجی اپنی اپنی پوزیشنوں پر پہنچ گئے تھے اور حملے کا بھرپور جواب دے رہے تھے۔ گھنٹ بھی ایک۔۔۔۔۔ میں موجود تھا اور این بڑی مہارت سے فورس میں میں ہونے والے معرکے کی ویڈیو بنا رہی تھی۔

افغان طالبان نے بہت شدید حملہ کیا تھا گولیاں کسی لمحے رک نہیں رہی تھیں فورس کپاؤنڈ میں کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا جو فوجی گولیوں کا جواب دے رہے تھے وہ بھی کسی دیوار کسی گاڑی یا کسی ٹینک کی آڑ میں رہ کر جواب دے رہے تھے دن بھر فارتوں کا تبادلہ ہوتا رہا تھا وہ تھے وقفے سے گرینینڈ بھی پھینکے جا رہے تھے۔ رات کے قریب اس حملے میں کمی آئی تھی اب اس کی فوجی نور افضل کے مجاہدوں کے ساتھ مل کر باہر سے طالبان کے

حملوں کا جواب دے رہے تھے اور کپاؤنڈ کے اندر سے گھنٹ اپنے ساتھیوں کے ساتھ فارتنگ کر رہا تھا۔ رات کے آخری پہر میں گولیوں کا یہ تبادلہ بند ہو گیا تھا یا تو طالبان تھک گئے تھے یا ان کا اسلحہ ختم ہو گیا تھا۔ رات گئے گھنٹ نے نور افضل کے مجاہدوں اور اپنے فوجیوں کے ساتھ ایک ساتھ مینٹنگ کی تھی اور انہیں ضروری ہدایات دی تھیں اور چند گھنٹوں بعد طالبان کا حملہ دوبارہ شروع ہو گیا تھا اور دونوں طرف سے دھواں دھار لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

اس بار کے حملے میں کئی فوجی اور نور افضل کے کئی مجاہد زخمی ہوئے تھے جنہیں امریکی بمیں ہی میں ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا امریکی فوجیوں اور نور افضل کے فوجیوں کو طبی امداد دیتے اور ان کا علاج کرنے میں کسی تفریق کا اظہار نہیں کیا جا رہا تھا گھنٹ بذات خود اس کام کی نگرانی بھی کر رہا تھا اور این اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ماہر نرس کے فرائض بھی انجام دے رہی تھی۔

”تم بہت بہادر ہو۔“ ایک موقع پر نور افضل نے این سے کہا وہ ایک زخمی کو دوا پلا رہی تھی۔

”میں نے تم جیسی بہادر عورت نہیں دیکھی جو یوں اپنی آسان زندگی چھوڑ کر ایک مشکل ترین زندگی گزار رہی ہے۔“

”میں یہ سب اپنے وطن اور گھنٹ کے لیے کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ غریب انسانیت کی خدمت کرنا میرا مذہب ہے مجھے مظلوموں کی مدد کر کے سکون ملتا ہے۔“

این نے جواب دیا جس سے نور افضل بہت متاثر ہوا۔

پھر طالبان کے حملے کا تیسرا دن تھا جب یہ اطلاع ملی کہ طالبان نے اس شے میں ایک قریبی گاؤں پر حملہ کر دیا ہے کہ ان کی جان کا دشمن گھنٹ اپنی منظور نظر این کے ساتھ وہاں موجود ہے حالانکہ گھنٹ اپنے کیپ میں موجود تھا لیکن شاید طالبان کو غلط فہمی یا غلط اطلاع دی گئی تھی انہوں نے کئی ہفتے شہریوں کے گھروں میں تلاشی بھی لی تھی لیکن اس واقعے کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی

”اور..... یہاں؟..... یہاں کون ہوگا؟“ این نے پوچھا۔

”کوئی اور..... میرے جیسا سر پھرا..... یا پھر قوانین پر چلنے والا کوئی بہادر۔“ گھیسٹ نے ہنس کر کہا۔

”میں تمہیں سمجھاتی تھی کہ یہ کام خطرناک ہے..... میں اسی لیے شادی کے لیے رضامند نہیں تھی..... دیکھو تمہارا اور میرا کیرئیر تباہ ہو گیا۔“

”کوئی بات نہیں..... مجھے ملازمت جانے کا دکھ تو ہے لیکن تمہیں پانے کی خوشی اس سے کہیں زیادہ ہے۔“

گھیسٹ نے کہا ”این حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔“

انگلے ہی روز وہ دونوں امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے تھے اس کی رجمنٹ میں سب کو یہ خبر پہنچ چکی تھی اور ہر کسی کو ان سے ہمدردی تھی انہیں گھیسٹ کی بہادری اور ہوشیاری پر پورا بھروسہ تھا وہ اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن مجبور تھے کیونکہ گھیسٹ پر قانون توڑنے کا الزام لگ چکا تھا اور جو جج تھا جسے جھٹلا پائیں چا سکتا تھا۔

امریکی آرمی نے بڑے خفیہ انداز میں اس کیس کو دو سال تک ڈیل کیا اور اس بارے میں کوئی خبر عام لوگوں تک نہ پہنچنے دی لیکن پھر جون ۲۰۱۴ میں شام

سات بج کر ۲۱ منٹ پر ABC نیوز پر اس کا انٹرویو نشر ہوا اور لوگوں کو حیران کر گیا۔

”میں نے اپنی ایک ذاتی تخلیقی دنیا بسائی تھی جس میں این کے ساتھ رہتا تھا اس سے محبت کرتا تھا میں طالبان کے درمیان تھا اور میں نشہ آور گولیوں کا اور شراب کا بھی عادی ہو گیا تھا لیکن میں اس زندگی سے خوش تھا۔“ اس نے ABC نیوز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

”میں نے جب این سے شادی کی درخواست کی تو وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی لیکن آخر کار میں نے اس کا دل جیت لیا تھا۔“

”مجھ سے ریٹائر ہونے کے لیے کہا گیا۔ مجھ سے

کہ نور افضل اور گھیسٹ کچھ ساتھیوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے تھے اور چند گھنٹوں ان کا مقابلہ کرنے کے بعد انہیں مار جھگا یا تھا پھر فورس کیمپ پر بھی طالبان کے حملے کا زور ٹوٹ گیا تھا اور دو رات گھیسٹ اور اس کے ساتھیوں نے سکون سے گزاری تھی۔

انگلے صبح گھیسٹ این کے ساتھ تاشیہ کر رہا تھا کہ اسے امریکی ہیڈ کوارٹر سے ایک خط موصول ہوا جو ایٹھینٹ

جنرل جان مالبو لینڈ کی طرف سے تھا اور جان مالبو لینڈ اس وقت امریکی فوج میں اسپیشل آپریشن برانچ میں تھا اور ڈپٹی کمانڈر آف اسپیشل برانچ تھا اس خط نے گھیسٹ

کے ہوش اڑا دیے وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا کسی نے اس کی بھری کر دی تھی اور اسپیشل آپریشن برانچ کو پتہ چل گیا تھا کہ گھیسٹ اپنی مرضی سے افغانستان میں امریکی

قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے ساتھ ساتھ آپریشن کے دوران ایک امریکی رپورٹر عورت کے مشق میں مبتلا ہو گیا ہے اور نشے کا بھی عادی ہو گیا ہے اس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔

جان مالبو لینڈ نے اپنے خط میں گھیسٹ کو مخاطب کیا تھا اور اس نے لکھا تھا۔

”ایک آفیسر ہونے کے باوجود تم نے اپنی عزت خود خاک میں ملائی ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ اب تمہیں اعتبار کے قابل نہیں سمجھا جا رہا تمہیں فوراً واپس آنا ہے۔“ گھیسٹ کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ این حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے

جھٹک کر خط اٹھایا تھا وہ بھی اسے پڑھ کر حیران رہ گئی تھی اسے ڈرتا تھا کہ ان کا یہ راز ایک دن فاش ہو جائے گا لیکن اتنی جلد ہی یہ ہوگا اس کا اندازہ اسے نہیں تھا ابھی اسے گھیسٹ کے ساتھ یہاں محبت بھری زندگی گزارتے ہوئے صرف نو ماہ ہی ہوئے تھے۔

”اب کیا ہوگا؟“ اس نے آہستہ سے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”واپس جائیں گے۔“ گھیسٹ نے کہا۔

ہے اس کی بیوی اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس پر اسامہ بن لادن کی طرف سے بھی حملہ کیا گیا تھا لیکن وہ بڑی مہارت سے بچ نکلا تھا اس واقعے کا ذکر اس نے اپنی کتاب

spartan the American
promise the
mission and the Betrayal of
special forces Major jim cant.
میں کیا ہے

اپنے شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے گھٹ سوچتا ہے کہ ایک..... فورس کمانڈر کا انجام کیا یہی تھا کہ اسے یو ایس آر می سے اسٹیفنی دیپنے پر مجبور کیا جائے صرف اس لیے کہ اس نے ایک جنگی رپورٹر سے محبت کی تھی اور شادی کی تھی اور اس نے اپنی جاب صرف اس لیے چھوڑ دی تھی کہ اس نے کیٹ کے ساتھ ایک سال تک خاموش زندگی گزاری تھی وہ بھی دنیا کی خطرناک ترین جگہ افغان پوسٹ پر..... لیکن وہ دونوں اپنی موجودہ زندگی سے بھی خوش ہیں اور محبت میں کامیابی ان کی ہے۔

اکثر شام کو وہ دونوں جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ماضی کی یادوں میں مہو جاتے ہیں اور افغانستان میں گزارے ہوئے محبت بھرے لمحات کو یاد کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں محبت میں نہیں جو فتح حاصل ہوئی ہے وہ ملازمت جانے کی خوشی سے بہت زیادہ ہے۔



میرے اعزازات بھی لے لئے گئے لیکن میں نے اس کے ساتھ رہ کر جو کامیابی حاصل کی یہ اس سے بہت کم ہے میرے لیے اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات بہت قیمتی ہیں۔“ گھٹ بہت افسردہ نظر آ رہا تھا ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

”ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم جو کر رہے ہیں وہ بہت خطرناک ہے لیکن اگر مجھے موقع ملے تو میں یہ سب دوبارہ کرنے کو تیار ہوں مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ اس نے مزید کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ میں اپنے عہدے سے بالاتر ہو کر غلط کام کر رہا تھا لیکن اصول توڑنے پر بھی کامیابی مل سکتی ہے..... میں نے بار کئی مہمان نہیں چھوڑا۔“ میں نے بھی ایک آدمی کا نقصان بھی نہیں اٹھایا اور اپنی جدوجہد کی لڑائی کے بدلے مجھے تیس رہنمائی کے ایوارڈ ملے۔ ہم نے ہر روز ان سے لڑائی کی اور اپنے تمام آدمیوں کو زندہ سلامت واپس لے کر آیا۔ میں جانتا ہوں کہ اصولوں کو توڑ کر بھی بعض اوقات کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ میں نے لارنس آف عربیہ سے م کردار ادا نہیں کیا اور لوگ مجھے لارنس آف افغانستان یونٹی نہیں کہتے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھٹک رہے تھے۔

اب گھٹ اور اس نے اپنے وطن Seathle میں پر سکون زندگی گزار رہے ہیں لیکن گھٹ کو اپنا عہدہ جانے کا بہت دکھ ہے۔

وہ اب بھی اپنی تیس سالہ زندگی میں ملنے والے دشمنوں کو یاد کرتا ہے اور اس خطرناک برین انجری کو یاد کرتا ہے جو اسے افغانستان میں سڑک کے کنارے پھینچنے والے ایک بم دھماکے میں ہوئی۔

کیٹ چھ گھنٹہ ریلے سے بھورے بالوں اور داڑھی کے ساتھ باؤنڈیز پہنے شہر کے کافی اور میوزک کے ماحول میں کھو گیا ہے اور موجودہ ذمہ داریاں پوری کر رہا

سیاست کی مکوہ

الشبه مخدوم

پاکستان کے زیادہ تر تعلیمی ادارے سیاست کا گزہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ملک کے سیاسی حالات کا ان پر براہ راست اثر پڑ رہا ہے، یہاں زہر تعلیم پر طالب علم کو کسی نہ کسی سیاسی گروہ کا ساتھ لازمی دنیا ہوتا ورنہ اس پر مذکورہ ادارے کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ سیاسی کرائم سمیر کے لیے بطور خاص ایک کالج کی طالبہ کا احوال 'جو اپنی شہرارتوں' نہایت اور صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی، وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

میرے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ میرے خاندان میں وکیل کچھ زیادہ ہی ہیں اور سدرہ کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کے وکیل بنے۔ اس کی یہ خواہش کیوں تھی؟ یہ اس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہہ دیا کرتی تھی کہ مجھے وکیل بننا اچھا لگتا ہے۔

کالج دور کے بعد بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس سے وکیل بننے کا خواب ابھورا تھا یا پورا ہو گیا تھا؟ مجھے اس بارے میں بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں بی ایس ای کر گئی تو دو بی ایس کرنے کے بعد ایک دم سے کم ہو گئی۔ بس ایک دن اس کا مجھے فون ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ تقریباً تین برس بعد اس کی آواز سنی تھی۔ اس نے مجھ سے ملنا چاہا تھا اور میں نے بخوشی اسے اپنے گھر بلایا تھا لیکن بجائے ملاقات کے اس کے بارے میں یہ خبر ملی کہ اس کے گھر کو آگ لگ گئی تھی، جس میں وہ بری طرح جھس گئی تھی۔ مقامی اسپتال والوں نے سہولیات نہ ہونے کے باعث ضامی اسپتال میں لے جانے کا مشورہ دیا تو اسے وہاں لے گئے۔

دو پہر کے وقت مجھے پتہ چلا۔ یہ خبر سننے کے دو گھنٹے تک میں اسے دکھ کے حصار سے نہ نکل سکی۔ مجھے دکھ کے ساتھ یہ محسوس بھی تھا کہ آخر وہ مجھ سے ملنا

وہ حادثہ تھا! اپنا حق مانگنے کی سزا جو بھی تھا میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ سدرہ کے بارے میں جیسے ہی یہ سنا کہ وہ ضلعی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے تو مجھے بہت دکھ ہوا وہ میری کلاس فیلو تھی اور کالج میں اپنی شہرارتوں، ذہانت اور صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ہمارے کالج میں بنیادی طور پر دو گروپ تھے۔ ایک گروپ شہر کی لڑکیوں کا اور دوسرا دیہاتی لڑکیوں کا تھا۔ میں شہر میں رہتی تھی اور وہ دیہات سے تعلق رکھتی تھی۔ لمبے قد کی گوری چٹنی اور بھرپور جسم کی مالک تھی۔ گہرے سیاہ گھنے بال، مولی آنکھیں، بھرے بھرے گال تیز تیز باتیں کرنے والی۔ اسے لباس کے بارے میں اتنا سلیقہ نہیں تھا۔ یونیفارم تو تھا ہی لیکن کبھی کبھار جب کوئی فٹکشن ہوتا تو اس میں وہ نری دیہاتی ہی لگتی تھی۔ وہ گہرے اور اوٹ پٹاٹنگ قسم کے رنگ، گونا گونا کناری اور پرانے فیشن کی کینٹنگ والے لباس ہی پہنتی تھی۔ یہ سب ہونے کے باوجود وہ اپنی باتوں اپنے بولند پن اور بہادری کی وجہ سے ہر کسی کے دل میں گھر کر جاتی تھی۔ دیہاتی لڑکیوں کے گروپ میں ہونے کی وجہ سے وہ اتنا زیادہ شہری لڑکیوں میں گھلتی مٹی نہیں تھی۔

”لیکن میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم اگر اس کے بارے میں سن لو گی تو مجھے امید ہے کہ یہ سب سن کر تم وہاں نہ جانے کا فیصلہ کر لو گی۔“ اس نے کہا تو میں بولی۔

”ٹھیک ہے بتاؤ۔“

”چلو میں بتا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں خاموش رہی۔ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگا۔



سدرہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ لیکن ایسا بھی غریب نہیں کہ وہ دو وقت کی روٹی کو ترس جائیں۔ ان کی زمین بھی جو کسی وقت اس کے دادا نے بنائی تھی۔ اس علاقے میں جن لوگوں کو زمین ملائی ہوئی تھی وہ نو آباد کار تھے۔ حکومت نے اس علاقے میں نہر نکال کر گاؤں آباد کئے تھے۔ انہوں نے بھی یہ زمین اس لیے بنائی تھی کہ پانی کا وسیلہ ہے نہر کے ساتھ زمین ہے ہوتے ہوتے آباد ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہر کے منبع اور ان کی زمین کے درمیان کئی بڑے بڑے جائیداد رکھے۔ وہ سارا پانی روک لیتے۔ وہ لوگ ٹیلوں پر تھے۔ باوجود زمین دار ہونے کے ان کی زمین پانی نہ ہونے کے باعث فصل نہ دے سکتی تھی۔ یوں وہ کسٹم پر وقت گزار رہے تھے۔ سدرہ بچپن ہی سے اس جگہ دہلی کو دیکھتی چلی آرہی تھی۔ سارے علاقے کی طرح وہ بھی مجھتی تھی کہ اگر ان کی زمینوں کے لیے پانی دستیاب ہو جائے جو ان کا حق ہے تو وہ لوگ بھی خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں اور ان کی تمام تر جگہ دہلی کے ذمہ دار وہی دو جائیداد ہیں جو اپنے اثر و رسوخ اور طاقت کے باعث ان کا پانی روک لیتے ہیں۔

ان کی شنوائی کہیں نہیں تھی۔ اگر کوئی مجھے کو درخواست دیتا تو اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی

کیوں چاہتی تھی؟ تبھی میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس سے ملنے ضرور جاؤں گی۔ گھر سے ضلعی اسپتال تک کا راستہ سوا گھنٹے کا تھا۔ میں نے اپنے کزن سے کہا کہ وہ مجھے ضلعی اسپتال لے جائے۔

”یہ تمہیں اچانک کیا کام پڑ گیا وہاں اور وہ بھی اس وقت؟“

”مجھے ضلعی اسپتال جانا ہے اپنی ایک دوست کی عیادت کرنی ہے اور واپس آ جانا ہے۔“ میں نے بتایا ”صبح چلیں گے۔ ابھی گئے تو واپس آتے رات ہو جائے گی۔“ اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا ”دیکھو گاڑی مجھے بھی چلانا آتی ہے میں خود چلی جاؤں گی۔“ میں نے رعب دکھایا۔

”کیا اتنا ہی ضروری ہے وہاں جانا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تبھی تو اس وقت جانے کا کہہ رہی ہوں۔“ میں نے اسے احساس دلایا۔

”مجھے اس وقت بھی تمہیں لے جانے پر اعتراض نہیں ہے لیکن پلیز مجھے بتاؤ تو۔ کوئی اتنی اہم ہی شے کی ہے تمہاری کون ہے وہ؟“

تب میں نے سدرہ کے بارے میں بتا کر کہا ”پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی؟“

”میرے خیال میں اگر تم وہاں نہ ہی جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔ میں اس کے بارے میں جانتا ہوں بلکہ پوری بات سے آگاہ ہوں۔ اگر چاہو تو مجھ سے ساری بات سن لو۔“ میرے کزن نے صوفے پر پھیل کر اطمینان سے کہا۔

”تم چلو تو سہی اور جو تمہیں معلوم ہے وہ راستے میں بتا دینا اس طرح راستہ بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔“ میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

اس کی شادی کر دی جائے۔ سدرہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے کچھ وقت کے لیے مہلت مانگی۔ جو اسے نہیں دی گئی۔ معاملہ کافی بڑھا۔ بات یہاں پر آ کر ختم ہو گئی کہ فی الحال اس کا نکاح کر دیا جائے۔ جب یہ وکالت پاس کر لے گی اور اس کا تایا زاد دوبارہ واپس آ جائے گا تو رخصتی ہو جائے گی۔ یہ تازہ طے ہوا لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے مسئلے نے سر اٹھا لیا۔ دونوں بھائیوں کی اولادیں یہ چاہتی تھیں کہ زمین بانٹ لی جائے۔ جس کے حصے میں جو آتی ہے اسے مل جائے۔ تایا زاد کا خیال تھا کہ زمین بیچ کر وہ شہر میں کوئی کاروبار کر س گے۔ یہاں کھیتی باڑی میں کہاں اتنی آمدن ہے۔ یہ معاملہ بھی تب تک کے لیے ٹالا جانے لگا۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور ان کی زمین تقسیم ہو گئی۔ سدرہ کا چونکہ ایک ہی بھائی تھا ساری زمین اسے مل گئی۔ باقی کو بہت تھوڑی تھوڑی آتی۔ جو بھی ہوا وہ وقت گزر گیا۔

سدرہ نے دوسرے شہر کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور پڑھنے لگی۔ انہی دنوں اسے پتہ چلا کہ ان کے ساتھ والے گاؤں کا ایک لڑکا دیم الحق بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اس کا شعبہ الگ تھا۔ اکثر اوقات ان کا آنا سامنا ہو جاتا۔ پھر ان میں بات چیت بھی شروع ہو گئی۔ یہ بات چیت اس وقت گہری دوستی میں بدل گئی جب دونوں کو پتہ چلا کہ بنیادی طور پر وہ دونوں ہی اپنے علاقے کے سیاست دانوں کے خلاف ہیں۔ اور ان سے نجات کے نئے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ ان کی باتیں اسی موضوع کے گرد گھومنے لگیں۔

سدرہ ذہین تھی اس نے ان دونوں جاگیرداروں کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی۔ وہ اخباروں اور رسالوں میں لکھنے لگی۔ جب بھی وہ یونیورسٹی سے

طرح زخم کھا کر خاموش ہو جاتا اور اگر کوئی سر پھر قسم کا افسر آ جاتا تو اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ یا تو اس کا تبادلہ کر دیا جاتا یا پھر اس قدر ڈرایا دھمکایا جاتا کہ وہ خود ہی تبادلہ کروا کے چلا جاتا۔ سوچ کر بھی تو چھوٹے عملے کی وہ ہر طرح سے کھاتے پیتے تھے۔ اس علاقے کے پیٹرنی دونوں ہاتھوں سے ٹوٹ کمار رہے تھے۔ وہ دو جاگیردار اگر صرف جاگیردار ہی ہوتے تو کہیں یہ نہیں سے شاید کوئی معاملہ حل ہو جانے کی امید ہوتی لیکن دراصل دونوں سیاست دان بھی تھے۔ اعجاز خان ہمیشہ ایم این اے کی سیٹ جیت جاتا اور اللہ یار ایم پی اے بن جاتا دونوں ایک ساتھ ہو کر پورے علاقے پر حکومت کر رہے تھے۔ انہیں روکنے کو کئے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنے جرائم پر سیاست کا پردہ ڈالے ہوئے تھے۔

یہ وہ حالات تھے جس نے سدرہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس علاقے میں اگر سیاسی تبدیلی ہوگی تو ہی ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ ورنہ وہ تو یہ عذاب بھگت رہے ہیں ان کی آئندہ نسل بھی بھگتے گی۔ وہ دن رات یہی سوچتی رہتی۔ اس کے تعلیم حاصل کرنے کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ بڑے خواب دیکھا کرتی تھی کہ وہ ویل بنے گی وکالت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو ان دونوں سیاست دانوں کے بارے میں شعور دے گی کہ وہ لوگ کس طرح ان کا استحصال کر رہے ہیں اور ان کے اس ظلم سے کسے بچا جاسکتا ہے۔

اس نے کالج کی تعلیم ختم کی تھی اور آگے پڑھنے کا سوچ رہی تھی۔ وہ پیپر دے کر فارغ تھی اور رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی کہ انہی دنوں اس کی شادی کی بات ہونے لگی۔ اس کا تایا زاد وہی میں کام کرتا تھا۔ دو آ یا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ آیا ہوا ہے تو

ہے۔ اور خلق خدا کی خدمت عبادت ہے۔
یوں وقت گزر رہا گیا اور ضلعی حکومتوں کے لیے
ایکشن کا شور شروع ہو گیا۔ جس طرح ہمارے ہاں
ہوتا ہے کہ جیسے ہی ایکشن کا موسم آ جائے انہی دنوں
نہ صرف نئے نئے لیڈر پیدا ہونے شروع ہو جاتے
ہیں بلکہ عوامی خدمت کا نقاب اوڑھ کر بہترے
بہروپے بھی ایکشن میں کود پڑتے ہیں۔ مقابلہ کی
فضا بن جاتی ہے۔ ان میں کئی لوگوں کی روٹی روزی
نکل رہی ہے۔

ضلعی نظام کے اس ایکشن میں ہر یونین کونسل کی
سطح پر ناظم اور نائب ناظم کے چناؤ کے ساتھ آٹھ
دوسرے ممبران بھی چنے جاتے تھے۔ پھر تمام یونین
کونسلوں کے ممبران مل کر تحصیل کا ناظم اور نائب ناظم
کا چناؤ کرنا تھا۔ مقابلے کی اس فضا میں انہی
جاگیرداروں کی طرف سے ایک امیدوار کرم داد تحصیل
ناظم کے لیے سامنے آ گیا اور اس نے اپنا گروپ
تشکیل دے کر ایکشن کی تیار ہاں شروع کر دیں۔ تو
دوسری طرف عبدالرحیم کا گروپ سامنے آ گیا
اور ایکشن مہم شروع ہو گئی۔

عبدالرحیم گروپ کو لیڈی کونسلر نہیں مل رہی تھی۔
وسیم اس گروپ کا حصہ تھا۔ اس نے گروپ کی توجہ
سدرہ کی طرف دلائی کہ لیڈی کونسلر کے لیے اس سے
بہتر امیدوار کوئی نہیں ہے۔ وہ سارے کامسارا گروپ
ان کے گھر آ گیا اور سدرہ کے باپ کو مجبور کر دیا کہ
لیڈی کونسلر کے لیے سدرہ کو امیدوار بنادیں۔ اس
میں سدرہ کی بھی خواہش تھی۔ سو ایکشن مہم میں وہ بھی
شامل ہو گئی۔ اس کی حامی عورتوں نے اس کا بھرپور
ساتھ دیا۔ این جی او والوں نے بھی اپنا اثر و رسوخ
استعمال کیا۔ دن بدن اس کی کامیابی کے امکانات
روشن ہوتے چلے گئے۔

واپس آتی اپنے ارد گرد کی عورتوں اور خاص طور پر
نوجوان لڑکیوں کو سمجھاتی کہ ان کے سب سے
بڑے دشمن وہی دونوں سیاست دان ہیں۔ جوان
کے وسائل پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ تقریباً ایک
برس کے اندر اندر اس نے اپنے بہت سارے ہم
خیال پیدا کر لیے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی جس شہر میں وہ پڑھتی
تھی۔ وہاں کی ایک این جی او تھی۔ وہ لوگ میڈیکل
کیمپ لگواتے تھے۔ وسیم اور سدرہ این جی او والوں
سے ملے۔ وہ راضی ہو گئے اور ہر مہینے ایک میڈیکل
کیمپ لگانے لگے۔ علاقہ وہی تھا لیکن ہر بار گاؤں
بدل جاتا۔ اس علاقے کے ہر گھر میں سدرہ اور وسیم کا
نام پہنچ گیا۔ جو نہیں جانتے تھے وہ بھی پہچاننے لگے۔
دونوں ہی علاقے کا چھوٹا موٹا کام کرنے لگے تھے۔
سدرہ نے گاؤں کی لڑکیوں کے لیے ایک سلائی اسکول
بھی کھول دیا جہاں لڑکیاں سینے پرونے کا ہنر سیکھنے
لگیں۔

جو عاتقوں پر حکومت کرتے ہیں وہ بے خبر نہیں
ہوتے۔ علاقے میں چلنے والی مخالف ہواؤں پر وہ
میشہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزارا تھا
کہ انہیں سدرہ کی سرگرمیاں کھٹکنے لگیں۔ وہ اس کی ٹوہ
میں رہنے لگے کہ وہ کیا کرتی ہے؟ وہ سدرہ اور وسیم کی
سرگرمیوں ہارے میں پوری طرح آگاہ تھے۔ انہیں یہ
پوری طرح احساس ہو گیا کہ دونوں ہی ان کے خلاف
بے حد نفرت رکھتے ہیں۔ ان کی نفرت کیوں تھی یہ بھی
انہیں معلوم ہو گیا تھا۔

کوئی بھی حکمران اپنی مخالفت برداشت نہیں کر
سکتا۔ اسے وہ خوشامدی تو پسند ہوتے ہیں جو اس کی
رگوں میں نہ بھاز ہر اتار تے رہتے ہیں۔ جو انہیں سمجھ
ہی نہیں آنے دیتے سیاست کا دوسرا نام عوامی خدمت

دل ایک سپر ہائی وے

نماز کے دوران دل میں غیر اختیاری وسوسے آنے کی وجہ سے مایوس یا پریشانی کا شکار ہونے کی بالکل ضرورت نہیں، دراصل انسان کا قلب تو ایک سپر ہائی وے کی مانند ہے اس پر شاہی سواریاں بھی گزرتی ہیں۔ امیر کبیر بھی چلتے ہیں، غریب اور فقیر بھی گزرتے ہیں۔ خوب صورتیوں اور بد شکلوں کی بھی یہی گزرگاہ ہے، نیلو کاروں، پارساؤں، مجرموں اور گناہ گاروں کے لیے بھی یہ شارخ عام ہے۔

عافیت اس میں سے کہ اس شاہراہ پر جیسی بھی ٹریفک آئے اسے خاموشی سے گزرنے دیا جائے اگر اس ٹریفک کی طرف متوجہ ہو کر اسے بند کرنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی گئی تو دل کی سڑک پر پھیر جام ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ اس راستے کا ٹریفک سگنل صرف سبز بتی پر مشتمل ہوتا ہے اس میں سرخ بتی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

شیخ سکندر قریشی..... لاڈکانہ

”کیوں نہیں۔“ یہ کہہ کر اس خاتون نے تفصیل بتانی شروع کر دی۔ وہ سارے کے سارے فونو اس کے یونیورسٹی اور ایک ریستوران کے تھے۔ جہاں وہ وسیم کے ساتھ گئی تھی۔ خاتون نے تو اسے اطلاع دے کر فون بند کر دیا مگر اسے سوچ میں ڈال دیا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس نے کیا؟

اسی دن وہ وسیم سے ملی۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔

”تمہیں آج پتا چلا ہے۔ مجھے تو ایک ہفتہ سے

ایکشن ہوا اور اس کا جو نتیجہ سامنے آیا اس میں عبدالرحیم ٹروپ تو ہار گیا لیکن ان کے دو امیدوار سدرہ اور وسیم کا والد چوہدری نیاز کامیاب ہو گئے۔ اب اس سے اگلا مرحلہ تحصیل ناظم کے چننے کا تھا۔ ان کی یونین کونسل کا ناظم چوہدری منظور تھا۔ اس نے کرم داو کے ووٹوں کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ کرم داو گروپ کے لوگ بھی ان کے پاس آنے لگے۔ انہوں نے منت سماجت سے لے کر پیسوں کی آفر تک کی لیکن چوہدری نیاز نہیں مانا۔ تب انہیں دھمکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ لالچ سے لیکر ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ چناؤ تک رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب تحصیل ناظم کا چناؤ ہونا تھا۔ انہوں نے مخالفت میں ووٹ دیا لیکن کرم داو تحصیل ناظم بن گیا۔ جس کا چوہدری منظور کو بے حد رنج تھا۔

ایکشن کا ہنگامہ ختم ہوا تو سدرہ پھر سے یونیورسٹی آ گئی۔ کچھ دن بعد وسیم بھی آ گیا۔ چونکہ ایکشن کے دنوں میں وہ بہت قریب رہے تھے اس لیے ان دونوں میں قربت ہو جانا فطری سی بات تھی۔ دن گذرتے گئے یہاں تک کہ ایک دن اسے اپنے ہی گاؤں سے ایک خاتون کا فون ملا۔ چند باتوں کے بعد اس خاتون نے پوچھا۔

”سدرہ! کیا تم وہاں یونیورسٹی میں وسیم سے عشق کا چکر چلا رہی ہو؟“

”یہ کیا کہہ رہی ہو اور ایسی بات تم سے کس نے کہی؟“ سدرہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”ارے یہاں تو ہر گھر میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے تمہارے اور اس کے فونو بھی ہیں وسیم کے ساتھ۔“ جیسے ہی اس نے کہا اسے لگا کوئی سازش اپنا کام دکھا گئی ہے۔ اس لیے سدرہ نے بڑے جھک سے پوچھا۔

”کیسے فونو ہیں ان کے بارے میں پتا کتنی ہو؟“

گاؤں کا ہے۔ وہ گرم دوا کے ٹروپ کا ہی ہے۔ ایکشن کے دنوں میں وہ بڑا سرگرم تھا۔ اسی نے سیل فون سے تصویریں بنوائی ہیں۔ اس نے کئی لوگوں کے سامنے اعتراف بھی کیا ہے۔ میں آج گاؤں جا رہا ہوں۔ اگر چاہو تو تم بھی آ جاؤ۔ اس پر سردہ نے اگلے دن آنے کا کہہ دیا۔

سردہ گاؤں آئی تو سب سے پہلے اسے اپنے والدین کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس سے متفر ہو چکے تھے۔ ان کا کوئی اور بس نہیں چلا تو یہی کہہ دیا کہ اب پڑھنا لکھنا بند یہ بھری بھی ختم۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ اس کے تایا کے بیٹے نے بھی بہت جلد آنے کی بامی بھری لیکن سردہ کا یہ سوال تھا کہ جب ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر اسے یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے؟ مگر کسی نے بھی اس کی نہیں سنی۔ اسے یونیورسٹی جانے سے منع کر دیا گیا۔ وہ خاموش ہو گئی تا کہ اس وقت تو ان لوگوں کو غصہ ہے لیکن کچھ دن بعد جب انہیں یقین آ جائے گا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کے خلاف سازش کی گئی ہے تو وہ دوبارہ سے یونیورسٹی چلی جائے گی۔ اسے انتظار کرنا تھا۔

ایک ہفتہ ہی گزرا تھا۔ وسیم نے اس لڑکے کو پکڑ لیا اور اس نے ساری بات اٹل دی۔ وہ اس لڑکے کا کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے جوتے مارنے کے۔ وہ اس نے مار دیئے۔ اسے خوب ذلیل کیا۔ وہ لڑکا چوہدری منظور کے پاس چاہہا۔ انہوں نے وسیم کے خلاف تھانے میں اقدام کل کا پرچہ کروا دیا۔ بات حد سے بڑھ گئی۔ ایک طرف اقتدار کی قوت تھی تو دوسری طرف سچائی۔ چوہدری منظور اور اس کے حواری تو یہ موقع تلاش کر رہے تھے کہ ایسا کچھ ہوا اور یونین کونسل میں یہ دو لوگ مخالفت کرنے والے ہیں یہ بھی ختم ہو جائیں۔ اور پھر وہ اپنی من مانی کریں۔ دوسرا وہ سیاسی

معلوم ہے۔“
”تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ سردہ نے سختی سے پوچھا۔

”تم خواہ مخواہ پریشان ہوئی۔“ اس نے تحمل سے جواب دیا تو اس نے غصے میں پوچھا۔
”کیا میں اب پریشان نہیں ہوں؟“

”ظاہر ہے بات پریشانی والی ہے۔ پریشان تو ہونا بنتا ہے۔ لیکن میں انتظار کر رہا تھا کہ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟“ وسیم نے پھر تحمل سے کہا۔

”آپ کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟“ سردہ نے پوچھا تو وسیم بولا۔

”ایک دو دن میں معلوم ہو جائے گا۔ میں نے یہاں بھی اور گاؤں میں بھی بندے لگائے ہوئے ہیں۔ فکر نہ کرو میں۔۔۔۔۔“

”مگر میں اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گی؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”دیکھو۔ اگر ہم میں کوئی غلط ہے تو پھر تمہیں ڈرنا چاہئے جب ہمارے درمیان ایسی کوئی بات ہی نہیں تو پھر ہمیں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ تم اپنے گھر والوں کو بتاؤ کہ یہ غلط بات ہے اور کوئی ہمارے خلاف ایسا کر رہا ہے۔“ وسیم نے اسے سمجھایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہیں یہ سیاسی مخالفین کا تو کام نہیں ہے؟“ سردہ نے پوچھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ خیر مجھے ایک دو دن دوسب کچھ سامنے آ جائے گا۔“ وسیم نے اسے حوصلہ دیا تو وہ کچھ دیر ساتھ رہنے کے بعد جدا ہو گئے۔

دو دن بعد اسے وسیم نے فون کر کے بتایا کہ اس بندے کا پتہ چل گیا ہے۔ اس نے یہ سب کچھ چوہدری منظور کے ایماء پر کیا۔ وہ لڑکا ہمارے ہی

کام زیادہ کرنے لگی تاکہ اسے مزید ترقی دے سکے۔
دو ہفتے نہیں گزرے تھے کہ ایک خاتون نے انہی
کریچن میں درخواست دے دی کہ سدرہ نامی لیڈی
کونسلر نے اس سے بھاری رشوت لی ہے تاکہ سرکاری
ملازمت دلا سکے۔ اب تو وہ پیسے واپس کر رہی ہے
اور نہ ملازمت دلوا رہی ہے۔

اس درخواست کے بارے میں اسے پتہ ہی اس
وقت لگا جب پولیس اسے پکڑنے کے لیے ان کے
گاؤں آگئی۔ گاؤں میں کسی کے گھر پولیس یوں چھاپہ
مار دے تو ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔
وہ لوگ صبر تھے کہ وہ سدرہ کو لے کر ہی جائیں گے۔
لیکن سدرہ بمسایوں کے گھر میں جا چھپی۔ یہاں
بھی وسیم کا والد چوہدری نیازان کے کام آیا۔ اس نے
لے دے کے ان پولیس والوں کو واپس بھیج دیا۔ ان
سے دو دن کی مہلت مانگی گئی۔

سدرہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب
کیوں ہو رہا ہے؟ اس دوران جہاں سدرہ کے گھر
والوں نے چوہدری نیازان کے ساتھ مل کر ضمانت
کروائی وہاں وسیم بھی اس کے کام آیا۔ اس نے
درخواست دینے والی عورت سے رابطہ کیا اور
درخواست واپس لینے کی بات کی۔ وہ عورت بہت
خرانت تھی۔ اس نے کرم داو گروپ سے پیسے لیے
ہوئے تھے۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہمیں
استعفیٰ دے دو تو ہم درخواست واپس لے لیتے
ہیں۔ اس پر سدرہ مان جاتی لیکن اس کے تایا زادے
دوہی سے فون کر کے اس کے رشتے ہی سے انکار کر
دیا کہ میں ایسی لڑکی کے ساتھ شادی ہی نہیں کرنا
چاہتا جسے پکڑنے پولیس گھر آگئی ہو۔ اس کے تایا
زادہ فون کیا آتا تھا۔ گاؤں کے علاوہ پورے علاقے
میں انوہ ساز فیکٹریوں نے سجانے کیا کیا انوہیں

انتقام بھی تو لینا چاہتے تھے۔ وہ پورے علاقے پر اپنی
دھاک بٹھا دینا چاہتے تھے۔ لوگوں کو یہ بتا دینا
چاہتے تھے کہ وہ ہی ہیں جو پورے علاقے میں من
مانی کر سکتے ہیں۔ ان کے مخالفین ان کا سامنا نہیں کر
سکتے۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ آگے اسمبلیوں کے الیکشن
ہیں۔ ابھی سے علاقے کو اپنی گرفت میں لے لیں۔
وہ انہی دونوں کو چیل دینا چاہتے تھے۔

وسیم کو پکڑ کر حوالات میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ تو ان
کی قسمت اچھی تھی یا ان کا تھوڑا بہت اثر رسوخ
تھا جس کے بل بوتے پر اس کی ضمانت ہو گئی۔ اس
سارے تازے میں لوگوں کو بہر حال پتہ چل گیا کہ
سدرہ کے خلاف سازش کی گئی تھی۔ لیکن انوہیں اس
قدر تھیں کہ گرد میں معاملہ صاف نہیں ہوا۔ اس کے
گھر والوں کا من بھی کافی حد تک صاف تو ہو گیا۔
لیکن یونیورسٹی جانے کی اجازت پھر بھی نہیں دی گئی۔
چوہدری منظور اور کرم داو گروپ کے لوگ سدرہ
کے باپ کے پاس آئے اور بڑے آرام سے سدرہ کا
استعفیٰ مانگ لیا۔ انہوں نے وسیم کی مثال دے کر کہا
کہ ایسا اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا
باپ تو پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے کرم داو گروپ کے
بندوں سے استعفیٰ دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب اس کے
باپ نے بات کی تو اس نے یہی شرط رکھ دی کہ وہ وسیم
کے خلاف پرچہ واپس لے لیں تو وہ استعفیٰ دے
دے گی۔ اس کی یہ شرط کرم داو گروپ کو ناگوار گذری۔
مگر وہ وقتی طور پر خاموش ہو گئے۔

سدرہ کے تایا زادہ کو دوہی سے آنے میں کچھ
رکاوٹیں درپیش ہوئیں تو اس نے دو ماہ بعد آنے کا کہہ
دیا۔ اب انہیں انتظار کرنا تھا۔ سدرہ نے پھر اپنے گھر
والوں سے یونیورسٹی جانے کی اجازت چاہی جو اسے
نہیں ملی۔ وہ خاموش ہو گئی لیکن اپنے سلائی اسکول کا

سارے کچھ چھٹے پرپس کو دے دوں گی اور خود ہر اس
تھکے کو درخواست دوں گی جس۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا تو
چوہدری منظور نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔
”کہنا نا جو مرضی کرو جس طرح ہم تمہیں عشق
کرنے سے نہیں روک سکے۔“

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سدرہ کسی جولوے کی مانند
اٹھی اور اس نے چار قدم پر پیٹھے ہوئے چوہدری منظور
کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ
وہ ایسا کرے گی۔ کوئی بندہ بھی اسے پکڑنے کے لیے
آگے نہیں بڑھا۔ دوسری لیڈی کونسلر ادھیڑ عمر عورت
تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ابھی سدرہ نے دھاڑتے
ہوئے کہا۔

”اب میرا ہاتھ کھل گیا ہے چوہدری منظور۔ کل
شام تک درخواست واپس لے لو۔ ورنہ میں جو
تمہارے ساتھ کروں گی وہ زمانہ کیچھے گا“ میں باہر کھڑی
تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اب تو نے جو کرنا ہے کر۔“

سدرہ یہ کہہ کر وہاں سے نکل پڑی۔ باہر وسیم کھڑا
تھا۔ جس وقت تک سدرہ باہر آئی اسی طرح اندر کی
بازگشت بھی باہر آگئی۔ ایک دم سے پاپٹل بچ گئی۔
سدرہ یونین کونسل کے لان میں کھڑی تھی۔ کوئی بندہ
باہر نہیں آیا۔ ابھی چوہدری نیاز ہی نے آکر اسے سمجھایا
بجھایا اور اسے ساتھ لے کر گاؤں چلا گیا۔ اپنے گھر
آکر اس نے سمجھایا

”دیکھو جی! میں مانتا ہوں کہ انہوں نے بہت
برا کیا تھا اس پر تمہارا رد عمل کوئی نئی پانٹو کی بات
نہیں۔ لیکن یہاں کی سیاست جرم کی خوراک پر
پرورش پاتی ہے۔ تمہارا یہ رد عمل جرم کی ابتدا بن
جائے گا۔ ایک جنگ۔“

”جنگ شروع ہوتی ہے تو ہو جائے۔ انہوں نے
ذلیل کرنے کی اخیر کر دی ہے۔ کیا لڑکی ہونا جرم

گھڑیں اور پھیلا دیں۔ تبھی سدرہ دلیر ہو گئی۔ ان
نے اپنے من میں سٹے کر لیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔
کچھ ہی دنوں بعد یونین کونسل کا اجلاس رکھ لیا
گیا۔ اس نے وسیم کو ملنے کے لیے کہا اور اسے بتا دیا
کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ جو بھی ہوگا وہ
اس کے لیے تیار ہے۔ اس نے بھی اس کی باتوں میں
ہاں ملا دی۔ اجلاس والے دن وہ بڑے اہتمام سے
وہاں چلی گئی۔ وسیم بھی اپنے باپ کے ساتھ یونین
کونسل کے دفتر چلا گیا۔

اجلاس جاری تھا۔ تمام ممبران کے ساتھ کچھ
دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ ابھی سدرہ نے چوہدری
منظور سے کہا

”جناب ناظم صاحب! مجھ پر جو بھونٹی اور ناجائز
درخواست دی گئی ہے اس بارے آپ جانتے ہیں؟“
”ہاں مجھے پتہ چلا ہے۔ اب تم نے رقم کھالی ہو
گی تو وہ غریب درخواست دینے پر مجبور ہوگی۔ ناظم
نے بڑے تفاخر اور طعنے انداز میں یوں کہا جیسے اس
بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ ابھی سدرہ نے انتہائی
غصے میں کہا

”نہیں چوہدری منظور! یہ درخواست صرف اور
صرف تمہاری بے غیرتی کی وجہ سے دی گئی ہے۔ اگر
کل شام تک وہ درخواست واپس نہ لی گئی تو میں
تمہارے ساتھ بہت برا کروں گی۔“

اس پر وہ طعنے انداز میں بولا۔
”جو کرنا ہے وہ بڑے شوق سے کرو۔ میں اس کا
دفاع کروں گا۔ سیاست میں تو ہوتا ہی ہے۔ تم ابھی
سے پاپٹل ہو رہی ہو۔“

”یہ سیاست نہیں فتنہ گردی ہے۔“ سدرہ نے کہا
”تو یہی سمجھ لو۔“ اس نے یہ کہہ کر قبضہ لگا دیا۔

”دیکھو۔ درخواست واپس لے لو۔ ورنہ میں

ہے۔ کیا اپنے حق کی آواز اٹھانا جرم ہے۔“ سدرہ نے نہایت غصے میں کہا۔

”جرم ہے نہیں بنادیا جاتا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام ایسا ہے جس میں مجرم پیدا کئے جا رہے ہیں۔ جو بھی حق کی آواز اٹھاتا ہے اسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو کمزور ہوتے ہیں وہ یا تو دب جاتے ہیں یا پھر وہ ایسا شعلہ بن کر ابھرتے ہیں کہ جو جرم کی راہ پر اپنا آپ بھی جلا لیتا ہے۔ یہ طاقت کی جنگ ہے اور جرم ہی اس کو براہنہاتا ہے۔“

”کچھ بھی ہے تایا جی میں اب نہیں چھوڑوں گی۔ میں ابھی جاؤں گی اور اس عورت کا بھی ہندو بست کرنی ہوں۔“ سدرہ نے کہا اور اٹھ گئی۔

”نہیں بیٹی! آج تم اس کی طرف نہیں جاؤ گی۔ آج شام یارات میں اس کا کوئی حل نکالتا ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ جو صلے اور جبر سے کام لو۔ کل پھر بات کرتے ہیں۔“ چوہدری نیاز نے سمجھا سمجھا کر اپنے گھر بھجوا دیا۔

اس وقت سد بہر ہو رہی تھی جب وہ گھر واپس لوٹی۔ اس کے گھر آنے سے پہلے ہی یونین کونسل میں پیش آنے والے واقعے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اس کے گھر والوں میں سے کسی نے اس سے بات نہیں کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک ایسی مصیبت کو گلے لگا آئی ہے جس سے چھوٹکارا بہت مشکل ہے۔ وہ شام تک بھی اپنے گھر نہیں رو سکی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ اپنے گھر میں نہیں رہے گی۔ وہ کل اپنا سب کچھ لے لی اور یونیورسٹی نکل جائے گی۔ پھر جب تک معاملہ حل نہیں ہو جاتا وہ وہیں رہے گی۔ وہ اپنے سلائی اسکول چلی گئی۔

اس نے رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسکول کا چوکیدار اس کے لیے اپنے گھر سے کھانا بنوانے چلا گیا۔ اس دوران سدرہ نے وہیں سے وسیم

کو فون کر کے پوچھا کہ وہ کہاں پر ہے۔ وہ اس سے مل کر اگلا لمحہ عمل تیار کرنا چاہتی تھی۔ وسیم شہر سے واپس آ رہا تھا۔ اس نے وسیم کو وہیں اسکول میں بلا لیا تاکہ سکون سے بات کر سکے۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ چل رہا تھا۔ وسیم نے اس سے ملنے کا وعدہ کر لیا کہ وہ شہر سے واپسی پر سیدھا اس کے پاس آ رہا ہے۔

وہ کھانا کھا چکی تھی۔ جب وہ اس کے پاس آ گیا۔ ان دونوں نے وہیں بیٹھ گئے سارے حالات کا تجزیہ کیا۔ انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب کرم داد اور اس کے سارے سیاسی گروپ کے ساتھ اسی زبان میں بات کی جائے گی جس زبان میں وہ بات کریں گے اگر کل شام تک انہوں نے درخواست واپس نہ لی تو وہ بھی اپنی کسی خاتون کے ذریعے درخواست دے دیں۔ اس کے علاوہ وہ ہر طرح کے رد عمل کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریباً دس بجے کے قریب وسیم اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے گھر کو چلا گیا اور وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب اچانک سلائی اسکول میں آگ لگ گئی۔ آگ لگانے والوں نے پہلے چوکیدار کو قتل کیا۔ پھر اسکول میں اس طرح آگ لگائی کہ وہ آگ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ سدرہ کی آنکھ کافی دیر بعد کھلی۔ اس نے شور مچایا۔ تو لوگوں کو پتہ چلا۔ وہ اسے بچانے کے لیے دوڑے۔ سدرہ کو بچا تو لیا گیا لیکن اس کی حالت بہت بری تھی۔



میرے کزن نے ساری تفصیل بتا دی تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہیں یہ سب کیسے پتہ؟“

”اس لیے کہ وسیم کے والد چوہدری نیاز کے ہم

کرپٹ سیاسی نظام کے سمندر میں ایک اور جرم یوں
 ڈوب جائے گا کہ اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور اگر بیچ
 گئی تو اس کی جتنی زندگی بھی ہوگی وہ جنگ کرتے
 گذرے گی۔ وہ بھی وہی ہتھکنڈے اپنائے گی جرم
 کی راہ پر چلے گی۔“

”ایسا کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دراصل ہمارے اس کرپٹ اور بدبودار سیاسی

نظام کی کوکھ سے جرم ہی پیدا ہو رہا ہے۔ اسی سیاسی
 نظام میں طاقت والے ظلم کر رہے ہیں اور مظلوم ظلم
 سہہ رہے ہیں۔ جو ظلم نہیں سہتے وہ باغی ہو جاتے ہیں
 اور ان کا انجام سمندر کی طرح ہی ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ
 چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر مجھ سے
 پوچھا۔ ”اب چلو گی؟“

”نہیں، کل چلیں گے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر
 اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں رات بہت دیر تک سمندر کے بارے میں
 سوچتی رہی۔ مجھے یہی لگا کہ اس سزا مند بارستے ہوئے
 سیاسی نظام میں باصلاحیت اور حساس لوگ ویسے ہی
 مرجاتے ہیں۔ میں اگر سمندر سے مل بھی لوں گی تو کیا
 کر پاؤں گی؟

اگلے دن صبح صبح سمندر کے فوت ہو جانے کی خبر آ
 گئی۔ میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔



وکیل ہیں۔ سمندر کا کیس بھی ہم نے لڑا تھا۔ اور اب
 بھی ہمارے پاس ہی ہے۔“ میرے کزن نے کہا۔
 جیسے کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے خاندان میں
 زیادہ وکیل ہیں۔ بڑوں نے جھوٹوں کو سکھایا اور وہ
 سب ایک گروپ میں کام کر رہے ہیں۔

”تمہیں کیا لگتا ہے سمندر کہاں تک نہیں گئی؟ کیا
 اس نے یہ سب کر کے غلطی نہیں کی؟“

”ہاں البتہ! اس نے بہت بڑی غلطی کی۔ جہاں
 تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک بے وقوف لڑکی تھی
 اور.....“ اس نے کہا تو میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا
 ”نہیں، میں نہیں مانتی کہ وہ بے وقوف تھی۔“

”میں اسے بے وقوف ان معنوں میں کہہ رہا
 ہوں کہ اس نے خواہ تو اسے جنگ شروع کر دی تھی۔
 حالانکہ جنگ اسی وقت لڑی جاتی ہے جب تھوڑی
 بہت بھی اس کے پاس قوت ہوتی۔ اسے یہ نہیں پتہ
 تھا کہ اس کا مقابلہ جاہل بے غیرت اور کینے سیاست
 دانوں سے ہے اور وہ ہمارے معاشرے کی ایک مجبور
 اور بے بس لڑکی۔ جس کے والدین بھی اس کا ساتھ
 نہیں دے رہے تھے۔“ میرے کزن نے کافی حد
 تک جذبات سے کہا

”کیا اپنے حق کی آواز بلند کرنا جرم ہے کیا؟“
 میں اس سے بحث کرتے ہوئے کہا

”دیکھو! امن صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب
 طاقت کا توازن ہو۔ یہ جو ہمارا سیاسی نظام ہے یہ
 بہت کرپٹ ہو چکا ہے۔ اب دیکھو ہوگا کیا؟“

”کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ وہ مرجائے گی یا اگر بیچ گئی
 تو ان کے خلاف لڑے گی۔“ میں نے جواب دیا۔

”جب تک اڑنے کے لیے پر پورے نہ ہوں
 اس وقت تک فضا میں اڑان نہیں بھری جاسکتی۔ اس
 نے بھی ایسا کیا اور زمین پر آ رہی۔ وہ مر گئی تو اس

غیر سیاسی انٹرویو

خورشید پیر زادہ

ہمارے ملک میں کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ایسے ہیں جو ہاتھوں میں ڈگریاں لیے گھومتے ہیں مگر ان کو کہیں نوکری نہیں ملتی کیونکہ ہمارے ملک کا نظام ہی خراب ہے۔ یہاں صرف اس کو نوکری ملتی ہے جس کی کوئی بڑی سفارش ہوتی ہے یا پھر وہ رشوت دینے کا اہل ہوتا ہے۔

حالات کی سبب سے ایسا جرسٹ کی کا احوال جس نے ہلا کسی اجرت اعزازی رپورٹر بنا منظور کر لیا تھا۔
سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص ایک غیر سیاسی انٹرویو

شریف کا ملک کے سیاسی اور فوجی شریفوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے) میں یہ بات آگئی کہ پاکستان کے کسی ٹی وی چینل میں اتنا شعور نہیں ہے کہ وہ میرے جیسی ہونہار جرنلسٹ کی نا تجربکاری سے فائدہ اٹھا سکے۔

اور جب غیر ارادی طور پر یہ بات میں نے اپنے گھر والوں کے سامنے کہی تو سب ہی میرا مذاق اڑانے لگے کہ ہم تو پہلے ہی منع کر رہے تھے کہ اس آگ میں مت کودو مگر تم مانی ہی نہیں اب بھگتو لیکن میں بھی کہاں مارا بننے والی تھی۔ میں نے سراسیمہ سے رجوع کیا کہ اب کیا کیا جائے آخر کیا وجہ ہے تو انہوں نے نہایت رسائی کے ساتھ میرے دماغ میں یہ بات بٹھائی کہ میرے پاس نہ تجربہ ہے اور نہ ہی سفارش۔ میں بولی تو سر آپ ہی کیسے سفارش کر دیں تا انہوں نے کہا بیٹا میری سفارش بھی کسی کام نہیں آئے گی میں حیرت سے بولی کیوں سر آپ تو جرنلزم کے اتنے بڑے استاد ہیں آپ کو کون منع کرے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے میرا سب سے بڑا دشمن میرا تجربہ ہے جس کو دیکھتے ہوئے چینل میں پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی کرسیاں خطرے میں نظر آئے نکلتی ہیں۔

میں ناکام و نامراد دل کے ساتھ گھر واپس آگئی اور سوچنے لگی کہ اب اس ڈگری کا کیا کروں اوپر سے بھائی بہنوں اور دوستوں کے طعنے میرے خون جلانے کے

میرا نام ہمارا انصاری ہے۔ ہمارا گھر اندہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی جب میں نے جرنلزم میں ایم اے کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ حالانکہ میرے گھر والوں اور دوستوں نے کافی سمجھایا تھا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے اس لیے اس سے گریز ہی کرو تو تمہاری ناتواں صحت کے لیے بہتر رہے گا لیکن چیونٹی کی طرح میرے بھی پر نکل آئے تھے سو میں نے لاکھ مخالفت کے باوجود یہ امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا کیونکہ سراسیمہ نے مجھے پڑھایا ہی اسنے اچھے طریقے سے تھا۔

چلیں جی امتحان بھی ہو گئے اور میں پاس بھی ہو گئی اور اس پاس ہونے کے زعم میں ملک کے چیدہ چیدہ نیوز چینلز پر اپنی سی وی ارسال کر دی ارسال تو کر دی لیکن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ اگر ایک ساتھ سارے ہی چینلز نے میری ڈیمانڈ کر دی تو میں کس چینل کو ہاں کہوں اور کس چینل کو نا۔ مگر ٹی وی چینلز نے میری یہ الجھن خود ہی ختم کر دی۔ وہ بولے کہ کسی نے میری سی وی پر دھیان ہی نہیں دیا اور ایک بار ایک چینل کے باہر کھڑے کھڑے تھکے مار کر میں غصیلے والے سے پکڑے خریدے تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ میری سی وی میں لینے ہوئے ہیں جو میں نے اس چینل میں جمع کروائی تھی۔ اس کے بعد میری عقل شریف (اس

لیے کافی تھے بلکہ یوں سمجھ لیں کہ جرنلزم کو میری چیز بنا لیا گیا تھا۔ میں مایوس کی انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی صحافیانہ عقلمندی کو کہاں خرچ کروں۔ ایسے میں ایک دن سرائیاز کا فون آ گیا ان کے لہجے میں ایک جوش بھرا ہوا تھا اور انہوں نے مجھے خوش خبری سنائی کہ ایک اخبار میں پوچھنے کل رپورٹر کی اسمائی کے لیے اشتہار آیا ہے جو انہوں نے آپ پٹھان کے ہونٹ پر چائے پینے کے دوران اخبار خراچی کرتے ہوئے دیکھا تھا اور پٹھان کی نظر چوکتے ہی انہوں نے وہ اشتہار پھاڑ کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے سمجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا کہ سرائیاز کی جاب سے کیا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ ارے باطل یہ جاب نہیں ہے اعزازی رپورٹر کی پوسٹ ہے۔ میں نے انہیں بخواہو وغیرہ نہیں ملے گی۔ میں نے حیرت سے کہا تو پھر وہ بولے اس سے کم از کم کئی فائدے مل سکتے ہیں۔ میں نے کہا مثلاً۔ سر نے کہا پہلا تو یہ کہ تمہیں صحافت کا عملی تجربہ ہو جائے گا دوسرے یہ کہ تمہیں گھر پر بیٹھ کر لوگوں کی باتیں سنیں سننا پسند آئی گی۔ تم مصروف ہو جاؤ گی۔ اس کے بعد تم کسی اچھی جگہ بھی ایلانی کر سکتی ہو کیونکہ تمہارے پاس تجربہ ہوگا۔

سرائیاز کی باتیں سن کر مجھے امید کی ایک چھوٹی سی کرن نظر آئی جو کم از کم میری چھوٹی بہن کرن کی نسبت تو کہیں بہتر تھی جو انہیں بیٹھے کھاتے پیتے مجھے صحافی صاحبہ کہہ کر پکارتی تھی۔ حالانکہ صحافی پکارے جانے پر مجھے خوش ہونا چاہئے تھا مگر اس کے لہجے میں جو طعنے بھرا ہوتا تھا وہ مجھے اندر سے کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھائی کے چکر میں میں نے گھر کے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگایا تھا اور مجھ سے پیاز تک نہیں کٹی جاتی تھی۔ لیکن اب مجھے ایک راستہ نظر آیا تھا جس کے ذریعے میں ایک عملی صحافی بن سکتی تھی۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسی دن مذکورہ اخبار کے دفتر پہنچ گئی۔ دفتر کیا تھا لگتا تھا سی

کبار خانے کو دفتر کے درجے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ میں نے دروازے پر رک کر ٹکٹے ٹکٹے دستک دئی اور کوئی جواب نہ پا کر میں ہمت کر کے اندر داخل ہو گئی۔

میں جب اندر داخل ہوئی تو صرف ایک ساتھ داٹ کا بلب جل رہا تھا اب پتہ نہیں چل رہا تھا یا سسک رہا تھا۔ ٹکٹے اندر صرے میں ہر جگہ اخبار کے بندلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً وہ اخبار تھے جو فروخت ہونے کی حسرت لے کر واپس اپنے مقام پر پہنچ گئے تھے۔

مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں میچائی اور جب آنکھیں اندر صرے میں کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے ایک بڑے سے ڈھیر کے پیچھے کوئی انسان نما چیز نظر آئی۔ میں نے اسے ہی غنیمت جانا اور قریب پہنچ کر جھٹ سے سلام جھڑ دیا۔

آنکھیں اٹھا کر نماوہ انسان میرے سلام کی آواز سننے ہی اس بری طرح اچھلا جیسے میں نے اس کی بغل میں بیٹھ کر خود کش جیکٹ کا رہن چھین لیا ہو اور جب انہوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ہے تو ان کی جان میں کچھ جان آئی اور دوسرے ہی لمحے وہ گیدڑ سے شیر بن چکے تھے۔

”جی فرمائیے۔ یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے دفتر میں داخل ہونے کا؟“ میں شہنا کر بولی۔ ”سر میں نے کئی بار دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو اندازاً مای پڑا۔“

”اوہ۔“ وہ ایک لمبی سی اوہ کر کے بولے۔ ”میں مصروف ہی اتنا رہتا ہوں کہ مجھے اس پاس کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ آخرا ایک کامیاب اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے۔“

میں نے دوبارہ ایک نظر آفس پر اور اس میں دھڑے ہوئے کامیاب اخبار کے بندلوں پر ڈالی۔ وہ صاحب بھی ایک کامیاب شخص۔ میرا مطلب سمجھ کر بولے۔ ”یہ بڈل ہی اخبار کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ ظاہر ہے یہ سوال پوچھنا تو میرا حق بنتا

ہی تھا۔

”وہ ایسے کہ...“ وہ صفائی دیتے ہوئے ہوئے۔ ”اس ملک کے عوام اور سیاست دانوں میں اتنا شعور ہی نہیں ہے کہ میرے اخبار میں لکھی ہوئی باتوں کو سمجھ سکیں۔“

”چلیں سر یہ بھی بہت ہے کہ آپ خود تو سمجھ لیتے ہیں نا۔“

”جی بات تو یہ ہے کہ۔“ وہ ناک پر ہینک بٹھا کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے ہوئے۔ ”کبھی کبھی میں خود بھی نہیں سمجھ پاتا کہ میں نے یہ کیا لکھ دیا ہے اور کیوں شائع کر دیا ہے۔ بہر حال۔ تم بتاؤ کون سے ادارے کے لیے چندہ لینا ٹی ہو۔“

”مجھے اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب سے ملنا ہے۔“

میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

انہوں نے مجھے غور سے دیکھنے کے لیے دوبارہ ہینک ناک پر سیٹ کی اور مجھ سے بھی زیادہ تیز لہجے میں ہوئے۔ ”تو میں تم کو کیا نظر آتا ہوں۔ میں کوئی چراسی لگ رہا ہوں جو اس دفتر کی صفائی کر رہا ہوں۔ ارے جی جی میں ہی اس اخبار کا اکلوتا اسٹاف ہوں سمجھیں۔“

”سمجھ گئی سر۔ تو آپ ہی وہ بستی ہیں جن سے مجھے ملنا ہے۔“

”اور کس مسئلے میں ملنا ہے۔ یہ بھی بتا دو۔“

”ارے سر آپ نے اشتہار دیا تھا کہ آپ کے اخبار کے لیے ایک پوٹریٹ کلر پورڈر کی ضرورت ہے۔“

”میں نے اشتہار دیا تھا۔“ وہ اپنے آدھے منہ مجھے سر کو کھاتے ہوئے گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اتنی گہری سوچ میں کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں مجھے انہیں گہری سوچ میں غرق کر دینے کے الزام میں گرفتار نہ کر لیا جائے۔

پھر وہ پیٹھے پیٹھے اپنی کرسی پر اچانک ہوں پھد کے کہ اگر کوئی مینڈک بھی انہیں پھد کتے ہوئے دیکھ لیتا تو یقیناً انہیں مینڈکوں کا گردہ تسلیم کر لیتا۔

”ہاں یاد آیا۔“ انہوں نے اپنی یادداشت کو پکڑ کر

ایک مسلمان گھرانے کا یومیہ دستور العمل

سورے سے سب دار ہونا تاکہ نماز فجر بروقت ادا ہو۔ نماز فجر کے بعد مسنون افکار کا معمول، تلاوت قرآن مجید۔ چھوٹے بچوں کو وقت پر غنیمت سے بے دار کرنا تاکہ وہ وضو، غسل، نماز اور ناشتے سے فارغ ہو کر بروقت اسکول یا مدرسہ جاسکیں۔ طلوع آفتاب کے وقت بلکی پھٹکی ورزش اور سیر کرنا تاکہ سستی دور ہو جائے۔ پانچوں وقت کی نماز باجماعت مسجد میں ادا کرنا، بچے والد کے ساتھ مسجد میں جائیں اور غنیمت اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں نماز پڑھیں۔ گھر کے بزرگوں کی خدمت میں جا کر خیریت پوچھنا۔ دینی اعمال کو بخوشی بجا لانا۔ بات بات میں اللہ کی بڑائی بیان کرنا۔ گھر میں دینی کتب فضائل اعمال، فضائل صدقات، بہشتی زیور وغیرہ کی تعلیم کا اہتمام کرنا۔ بعد از عشاء جلدی سونا۔

(مرسلہ: عاظمی علی..... اسلام آباد)

اپنے دماغ میں واپس لاتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ تو کئی مہینے پہلے کی بات ہے اور اب تک۔“

”اور اب تک آپ اس پوسٹ پر کسی کو رکھ چکے ہیں۔“ میں نے مایوس لہجے میں کہا۔

”ارے کہاں خاک رکھ لیا ہے۔“ انہوں نے گلا کھنکارا اور ملغم کا ایک بڑا سا گولہ ایک کونے میں داغنے ہوئے ہوئے۔ ”حرام ہے جو کسی نے اس اشتہار کے جواب میں جھوٹے منہ ہی اس دفتر میں جھانکا ہو۔“

یہ بات سن کہ میرا دل خوشی سے ملیوں، چیلنے لگا۔ ”سر ہو سکتا ہے کسی نے جھانکا ہو مگر اسے آپ نظر نہ آئے ہوں تو مایوس ہو کر چلا گیا ہو۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے میری تائید میں سر ہلایا تو ناک پر ٹکی ہوئی ہینک نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ”تو تم نے اب پڑھا ہے وہ اشتہار۔“

”نہیں سر میں بھلا کیسے پڑھ سکتی تھی۔“

لیکن وہ بھی میری طرح ایک نمبر کا سنگی ہے اور کیوں نہ ہو۔ آخر کو میرا چھوٹا بھائی جو ٹھہرا۔“

اس انکشاف پر میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ تو یہ ایڈیٹر صاحب اور امتیاز سر آپس میں بھائی ہیں اور صحافت کی سر بلندی کے لیے ان دونوں حضرات کی اپنی اپنی جگہ پر کی گئی کوشش کو سراہتے ہوئے میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

”ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے۔“ انہوں نے میری آنکھوں سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے کہا اور ان کی ڈپٹ سن کر آنسو پیچا رہے وہیں کے وہیں ٹھنک کر رہ گئے۔

خیر قصہ ٹھہر میں نے اپنی سی دی ان کے آگے رکھ دی جو انہوں نے اٹھا کر ایک طرف پھینک دی۔ ”امتیاز کا حوالہ دینے کے بعد اس سی دی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ امتیاز ہر کسی گھسیارے کو کہیں جانے کا مشورہ نہیں دیتا۔ خیر تم آگئی ہو تو اچھا ہی ہوا۔ ورنہ میں مست کر رہا تھا کہ خود سی جا کر یہ کارنامہ سرانجام دوں۔“

”کون سا کارنامہ سر۔“

”ارے ابھی آج کل ایک خاتون سیاستدان کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔“

”ثبت یا سنی؟“ میں نے سوال داغ دیا۔

”بھئی داد۔“ انہوں نے خوش ہو کر میری پیٹھ ٹھونکی جس کے نتیجے میں میں تین ٹانگوں والے اسٹول سے اونٹھنے منہ گرتے گرتے پڑی۔

”سرا بھی میں گر جاتی۔“ میں نے شکایتی لہجے میں انہیں ٹوکا۔

”کوئی بات نہیں۔ گرتے ہیں شمسوار بھی میدان جنگ میں۔ اور صحافت کے میدان سے زیادہ خطرناک تو جنگ کا میدان بھی نہیں ہوتا۔“

”لیکن آپ نے میری پیٹھ کسی خوشی میں ٹھونکی تھی یا ٹھکر میں۔“

”لاحول والا۔ خوشی میں ٹھونکی تھی۔ مثبت یا منفی۔“

”ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی اس ملک کی اکثریتی آبادی کی طرح ہو۔“

”نہیں سر۔ میں نے ایم اے جرنلزم امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔“ میں نے بڑے فخر سے کہا۔

”مگر ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ میں بھلا کیسے پڑھ سکتی تھی۔“ وہ میرے بال کی کھال نکالتے ہوئے بولے۔

”سر وہ اشتہار میں نے نہیں میرے استاد امتیاز صاحب کے ہتھے چڑھا تھا۔“

”تھے۔“ ایڈیٹر صاحب ایک دم ہتھے سے اٹھ گئے۔ ”بی بی یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہتھے چڑھ گیا۔ ارے ہمارا اشتہار تھا یا کوئی اشتہاری ملزم جو پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔“

”وہ۔ وہ۔ میرا مطلب تھا کہ۔“ میں نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میرے استاد امتیاز صاحب نے پڑھا تھا اتفاقاً شاید انہوں نے بازار سے کوئی سودا لیا تھا وہ اخبار میں بندھا چلا آیا تھا۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ وہ ٹھنڈے ہو کر کرسی پر پھیلنے ہوئے بولے۔ حالانکہ وہ پیچا رہے کتنا بھی پھیلنے بیکار تھا۔ اتنے غشی سے تھے کہ ایک کرسی پر ان جیسے وہ ڈھائی ایڈیٹر تو آرام سے استراحت فرما سکتے تھے۔ ”تو تمہارے استاد امتیاز صاحب نے وہ اشتہار دیکھا۔ امتیاز۔ امتیاز۔ جرنلزم۔ ارے کہیں یہ وہی امتیاز تو نہیں ہے جو یونیورسٹی میں جرنلزم پڑھانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔“

”جی جی سر۔ وہی ہیں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہیں۔“ میں یہ جان کر خوش ہو گئی کہ یہ سر امتیاز کے جاسنے والے ہیں اب تو میرا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔

”اس گدھے کو کون نہیں جانتا۔“ انہوں نے سر امتیاز کو شاندار خطاب سے نوازتے ہوئے کہا۔ ”میں کتنی بار اسے سمجھا چکا ہوں کہ میاں کیوں خواہ مخواہ بچے بچیوں کو جرنلزم پڑھا کر ان کا مستقبل تار یک کر رہے ہو۔“

واہ۔ اس کا مطلب ہے کہ تم میں صحافت کے جراثیم کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔“

”جی سر۔ حالانکہ میرے گھر والوں نے کئی قسم کے اسپرے کر کے ان جراثیموں کو مارنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن۔“

”لیکن ناکام ہی رہے۔ گند۔ میں تمہارے اندر مستقبل کی نہایت کامیاب صحافی کو دیکھ رہا ہوں اور وہ دن دور نہیں جب ایک آنے والا میڈیا ہیڈ ورک نہیں خرید کر مفت کی غواہ دیتا رہے گا تا کہ تم کچھ اور نہ لکھ سکو۔“

ایڈیٹر صاحب کے منہ سے اپنے لیے تعریفی الفاظ سن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ تعریف کا یہ نشہ مجھے ہوا میں نہ اڑا دے۔

”مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ان صحافیوں میں سے نہیں ہو۔ اب تم جلدی سے تیاری چلاؤ میں کل ہی ٹائم لے کر تمہیں ان خاتون کے پاس انٹرویو کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کئی بار اپنے کانوں کو جھڑا غروہ صاف تھے۔

ایڈیٹر صاحب اس بار پھر سمجھ گئے۔ ”تم بالکل ٹھیک سن رہی ہو لڑکی۔ تم کل ہی اس انٹرویو کے لیے روانہ ہو رہی ہو اور صاف گوئی سے یہ بھی بتا دوں کہ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔ ورنہ۔“

”ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ میں نے کہا تھا کہ مجھے خود ہی انٹرویو کرنا پڑتا اور میں غورتوں سے بات کرتے ہوئے بہت نروس سا ہو جاتا ہوں۔“

”مگر سر آپ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے تو ذرا بھی نروس نہیں ہوسے۔“

”سو رہی۔ میں سیاسی غورتیں کہنا چاہتا تھا۔ اور تم تو صحافتی غورت۔ نہیں بلکہ لڑکی ہو۔ چلو جاؤ سوالات کی تیاری کرو اور کل صبح ٹھیک تین بجے انٹرویو کے لیے روانہ ہونا ہے۔“

”جی۔ صبح تین بجے؟“ میں حیرت سے بولی۔

”ارے ان سیاست دانوں اور شو بزدلوں کی صبح ہی سہہ چہر تین بجے ہوتی ہے۔ نئی ہوا ہستا ہستا خود ہی سمجھ جاؤ گی۔“

”بہت بہت مہربانی سر۔ اچھا اب میں جاؤں۔“

”ارے ایسے کیسے جاؤں۔ چائے پانی کے بغیر کیسے جانے دیں۔“

”نہیں سر۔ رہتے دیں۔ پھر کبھی سہی۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

”ایسے کیسے جانے دیں۔ طلب تو ابھی ہو رہی ہے۔ شاہاش انٹو اور وہاں کو نے میں چو لے پر چلی رکھی ہے اس میں چائے بنا لو۔ خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔ شاہاش۔“

اور یہ میری عملی زندگی کا پہلا کام تھا۔

..... ☆ ☆ ☆

خیر جی میں نے ساری رات سوالات بنانے میں کالی کر دی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ بس ایک دھن سوار تھی اور یہ میرا پہلا عملی امتحان جس میں پوری طرح سے کامیاب ہونا چاہتی تھی۔ اس کے لیے میں نے سراسیمہ سے بھی مدد لی اور وہ بھی فون پر مجھے کئی نقطے سمجھاتے رہے۔

اور دوسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ اب میری سمجھا یا کہ مصروف لوگوں کی صبح اتنی دیر سے کیوں ہوتی ہے اور لا شعوری طور پر مجھے یہ سوچ کر بھی خوشی مل رہی تھی کہ اب میں بھی مصروف ہوئی ہوں۔

میں الناسید حاننا شہ اور دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھا کر بھانم بھاگ سی این جی رکشہ میں بیٹھ کر اخبار کے دفتر پہنچ گئی۔ اندر داخل ہوئی تو ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب بھی براجمان تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو۔ ایڈیٹر صاحب بولے۔ ”ارے بھی یہ اپنے شخصی

صاحب ہیں۔ اس فیلڈ کے نہایت مشہور فوٹو گرافر۔ یہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔ تم انٹرویو کرو گی اور یہ فوٹو کھینچیں گے۔“

شکسی صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ وہ اونٹ کی طرح جگلی کرتے ہوئے گڑکا چہارہ ہے تھے۔ انہوں نے نہایت بے وردی سے شکے کی پیک ایک بڈل پر اچھالی۔ میں نے چونک کر ایڈیٹر صاحب کی طرف دیکھا مگر انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تو میں سمجھ گئی کہ یہ مشتے کا فوٹو گرافر ہے اس لیے اس کی ہر بد تمیزی روا ہے۔

”وہ۔ ان خاتون کو انٹرویو کے لیے انہوں نے راضی کیا ہے۔ یہ ان کے کئی فوٹویشن کر چکے ہیں۔ سمجھ رہی ہوں نا۔“

میں نے نہ سمجھتے ہوئے بھی ہاں میں گردن ہلائی اور رات بھر کی محنت کے بعد ترتیب دیا کیا سوال نامہ ایڈیٹر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے ایک دو جگہ ایڈیٹنگ کی اور اوکے کہہ کر سوالنامہ میرے حوالے اور مجھے شکسی صاحب کے حوالے کر دیا۔

ہم دونوں دفتر سے اتر کر باہر سڑک پر آئے تو شکسی صاحب نے بڑے رعب سے ایک رکشہ کو آواز دے کر روک لیا۔ چالیس منٹ کی مسافت کے بعد شکسی صاحب نے رکشہ کو ڈیفنس میں واقع ایک بنگلے کے سامنے روک لیا۔ جیسے ہی رکشہ رکاشکسی صاحب اتر بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔

”شکسی صاحب کراہیے۔“ میں نے ان کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

وہ بغیر پلٹے بولے۔ ”ہاں ہاں تم ہی دے دو۔ میں برگرز برا نہیں مانوں گا۔“

میری تو جان ہی جل گئی۔ مگر کیا کرتی پیسے دے کر رکشے والے کو قارش کیا اور شکسی صاحب کے پیچھے لگی۔ اتنی دیر میں وہ گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ چونکہ دار نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا جس سے یہ

اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اکثر یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔

چونکہ دار نے انٹرکام پر اندر اطلاع کی اور ایک ملازمہ نے ہمیں ریسیو کرتے ہوئے ایک بڑے سے ڈرائنگ روم میں لا کر بیٹھا دیا۔ میں وہاں کی آرائش دیکھ دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھی اور شکسی میری مرعوبیت سے غفلت طور پر ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ملازمہ نے مالکن کے آنے کی اطلاع دی تو شکسی کے اشارے پر میں بھی ان کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ بہت ہی شاندار عورت تھی مہنگا ترین لباس، وہ کلو سے زیادہ میک اپ، زیورات سے لدی پھندی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئیں اور کچھ بولے بغیر ہی شکسی نے اپنے بیگ سے کمرہ نکالا اور دھڑا دھڑ مختلف انداز میں ان کی تصاویر کھینچنے لگا۔ میں خاموش تماشا بازی کی طرح ایک طرف بیٹھی یہ سب دیکھتی رہی۔ صحافت کا یہ روپ میرے لیے بہت ہی انوکھا تھا اور ابھی تو مجھے نہ جانے اور کتنے روپ دیکھنے تھے۔

تقریباً چھ رول کی فوٹو گرافی کے بعد خاتون کے چہرے پر محض نمودار ہونے لگی تو شکسی رک گیا۔ ملازمہ نے فوراً پاشٹ میز پر لگا دیا اور جب تک میں نے ایک سوسہ فٹم کیا شکسی پوری پلیٹ کے ساتھ انصاف کر چکا تھا۔

”اچھا بیگم صاحب۔ میں یہ تصویریں تیار کر کے کل تک پہنچا دوں گا۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ اور یاد ہے اپنا چیک بھی لیتے جانا اور ہاں یہ تصویریں سارے اخباروں اور رسالوں میں لگ جانی چاہیں۔“

”ارے بیگم صاحبہ کیوں نہیں لگیں گی؟ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا؟“

بیگم صاحبہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو وہ فوراً بولا۔ ”یہ بھی اخبار سے ہیں۔ یہ جو مانتی ہیں آپ دے دینا مجھے اجازت دیں۔“

یہ کہہ کر شکسی تو اپنا بیگ اٹھا کر چلتا ہوا اب بیگم صاحبہ

اور میں دن نو دن آئے سامنے بیٹھی تھیں۔

”ہاں تو آپ کیا لینے آئی ہیں؟“ بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

”آپ کا احترام۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ شروع کرو۔“

میں نے اپنا چھوٹا سا نیپ ریکارڈ نکال کر بیچ میں میز پر رکھ دیا۔

”السلام علیکم۔“ لیکن بیگم صاحبہ خاموش ہی رہیں۔ ”میں نے آپ کو سلام کیا ہے۔ تم از کلم اس کا جواب تو دے دیں۔“

”میں نے آج تک کسی کو کچھ دینا سیکھا ہی نہیں ہے۔“

میں سمجھ گئی کہ یہ اندرونی طرح شروع ہوگا۔ اس لیے میں بھی اشارت ہوئی۔

”تو آپ نے کیا سیکھا ہے؟“

”سیاست کرنا۔“

میں نے تب کر کہا۔ ”فی الحال تو آپ میرے ساتھ سیاست کرنا بند کریں اور سیدھے طرے سے میرے سوالوں کے جواب دیں۔“

میرا یہ کہنا تھا کہ وہ صوفے پر مر رہے کی طرح اکڑ کر بیٹھ گئیں اور صبح خراش لہجے میں بولیں۔ ”ابھی موبائل پر نکل ماروں گی۔ اور میرے گارڈز تمہیں اٹھا کر ایسی جگہ جیل میں لے جائیں گے۔ جسے ابھی تک امریکا نے بھی دریافت نہیں کیا ہے۔“

”میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے کہ آپ انتہا پسندی پر اتر آئی ہیں۔“ میں نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا۔

”میں جب تمہیں کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے کچھ لینے کی امید مت رکھنا۔ تو بار بار کہے جا رہی ہو کہ سوالوں کے جواب دیں۔ کیسے دے دوں۔ اپنی روایت توڑ دوں تمہارے لیے۔“

”مگر بیگم صاحبہ یہ تو اندرونی ہے۔ اس سے تو آپ کی داد واد میں اور اضافہ ہوگا۔“ میں نے اپنے پٹارے

میں سے مکھن نکال کر نگاہیں ہونے کہا۔

کیا کچ کہہ رہی ہو۔ کہیں تم مجھ سے وہ والا کھیل تو نہیں کھیل رہیں۔ جو ہم نے ویل ایف او کے نام پر کھیل تھا۔ وہ خوش ہو کر گولوں کی کیفیت میں بولیں۔

”مجھے سیاست سے سخت چڑ ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب میں مطمئن ہوں۔ تم اپنی جرنلسٹ لگتی ہو۔ ویسے یہ اندرونی کون کون پڑھے گا۔“ وہ صوفے پر کشن کے سہارے پھیلتے ہوئے بولیں۔

”وہ سب۔ جنہیں آپ پڑھوانا چاہتی ہیں۔ عوام و غیرہ۔“ میں نے اپنے تئیں بہت بڑھیا بات کہی۔

”ارے عوام کو تو مارو گولی۔ وہ اخبار میں یہ اندرونی دیکھنے نہ دیکھنے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اور تمہاری صحت پر تو بالکل ہی نہیں پڑتا چاہئے۔ بس وہ ضرور دیکھیں جن کے دیکھنے سے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔“ بیگم صاحبہ نے کہیں دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں انہیں تو ہم کئی اعزازی کاپیاں بھجوا دیں گے۔“

”یہ ہوئی نا بات۔ اندرونی بھی تو ایسا ہونا چاہئے جس سے سیاسی قدم میں اضافہ ہو نہ ہو۔ بڑے صاحب کے سامنے اپنے ٹمبروں میں اضافہ ضرور ہونا چاہئے۔“

”سب سے پہلے تو آپ اپنا تعارف کروائیے۔“

میں اندرونی کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”وہ جب کر بولیں۔“ کیا مطلب ہے تمہارا میں۔

میں اتنی مشہور سیاست دان ہوں ملک کا بچہ بچہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔“

”مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ سب تمہیں کیوں جانتے ہیں۔ لیکن یہ تو اندرونی کا اصول ہے۔ آخر آپ کو اپنے بارے میں بتانے پر کیا اعتراض ہے۔“

”مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔ ویسے پروگرام کی حد تک بتا دیتی ہوں کہ نام تو میرے دادا ہانے کچھ اور رکھا تھا۔“ وہ سنہللا لیتے ہوئے بولیں۔

سیاست میں بھی کبھی کبھار دوسری پارٹیوں کو بولنے کا موقع دے ہی دیتے ہیں۔“

”چلو اب میں بھی تم کو موقع دے رہی ہوں۔“ میں نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میرا نام تو کچھ اور تھا لیکن اب حضور نے مجھے کئی بیگم کا لقب دیا تھا۔“

”وہ کس خوشی میں؟“

”جس دن میں پیدا ہوئی تھی نا اسی دن الیکشن تھے اور اب حضور بڑی اکثریت سے وہ الیکشن جیت گئے تھے۔“

”تو انہوں نے سوچا کہ تم ان کے لیے کئی ثابت ہوئی ہو۔“

”بالکل یہی بات تھی۔“

”کاش عوام کے لیے بھی ثابت ہوتیں۔“ میں نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

”کیوں میں نے عوام کے کون سے کان کتر لیے ہیں جو تمہیں عوام کی اتنی فکر کھائے جا رہی ہے۔ میں ایک بات صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ میرے سامنے یہ عوام شام کا نالک مت کرنا۔ جو پوچھنا ہے میرے بارے میں ہی پوچھنا۔“

”مگر آپ کو عوام سے اتنی چیز کیوں ہے؟“ میں نے انہیں کریدتے ہوئے پوچھا۔

”سیاستدان جو بھڑی۔“

”مگر یہ عوام ہی تو ہیں جو لاکھوں میں لگ کر تمہیں دوت دیتے ہیں۔“

”اے لو۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہمیں عوام دوت دیتے ہیں۔“ انہوں نے بلند آواز قہقہہ لگا کر میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو بچپن سے یہی دیکھا ہے۔“

”اے تم تو بہت پرانی ہے۔ یہ تو شاید پچھلی صدی کی بات ہے۔ بی بی اپنے بچپن کو بھول جاؤ اور بڑی بوکر جوانی کی طرف آ جاؤ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”کہاں رکھا تھا۔ کس رکھ کر بھول گئے تھے یا۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے مذاق اچھا نہیں لگتا ہاں اور کسی صحافی کا تو بالکل بھی نہیں۔ مجھے تو تم سب زہر لگتے ہو۔“

”اور یہ زہر پینا بھی کسی کسی کا کام ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا ایک اور تیر چلایا۔ ”ہاں تو تم بتا رہیں کہ تمہارا نام کہیں کھو گیا تھا۔“ میں ان کے ساتھ ٹو تراک سے اس لیے بات کر رہی تھی کہ میں سمجھ چکی تھی کہ یہ بند کی یہی زبان زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ اگر میں انصافی گفتگو شروع کر دیتی تو پھر مجھے ہر سوال کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی بیان کرنی پڑتی۔

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ نام کھو دیا تھا۔ بہت زیادہ بول رہی ہوں تم۔“

”بولنے کے ہی تو میسے ملتے ہیں۔ اگر خاموش بیٹھی رہوں گی تو اخبار والے مجھے بھگ کے کسی اور کولا بٹھا میں گے۔“ ایک اور صاف گوئی۔

”تم جیسی صحافی جو ہوتی ہیں نا۔ وہ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی اخبار یا چینل کی محتاج رہتی ہیں۔ ہمیں دیکھو ہم بیک ڈیور چینل سے بھی اپنا کام چلا لیتے ہیں۔“

”نام تو دیں رہ گیا۔“ میں نے انہیں یاد دلاتے ہوئے کہا۔

وہ چڑ کر بولیں۔۔۔۔۔ ”تو اٹھا لے۔ ارے تجھے بڑی فکر لگی ہوئی ہے میرے نام کی۔ اتنی تو مجھے خود بھی نہیں ہوتی۔“

”میں ان ناموں کی بات نہیں کر رہی ہوں جو عوام نے مختلف دور میں آپ کو دیے ہیں۔ میں تو ذاتی نام کی بات کر رہی ہوں۔“ میں بھی ان سے پیچھے رہنے والی نہیں تھی۔ اور یہ سب سرائیاز کا پڑھایا سکھایا ہوا سبق تھا کہ صحافی کو کسی سے دب کر بات نہیں کرنی چاہئے۔

”وہی تو بتانے کی کوشش کر رہی ہوں اتنی دیر سے۔“ مگر تمہاری زبان تو اتنی چرچر چل رہی ہے کہ مجھے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہو تم۔ حالانکہ ہم تو

سوالات کر کے لوگوں پر اپنا آئی کیو کیوں ظاہر کر رہی ہوں۔
 ”اس میں آئی کیو والی بات کہاں سے آگئی۔ میں تو
 لوگوں کو ریاضت کروا رہی تھی۔“ میں اپنی صفائی دیتے
 ہوئے کہا۔

”یہ جو تمہارے عوام ہیں نا۔ یہ مجھے اچھی طرح
 جانتے ہیں کہ میں کس قسم کی سیاستدان ہوں۔ اور جو
 نہیں جانتے وہ بھی جان لیں۔“ وہ پر نفخہ سے بولی۔
 ”آپ ایک صحافی کے سامنے بیٹھ کر عوام کو تڑی نہیں
 لگا سکتیں۔“ میں نے عوام کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں تو اسمبلی میں بیٹھ کر اپوزیشن کو بھی تڑیاں لگاتی
 ہوں۔ تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔“ اس نے نہایت
 حقارت سے میری طرف دیکھا۔

”اچھا اب بات کوا گے بڑھاتے ہیں۔“
 ”میں خود بھی حد سے بڑھی ہوئی ہوں۔ اس لیے
 جو بات بھی کرنا۔ پہلے تو لٹنا پھر بولنا۔“ وہ مجھے گھور کر
 دیکھتے ہوئے بولی۔

”تب تک تو انٹرویو کا وقت ہی ختم ہو جائے گا۔“
 میں نے جلدی سے کہا۔
 ”تمہاری اسمبلیوں کا وقت بھی تو کسی بھی وقت ختم ہو
 سکتا ہے۔“

”میں بات شروع کرتی ہوں۔“
 ”تو کرنی رہو۔ مجھے کیا۔“ وہ بدتمیزی سے بولی۔
 ”عجیب بدتمیز عورت ہو تم۔“ مجھے غصہ آ گیا۔

”اے خبردار مجھے عورت مت کہنا۔ میں سیاستدان
 ہوں سمجھیں۔ تم ہم جنس ہونے کا فائدہ اٹھانے کی
 کوشش مت کرنا۔ اور رہ گئی تمیز تو تم جیسی غریب صحافی
 اس قابل ہی نہیں ہو تھیں کہ ان سے تمیز سے بات کی
 جائے۔ میں بھی کبھی کوئی اخبار یا چینل دیکھ لیتی
 ہوں۔ اور ایک چینل والوں نے تو مجھ سے بھی بڑا بدتمیز
 لاناٹھا ہے۔ ہم سیاستدانوں سے ایسے اکھڑنے لگے ہیں
 بات کرتا ہے کہ ان کے سامنے نہ ہو تو اس کے دانت
 نکال کر اپنے کھیتوں میں گڑھا دوں۔“ اس کا غصہ

”میں پرانی ہوں یا نہیں ہوں۔ لیکن اس کا ووٹ
 سے کیا تعلق۔“
 ”ارے بھی یہ بہت پہلے ہوتا تھا کہ عوام ووٹ
 دیتے تھے اور سیاستدان ووٹ لیتا تھا۔“ انہوں نے
 میری ناقص معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو اب الیکشن میں کیا ہوتا ہے۔“
 ”بڑی بھولی جنتی ہو تم۔ بچپن کے الیکشن تو یاد ہیں
 تمہیں لیکن آج کل کے الیکشن کے بارے میں کچھ
 نہیں جانتیں۔“ وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔

”آج کل جو سیاست چل رہی ہے۔ اسے دیکھتے
 ہوئے میں نے ووٹ دینا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”اور ہم نے تمہارے ووٹوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اس
 طرح تم مان رہی ہو نا کہ آج کل تم یعنی عوام ووٹ
 دینے نہیں آتے۔“ ان کے لہجے میں عجیب سا نفخہ تھا۔
 ”لیکن جب نتیجہ آتا ہے تو ہزاروں ووٹ نکل آتے
 ہیں۔ یہ کیا جادوگری ہے۔“

”یہ وہ جادوگری ہے جو پہلے صرف۔۔۔ میں جانتی تھی۔
 اب پچھلے الیکشنوں میں ہم نے امریکہ بھی ایکسپورٹ
 کر دی ہے۔ بیچارہ الگور میا می میں اپنے ووٹ ہی
 ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔“ وہ ایک بار پھر سامری کی طرح
 قبضہ لگا کر بولی۔

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہش نے بھی تمہارے نقش
 قدم پر چل کر کامیابی حاصل کی تھی۔“ میں نے پوچھا
 ”ارے کیوں نہ کرتا۔ آخر اسے ہماری حمایت
 چاہیے تھی یا نہیں۔“

”تو ثابت ہوا کہ آپ سیاست دان ہیں۔“
 ”نہیں میں گھروں میں کام کرنے والی ماہی ہوں۔
 “ وہ ایک بار پھر چڑ کر بولی۔

”مگر میں تو سیاست دان سمجھ کر تمہارا انٹرویو کر رہی
 ہوں۔“

”ارے تم کو صحافی کس گھماڑ نے بنایا ہے۔ جب
 جانتی ہو کہ میں سیاست دان ہوں تو ایسے بے وقوفانہ

”اس لیے کیا ہے اس حلقے کی نمائندہ ہیں۔“
 ”اول تو میں جن کی نمائندہ ہوں انہی کے لیے
 کام کرتی ہوں۔ ویسے تم کو ایک راز کی بات بتاؤں۔“
 ”وہ راز داری سے بولی۔“

”سے کا نمبر تو نہیں ہے۔“
 ”ایک تو جس کو دیکھو سنے بازی کے پیچھے پڑا ہوا
 ہے۔ سب نے ہماری فعل کرنا ضروری سمجھ لیا ہے۔“ وہ
 منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”آپ سنے کو بھی چھوڑیں اور بازی کو بھی۔ راز کی
 بات بتائیں۔ مجھے سسپنس ہونے لگا ہے۔“
 ”تو مجھے ان سے کیا کہ تمہیں کیا ہونے لگا ہے۔“
 وہ پھر بدتمیزی پر اتر آئی۔

”چلیں آپ وہ بات تو بتائیں جو بتانا چاہ رہی ہیں۔“
 ”راز کی بات یہ ہے کہ سیاست دان وہ واحد مخلوق
 ہوتی ہے جس کے پاس کوئی معصرویت نہیں ہے۔ ان کل
 کے دور میں۔“ وہ سرگوشیاں لہجے میں بولی۔
 ”نہیں۔ نہیں۔“

”ہاں۔ ہاں۔ تو کیا میں تم کو چھوٹی لگتی ہوں۔“
 ”میں نے کب کہا آپ خود ہی خود کو سیاست دان
 بول رہی ہیں۔“ میں نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔
 ”میں سیاست دان ہوں کسی اور نام سے۔“

”یہ تو مجھے آج پتہ لگا ہے کہ سیاست دانوں کا بھی
 کوئی نام ہے ہوتا ہے۔ ویسے تم کون سی کورٹ کے باہر
 نام پ کر رہی تھیں۔“

”دیکھو کورٹ کی باتیں یہاں رہتے دو۔ ویسے بھی
 اب بڑی مشکلوں سے کاٹے کوٹ والی ریلیوں سے
 جان چھوٹی ہے۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”پھر تو تم کو یہ بھی پتہ ہوگا کہ ملک کی اٹھانوے
 فیصد آبادی بھی تم سے تنگ ہے۔“ میں نے ایک اور وار
 کیا۔ اور یہ وار اداکار شان کی فلم وار کے علاوہ تھا۔

وہ غصے سے تھملا اٹھی۔ ”میرے ساتھ مٹھری کرتی
 ہے۔ تم کو پتہ ہے کہ ایک سیاست دان سے اور خاص

ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔
 میں ٹھنڈے پتے میں بولی۔ ”سمجھ گئی۔ تو تمہاری
 باتوں سے کم از کم یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ تم جدی
 پیشتی سیاست دان ہو۔“

”صرف میں ہی کیا۔ اس ملک میں جتنے بھی ہیں
 سب ہی جدی پیشتی ہیں۔ نئے نئے کو تو ہم؟ سبلی کے
 پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ بس اس بار پتہ نہیں ہے
 چوک ہو گئی کہ ایک نیا سیاست دان بھی انٹر ہو گیا ہے۔ لیکن
 آہستہ آہستہ وہ بھی ہمارے رنگ میں رنگتا جا رہا ہے۔“

”اب ذرا تم اپنے خاندان کے بیک گراؤنڈ کے
 بارے میں کچھ بتاؤ۔“
 ”تم سے پہلے بھی کئی صحافیوں نے ہمارے خاندان

کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں معلومات حاصل
 کرنے کی کوشش کی تھی۔“ وہ مجھے چھتتی ہوئی نظروں
 سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور آج وہ سب انڈر راکونڈ
 ہو چکے ہیں۔“
 ”کہاں؟“

”یہ تو ان کی روجوں کو بھی پتہ نہیں ہوگا۔“ وہ منہ کر
 بولی۔

”تم نے کتنی بار انکیشن میں حصہ لیا ہے۔“ میں نے
 سوال کیا۔

”جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے اور اب تک
 تو کتنی بھی بھولی گئی ہوں۔“

”کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آپ ہر بار جیتی
 ہی آ رہی ہیں۔“ مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

”ابھی تک ہمارے حلقے کی کسی مائی نے وہ فعل ہی
 پیدا نہیں کیا جو مجھے ہراسے۔“ وہ گردن اٹھا کر بولی۔

”حالانکہ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ ہر بار جیتنے کے
 باوجود آپ نے اپنے حلقے میں ایک بھی ترقیاتی کام
 نہیں کروایا۔“ میں اپنی حاصل کردہ معلومات کے
 مطابق سوال کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیوں کرواؤں۔“

دل سے نکلے ہیں لفظ

✚ رشتے کا تقاضہ اس بات میں نہیں کہ کوئی تمہیں مکمل کر دے لیکن کوئی تو ایسا ہوتا چاہیے جس کے ساتھ تم اپنے ادھورے پن کو بانٹ سکو۔

✚ پریشانیاں چھوٹے پتھروں کی طرح ہوتی ہیں اگر تم اسے اپنی آنکھوں کے قریب رکھو گے تو یہ تمہاری بینائی کو چھپا دیں گی لیکن اگر تم اسے فاصلے پر رکھو گے تو تم دیکھ سکو گے کہ یہ کتنی چھوٹی ہیں۔

✚ کسی کے برا کہہ دینے سے نہ ہم بُرے ہو جاتے ہیں نہ وہ اچھے ہر شخص اپنی زبان سے اپنا ظرف دکھاتا ہے نہ کہ دوسرے کا شک۔

✚ انسان تب سمجھ دار نہیں ہوتا جب وہ بڑی بڑی باتیں کرنے لگے بلکہ تب سمجھ دار ہوتا ہے جب وہ چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھنے لگے۔

حسن اختر۔۔۔ اسلام آباد

ظہور سے اس سیاست دان سے جو چوہدرانی بھی ہو، مسخری کرنا کتنا ہنگامہ کر سکتا ہے۔“

”یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ آپ تادان کے لیے بہت بھاری رقم وصول کرتی ہیں۔“ میں نے ایک اور چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ادھر ادھر کی باتیں لے رہی ہو تم۔ جس مقصد کے لیے بلایا ہے وہ بات کیوں نہیں کرتیں۔“ اس سوال سے وہ کچھ بڑبڑا سی گئی تھی۔

”تم تو خواہ مخواہ تاراض ہو رہی ہو۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم کو یہ خیال کب آیا کہ تم بھی سیاست دان بن سکتی ہو۔“

”لگتا ہے تم کو ہمارے خاندان کی ہسٹری کا پتہ نہیں ہے۔“ وہ پھر اڑ کر بولی۔

”اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی ہسٹری شیٹر کو نہیں جانتی۔“

”کتنی بار بول چکی ہوں اور تم خود بھی اعتراض کر چکی ہو کہ ہم لوگ جہدی پشتی، خاندانی سیاست دان ہیں۔“ وہ میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے میں نے کوئی بہت ہی احمقانہ سوال کر دیا ہو۔

”آپ کا دادا تو وہ میرا چوہدری تھا۔“

”ہر وہ میرا اور چوہدری سیاست دان بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ سیاست سے کام نہیں لے تو پھر علاقے میں اپنا ٹہکا کیسے بٹھائے گا۔“ اس نے چوہدری کا ایک زریں اصول بتاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے ہارے میں مشہور ہے کہ تم ہر حکومت میں شامل رہتی ہو۔“ میں نے اگلا سوال دیکھ کر کیا۔

”تو اس میں کیا برائی ہے۔“ ظاہر ہے ان کو اس میں کیا برائی نظر آتی۔

”آخر انسان کا ضمیر بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔“ میں نے اس کے ضمیر کو جنموڑنے کی کامیابی کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ضمیر کو تو ہم نے کاروباری کر کے کبھی کاغذ پر دیا

”اور یہ بھی ہے کہ تم نے تقریباً ہر وزارت کے دفتر کا مڑا چکھا ہے۔“ میں نے سر اٹپار کی دی ہوئی معلومات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس کیا کروں۔ تھوڑی پٹوری ٹائپ بھی ہوں گا۔“ وہ مسکرا کر بولی اور اس کی مسکراہٹ میں بھی ہلا کا زہر بھرا ہوا تھا۔

”تم وزیر تعلیم بنیں۔ لیکن تم نے اپنے علاقے میں ایک اسکول تک نہیں کھولا۔“ اور یہ بھی میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ ایک وزیر تعلیم نے اپنے حلقے میں کوئی اسکول نہیں کھولا تھا۔ پھر ایسے انسان کو وزیر تعلیم ہونے کا کیا فائدہ۔

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”کون کہتا ہے کہ میں نے اسکول نہیں کھولا۔ ایک نہیں چار چار اسکول کھولے۔“

”اور اب ان چاروں اسکولوں میں آپ کی گائے

بات کرتی ہوں، "میں اندر سے کھول رہی تھی لیکن مجھے اپنی کھولا ہٹ پر قابو رکھنا تھا ورنہ اس بد میز عورت سے کوئی بے عید نہیں تھا کہ میرے بدن کے تمام اسپر پارٹس کھلوا کر رکھ دیتی۔

”تو بات کرنا کوئی جرم ہے کیا۔ وہ دھننا کے ساتھ بولی۔

”میں بات کر رہی تھی غریبوں کی۔ ان غریبوں کو حقوق تو کبھی نہیں ملتے۔“

”ان کو حقوق ملیں نہ ملیں، ہم کو تو وزارت مل جاتی ہے۔“

”مطلب عوام کو صرف لارے لیے ملتے ہیں۔“
 ”ایک غریب کے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ ہم خود

اس کے پاس ووٹ مانگنے جاتے ہیں۔ ”وہ ایسے سبک
میں بولی جیسے اس کا پاؤں کسی گندم پر نہ گیا ہو۔

”بڑی بات ہے ورنہ تم کو اچھ کر خود سے پانی بھی نہیں پیتیں۔“ میں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

یہ مے ایسے ہی بات می ہے یا بھ پر مھریا

جانتی ہوں کہ باہر تمہارے بیس گارڈ کھڑے ہیں۔ جن

15. ہندی تم سانی معلوم ہو رہا ہو۔ 16. وہ مجھے تم لانی

”بندی اور سپانی سمجھنے کا شکر یہ اچھا ہے کیوں مشہور

”یہ سب ڈیرا دشمن لابی کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ جو ڈیرا اور چوہدری ظالم ہوتا ہے؟“

ہیں۔ ہم تو بابا ہر کسی کے ساتھ انصاف سے چلتے آتے ہیں۔ اسی لیے لوگ دور دور سے ہمارے پاس جرمہ کمرانے آتے ہیں۔ ”یہ جرمہ اس جرمہ کے علاوہ تھا جو

”کوئی ایسا انصاف جو تم کو آج تک یاد رہ گیا ہو۔“

”ایسے تو بہت سے ہیں لیکن میں تم کو ایک واقعہ بتاتی ہوں۔ ایک بار ہمارا جرگے میں ایک کیمس آیا۔ جس میں ایک کھیت کے دو غویدار تھے۔ وہ یاد کرتے ہوئے بولی۔

”پھر تم نے کیا انصاف کیا؟“

”میں نے کہا بابا یہ تو خون خریدہ ہونے کا امکان ہے۔ اس کا ایک ہی حل ہے۔ یہ کھیت نہ تیرا نہ اس کا۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔“

”واہ قربان جاؤں تمہارے انصاف پر۔“

”جہاؤ۔ ضرور قربان جاؤ اور جو نہیں ہوتا اسے ہم خود قربان کر دیتے ہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو سب سے زیادہ مزا کس وزارت میں آیا۔“

”وزارت اطلاعات و نشریات میں۔“

”مگر یہ تو شاید وہ واحد وزارت ہے جو تم کو آج تک نہیں ملی۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”اسی لیے تو مزا آیا۔ مجھے دوسرے کس وزارت میں تاگ اڑانے میں بہت مزا آتا تھا۔ بہت مانی ہوں میں۔“

”وہ تو گف ہی رہی ہیں۔“

”بہت مستیاں کرنی رہتی ہوں۔ وزیر اطلاعات ابھی اطلاع کو نشر بھی نہیں کرتا تھا اور میں سب کو بتا دیتی تھی۔“ وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

”اور اس کا انجام کیا ہوا۔“

”سنا ہے کہ آج کل وہ بیچارہ ریلوے انجن کے ساتھ سرگھرانے کے بعد دیوار سے سرگھرا رہا ہے۔“

”اچھا۔ تم مجھے کوئی ایک مثال دو کہ تم نے دزیر بننے کے بعد کیا بنایا۔“ مجھے اس کی باتیں سن کر بدبختی ہو رہی تھی۔

”کیوں نہیں بنایا۔ بہت مال بنایا۔ تم پہلے بتاؤ کہ بینک اسٹینٹ ساتھ لے آئی۔“

”آج کل تم اپنی عادت کے مطابق ایک بار پھر سرکاری پارٹی میں شامل ہو لیکن کوئی وزارت نہیں لی۔“

”کیوں؟“ میری حیرت حقیقی تھی۔

”بس چھوٹے بھائی کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی۔ میں نے بھی کہا چلو بچے اس دفعہ تم عیش کرو۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”میں نے ایک چھٹل پر تمہارا انٹرویو دیکھا تھا۔ جس میں تم نے بڑی مزے مزے کی باتیں کی تھیں۔“ حالانکہ حرام ہے جو میں نے وہ انٹرویو دیکھا ہو۔ بس سر امتیاز نے ہی بتایا تھا اس کے بارے میں۔

”پچھات مار کے دانت باہر نکال دوں گی۔ میں تم کو جو کر گئی ہوں کیا جو مزے مزے کا بات کرنی ہوں۔“ اسے پھر غصہ آ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ غصہ اس کی ناک پر دھرا ہوا ہے۔

”مم میرا مطلب ہے بہت اچھی اچھی باتیں کی تھیں۔“

”حیرت ہے میں بھی اچھی بات کر لیتی ہوں۔ خیر ہے خیر ہے۔“ اس بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔

”بچپن میں آپ کے کیا شوق تھے؟“

”کو دنا۔ چھلانگیں مارنا۔ اسے بھی سے اسے بھی پر۔ سے بھی سے اسے بھی پر۔“ وہ بچپن کو یاد کر کے خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”یعنی تم کو ٹپے پٹنی تھیں۔“

”نہیں۔ اس وقت تک ہم کو بھی میں آگئے تھے۔“ وہ ہر سانسیت کے ساتھ بولی۔

”تو بڑے ہونے کے بعد تم نے یہ شوق چھوڑ دیا۔“

”لو بچپن کے شوق بھی ختم ہوتے ہیں کیا۔“

”یعنی یہ شغل آج تک چل رہا ہے۔“

”ہاں۔ لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ۔ پہلے میں کوٹھیاں ناپا کرتی تھی۔ اب ہوائی جہاز سے ناپتی ہوں۔“ وہ ہوائی جہاز کا اشارہ کرتے ہوئے بولی تاکہ مجھے سمجھا جائے کہ ہوائی جہاز کسے کہتے ہیں۔

”بغیر پیراشوٹ کے؟“

”میں جانتی ہوں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تمہاری تو یہ دلی خواہش ہے کہ میں کسی دن پیراشوٹ پہنے بغیر

ہی کو جاؤں۔ لیکن میں تمہیں اور تمہارے عوام کو بتائے
دیتی ہوں کہ جب تک میرے دم میں دم ہے تم لوگوں
کے سینے پر موٹک دیتی رہوں گی۔“ وہ باقاعدہ دلے کا
اسٹاکل کرتے ہوئے بولی۔

”اب تو موٹک بھی بہت مٹگئی ہوئی ہے۔ غریب
آدمی کی پہنچ سے دور۔“

”اچھا ہی ہوا۔“

”تم کیوں نہیں چاہتیں کہ غریب بھی سکھیں ہوں۔
پیسے بھر کر کھانا کھائے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت آرام کی
زندگی گزارے۔“ میرے بچے میں غریبوں کے
بھدروں ہی بھدروں بھری ہوئی تھی۔

”ارے اگر ہم نے ان کے لیے یہ سب کر لیا تو یہ
جوز بردستی کے ہمارے جلسوں میں آ جاتے ہیں۔ ہم اس
سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے جیسا چل رہا ہے
چلے دو۔“ اس نے پھر میری معلومات میں اضافہ کیا۔
”مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ غریبوں کی یہ حالت دیکھ
کر۔“

”ظاہر ہے۔ ایک غریب کو ہی غریب کی حالت پر دکھ
ہوتا ہے۔“ وہ مجھے اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے بولی۔
”تم نے اب تک میری کسی ایک بات کا بھی
ڈھنگ سے جواب نہیں دیا ہے۔“

”تو تمہیں ڈھنگ سے جواب دینے پر مجھے کون سا
تمغہ مل جائے گا۔“

”چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتائیں اسمبلی کا ماحول کیسا
ہے۔“

”بہت اچھا۔ بہت گھریلو۔ بالکل میری پیروی
جیسا۔“

”میرا خیال ہے اب انٹرویو کو یہیں ختم کر دیتے
ہیں۔“ میں نے ٹیپ ریکارڈ ریف کرتے ہوئے کہا۔
”بہت ہی ٹیک خیال ہے۔“

میں نے اپنا سامان ٹیپ میں رکھا اور اس سے ہاتھ
ملائے بغیر باہر جانے لگی۔ ظاہر ہے میں اپنے ہاتھ

گندے کرنا نہیں چاہتی تھی۔
”ایک منٹ رکو۔“ اس نے پیچھے سے آواز دے کر
مجھے روکتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہے۔ انٹرویو تو ختم ہو گیا۔“ میں بولی۔
”یہ نہیں کیوں مجھے لگا کہ تمہیں ہمارے ساتھ ہونا
چاہیے۔ کیونکہ ہمارے بڑے صاحب کہتے ہیں کہ
ہماری کوتاہیوں اور جہالت کو چھپانے کے لیے ایک
آدھ پڑھا لکھا بندہ بھی ساتھ ہونا چاہئے۔ میں نے تم
سے شروع میں ہی کہا تھا کہ میں کسی کو کچھ نہیں دیتی۔
لیکن تم کو ایک گولڈن مشورہ دے رہی ہوں۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ یہ صحافت و حافظ چھوڑ دو۔“
”تو پھر کیا کروں؟“ میں نے تنک کر جواب دیا۔
”وہی جو میں کر رہی ہوں۔ سیاست میں آ جاؤ۔“
میں نے تیز نظروں سے اس کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔
اور جس اخبار میں یہ انٹرویو چھپنا تھا اس میں یہ خبر
شائع ہوئی کہ ”حکومتی جماعت نے معنی انتخابات کے
لیے ایم اے جرنلزم میں گولڈ میڈلسٹ ہما انصاری کو
پارٹی ٹکٹ جاری کر دیا ہے۔“

۴۱

بھینٹ

علی اختر

سیاست ایک سسٹم کا نام ہے جس کے تحت عوام سے محبت کرنے والے ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار سماجی کارکن خود کو بطور عوامی نمائندہ کے طور پر پیش کرتے ہیں اور عوام اپنے حق رائے دہی کے ذریعے انہیں پارلیمنٹ میں پہنچاتے ہیں تاکہ وہ ان کے حقوق کے لیے قانون سازی کر سکیں۔ لیکن ہمارے پاس سیاست ایک کاروبار کا درجہ اختیار کر چکی ہے جس کے تحت کرپٹ عناصر اپنے کرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے سامنے آتے ہیں۔

دو سیاست دانوں کا قصہ 'جستجو' نے اپنے مفادات کے تحت خونیں رشتوں کو سیاست کی بھیبت چڑھا دیا تھا

میں ناں..... میں آپ کے آبائی چک کرتا پور کے ساتھ والے گاؤں ڈھولے آل سے آیا ہوں اور چوہدری بلاول کا نوکر ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ان کی دشمنی پرانے وقتوں سے نوکھراں قصبے کے زمیندار ہیبت خاں کے خاندان سے چلی آرہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہیبت خاں کا بھائی رشید خان لیپن دین کے چھٹڑے میں قتل ہو گیا۔ انہوں نے یہ قتل چوہدری بلاول کے کارندوں پر ڈال دیا۔ کتنا عرصہ تک کیس چلتا رہا مگر شہوتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہمارے بندے عدالت سے بری ہو گئے۔ انہوں نے یہ ضد دل میں پالے رکھی اور ایک روز موقع ملے ہی چوہدری بلاول کے چھوٹے بھائی کو گولیوں سے بھون ڈالا اب ان کے آدمی قتل کی اس واردات کی وجہ سے جیل میں ہیں ان کی آج کل گواہیاں لگنے والی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر سانس لینے کو رکا تو میں نے ہنکارا بھرا۔

نچر..... سانس لینے کے بعد وہ پھر بولا۔
"ابھی چند روز پہلے کی بات ہے ہیبت خاں کی سوتیلی بہن قتل ہو گئی قاتلوں نے اس کی عزت لوٹی

میں اپنے جیمیر میں ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا چاچا عبدال میری میز صاف کر رہا تھا سائیکس کی فائلیں ادھر ادھر رکھی ہوئی تھیں ٹھک سے دروازہ کھلا۔ شیشے کا دروازہ تھا زور سے بجاتا مجھے لگا جیسے ٹوٹ گیا ہو میں نے بڑی عیسائی نظروں سے آنے والے کو دیکھا چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا جس نے سر پر میلا کچیا صاف ہانڈھ رکھا تھا۔ اندر آتے ہی وہ یوں گری پر ڈھیر ہوا جیسے بڑی دور سے بھاگتا آ رہا ہو۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی میری عیسائی نظریں دیکھ کر وہ پھولے سانس میں بولا۔

"معاف کرنا صاحب جی..... دے کا مریض ہوں تیز چلوں تو سانس پھولنے لگتا ہے۔"
"کوئی بات نہیں پانی پیئیں۔" میں نے چاچا عبدال سے کہا۔

"چاچا! انہیں پانی پاؤ۔" چاچا عبدال پہلے ہی صفائی چھوڑ چکا تھا فوراً قریب پڑے کولر سے پانی کا گلاس بھرنے لگا۔ اتنی دیر میں اس کا سانس بحال ہو چکا تھا گلاس پکڑتے ہوئے وہ بولا۔

"غالبا آپ نے مجھے پہچانا نہیں آپ قادر وکیل

اور پھر اسے اپنے ساتھ اغوا کر کے لے گئے جاتے جاتے ان کی چیتھی بھینس گوری کو بھی گولی مار کر ختم کر گئے۔ اگلے روز گاؤں سے ہت کر چرنی کے کھیت سے اس کی لاش ملی۔ لاش کا چہرہ مسخ کیا ہوا تھا انہوں نے اس قتل کا مدعا چوہدری بلاول پر ڈال دیا ہے۔ مسخ شدہ لاش کے پوسٹ مارٹم اور ڈاکٹری ملاحظہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مڑموں نے گینگ ریپ کے بعد بڑی بے دردی سے پہلے گولیاں ماریں اور پھر چہرے کو تیز آلے سے مسخ کر ڈالا۔ پرچے کے ساتھ دونوں رپورٹیں بھی لگی ہیں۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے پھر رکھا اس کی سانسیں اتنا بولنے سے درہم برہم ہو رہی تھیں، کچھ دیر بعد وہ بولا۔

”وکیل صاحب یہ دمہ بھی بڑی موذی مرض ہے ہموار اور چلتی حیاتی کو کتنی چھدری چھدری کر دیتا ہے ابھی تک اس کا علاج ہی نہیں نکلا۔“

”ہاں تو میں بتا رہا تھا انہوں نے اس قتل کا مدعا چوہدری بلاول پر ڈال دیا ہے اور مقامی تھانے میں نامزد پرچہ درج کروا دیا ہے۔ آپ کو بتا ہے کہ آج کل ایکشنوں کا زور ہے اور چوہدری بلاول اپنے گاؤں سے انکیشن بھی لڑ رہا ہے پولیس والے پہلے تو ان کے دبہ بے کی وجہ سے خاموش تھے مگر پرچہ درج ہونے کے بعد انہوں نے گرفتاری کے لیے زور مارنا شروع کر دیا ہے میں اس بارے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

میں اس کی کہانی سن کر سوچوں میں ڈوب گیا نہ جانے ہمارے معاشرے سے یہ لعنت کب ختم ہوگی مقامی لوگ اپنی اپنی دشمنیوں میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ ان کی تسلیں ختم ہو جاتی ہیں دشمنیاں نہیں ختم ہوتیں۔ وہ اپنی چوہدرایت اور ٹاک اونچا

رکھنے کے لیے مخالفوں کو جھوٹے کیسوں میں پھنسا کر مڑہ لیتے ہیں میں جس گاؤں میں رہتا ہوں وہاں بھی ایسے کیس آئے دن بنتے رہتے ہیں اور آپس کی دشمنیاں نسلوں تک پالنے پر فخر کیا جاتا ہے۔ ایک تو ان کی جہالت اور پر سے ہمارا عدالتی نظام بھی اپنی پیچیدگیوں سے بندے کو نکلنے نہیں دیتا۔ میرے والد صاحب گورنمنٹ کی بنائی ایسی مصالحتی کمیٹی کے چیئر مین ہیں جو مقامی لوگوں کے جھگڑوں میں مصالحتی کردار ادا کر کے معاملات نبھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ نمبرداری تو ہمارے خاندان میں دراشتی چلی آ رہی ہے میں نے شہر کے کانٹ سے بی ایس سی بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تو میرا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا اور نمبروں کے لحاظ سے میرا میرٹ بھی بنتا تھا مگر جب والد صاحب نے گاؤں میں پلٹی دشمنیوں کا تناسب دیکھا اور عدالتی چکروں میں لوگوں کو پانی کی طرح روپیہ بہاتے دیکھا تو انہوں نے مجھ پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ میں ڈاکٹر بننے کی بجائے وکالت کا امتحان پاس کر کے وکیل ہوں۔

میں نے بہت شور مچایا مگر والد صاحب کی دلیلوں نے میری ایک نہ چلنے دی بالآخر میں نے ایل ایل بی کا امتحان بھی اچھے نمبروں میں پاس کیا اور وکیل بن کر پکھری آ گیا۔ یہ چیئر مجھے چند سال پہلے ہی ملا تھا۔ میرا کام گاؤں کے روایتی جھگڑوں اور کیسوں کی وجہ سے اچھی طرح چلنے لگا تھا ان کے علاوہ مجھے اور بھی کیسز ملنے لگے تھے۔ میں نے اپنے آفس میں ایک کمپیوٹر لکڑک اور ایک چپڑا سی رکھا ہوا ہے جو میرے عدالتی کام اور دفتری ضروریات پورا کرتے ہیں آج کے کیس کی روداد سننے کے بعد میں نے ایک بار پھر آنے والے کارندے سے پوچھا۔

”چوہدری بلاول آج کل کدھر ہیں؟“

کیا۔

”جی جی..... چوہدری صاحب کا کارڈ ہے میرے پاس۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے کمرے کی جیب سے کاغذوں کے مڑے تڑے جتھے سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

”ٹھیک ہے بات کر لوں گا“ جب تک چوہدری بلاول سے بات نہیں ہو جاتی کیس کو ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔“ میں نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

”جی جی.....“ اس نے جیسے میری بات کی تصدیق کر ڈالی ہو تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا۔
”آپ کی فیس.....؟“

”یہ تم طے کرو گے یا چوہدری بلاول..... پھر کیس کی نوعیت دیکھ کر کہوں گا۔“ میں نے بتایا۔

”ٹھیک ہے جی ٹھیک ہے..... پھر میں چوہدری صاحب کو بتا دیتا ہوں وہ خود آپ سے بات کر لیں یا آپ ان سے تفصیلات پوچھ لیں، میں چلتا ہوں۔ شہر میں دوسرے کام بھی ہیں گاؤں پہنچتے پہنچتے شام اتر آئے گی۔“ یہ کہہ کر وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

اگلے روز میں نے اپنا طرک متعلقہ تھانے میں بھیجا اور وہاں سے ایف آئی آر کی نقل منگوائی، ایف آئی آر ہیبت خاں کے کارندے کے ذریعے درج کروائی گئی تھی میں نے اس کا مطالعہ کیا اس میں درج تھا۔

”میں جمیل عرف جیلا قوم موچی سکندھ قصبہ ٹوکھراں ہیبت خاں کا عرصہ میں سال سے ملازم ہوں اور میں ان کی بھینسوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کا خیال رکھتا ہوں مورخہ ۲۱ جولائی ۸۴ء کو میں بھینسوں کا دودھ دھونے کے لیے جب حویلی گیا تو میں نے دیکھا چوہدری ہیبت خاں کی سب سے چیتھی بھینس گوری کو نا معلوم لوگوں نے گولی مار کر

رہتے ہیں، واردات والے دن بھی لاہور میں ہی تھے۔ گاؤں کبھی کبھار آتے ہیں آج کل الیکشنوں کی وجہ سے روزانہ رات گاؤں آ جاتے ہیں اور اپنے سپونروں کے ساتھ حویلی میں میٹنگیں کرتے رہتے ہیں اس کیس نے انہیں بے حد پریشان کر رکھا ہے۔“

”بڑے لوگوں کو ایسی کا ہے کی پریشانی..... پولیس سے مل کر سودا بازی کر لیتے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ہوا تھا..... ایسا بھی کرنے کی کوشش کی گئی تھی، پولیس کے بڑے افسروں کے ساتھ تو چوہدری بلاول کا ویسے ہی اٹھنا بیٹھنا ہے مگر تھنیدار کہتا ہے دوسرے فریق نے اوپر سے بڑا ڈانڈا ہاؤ ڈال رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک بار چوہدری بلاول کو تھنڈیاں ضرور لگوائی ہیں۔“

”چوہدری بلاول بھی پارٹی کا دباؤ ڈالوا دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ان کی پارٹی برسرِ اقتدار نہیں ہے اس لیے ان کی سنی نہیں جانی اب تو پارٹی نے بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ پہلے چوہدری ماتھے پر لگی کالک دھوئے تو اسے ٹکٹ ملے گا ورنہ..... وکیل ہا ہوا اس طرح ٹکٹ چھوڑ دینا مردوں کا کام تو نہیں اور پھر یہ ساری عمر کے لیے طعنہ بن جائے گا۔“

”تھانے کون سا ہے؟“ میں نے اس کی بات ٹوکی۔

”وہ جی گردیال سنگھ کا تھانہ ہے۔“ اس نے بتایا۔
”تھانے کا کوئی ٹیلی فون نمبر یا چوہدری بلاول کا رابطہ نمبر..... کچھ ساتھ لائے ہو؟“ میں نے استفسار

فضل عرف بھیجی کے نوئے پھوٹے دستخط تھے اور محرر کے دستخطوں سے ایف آئی آر مکمل ہوئی تھی۔
ایف آئی آر پڑھنے کے بعد میں نے چوہدری بلاول کے موبائل پر کال کی تھوڑی دیر تک قتل جانی رہی پھر دوسری طرف سے آن ہوا اور ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔

”ہیلو... کس سے ملنا ہے؟“
”اگر میں غلط نہیں تو یہ چوہدری بلاول کا سیل نمبر ہے آپ کون...؟“ میں نے پوچھا۔
”آپ کون... اور کس لیے ملنا ہے؟“
”انہیں کہیے یہ نمبر جو آپ کے موبائل پر آ گیا ہے عبدالقادر ویل کا ہے فارخ ہوں تو مجھ سے بات کر لیں۔“ یہ کہہ کر میں نے موبائل بند کر دیا۔

یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک رواج ہے کہ بڑے لوگ خواتین کو اپنا رعب جمانے کے لیے دوسروں کو بچ کر رہتے ہیں آپ کسی بھی سرکاری دفتر میں چلے جائیں آپ کو چہرہ اسی اندر نہیں جانے دے گا کہ صاحب مصروف ہیں کسی اہم میٹنگ میں بات کر رہے ہیں۔ چاہے اندر صاحب فی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہے ہوں دوسروں کے وقت کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ یہی حال تو ولیتوں اور چوہدریوں کا ہوتا ہے صاحب کا نوکر مالک سے زیادہ صاحب ہوتا ہے۔ بہر حال میں نے غصے میں موبائل بند کر دیا تھا اور دوسرے کیسوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

دفعہ نمبر ۱۷۱ کے تحت چوہدری بلاول کا وہی نمبر جھنگایا گھنٹی ہوتی رہی میں نے بھی دانستہ موبائل آن نہیں کیا پوری گھنٹیاں ہونے کے بعد موبائل بند ہو گیا۔ مردوہ رونا آنے لگی آدھے سے زیادہ نون گزری تو میں نے موبائل آن کر لیا۔ دوسری طرف

بلاک کر دیا ہے۔ میں نے بیٹ خاں کو اطلاع دی تو وہ بھاگا بھاگا جانوروں کے بازے کی طرف آیا تو پیچھے سے دوسرے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ شور کی آواز سن کر بیٹ خاں کی کوٹھی سے سیکڑہ نوکرانی بدحواسی سے بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی کہ تھیں اپنے کمرے میں نہیں ہے اس کا دوپٹہ بیڈ کے آدھا اوپر اور آدھا زمین پر پڑا ہے اور اس کی چوڑیاں ٹوٹی ہوئی ہیں ہم سب ادھر چلے گئے اور تھیں کوڑھونڈنے لگے۔ وہ از خود کہیں نہیں جاسکتی تھی کیونکہ وہ آنکھوں سے اندھی تھی۔ لگتا تھا اس کو زبردستی اغوا کر لیا گیا ہے ابھی اسے تلاش کر رہے تھے۔ خان جی نے سب کامیوں کو کہہ دیا تھا کہ اگر اس بات کی اطلاع کسی نے گاؤں میں کی تو اس کی خیر نہیں۔ لگتا تھا کہ تھیں کو زمین نکل گئی ہے وقت گزر رہا تھا مگر تھیں کا کچھ پتا نہ تھا۔ اگلے روز صبح ہی گاؤں کا بندہ جس کا نام فضل عرف بھیجی ہے اس نے اطلاع دی کہ چری کے کھیتوں میں کسی جوان لڑکی کی لاش ملی چری ہے اس کا چہرہ سٹا کیا گیا ہے۔ اس نے لاش پھینک کر جانے والے آدمیوں کو دیکھا ہے جن میں چوہدری بلاول بھی شامل تھا۔

بیٹ خاں خود ان کھیتوں میں گیا تو دیکھا کہ یہ لاش تھیں کی ہے اس نے لاش کپڑوں اس کی چوڑیوں اور سب سے بڑھ کر ہاتھ کی انگلی میں بڑی سونے کی انگلی سے شناخت کی۔ لاش کا ڈاکٹر ملاحظہ کر دیا گیا تو انکشاف ہوا اس کے ساتھ گینگ ریپ ہوا ہے اور جسم سے چھ گولیوں کے نشان پوسٹ مارٹم میں آئے ہیں۔ دونوں رپورٹیں ایف آئی آر کے ساتھ ہیں۔“

بیان کے نیچے ایف آئی آر درج کر دینے والے کا نام اور انگوٹھا ثبت تھا ایک طرف دوسرے بندے

سے اسی بھاری کھرک آواز میں ملاحت تھی۔

”قادر وکیل بات کر رہے ہیں؟“ پوچھا گیا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے بھی آواز میں نرمی رکھتے ہوئے کہا۔

”چوہدری بلاول بول رہا ہوں ابھی ابھی آپ کا فون آیا تھا۔“ دوسری طرف سے استفسار کیا گیا۔

”میں نے آپ کے کیس کے بارے میں کچھ باتیں کرنا تھیں۔“ میں نے بات کا آغاز کیا۔

”میرے کارندے نے آپ کو بتایا تھا۔“ ادھر سے جواب ملا۔

”آپ کے کیس کی ایف آئی آر میرے سامنے پڑی ہے کچھ باتیں جو اب طلب ہیں اور پھر آپ پسند فرمائیں تو اس کیس کی ذمہ داری اٹھالوں اگر آپ کا ارادہ کسی اور وکیل کو رکھنے کا ہو تب بھی بتادیں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”ارے نہیں نہیں..... یہ آپ کو کس نے کہہ دیا میں نے ہی تو اپنے کارندے کو بھیجا تھا آپ اپنی فیس کے بارے میں بتائیں اور یہ کیس آپ ہی لڑیں گے۔“ میں نے اپنی فیس اور کاغذات کے خرچہ وغیرہ کا بتایا تو دوسری طرف سے چوہدری بلاول بولا۔

”وکیل صاحب! یہ تو محض ضد ہے مخالفین کی وگرنہ جس طرح کی مرضی قسم لے لیں حلف اٹھالیں مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں اور نہ ہی میری صلاح اور مشورہ اس میں شامل ہے۔ اب بتائیں چوہدری بلاول اندھی لڑکیوں سے ایسا کام کرے گا جس کا ذکر ایف آئی آر میں کیا گیا ہے اس کی نقل میں نے بھی نکلوا رکھی تھی آپ کو بھجوانے کے لیے۔“

فیس طے ہونے کے بعد میں نے دوبارہ کہا۔

”آپ اپنے کسی کارندے ممکن ہو تو اسی بزرگ کو

بھجوا کر کاغذات منگوالیں اور ان پر اپنے دستخط کر کے شناختی کارڈ کی کاپی بھجوادیں تاکہ میں آپ کی طرف سے کیس لڑ سکوں اور کچھ رقم بھی بھجوادیں کم از کم فیس کا آدھا حصہ۔“

”میں نے اس ملک میں رہنا ہے اور اسی جگہ سے الیکشن لڑنا ہے۔“ دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

”اصول تو اصول ہی ہوتے ہیں چوہدری صاحب!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا بابا اچھا..... اب آپ کے بس میں جو آگئے ہیں۔ میں آج ہی بھجوا دیتا ہوں بلکہ ابھی تیار کرتا ہوں اسے آپ کے پاس بھجوانے کے لیے۔“ اس کے بعد فون بند ہو گیا۔

کچہری میں آہستہ آہستہ رش ہونے لگا مختلف دیہاتوں، علاقوں اور شہر کے محلوں سے ساکنین اپنی تاربخوں پر پہنچنے لگے تھے۔ دکانداران کے کارندے بغلوں میں نشین اور ان کی فائلیں لفافے اٹھائے حیزی سے عدالتوں کی طرف آ جا رہے تھے۔ میں نے بھی ڈائری دیکھی اور آج کے کیس دیکھ کر ان کی فائلیں میز پر رکھیں جن عدالتوں کے مجسٹریٹ اور جج صاحبان کچہری پر تھے وہاں حاضری لگوانے کو چاچا عبدال کو ضروری کاغذات کے ہمراہ روانہ کر دیا اور اہم کیس خود دیکھ کر انہیں باری کے تحت رکھا۔ عام دنوں میں نو بجے کچہری لگتی ہے اس وقت تک کچہری میں قفل بھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ دس بجے تک تو معاملات پورے عروج پر ہوتے ہیں ابھی دس بجنے میں پانچ دس منٹ باقی ہوں گے جب چاچا عبدال بڑی حیزی کے ساتھ دفتر میں آیا۔

”دو جی پتا چلا ہے شہر میں کسی بڑی سیاسی پارٹی کا جلسہ نکالا ہوا ہے اور شہر کا تمام کاروبار بند ہو چکا

نیزہ افتخ

فریق اپنے ترکش کا ہر تیرا زما کر فتح یاب ہو جاتا تو دوسرا اٹھ کر یا تو باہر نکل جاتا یا پھر کسی دوسری ٹکڑی میں جا بیٹھتا۔

ہیبت خاں سب سے الگ بیٹھا تھا اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہ تھے اس کی باڈی لنگوٹ بٹا رہی تھی جیسے اس قتل کا اسے قطعاً کوئی افسوس نہیں مگر سب کے سامنے وہ اداکاری کر رہا تھا۔ اس نے اس کے قریب سے ہوتا ہوا ہیبت خاں کے قریب پہنچا۔ ہیبت خاں نے استقبالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے اپنا منہ ہیبت خاں کے قریب کر کے کچھ کہا تو ہیبت خاں کو غمی آواز میں بولا۔

”ہاں ہاں تو آنے دو.....“ اس کے ساتھ بیٹھے یار خاں کرار خاں نے پوچھا۔

”کون ہے.....؟“

”ڈی ایس پی طاہر ایوب ہے.....“ ہیبت خاں بولا۔

”ہا ہا..... جتنا تو اس طرح رہا ہے جیسے ملک کا سربراہ آ رہا ہو۔ ارے بھائی آنے دو.....“ کرار خاں ہنستے ہوئے بولا۔

”یہ میز سے بولیں گلاس اٹھا لو اور میز صاف کر دو.....“ ہیبت خاں نے اپنے ملازم سے کہا اور اس سے پہلے کما نے والا ان تک پہنچتا ہیبت خاں کے سامنے رکھا ہوا میز صاف ہو چکا تھا۔

ڈی ایس پی طاہر ایوب اپنے دو سپاہیوں سمیت اس کے پاس پہنچا تو ہیبت خاں نے اس کا اٹھ کر استقبال کیا طاہر ایوب نے آتے ہی کہا۔

”معاف کرنا خاں جی! میں آپ کو اس وقت زحمت دے رہا ہوں لیکن آپ کو پتا ہے قانونی تقاضے بھی پورے کرنا ہوتے ہیں۔“

ہے شٹر ڈاؤن ہو رہے ہیں۔ مجسٹریٹ اور جج صاحبان بھی کام چھوڑ بیٹھے ہیں اور پکھری بھی بند کی جارہی ہے اوپر سے احکامات ہیں معاملہ زیادہ خراب نظر آ رہا ہے۔“ چاچا عبدال ایک سانس ہی میں سب کچھ کہہ گیا۔

میں جیمپیر سے نکلا تو پکھری میں تقریباً افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور لوگ جلدی جلدی پکھریوں سے باہر نکل رہے تھے پھر کچھ ہی دیر میں پکھری خالی ہو گئی۔ میں بھی جیمپیر میں آ گیا تھا ابھی میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ چوہدری بلاول کا وہی نوکرتا گیا اور آتے ہی بولا۔

”توبہ ہے جی..... شہر میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔“

”ہم لوگ اسے تفریح سمجھتے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنا نقصان کر کے خوش ہوتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے فائلوں سے کچھ کاغذ نکالے وکالت نامہ تیار کیا اور جس جس جگہ دستخط مطلوب تھے نشان لگا کر دے دیئے اور کہا۔

”کل تک کاغذات مجھے پہنچا دیئے جائیں۔“



ہیبت خاں کی حویلی نما کوٹھی کے سیر بنزلان میں پچھی کرسیوں پر ابھی بھی سچین کے قتل کا افسوس کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا اس کا ایک کارندہ افسوس کے لیے آنے والوں کو چائے پانی پیش کر رہا تھا۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بات ہیبت خاں کی بہن کے قتل سے شروع ہو کر نہ جانے کہاں تک پہنچ جاتی تھی اور جب وہ اپنی اپنی دلیلوں کی تلواروں سے دوسروں کی سوچوں کو زخمی نہ کر لیتے انہیں سکون نہ ملتا پھر ایک

”جی جی..... میرا مطلب ہے بیٹھیے کچھ چائے پانی ہو جائے باقی کام تو ہوتا رہے گا۔“ بیبت خاں نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

”سب بعد کی باتیں ہیں خاں جی! پہلے ہم اپنا کام کر لیں۔“ پھر اس نے ایک سیاہی کی طرف دیکھا۔ ”کالی پٹسل ہے تمہارے پاس؟“

”وہ تو جی گاڑی میں رکھی ہے۔“ سیاہی نے سبے انداز میں جواب دیا۔

”گنتے ہو..... بالکل گنتے..... جاؤ جا کر لے آؤ۔“ ڈی ایس جی طاہر ایوب نے ڈانسنے کے انداز میں کہا۔

”آپ ٹھہریں میں بندہ بھجاتا ہوں۔“ پھر بیبت خاں نے اپنے نوکر کو آواز دی۔ ”اوئے ایوبے..... جا بھاگ کر باہر سے صاحب کی گاڑی میں کانڈ پٹسل لے آ۔“ تیرہ چودہ سالہ بلائز کا بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور فوراً ہی پلٹ آیا۔

”میں مقتول کا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ڈی ایس جی طاہر ایوب نے کہا۔

”ضرور ضرور..... اب وہاں کیا رہ گیا ہے صرف یادیں ہی باقی ہیں۔ بہت پیار کرتی تھی مجھ سے یقین کریں ابھی تک میرے کانوں میں اس کی جی لالہ..... جی لالہ کہنے کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ لگتا ہے ابھی اندر سے نکل آئے گی۔“ بیبت خاں نے اداس لہجے میں کہا۔

”خان صاحب! مجھے بھی اس بارے میں بڑا دکھ ہو رہا ہے آپ جیسی شخصیت کے ساتھ یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔“ ڈی ایس جی نے جواب دیا۔

دونوں چلتے ہوئے ایک کمرے میں آ گئے کمرہ عام سا تھا کوئی غیر معمولی سجاوٹ بھی نہ تھی۔ ڈی ایس جی نے طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ذرا پردہ نظروں سے

”جی جی..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا..... جی لالہ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں..... میری آنکھوں کے آگے یہ اندھیرا کیوں چھا رہا ہے.....“ میں اسے تسلی دے رہا تھا جب ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے اس نے اس کی آنکھوں کو چیک کیا اور کچھ دوائیاں لکھ دیں

”جی جی..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا..... جی لالہ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں..... میری آنکھوں کے آگے یہ اندھیرا کیوں چھا رہا ہے.....“ میں اسے تسلی دے رہا تھا جب ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے اس نے اس کی آنکھوں کو چیک کیا اور کچھ دوائیاں لکھ دیں

”جی جی..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا..... جی لالہ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں..... میری آنکھوں کے آگے یہ اندھیرا کیوں چھا رہا ہے.....“ میں اسے تسلی دے رہا تھا جب ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے اس نے اس کی آنکھوں کو چیک کیا اور کچھ دوائیاں لکھ دیں

”جی جی..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا..... جی لالہ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں..... میری آنکھوں کے آگے یہ اندھیرا کیوں چھا رہا ہے.....“ میں اسے تسلی دے رہا تھا جب ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے اس نے اس کی آنکھوں کو چیک کیا اور کچھ دوائیاں لکھ دیں

”جی جی..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا..... جی لالہ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں..... میری آنکھوں کے آگے یہ اندھیرا کیوں چھا رہا ہے.....“ میں اسے تسلی دے رہا تھا جب ہم ڈاکٹر کے پاس پہنچے اس نے اس کی آنکھوں کو چیک کیا اور کچھ دوائیاں لکھ دیں

”اورہ معاف کرنا صاحب! میں واقعی سنبھلا گیا ہوں پتا نہیں جذبات میں کیا اول فلول تک رہا ہوں۔ دراصل یہ صدمہ ہی ایسا پھر اوپر سے پولیس کیس اور میری بنی بنائی ساکھ..... سب نے مجھے پاگل کر ڈالا ہے معاف کرنا جی!“ بیبت خاں نے بوکھلائے انداز میں کہا۔

”ہاں تو بہت پیار تھا آپ کو اپنی بہن سے.....“ طاہر ایوب نے ٹھہرے انداز میں پوچھا۔
”سر! اس وقت میرے حواس ٹھیک نہیں ہیں میں آپ سے خود مل لوں گا معذرت خواہ ہوں جناب میں آپ کو پورا وقت نہیں دے سکا۔“
”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... تم نے ہماری گفتگو نوٹ کر لی ہے۔“ طاہر ایوب نے بیک وقت بیبت خاں اور اپنے سپاہی کو کہا۔

”جی سر!“ سپاہی نے جواب دیا۔
”میل مل لوں گا جی آپ سے بے فکر رہیں۔“ بیبت خاں نے اسی انداز میں کہا اور پھر جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر طاہر ایوب کی طرف بڑھائی۔

”معاف کرنا خاں صاحب! ہر آدمی کو ایک ہی ترازو میں نہ تولوا کریں۔“ طاہر ایوب نے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے سپاہی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ بھی نوٹ کر لیا ہے کہ نہیں.....؟“
”جی سر..... کر لیا ہے۔“ سپاہی نے مسودہ ہاند انداز میں کہا۔

”گتہ.....“ طاہر ایوب نے کہا اور اپنی پتلون کی جیب سے چھوٹا سا میپ ریکارڈر نکال کر اس کا بینڈ بند کرتے ہوئے بیبت خاں کو کہا۔

”معاف کرنا خاں صاحب کا نذات کی گواہی

آنکھوں میں ڈالنے کے لیے ڈرائیو دیے ہم واپس آ گئے۔ بس اسی روز سے میری بہن اندھے پن کا شکار ہو گئی میں نے شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔“
”تھیں..... یہی نام تھا نا مقتول کا.....؟“ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

”جی جی.....“ بیبت خاں بولا۔
”آپ کی یہ سگی بہن تھی؟“ ڈی ایس پی نے دوسرا سوال کیا۔
”نہیں جی سوتیلی تھی لیکن مجھے سگی بہن کی طرح عزیز تھی۔“

ڈی ایس پی طاہر ایوب نے بڑی عمیق نظروں سے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا تو بینڈ کے قریب سے اسے چوڑی کانگڑا ملا اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور سپاہی کو سنبھالنے کے لیے کہا۔

”ہوں تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟“ طاہر ایوب ڈی ایس پی نے دوبارہ بیبت خاں نے پوچھا۔
”جی میں بتا رہا تھا وہ مجھے بہت عزیز تھی۔“ بیبت خاں نے رو ہانسی آواز میں جواب دیا۔ ابھی وہ با میں کمرہ ہی رہے تھے کہ ایک ملازم بھاگتا ہوا اندر آیا۔

”خان جی..... خان جی..... ایک بری خبر؟“
”کیا ہوا؟ کیوں اس قدر بولا یا ہوا ہے۔“ بیبت خاں اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”وہ جی..... قبرستان میں کتوں نے بی بی صاحبہ کی قبر کو کھول دیا ہے اور اس میں سے بی بی صاحبہ کا کفن نظر آ رہا ہے۔“

”کیا بکواس کرتے ہو..... اس عورت نے مر کر بھی میرے لیے مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔“ بیبت خاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر فوراً ہی اسے جیسے اسے ہوش آ گیا۔

سنہری باتیں

● محبوبوں میں شدت اس وقت تک رہتی ہے جب تک وصال نہ ہو جب ہجر محبت میں سے تفریق ہو جاتا ہے تو محبت میں کشش ختم تو نہیں البتہ بہت قلیل رہ جاتی ہے۔

● جب عورت والدین کے گھر سے رخصت ہو رہی ہوتی ہے تو دوسری طرف عورت کی "میں" ختم ہو رہی ہوتی ہے۔

● زندگی ایک عجیب سفر ہے جس کے کسی انٹیشن کا پتا نہیں چلتا کہ کہاں پر گاڑی رکے گی۔

● عورت کی سادہ آنکھیں جھکی پلکیں اس کی حیا کی دلیل ہیں۔

● جب تم برابر وقت آئے تو اچھے وقت کو یاد کرو۔
● دلوں کو فتح کرنے کے لیے تلوار کی نہیں قلم کی ضرورت ہوتی ہے (ٹیکسپیئر)

● ہم اندھیرے سے ڈرنے والے بچے کو با سانی دروازہ کر سکتے ہیں لیکن زندگی کا حقیقی المیہ یہ ہے کہ لوگ روشنی سے ڈرتے ہیں (دلیل کروٹھی)۔

● اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مسرت کو خاک میں ملاؤ (برنیزنڈ رسل)

محمد ارسلان ... اسلام آباد

دوسرے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے چوہدری بلاول کے گن مین ہاتھوں میں جدید اسلحہ بکڑے ادھر ادھر گھوم رہے تھے عجیب تناؤ زدہ ماحول تھا۔ کھانا کھانے کے بعد پولیس والے اٹھے ان میں سے ایک بڑے نے چوہدری بلاول کے کارندے سے کہا۔

"چوہدری صاحب کو بولنا ہم آئے تھے انہیں اپنی ضمانت کروانی چاہیے ہماری اوپر بڑا دباؤ پڑ رہا ہے

اگر چہ سچی ہوتی ہے لیکن کایاں آ دی جب مکر جائیں تو یہ گواہی بھی گونگی ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نے یہ جرات کر لی نہ ریکارڈ ہو گئی ہے ہماری گفتگو تاکہ سندھ رہے امید ہے آپ برائے مانیں گے۔" یہ کہتے ہوئے طاہر ایوب اپنے سپاہی کو لے کر تیزی سے باہر نکل گیا اس کے جاتے ہی بیٹ خاں کی حویلی میں گویا زلزلہ سا آگیا۔

"اوئے فیضو کدھر ہے.....؟ بلاؤ اس ماں کے.....؟" غصے میں بیٹ خاں دہاڑا اٹتے میں فیضو ڈرتا اور کانپتا ہوا قریب آ گیا۔

"اوئے تمہیں اتنا نہیں پتا جب دو بڑے ہاتوں میں مصروف ہوں تو ان کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے۔" بیٹ خاں نے غصے میں پوچھا۔

"پتا تھا خاں جی لیکن بات ہی ایسی تھی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔" فیضو نے ڈرتے ہوئے رک رک کر جواب دیا۔

"جاؤ بلا بختوانی کو..... اور اس کا سر موچھیں" دائی اور ابرو سب موڑے ہوئے تھمہاری غلطی کی یہ سب سے چھوٹی سزا ہے ورنہ تو جانتا ہے بیٹ خاں بندہ مرادے تو اس کی کھونج بھی نہیں نکلتی وہ تو..... جو کندھوں پر پھول لگا کر اڑتا پھرتا ہے اس کو تو میں بعد میں دیکھوں گا۔ سالا جیب میں ٹیپ لیے پھرتا ہے اور اکھاڑ دو یہ سب شامیائے کرسیاں اٹھادو۔ بہت ہو چکا سوگ حرام خور مرتے مر گئی لیکن ہمیں مصیبت میں ڈال گئی ہے اور تم..... بندے ساتھ لے جاؤ قبرستان اچھی طرح سے دوبارہ قبر بناؤ ایک دو دن تک اس کا بھی کچھ کرتا ہوں۔"



چوہدری بلاول کی حویلی کے لان میں گئے شامیائیوں کے نیچے چند پولیس والے اور کچھ

ہم آپ کا ٹک کھاتے ہیں ہمارا کام تو آپ کو بتانے کا ہے ویسے آج کل لاہور ہوتے ہیں یا کچھ گاؤں بھی آتے ہیں۔“

”اوپر لاہور ہی ہوتے ہیں گاؤں کم ہی آتے ہیں میں بتا دوں گا انہیں۔“ کارندے نے جواب دیا۔

”کب تک میں کاندوں کا پیٹ یہ لکھ کر بھرتا رہوں گا کہ وہ گاؤں میں نہیں ہیں ہم بھی مجبور ہیں۔ کیا کریں ان کا خیال کریں یا قانون کو دیکھیں۔“ جاتے جاتے پولیس والے کہہ گئے۔

پولیس والوں کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب حویلی میں چوہدری بلاول کی پجارد آ کر رکی۔ کلف لگے کپڑوں میں مٹیوں ہاتھ میں نئے ماڈل کا مہنگا موبائل پکڑے پجارد سے نیچے اتر آ تو وہ کارندہ بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور پولیس کا پیغام اسے پہنچا دیا۔

”اچھا اچھا... ان سے بھی مٹ لیں گے وہ باورچی کدھر ہے اسے بلواؤ۔“ ملازم نے وہیں کھڑے کھڑے باورچی کو آواز دی تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آ گیا۔

”جی چوہدری صاحب! وہ آتے ہی بولا۔“

”بابا! دیکھو میرے چند خاص مہمان دوپہر کو آنے والے ہیں ان کے کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔ پھلی کے کنٹینر بن جائیں گے۔ میں پھلی منگوادیتا ہوں ساتھ چکن کڑی بنالینا بیٹھے ہیں اگر کسٹرو بن جائے تو ٹھیک ہے ورنہ فرنی بنالینا لیکن شکایت نہیں ہونی چاہیے۔“

”پہلے کبھی شکایت ہوئی ہے چوہدری صاحب!“

وہ منمنایا۔

”میں آج کی بات کر رہا ہوں میری عزت کا

سوال ہے۔“ چوہدری دوبارہ بولا۔

”ٹھیک ہے چوہدری جی آپ ان کے لوازمات منگوائیں۔“

”میں ذرا کیور کو بھیجتا ہوں چاہو تو خود ساتھ چلے جاؤ اور پسند کی چیزیں لے آؤ یا اسے لکھ دو یہ لے آئے گا۔ دیکھ فرید۔۔۔۔۔ اوئے فرید۔۔۔۔۔“

”جی چوہدری صاحب!“ فرید بھاگا بھاگا آیا۔

”تم بابا کو ساتھ لے جاؤ بازار سے کچھ چیزیں لانا ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کچھ پیسے نکال کر بابا کو پکڑائے اور خود دوسری طرف چلا گیا۔ حویلی میں چند ایک لوگ بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے جب انہوں نے چوہدری بلاول کو دیکھا تو جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”اوئے نصیرے۔۔۔۔۔ کارکون لے کر گیا ہے۔“

”جی وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی! دھکا لگا کر مکینک کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔“ نصیرے نے جواب دیا۔

”اس سالی کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا کب تک ٹھیک ہوگی؟“ چوہدری بلاول نے پوچھا۔

”میں فون کرتا ہوں ابھی پوچھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر

اس نے اپنے کتے کی جیب سے پرانے ماڈل کا موبائل نکالا اور مکینک کو فون کرنے لگا۔ فون ہونے میں کچھ دیر لگی تو چوہدری بلاول نے ہنس کر کہا۔

”اوئے سالے۔۔۔۔۔ بابا آدم کے وقت کا موبائل رکھا ہوا ہے وہ جو تم روزانہ لوگوں سے چھینتے ہو ان میں سے کوئی ایک رکھاؤ۔“

”آپ چاہتے ہیں کہ مدعا سمیت پکڑا جاؤں! وہ تو ادھر چھینا ادھر بیچنے والا معاملہ ہوتا ہے۔“ اس نے دوبارہ فون ملاتے ہوئے جواب دیا کچھ دیر کے بعد فون کر کے اس نے بتایا کہ کارٹھیک ہو چکی ہے اور

ذرا نیوراسے لے کر رہا ہے۔ ”کچھ بھی کہہ لو لیکن چوہدری نہیں.....“ چوہدری

”اچھا نصیر ہے اور کھو یہ حویلی کو صاف ستھرا کر لو“
شہر سے بڑے بڑے لوگ آرہے ہیں میں کوٹھی میں
انہیں کھانا کھلا کر حویلی میں لے آؤں گا۔ ٹھیک ہے
یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے یہ جتنا قالو سامان اور
نوٹی ہوئی چیزیں ہیں یہاں نظر نہیں آتی چائیں۔“
ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ کار حویلی کے اندر آ گئی
کارتے دیکھ کر چوہدری بلاول ادھر جانے لگا جاتے
جاتے اس نے ایک بار پھر نصیر کے کی طرف دیکھا۔
”سمجھ گئے ہوناں۔“

”جی جی، چوہدری صاحب! آپ فکر ہی نہ
کریں۔“ چوہدری بلاول کار میں بیٹھا اور کوٹھی چلا گیا
کوٹھی میں داخل ہوتے ہیں وہ دہانڈا۔
”جینی..... او جینی.....“ اس کی آواز سننے ہی دس
بارہ سال کی ایک کالی کلوٹی لڑکی اپنے گیلے ہاتھوں کو
دوپٹے سے پونچھتی ہوئی آ گئی۔
”وہ اندر دیکھو نوشین آئی ہے۔“

”ان کے سامنے چند ٹاپے کے لیے.....“
چوہدری بلاول نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کچھ اس
طرح کا انداز اختیار کرنا ہے کہ وہ لوگ مجھے پارٹی
ٹکٹ دے کر ہی جائیں۔ ان میں ایک آدمی
بااختیار ہوگا میں تمہیں اشارہ کر دوں گا بس تم نے
اس کے ارد گرد ہی رہنا ہے یہ کام تو بڑی آسانی سے
کر سکتی ہو۔“

”جی اچھا.....“ وہ یہ سننے ہی اٹھنے قدموں واپس
چلی گئی چند لمحوں کے بعد اس کے ساتھ اٹھارہ بیس
سالہ جیکھے نقوش اور ہنستی بڑی آنکھوں والی گوری جٹی
لڑکی باہر آ گئی۔
یہ نوشین بھی اسے آپ صبح کی چٹکی اور کچھ کچھ
سانولی روشنی کہہ لیں یا کٹرل دوپہر کی دھوپ۔ وہ
آتے ہی چوہدری بلاول کے نزدیک سے کربولی۔
”جی چوہدری جی.....“

”ہزار بار کہا ہے تمہارے منہ سے چوہدری کا
لفظ جتنا نہیں ہے۔“ چوہدری بلاول نے ملائم لہجے
میں کہا۔
”تو اور کیا کہوں..... جان..... جانو.....
جانی.....“ اس کے لہجے کی گھنٹیاں اک دم بج اٹھیں۔

پھر اس بات پر دونوں ہنس پڑے نوشین کو
چوہدری بلاول ہمیشہ لٹکائی کہہ کر پکارتا تھا گاؤں میں
ایک ہی تو لڑکیوں کا ہڈل درجے کا اسکول تھا جس
میں اس سمیت دو اور بچہ تھیں مگر نوشین ان سے
خوب صورت تیز طرار اور بھرپور جوان بھی۔ اسے

نظر ڈالی۔

”اوہ..... وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے میں چلتا ہوں مجھے اور بھی کام دیکھنے ہیں۔“



دو پہر ڈھلنے سے پہلے پہلے دو تین کاریں اور ایک نئے ماڈل کی چھپائی پجارو چوہدری بلاول کی حویلی میں آ کر رکیں چوہدری بلاول کا کارندہ گاڑیوں کو ترتیب سے حویلی میں لگوار ہاتھ اور چوہدری بلاول خود آئے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ انہیں ترتیب سے لگوانے کے بعد چوہدری بلاول نے اپنی پجارو اور کار میں مہمانوں کو بٹھایا اور ان کے ساتھ خود بھی کوٹھی میں آ گیا۔ کوٹھی کے لان میں چھٹی ہوئی کرسیوں پر مہمانوں کو بٹھا کر وہ اندر چلا گیا جہاں نوشین بڑا خوب صورت لباس اور میک اپ میں ملازموں کو ہدایات دے رہی تھی۔

”مہمان آچکے ہیں.....“ اس نے نوشین کے قریب آ کر سرگوشی کی۔

”پھر ڈرکا ہے کا۔“ نوشین نے آنکھیں مڑا کئیں۔ ”کھانا تیار ہے ایک بار مہمان خانے پر نظر ڈال لیں کوئی کمی بیشی ہو تو بتادیں۔ میٹنگ ادھر ہی ہوگی ناں۔“ نوشین نے دریافت کیا تو وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا مہمان خانے میں آ گیا۔ ایک بڑے لیکن درمیانی میز کے ارد گرد بڑی ترتیب سے کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چوہدری بلاول کو لگا جیسے اس کی ترتیب پہلے سے بہتر اور خوب صورت انداز میں کر دی گئی ہو اس نے داوی دی۔

”شکریہ۔“ نوشین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

مہمانوں کو بوتلیں سرور کر دی گئی تھیں اور پھر جب وہ ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تو لان میں آ کر اس نے

بات کرنا اور کسی بھی راہی کو اپنے رستے سے چلتے ہوئے بھٹکانے کا انداز آتا تھا۔ چوہدری بلاول کا اس سے تعارف ایک اسکول فنکشن میں ہوا تھا جس کی وہ صدارت کر رہا تھا اور نوشین میزبان تھی۔ اسکول کی ہیڈ مسٹر بیس ادھیر عمر اور ڈپٹی ڈپٹی ڈپٹی خاتون تھیں وہ اگر شام بھی تو یہ ایک کڑکٹی اور کوکتی ہوئی دو پہر تھی۔ فنکشن میں نوشین نے کچھ اس طرح سے چوہدری بلاول کی پذیرائی کی تھی کہ فنکشن ختم ہوتے ہی چوہدری بلاول اپنا آپ وہاں بارہا آتا تھا۔

اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً نوشین سے وہ ہنسا ہنسا اور پھر آج کل کے دور میں سب سے بڑا رابطہ موبائل سے جو سب سے بڑا زوردار ہے۔ نوشین سے رابطے بڑھے تو چوہدری بلاول کی تمام عنائیں نوشین پر برستے لگیں اور آج اس کا سب سے بڑا امتحان تھا۔

وہ کچھ دیر اس کے قریب کھڑی اپنے ایک ناخن سے دوسرے ہاتھ کی انگلی کے ناخن سے نیل پالش اکھاڑتی رہی جب وہ خاموشی کی پاتال میں کہیں گم تھی تو چوہدری بلاول نے اس کا سکوت توڑا۔

”آج کا سارا فنکشن تمہارے نام اور تمہاری کامیابی میری کامیابی ہے میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مزاتو نوشین فوراً بول اٹھی۔

”مگر وہ آپ کی بیگم کہیں.....“

”ایک بات ذہن میں رکھو ہم زمیندار و ذریعوں کی گھریلو عورتیں کبھی کسی کے سامنے نہیں آتیں اسے کوئی غرض نہیں کوٹھی میں کیا ہو رہا ہے اور کون کیا کر رہا ہے۔ وہ ہمارے حکم کی پابند ہوتی ہیں ہمارے حکم کے بغیر یہاں پہنچے بھی نہیں مل سکتا۔ وہ تو پھر ایک کنزرو اور نمائی سی عورت ہے تم بے فکر ہو کر کام کرو باورچی بابا تمہاری مدد کرے گا۔ باقی سامان بچن میں موجود ہے اوکے۔“ پھر اس نے کمرے میں لگے ہوئے کلاک

”میری سیکرٹری نوشین.....“ چوہدری بلاول نے تعارف کرایا۔ اس نے ہلکی سی جھنجھٹ سے داو دیتی نظروں کا جواب دیا اور چوہدری بلاول کی قمرانی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ نئی تبدیلی ہے، لگتا ہے ابھی سے لیڈر ہو گئے ہو۔“ ایکہ واذا آئی۔

”سمجھ دار اور عقل مند دوستوں کی سنگت میں کیا پلٹ ہوئی جاتی ہے۔“ دوسری آوازا بھری۔

”بالکل درست کہا.....“ چوہدری بلاول نے جواب دیا۔

”نیں پارٹی کے مخصوص اور بڑے عہدہ داروں کے ساتھ اس لیے ادھر آیا ہوں کہ پارٹی کچھ وضاحتیں آپ کی طرف سے چاہتی ہے اگر ان پر پورا اترے تو آپ کو اس حلقہ سے پارٹی ٹکٹ دے دیا جائے گا ورنہ آپ کو پتا ہے کہ پارٹی میں اس حلقے کے لیے اور بھی نئی لوگوں کی درخواستیں موجود ہیں لیکن آپ کو اس لیے اہمیت دی جا رہی ہے کہ آپ پارٹی کے پرانے نمبر ہیں اور آپ کی پارٹی کے لیے خدمات بھی دوسروں سے زیادہ ہیں وہ آپ کے کیس کا کیا ہوا؟“ اس بڑے نے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں ہوا واصل میں نے ابھی سنجیدگی سے اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں۔“

”کیا آپ کی سیکرٹری ہماری گفتگو کے دوران ادھر بیٹھیں گی؟“ اس نے پوچھا۔

”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو.....؟“ چوہدری بلاول نے جواب دیا۔

”رہنے دیں جی، ہوا کا تروتازہ جھونکا آتا رہے تو زمین کی پالیدگی برقرار رہتی ہے۔“ دوسرے نے جواب دیا تو اس پر ایک بھرپور تہنید بھری۔

”لگتا ہے لوگوں کی طرف سے مزاح اور مزاح

مہمانوں کو کھانے کے لیے مدعو کیا انہوں نے اپنے ایک سینئر کو آگے ہونے کی دعوت دی۔ وہ اونچے لمبے قد اور بڑی بڑی خوب صورت انداز میں تراشی موٹھوں والا ایک پچاس پچپن سال کا مضبوط جسم کا مالک تھا جس نے بڑی ٹیس کمائی کی سٹیک لگا رکھی تھی اور کھف لگے شلواریں کھانے کے اوپر اسی ٹکڑ کی واسکت پہن رکھی تھی۔

وہ آگے بڑھا تو دوسرے بھی اس کے پیچھے ہل نما کمرے میں آگئے وہاں بڑی نفاست کے ساتھ کھانا پہلے سے چنا ہوا تھا وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران ہلکی ہلکی باتیں اور قہقہے لگتے رہے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چوہدری بلاول انہیں مہمان خانے میں لے آیا۔

”چائے ادھر چل کر پیتے ہیں۔“ چوہدری بلاول نے کہا تو وہ سارے اس بات پر راضی ہو گئے مہمان خانے میں بھی بڑی سادگی لیکن نفاست سے ڈرائش کی گئی تھی۔

”لگتا ہے یہاں آپ سے زیادہ نفاست پسند ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس گزارا بنے ہم غریبوں کے ڈیرے ہوتے ہیں کوھیاں تو شہر والوں کے نصیبوں میں ہوتی ہیں۔ یہ تو ٹیم کو پڑھائی لکھائی نے شدید دے رکھی ہے اس لیے وہ ایسے کام کرتی رہتی ہے ورنہ ہم تو دیہاتی ہیں سدا کے دیہاتی۔“ چوہدری بلاول نے ہنستے ہوئے ویل دی۔

وہ سارے جب بیٹھ گئے تو کچھ وقفے کے بعد ایک تازہ اور اعلیٰ خوشبو کا بیول تیرتا ہوا مہمان خانے میں داخل ہوا وہ اس قدر اچانک اور اتنی تیزی سے اندر آئی کہ سب کی نظریں یکدم اس کی طرف اٹھیں اور پھر جیسے جم کر رہ گئی ہوں۔

کی رنجینی میں فرق نہیں آیا۔“ کسی دوسرے نے کہا۔
 ”ہاں اگرچہ ہدیری بلاول نے محسوس نہ کریں تو ہم
 ان کا یہ شو میں اسد صاحب کی بغل میں دیکھنا چاہیں
 گئے وہاں کیسا لگتا ہے۔“ لودھی نے دوبارہ ہنس کر
 تجویز پیش کی۔
 ”انہیں پارٹی میں کیوں نہیں لاتے۔“ اسد نے

صاحب! اسد نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔
 ”میں نے بتایا کہ ابھی میں نے اس کیس کو
 سنجیدگی سے نہیں لیا، میں اندر سے مطمئن ہوں
 کیونکہ میں بے گناہ ہوں اور محض دشمنی کی بنا پر مجھے
 اس میں الجھایا گیا ہے۔ میں نے پہلے مینٹل میں
 واضح کیا تھا۔“

چوہدری بلاول سے پوچھا۔
 ”میں پارٹی میں ہوں تو یہ بھی پارٹی میں ہے۔“
 چوہدری بلاول نے جواب گول کیا۔
 ”نہیں ایسے نہیں، ہم انہیں پارٹی کی لیز ونگ
 میں کوئی عمدہ دیں گے۔“ اسد نے دوبارہ کہا۔
 ”بات کسی اور طرف جانکی، میری تجویز کا کیا
 بنا۔“ لودھی نے دوبارہ آواز اٹھائی۔

”ٹھیک ہے لیکن آج کل ماحول بدل گیا ہے
 آج لوگ بہت تیز اور آگے چل چکے ہیں۔ کسی زمانے
 میں پولیس ہماری عزت کرتی تھی ہمارے پوچھے بغیر
 کوئی کیس تھانے میں رجسٹر نہیں ہوتا تھا لیکن اب
 وہ بھی ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں اگر آپ کو پارٹی
 ٹکٹ دے دیتی ہے اور مخالف اپنا داؤ استعمال کرنے
 میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کسی مرحلے میں آپ کی
 گرفتاری ہو جاتی ہے تو پارٹی بدنام ہو جائے گی اس
 لیے ہم نے کہا تھا۔“

اس بات پر اسد کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک شخص
 نے اپنی کرسی پیش کی اور اٹھ کر دوسری نشست پر بیٹھ
 گیا۔ چوہدری بلاول نے نوشین کی طرف دیکھا تو وہ
 اپنی جگہ سے اٹھی اور کیٹ واک کرتے ہوئے اسد
 کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب بھی سب کی
 نظریں اسی کی طرف لگی ہوئی تھیں اور نوشین کو بھی اس
 بات کا پوری طرح احساس تھا جی تو اس کی ہر ہر ادا کا
 فرائض ہو رہی تھی۔

”مگر اس سلسلے میں پارٹی نے بھی میرا ساتھ نہیں
 دیا حالانکہ متحارب فریق اپنی پارٹی سے ہر قسم کی
 سہولتیں اور مراعات لے رہا ہے اس کیس کو رجسٹر
 کروانے میں بھی اس کی پارٹی کا بڑا ہاتھ ہے۔“
 چوہدری بلاول نے گلہ کیا۔

”گلد۔۔۔۔۔ اب ہوئی ناں بات، خوب گزرے گی
 جوئل بیٹھیں دیوانے دو۔“ دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی
 نوشین سے نہ ہا گیا اور کھل کر ہنس دی جلت رنگ سی بج
 اٹھی۔

”سب ٹھیک ہے پارٹی پوزیشن کو بھی تم جانتے
 ہو، برسر اقتدار پارٹی اور اپوزیشن میں بہر حال فرق تو
 ہوتا ہے۔“

”اوہ عڑ یا۔۔۔۔۔ ہنستی ہے تو بولتی بھی ہوگی۔“ لودھی
 نے چمکتے ہوئے کہا۔

”اگر پارٹی اپنے ممبر کا تحفظ نہیں کرتی تو اور
 کون کرے گا؟ میں پارٹی معاملات پر معذرت
 خواہ ہوں۔“ ایک کھٹکتی ہوئی زمانہ آواز ابھری تو
 سب کی نظریں اس آواز کی طرف اٹھیں۔ یہ
 نوشین کی آواز تھی۔

”بس بھئی بہت ہو چکا اب اصل بات کی طرف
 آتے ہیں۔“

”بات تو غور طلب ہے۔“ ایک مردانہ آواز

”ہاں تو آپ کچھ بتا رہے تھے چوہدری ابھری۔“

پارٹی کو ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔“ لودھی نے بات آگے بڑھائی۔

”جیسے چوہدری بلاول چاہیں گے میں فیصلہ کر لوں گی۔“ نوشین نے جواب دیا۔

”گویا آپ کی ڈور چوہدری بلاول کے ہاتھ میں ہے۔“ ایک بولا۔

”یونہی سمجھ لیں۔“ نوشین مسکرا کر بولی۔

”میں آپ کے فیصلے کا منتظر رہوں گا یہ رہا میرا وزیٹنگ کارڈ۔“ آپ براہ راست بھی مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکتی ہیں۔“ نوشین کی نظریں چوہدری بلاول سے ملیں تو چوہدری نے آنکھ کے اشارے سے اسے کارڈ لینے کا کہا۔ نوشین نے کارڈ پکڑ لیا اس کے بعد وہ سارے اٹھ گئے سب نے فرداً فرداً چوہدری بلاول سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد نوشین سے بھی ہاتھ ملایا سب سے آخر میں اس نے نوشین سے ہاتھ ملایا اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پچھ دیر اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامے رکھا اور ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں ذاتی طور پر آپ کی آمد کا منتظر رہوں گا“ آپ جیسی خوب صورت اور باصلاحیت خواتین کی پارٹی میں شمولیت سے پارٹی مضبوط ہوگی۔“

”میں کوشش کروں گی۔“ نوشین نے مسکرا کر اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”اوکے ایک بار پھر پارٹی ٹکٹ کی پیشگی مبارک۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا اور کونہی کے لان میں آگئے چوہدری بلاول کے ڈرائیور فوراً انہیں لے کر حویلی آ گئے۔

”میرے آنے تک رکتا۔“ چوہدری بلاول نے نوشین کو کہا اور ان کے ساتھ حویلی آ گیا۔ چوہدری اپنے گاڑن سمیت اپنی پکار میں بیٹھا اور گاؤں کی

”حکم پارٹی کے معاملات میں آپ کس حساب سے دخل اندازی کر رہی ہیں؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میں پہلے معذرت کر چکی ہوں اگر آپ کو برا لگا ہے تو ایک بار پھر میں معذرت خواہ ہوں۔ مگر ایک بات کہے بغیر نہ رہ سکوں گی کہ اس حلقے سے چوہدری بلاول سے زیادہ اچھا امیدوار آپ کو نہیں ملے گا جو ہر لحاظ سے جیتنے کی پوزیشن میں ہے۔“ نوشین نے ایک بار پھر دلیل دی ابھی وہ باتیں کر رہے تھے کہ چوہدری بلاول کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

چوہدری بلاول نے موبائل کو دیکھا اور آن کرتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس مہمان خانے میں آیا تو پارٹی کے بڑے عہدہ دار اسد کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”میرے وکیل عبدالقادر کا فون تھا اس نے بتایا کہ میری ضمانت قبل از گرفتاری عدالت نے منظور کر لی ہے۔“

”گلد۔۔۔۔۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”پھر میں ایگزیکٹو باڈی کے چیئرمین کی حیثیت سے اس حلقے سے آپ کو ٹکٹ کی یقین دہانی کراتا ہوں“ آپ کو اس کی پیشگی مبارک باد ہو۔ پارٹی چیئرمین کے دستخطوں کے بعد آپ کو باقاعدہ اس کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا جائے گا۔“ اسد نے آہستہ آہستہ اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تو تمام دوستوں نے اس بات کی نہ صرف بھرپور تائید کی بلکہ تالیاں بجا کر اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

”تو پھر آپ نے پارٹی کی رکنیت لینے کے بارے میں کیا سوچا؟“ اسد نے اب نوشین کو مخاطب کیا۔

”آپ جیسی ذہین اور باصلاحیت خواتین کی

”تم ہمیشہ سے میرا دل ہی ہو۔“ چوہدری بلاول نے ہنس کر کہا تو نشلی نے اپنا سر اس کے چوڑے چپکے سینے پر رکھ دیا۔



شہر میں ہونے والے ہنگامے اور توڑ پھوڑ کے بعد ذرا سکون ہوا تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کاروبار کھلے تو بازاروں میں خریداروں کا رش جاگ اٹھا۔ کچھریاں بھی کھل چکی تھیں، قادر وکیل اپنے جیمبر میں بیٹھا آج کی تاریخ والے کیسوں کی فائلیں دیکھ رہا تھا۔

”کوئی دوبارہ تو قین کیسز ہیں میرے خیال میں ان کی صرف تاریخیں ملتی ہیں۔ تم ان عدالتوں کا چکر لگا آنا۔“ قادر نے اپنے ٹائپسٹ کو فائلیں دیتے ہوئے کہا۔

”میں دوسرے جج کی عدالت میں ہوں گا“ چوہدری بلاول کا کیس آج لگا ہے پہلی تاریخ ہے پھر مجھے اپنا دکان کا نامہ بھی داخل کرانا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو مجھے ادھر سے بلا لینا۔“ میں نے بتایا اور کیس کی فائل اٹھا کر اس متعلقہ عدالت کی طرف جانے لگا۔ میرا ایک قدم ابھی جیمبر اور دوسرا باہر تھا کہ وہ بدحواس ہو کر بھاگتا ہوا جیمبر میں داخل ہوا۔

”تمیں چونتیس سالہ گھنے جسم کا اونچے قد کا ٹھکانا دیکھائی سنا تو جوان تھا، جو بہت صبر پایا ہوا تھا اندر آتے ہی وہ ڈر سے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے جی..... قادر وکیل سے ملنا ہے۔“

”میں ہی قادر ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے ڈر سے انداز میں کہا۔

”تم بیٹھو میں عدالت سے ہو کر آتا ہوں۔“

حدود سے انہیں باہر تک چھوڑ کر واپس آ گیا وہ سیدھا کونھی میں آیا تھا جہاں نوشین ابھی تک اس کی منتظر تھی۔

”یہ سب تمہاری محنتوں کا ثمر ہے۔“ چوہدری بلاول نے نوشین کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ نوشین بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ چوہدری بلاول نے نوشین سے پوچھا۔

”کوئی پرابلم..... نشلی.....“ وہ دوبارہ بولا۔

”کچھ نہیں اپنے چہرے پر جمی ان شہدوں کی جتنی نظریں صاف کر رہی ہوں۔“ نوشین مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہک سنے گا لے بادلوں میں چھپی ہوئی سفید دودھیا روشنی اچھی نہیں لگتی اور گھبائی ہوئی چاندنی چوہدری بلاول ویسے ہی پسند نہیں کرتا۔“ چوہدری بلاول نے اس کے سفید گلابی گال تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا تو نشلی کا جلتے گلاب ایک بار پھر بج اٹھا۔

”اب میں جاؤں۔“ نشلی نے پوچھا۔

”شکریہ..... ایک بار پھر شکریہ یہ کام تم ہی کر سکتی تھیں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ میں اب آزادی سے اس کیس کے بارے میں سوچتا ہوں اس کم بخت نے ایک نئے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے اگر تم مناسب سمجھو تو پادری سے میرے لیے کوئی مدد بھی لے سکتی ہو۔“ چٹھ سوچتے ہوئے چوہدری بلاول نے نشلی سے کہا۔

”میرے اچانک بولنے سے وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے تھے ضرورت پڑی تو بند ہی پھر بھی آپ کے لیے حاضر ہے۔“ نشلی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

”کتنی دیر لگے گی؟“ اس نے استفسار کیا۔

”کچھ دیر تو لگے گی ہی میں نے بتایا تم جیمبر میں بیٹھو عبدال چاچا! مہمان کو چائے دے پلاؤ۔“ میں نے عبدال چاچا سے کہا اور دوبارہ باہر نکل آیا۔

”ذرا جلدی آنے کی کوشش کیجیے گا صاحب! مجھے جانے کی جلدی ہے۔“ اس کی فضا میں تیرتی آواز آئی۔

میں عدالت میں پہنچا ابھی میرے کیس میں دیر تھی میں عدالت کے کمرے میں داخل ہوا اور جج کے ریڈر سے مخاطب ہو کر میں نے اپنی فائل اس کے حوالے کرتے ہوئے بتایا کہ چوہدری بلاول کیس میں تاریخ دے دی جائے ابھی تک عدالت میں جج نہیں آیا تھا۔ ریڈر سے میری شناسائی تھی اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور فائل لے کر رکھ لی۔

”میں دوبارہ چکر لگاؤں گا یا اپنے آدمی کو بھیج کر تاریخ کے بارے میں پوچھ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ریڈر نے جواب دیا۔

اور میں عدالت کے کمرے سے باہر نکل آیا تیزی سے چلتا ہوا اپنے جیمبر میں داخل ہوا تو مجھے وہ آدمی نہیں نظر نہیں آیا۔ چاچا عبدال دوسرے جیمبر میں بیٹھا تھا مجھے کچھ کرو بھی آ گیا اور اتے ہی بولا۔

”عجیب ہونق شخص تھا میں نے اسے پانی پلایا اور چائے کا کہنے چلا گیا واپس آیا تو وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔“ میں دوبارہ آتا ہوں میں نے کہا کہ میں اس کے لیے چائے کا کہہ کر آیا ہوں تو وہ بولا ”پتا نہیں وکیل صاحب کو کتنی دیر لگ جائے میں اتنے میں شہر دوسرا کام کر کے آتا ہوں ان سے کہیے گا میرا انتظار کریں کہیں اور نہ جائیں مجھے ان سے ضروری بات کرنا ہے چوہدری بلاول کیس سے متعلق۔“

میں نے آج کا اخبار بھاگایا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا میرا شیوا ابھی تاریکیوں میں لے کر واپس نہیں آیا تھا میں کتنی دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا تو میں اگلے روز گلنے والے کیسوں کی فائلیں دیکھنے لگا۔ میں اس وقت تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ وہ دوبارہ آ گیا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک ہوا سانس اڑی ہوئی تھیں آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

”آپ ہی قادر وکیل ہیں ناں؟“ اس نے اپنے آپ کو ایک بار پھر یقین دہانی کروانے کی خاطر پوچھا۔

”ہاں..... ہاں بھئی تمہیں کوئی شک ہے۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ خوف زدہ انداز میں مسکرایا۔

”میرا نام سلیم عرف چشتی ہے میں بیت خاں کے گاؤں سے آیا ہوں اور خان کا بڑا خاص ملازم ہوں یوں کہہ لیں اس کی مونچھ کا بال ہوں۔“

”ہوں..... میں نے دلچسپی ظاہر کی۔“

”میں آپ کو اس کیس کے بارے میں خاص معلومات دے آیا ہوں۔“ اس نے اپنے ارد گرد دیکھ کر کہا۔

”یہ میرا چیرا چاچا عبدال سے اور دوسرا میرا شیوا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک جیمبر میں کوئی دوسرا نہیں ہے تم بلا خوف بتاؤ کیا بتانا چاہتے ہو؟“

”اگر میں کہوں کہ بیت خاں نے چوہدری بلاول کو مخض پھسانے کے لیے مل کا یہ کیس ان پر ڈالا ہے تو؟“

”تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو جبکہ چوہدری بلاول کے کیس میں ان کی معاونت کرنے والے دوسرے لوگوں نے اپنی طرف قری دے دی ہے اور وہ کیس کے مندرجات جان چکے ہیں۔“ میں نے اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

”اچھا تھوڑی دیر ٹھہرو۔“ میں نے اسے تسلی دی اور پھر چاچا عبدال سے کہا۔

”چاچا عبدال ذرا جلدی سے جاؤ اور کچھریوں میں موجود ایس ایس پی کے آفس میں دیکھ کر آؤ وہ تشریف رکھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ چاچا عبدال بولا اور چیمبر سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا اور بتایا کہ وہ اپنے دفتر میں موجود ہیں، میں نے اسے ساتھ لیا اور ایس ایس پی کے آفس میں آ گیا باہر کھڑے اردلی سے ملاقات کے لیے کہا۔

اردلی کچھ دیر بعد اندر سے نکلا اور ہمیں اندر لے گیا، ہم دونوں دفتر میں چلے گئے۔

اس کے حلیہ بیان نے کیس کی تمام مضبوطی ختم کر کے رکھ دی تھی اور کیس کا پانسہ بدل کر رہ گیا تھا اب میری درخواست پر ایس ایس پی نے اس بیان کو تاوقت ضرورت محفوظ رکھ لیا تھا۔ میں خوش تھا کہ اس اچانک خدائی امداد نے وقت سے بہت پہلے مجھے سرخرو کر ڈالا تھا۔

وہ اپنا پتا نشان اور موبائل نمبر مجھے فراہم کر کے جا چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسے بھی کیس ہوتے ہیں جو بیٹھے بٹھائے مجھ جیسے بے ہنر وکیل جیت جاتے ہیں۔ اس کے بیان سے لگتا تھا کہ جین کا قتل عداوت نہیں اک بھینٹ تھا۔



”درست کہا آپ نے ایسے کئی کیس بیٹ خاں کے کہنے پر میں بھی بول کر چکا ہوں آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اور خاص طور پر ایسے وڈیروں جو ہدیوں اور خاتونوں کے ملازم اپنی بھوک مٹانے کے لیے ان کے آگے پیچھے دم بلانا اپنی ایمانداری اور جانتاری جانتے ہیں اور ان کے کہنے پر بعض کیس اپنے اوپر ڈال دیتے ہیں جو ہم نے نہیں کیے ہوتے۔“

سچ پوچھیں کہ وفاداری ثابت کرتے ہوئے اس کی طرف دھیان بھی نہیں جاتا پتا نہیں ہمارا یہ فعل کس کھاتے میں لکھا جاتا ہوگا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ بیٹ خاں کی سوتیلی بہن جین کا قتل جو بدیری بلاول یا اس کے کسی کارندے نہیں کیا بلکہ اس قتل میں خود بیٹ خاں کا ہاتھ ہے اسی نے اپنی بہن کو قتل کرایا ہے۔“

”اس کا ثبوت۔۔۔ عداوت مغرضوں کی بجائے ثبوت مانتی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”سب کچھ موجود ہے اور میں سب باتیں اور ثبوت آپ کو فراہم کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہیں تفتیشی افسر کو بھی بیان دینا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”اس کے لیے بھی میں تیار ہوں۔“ وہ بولا۔

”اچھا اچھا موبائل نمبر مجھے دے دو میں بات کر کے آپ کو بلواؤں گا۔“ میں نے بتایا۔

”بیٹ خاں بہت سفاک اور عیاش آدمی ہے اس کے کانوں میں بھنگ پڑ گئی تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی بار میں آپ کو نظربندی نہ آؤں اگر آپ آج یہ تکلف کر لیں تو۔۔۔۔۔“

کالے پتھر

انجم فاروق ساحلی

ملک میں تعلیم کس قدر مہنگی ہے 'کتابیں اسٹیشنری دیگر اخراجات جو تعلیم پر اٹھتے ہیں وہ رزق حلال سے پورے نہیں کیے جاسکتے۔ کرپشن ایسی ہے کہ انسان اپنا جائز کام بھی نہیں کروا سکتا۔ یہ سب سیاسی اعتبار سے کا کھا دھرا ہے 'ملکی و قومی جرائم نے اس ملک کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر مستزاد قرضوں پر قرضے لیے جارہے ہیں اور ملکی دولت لوٹ کر باہر کے ملکوں میں جمع کروادی گئی ہے۔ ملکی و قومی مفاد کی بجائے اپنے ذاتی کمیشنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔

ایک اہم این اے کے بیٹے کا احوال 'جس نے شراب کے نشے میں دھت اٹھاتی رش ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک معصوم بچے کو کچل دیا تھا۔

سیاسی کرائم نمبر کے لیے بطور خاص ان کالے چہرے والے سیاست دانوں کا احوال جو ملک کی دولت دونوں ہاتھ سے لوٹ کر باہر بھیج رہے تھے۔

برسر اقتدار پارٹی کے رکن قومی اسمبلی وجاہت علی خان ناشتے کی میز پر اپنے دونوں بیٹوں عمران اور کامران کے ساتھ موجود تھے۔ جیسے ہی وہ ناشتے سے فارغ ہوئے عمران نے اخبار انقلاب کی خبر ان کے سامنے کر دی۔ وجاہت علی خان نے بڑبڑاتے ہوئے خبر کو پڑھا تو کمری نہ ملنے کی وجہ سے چاروں نوجوان خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سرکاری حکومت نوکریوں پر بین لگا کر بیٹھ گئی ہے 'نوجوانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ حکومت ووٹ لے کر بے حس ہو گئی ہے اور کچھ نہیں کر رہی۔

"بیٹے عمران! مجھے ان واقعات پر افسوس ہے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وزیراعظم کی کابینہ فیصلہ کرتی ہے یا اسمبلی میں بل پیش ہوتا ہے پھر رائے شماری کے بعد اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔" وجاہت علی خان نے غیر جذباتی لہجے میں اخبار میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی کیا یہ ایک سیاسی جرم ہے۔"

"وہ کس طرح؟" وجاہت علی خان نے قدرے

ترش لہجے میں کہا۔

"جس آپ کی پارٹی انتخابی مہم کے دوران بار بار یہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ ہم برسر اقتدار آ کر نوجوانوں کو ملازمتیں دیں گے انہیں ملک کی ترقی و خوشحالی کی راہ پر ڈالیں گے تو پھر ان وعدوں سے بھر جانا سیاسی جرم ہی ہوا۔" عمران نے لہجے کو جارحانہ بناتے ہوئے کہا۔

"بیٹے عمران! اس سلسلے میں اقدامات کیے جا رہے ہیں ملازمتوں کے مواقع محدود ہیں اور آبادی بہت بڑھ گئی ہے لہذا مسائل پر قابو پانے میں دقت لگتا ہے۔ اگر کسی کو سرکاری ملازمت نہ ملے تو وہ کوئی دوسرا کام بھی کر سکتا ہے 'کسی کی خودکشی کو حکومت سے منسوب کرنا درست نہیں۔" وجاہت علی خان نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ڈیڈی آخر میرے کو کیوں نہیں اپنایا جاتا میرے پاس اس دقت کی سیاسی درکروں کے لڑکے کے متعلق رپورٹ موجود ہے جنہیں نالائق ہونے کے باوجود ملازمتیں دی گئی ہیں۔ صرف اس لیے کہ ان کے

والدین برسرِ اقتدار پارٹی کے سیاسی گماشتے ہیں۔“
عمران نے ناگواری کا اظہار کیا۔ وجاہت علی خان کے
چہرے پر غصے سے شکنیں پڑ گئیں پھر وہ گویا ہوئے۔

”بیٹے انتہائی وعدے کوئی پارٹی بھی پورے نہیں
کرتی ہم سے پہلی حکومت پانچ سال برسرِ اقتدار رہی
لیکن صوبے بھر کی حالت کا کسے علم نہیں۔ ہماری
حکومت کئی ترقیاتی منصوبوں پر کام کر رہی ہے سڑکیں
اپنی انداز پاس پارک ڈیولپمنٹ بہت کچھ ہو رہا ہے۔
رہے اخبار نویس تو وہ ہر وقت صرف منفی باتیں ہی
اچھالتے ہیں میں نے زندگی کی بہت بڑی غلطی کی
تمہیں صحافی بننے دیا اب تم میرا ہی احتساب کرنا
چاہتے ہو۔“

”ویڈی ترقیاتی منصوبے سڑکیں پل اپنی جگہ مگر
مہنگائی کی آگ غریب کی زندگی کو جلا رہی ہے۔ اس
سلسلے میں حکومت نے کیا کیا؟ بجلی پانی سونے گیس کے
بیل کس قدر زیادہ پیچھے جارہے ہیں عوام چیخ رہے ہیں
پرائم منسٹر صاحب مینڈیٹ کو رو رہے ہیں کیا مینڈیٹ
اس لیے دیا جاتا ہے کہ غریب عوام کا جینا حرام کر کے رکھ
دیا جائے۔“ عمران نے تشدد کا نشانہ بنایا۔

ویڈی تعلیم کس قدر مہنگی ہے کتابیں اسٹیشنری
دیگر اخراجات جو تعلیم پر اٹھتے ہیں وہ رزق حلال سے
پورے نہیں کیے جاسکتے۔ کرپشن ایسی ہے کہ انسان اپنا
جائز کام بھی نہیں کروا سکتا۔ یہ سب سیاستدانوں کا کیا
دھرا ہے ملکی وقومی جرائم نے اس ملک کو کھوکھلا کر کے
رکھ دیا ہے۔ اس پر مستزاد قرضوں پر قرضے لیے
جارہے ہیں اور ملکی دولت لوٹ لوٹ کر باہر کے ملکوں
میں جمع کروادی گئی ہے۔ ملکی وقومی مفاد کی بجائے
اپنے ذاتی کمیشنوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔“ عمران
نے اپنی بھڑاس نکالی۔

”بہنا عمران! تم عوام کی فکر کی بجائے اپنی زندگی کو

انجوائے کرنا سیکھو جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں تم بھی اپنے
بڑے بھائی کا مران کی طرح ان سے محظوظ ہونا سیکھو
کھاؤ پیو عیش کرو نو جوانی میں اپنے آپ کو روگ لگا لینا
اچھا نہیں ہوتا آخر میں تمہارا باپ ہوں تمہارا دشمن نہیں
اور جہاں تک جھوٹ سچ کا تعلق ہے تو حکومت کے
انتہائی جھوٹ یا وعدہ خلافی کے علاوہ کیا سارا معاشرہ سچ
بولتا ہے۔ دکا انداز تا جزا کفر اساتذہ مذہبی اسکا ردِ حملہ
کے مولوی بھی سچ بولتے ہیں۔ ان سب کی زندگی بھی
جھوٹ سے ہی عبارت ہے مولوی قرآن کے واضح
ادکامات کے باوجود تفرقہ بازی پھیلاتے ہیں لوگوں کو
لڑاکرائی دکانداری چکاتے ہیں۔ ذاکر اپنی کوتاہیوں
سے میرے والوں کی ذمہ داری بھی اپنے سر نہیں لیتے
تا جرنالہ مال بیچ کر بھی اعتراف نہیں کرتے۔ عورت
عورت کو تباہ کر کے بھی اس کا اعتراف نہیں کرتی۔ اس
دنیا میں کون ہے جو الودہ نہیں۔“ وجاہت علی خان نے
عمران کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ان سب طبقوں کی اصلاح کی ذمہ داری حکومت
پر ہی تو عائد ہوتی ہے ترقی یافتہ ممالک میں چونکہ
قانون پر پورا عمل درآمد ہوتا ہے قانون بکلتا نہیں اس
لیے ان سب طبقوں کو بھی بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے لیکن
جس ملک میں وزیر کا لڑکا بڑے سے بڑا جرم کر کے
چھوٹ جائے اور غریب کو بلاوجہ تشدد کا نشانہ بنایا
جائے اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔“ عمران نے سچ
لہجے میں کہا۔

”کیا میں ان تمام برائیوں کا اکیلا ذمہ دار ہوں۔“
وجاہت علی خان غصے سے دباڑے اس بار عمران
خاموش رہا۔ وجاہت علی خان چند لمحے عمران کو
گھورتے رہے پھر کامران کی طرف متوجہ ہوتے
ہوئے ان کا غصہ زائل ہو گیا۔

”ہاں تو بیٹا تمہیں کتنے روپے چاہئیں؟“

”ذیذی بس پانچ لاکھ روپیہ دے دیں مجھے اپنی حسین محبوبہ کی فرمائش پوری کرنا پڑتی ہیں اس کے علاوہ باقی دنیا داری بھی ہے۔“ کامران سے معصوم صورت بنا کر اپنا مطالبہ سنایا۔

”ٹھیک ہے مینا دے رہا ہوں بس یہ خیال رکھنا کہ تم سے کوئی ایسی حرکت نہ سرزد ہو جائے مجھے اخبار یا میڈیا والے پکڑ لیں۔“ سیٹھ وجاہت علی خان نے اب کی بار مسکراتے ہوئے عمران کی طرف دیکھا پھر بریف کیس سے چیک بک نکال کر پانچ لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر کامران کو تھما دیا اس کے بعد اپنی بیٹی فرزانہ جو رات دیر سے گھر لوٹی تھی اور اس وقت سو رہی تھی اس کے لیے ایک لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر الگ سے کامران کو دے دیا۔

”اور تم بھی لے لو کچھ۔“ وجاہت علی خان نے چیک بک عمران کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔
”شکریہ ذیذی! میرے اخراجات اب اخبار کی ملازمت سے پورے ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تمہاری مرضی میں تمہاری بحث و مخالفت کے باوجود کسی امتیاز یا تفریق کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا۔ میرا سب کچھ تم لوگوں کے لیے ہی ہے۔“ وجاہت علی خان نے پُر شفقت لہجے میں کہا اور پھر موبائل کی بیل بجنے پر فون سنتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں ایک ہنگامی میننگ پر اسلام آباد بلا گیا تھا وہ بریف کیس لے کر جلدی سے پورٹیکو میں گاڑی کی طرف نکلے عمران اپنے اخبار انقلاب کی چھوٹی گاڑی میں آفس روانہ ہو گیا۔ کامران نے اپنی غیبتی کراؤن کرولا باہر نکالی اور گاڑی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے اس کا ڈیبن اپنی غیبتی محبوبہ کے گرد گھومنے لگا جو واقعی سورج کی شعاع کی مانند روشن تر و تازہ اور نکھری ہوئی تھی۔ اس کا حسین سراپا دلکش چال اور

چہرے کے خوب صورت نقش و نگار دل میں اتر جانے والے تھے اس کے جسمی نشیب و فراز میں ایک خاص کشش تھی وہ ایک ایسا ہیرو تھی جو کھنڈر میں بھٹک رہا تھا۔

وہ تاریک کھنڈر کیا تھا وہ تاریک کھنڈر غربت کا اندھیرا تھا جس میں وہ خوشنما کرن اپنا ذرا سا جالا کیے ہوئے تھی۔ کامران زرب لب مسکرایا۔
”ابھی تک مانتی چلی آرہی ہے اور خرچے پر خرچہ کرو رہی ہے لیکن کب تک آخرا سے میرے بندروم میں آنا ہی پڑے گا پھر وہ میرے جال میں پھنس جائے گی اور اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور ہوگی۔ میں اس کی حالت جذبات میں تصاویر اتر والوں کا جس کے لیے میرے پاس جدید ترین ریموٹ کنٹرول کمرے ہیں جو میرے فارم ہڈیسٹ روم میں اور ہوٹل وکیش کے کمرہ نمبر 42 میں بھی نصب ہیں۔ میری اسپورٹنگ گھڑی کے ڈائل پر ان کمروں کو آن کرنے والے نمونے موجود ہیں۔“

ابھی تک کتنی ہی حسین خندیاں ہیں جو میرے دام ہوس کا شکار ہو کر بے بسی سے میرے تلوے چاٹ رہی ہیں۔ ذیذی جج کہتے ہیں دماغ اور سیاست بڑی چیز ہے ان کا صحیح استعمال ہی انسان کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اخلاقیات کے بندھے کئے اصولوں پر چل کر تو انسان کے لیے پیٹ بھرتا تن ڈھانچا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔“ کامران پانچ لاکھ کی مسرت سے مسکراتا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی نگاہ سڑک سے ہٹ کر ایل سی ڈی اسکرین پر رقص کرتی نیم عریاں لڑکیوں پر بھی چلی جاتی تھی جو شریر اور بے باک تھیں۔

یتیم خانے کی ایک بوسیدہ گلی کے باہر مین روڈ پر گاڑی روک کر اس نے کرن کومس کال دی تھوڑی دیر بعد کرن اپنے حسن جاں سوز کے ساتھ اس کی گاڑی کی

نہیں چڑھنے دیا۔ میٹرک کے بعد کسی کالج میں داخل نہ کروایا اگر زیادہ پڑھ لکھ جاتی تو کوئی اچھی ملازمت مل جاتی مگر میرے نصیب کہاں ایسے تھے۔ آئینہ دیکھ دیکھ کر خوش ہونے سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔“ کرن نے اپنے جلمے دل کی بھڑاس نکالی۔

”گھبراتا کیوں ہو جان من! ابھی کچھ دیر بعد ہمارے پاس نوٹ ہی نوٹ ہوں گے ڈیڑی نے چیک دے دیا ہے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے میرے ہوتے ہوئے صرف میرے جذبات کی قدر کرنی چاہیے۔“ کرن نے اپنا بوجھ کامران کے کندھے پر ڈال دیا۔

”لیکن کامران ڈیر! تمہیں مجھ سے شادی کا اعلان کرنا ہوگا آج ورنہ اس کے بغیر میں آگے نہیں جاسکتی۔“ کرن نے کامران کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں میں بالکل تیار ہوں۔ صرف ایم بی اے کا رزلٹ آنے دو اس کے بعد ہارات تمہارے ہی گھر جائے گی۔“ کامران کے چہرے پر مسکراہٹ اور یہ وعدہ کتنی لڑکیوں کی زندگی تباہ کر چکا ہے۔

”کیا تمہارے سیاستدان اور امیر ڈیڑی مجھے اپنی بہو بنائیں گے۔“ کرن نے پچھ سوچتے ہوئے کامران سے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں میں انہیں تمہاری تصویر دکھا کر رضا مند کر چکا ہوں تمہاری تصویر دیکھ کر ڈیڑی نے کہا تھا کہ ہم اپنے بیٹے کی خاطر اس ہیرے کو غربت کی کان سے نکال میں گے۔“ کرن مطمئن ہو کر پھر کامران کے کندھے سے لگ گئی۔ اس وقت سامنے نیشنل بینک دکھائی دیے لگا کامران نے پارکنگ پر گاڑی کھڑی کی اور کرن کو ساتھ لے کر

اچلی نشست پر موجود تھی۔ کرن نرم گنداز میٹ پر ٹیک لگا کر کھل کھلا اٹھی۔ گرمی کے موسم میں اسے سی کی بدولت بخ ٹھنڈی فضا کتنی خوشگوار معلوم ہو رہی تھی وہ سوچنے لگی کہ دولت وہ چاہی ہے جس سے دنیا کے ہر عیش و آرام کا دروازہ کھولا جاسکتا ہے اسے جادو کی چابی بھی کہا جاسکتا ہے۔ دولت کے آنے سے رشتہ دار پڑوسی ملنے جلنے والے کتے قریب ہونے لگتے ہیں اور دوسری طرف غربت کے بھیانک سائے میں والدین کی رخ نوک جھونک ایک دوسرے کو موردِ اِثرام ٹھہراتا بچوں کی کثرت مسائل گھر کے کرائے کا خوف ہر وقت انسان اپنا ہی خون پیتا رہتا ہے۔ بیاوازیں کرن کے اندر سے اٹھ رہی تھیں اور وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس بھنور سے باہر ضرور نکلے گی۔

”کن خیالوں میں گم ہو؟“ کامران نے اس کے کندھے پر بازو پھینکا دیا۔

”بس کامران صاحب! مکان کے کرائے کا مسئلہ جب سے ابا کی کریانے کی دکان کی قریب دوسری بڑی دکان کھل گئی ہے ہمارا تو ناقلہ ہی بند ہو گیا ہے۔ مکان اور دکان کا کرایہ دینا ہی مشکل ہو گیا ہے ابادے کے مریض ہیں۔ کل تو ان کا سانس رک ہی گیا تھا اپنی سہیلی شگفتہ کو فون کیا وہ گاڑی لے کر آئی پھر انہیں اسپتال پہنچایا جہاں امیر جنسی میں دیکھ بھال کے بعد ان کی حالت بہتر ہو گئی تو رات دو بجے گھر لے کر آئی۔ ڈاکٹروں نے بھی ادھر بھگایا بھی ادھر لے دیا وہ پھر یہ بھی لے آؤ وہ بھی لاؤ۔ اگر شگفتہ ساتھ نہ ہوتی تو ابا کی سانس شاید ہی بھال ہوگی۔ امیر لوگ ہی کام آتے ہیں غریب کیا کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ وہ تو خود بے حال ہوتا ہے وہ کسی کی آگ کیا بجھائے گا۔ بقرعید آنے والی ہے بچوں کے کپڑوں اور جوتوں کا مسئلہ ہے ابانے بچوں کی لائن لگا کر مجھے کسی لائن پر

بینک کے صدر دروازے کی طرف چلے لگا بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر کرن کے منہ میں پانی آ گیا اسے اپنے گھر کے سامنے عالی شان مکان میں رہنے والی ملک صاحب کی بیٹیاں یاد آنے لگیں جو کتنی شان سے نئے فیشن کے بھڑکیلے خوش مالہاس پہن کر باہر نکلتی تھیں اور اس کے پاس چند پرانے سوٹ ہی تھے جنہیں پہن پہن کر وہ بور ہو چکی تھی جو تے بھی سستے اور غیر معیاری سے تھے۔ میک اپ کا سامان بھی ختم ہو چکا تھا اور جیولری تو اس کے مقدر میں ہی نہیں تھی۔ کامران نے مسائل کے حل کے لیے کئی نوٹوں کی گڈیاں کرن کو تھما دیں کرن نے جلدی جلدی انہیں پرس میں ڈال کر لاک لگا دیا کہ کہیں وہ از کر دور نہ چلی جائیں۔

اب اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون دکھائی دے رہا تھا فکر کے بادل چھٹ گئے تھے اور جوانی کا موسم اٹھ آیا تھا۔ اس نے شوخ لگا ہوں سے کامران کی طرف دیکھا کامران کا ہاتھ مائل بہ شرارت تھا دوسرا ہاتھ اسنیرنگ پر تھا۔ دہنی چوک سے آگے نکل کر ایک مغربی طرز کے ہوٹل کے عقبی حصے میں پارکنگ پر اسٹیشن ٹوکن لے کر کامران نے گاڑی کھڑی کر دی۔ دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور ہوٹل کے عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ شیشے کے دروازے سے گزر کر وہ ایک خوشنما ہال میں سامنے نصف دائرے کی شکل کے سیاہ کاؤنٹر پر بیٹھی نیم عریاں لڑکی نے مسکرا کر انہیں خوش آمدید کہا۔

کامران کے علاوہ یہاں اور بھی سیاستدان اور امرا کی ماز سے پالی ہوئی اولادیں موجود تھیں۔ کامران نے لڑکی کو اپنی شراب کی ڈیمانڈ سے آگاہ کیا باوردی ملازم تیز قدم اٹھاتا ہوا آرڈر کی تکمیل کے لیے متحرک ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہال میں لگی خوشنما میزوں میں

سے ایک پر کامران کی پسندیدہ سرخ شراب سجاوی گئی جسے وہ لال پری کہتا تھا باقی شراب کی بوتلیں ڈیگی میں رکھنے کے لیے ملازم کامران سے چابی لے کر باہر روانہ ہو گیا۔ کرن تھوڑی سی شراب تو پینے لگی تھی لیکن آج کامران نے ضد کر کے اسے تیز سرخ شراب پلا دی پھر دونوں ڈاننگ فلور پر چلے گئے جہاں دوسرے سیاستدانوں ایم این اے ایم پی اے وغیرہ کے مختلف پارٹیوں کے ممبرز کے لڑکے لڑکیاں رقص و سرور کی محفل جمائے ہوئے تھے۔ ماحول نیم تاریک تھا اور چھت سے پڑتی روشنیوں کی ریلین چمک اچانک ہی لڑکیوں کے جسموں کے نشیب و فراز نمایاں کر دیتی تھی۔ ماحول سحر انگیز تھا۔

کامران اور کرن نے خوب اچھل کود کا مظاہرہ کیا جب دونوں ہال سے باہر نکلے تو دونوں پر ہلکا ہلکا سا نشہ چھایا ہوا تھا کامران کی کار تیزی سے رائے ونڈ روڈ پر اپنے زرعی فارم کی طرف سفر کرنے لگی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل پھیلنے لگے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ راستہ دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا کیونکہ ہوا کے شدید جھکڑ شروع ہو گئے تھے۔ شراب کی بو کامران کے منہ سے اٹھ رہی تھی آج وہ مروجہ مستی میں آ کر زیادہ پی چکا تھا ابھی بھی کار ڈمگائے لگتی کرن کچھ فکر مند ہوئی موسم بے بے حد خراب تھا۔

جیسے ہی کار رائے ونڈ روڈ پر آ کر کچی کوئی انشاپ سے پھٹا آگے نکلی دونوں جانب گھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا نشے اور بارش کی شدت کی وجہ سے کامران بروقت بریک نہ لگا سکا اور اس کی لمبی کروڑ کر دلائے سڑک پر بھٹ کر یوں کار بوڑ گزاری لڑکی کو پھیل کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی چیخ سے ماحول کانپ اٹھا کامران نے تیزی سے سڑک کا جائزہ لیا تیز بارش زدہ

ماحول میں سڑک اور ماحول سنسان تھا۔

”یہ کیا ہو گیا۔۔۔ اب کیا ہو گا؟“ کرن خوف زدہ لہجے میں بڑبڑائی۔

”جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ کامران نے رکی ہوئی گاڑی کو پھر اشارے کرتے ہوئے کہا لیکن کرن نے چابی بھیج کر گاڑی روک دی۔

”کامران اتنے بے حس نہ بنو اسے جا کر دیکھتے ہیں اگر زندہ ہے تو کسی قریبی اسپتال لے چلتے ہیں۔“ کامران تذبذب کا شکار تھا پھر باہر نکلا اور کرن کے ساتھ تڑپتی لڑکی کے پاس آیا کار کے ٹائز اس کے سنے سے گزر گئے وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی بے حس و حرکت آج تک نہیں۔

”ختم ہو گئی اب بھاگنا ہو گا۔“ کامران بڑبڑایا اسی وقت ایک تندرست سے بوڑھے نے بیج مار کر سڑک پر آ کے اسے پکڑ لیا۔ کامران کسرتی جسم کا مالک تھا اس نے بوڑھے کو جھٹک کر دو گھونسلے اس کے منہ پر مارے بوڑھے کا منہ خون سے سرخ ہو گیا لیکن وہ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا بلکہ غضب ناک انداز سے گرج کر بولا۔

”حرام زادے تُو نے تو شراب پی رکھی ہے تُو نے میری بیٹی کو شراب کے نشے میں چل دیا ہے۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ بوڑھے کے بازوؤں میں پرانی خوراک کی طاقت موجود تھی وہ زخمی چہرے کے باوجود اسے دبوچے ہوئے تھے کرن کانپ گئی۔

کامران نے اپنا رویہ فوراً نکال لیا لیکن اس وقت سڑک پر دور کچھ گاڑیاں تیزی سے ادھر آتی ہوئی نظر آنے لگیں جن میں ایک پولیس کار بھی شامل تھی۔ اب کامران نے کچھ سوچ کر بوڑھے کے بازو کے مقام پر اٹ مار دی جس سے ایک کراہ کے ساتھ بوڑھے کی چیخ نکل گئی اور گرفت کمزور پڑ گئی۔ کامران اسے جھٹک

کر گاڑی کی طرف بھاگا کرن اس کے ساتھ تھی۔ کامران نے گاڑی میں بیٹھ کر کار کو ایک ذیلی سڑک پر ڈال دیا تاکہ کسی کو ان پر شک و شبہ نہ ہو۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ زخمی بوڑھے نے اچانک بجلی چمکنے سے روشنی میں اس کی گاڑی کا نمبر ذہن نشین کر کے انگلی سے اپنے چہرے سے بہتے لبو کے ساتھ اپنی سگریٹ کی ڈب پرائیک شید کے نیچے جا کر لکھ لیا تھا۔

اس وقت زخمی بوڑھے کے پاس روزنامہ انقلاب کے رپورٹر انور کی گاڑی آ کر رکی انور نے سڑک کا منظر بھی دیکھ لیا تھا۔ بوڑھا سڑک کے کنارے دیہاتی دے کر گاڑیاں روکنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن بہت سی کاریں نکلتی چلی گئیں وہ اس حادثے کے چکر میں نہیں الجھنا چاہتے تھے لیکن رپورٹر انور نرم دل اور ہمدردانہ مزاج کا انسان تھا ظلم اور زیادتی تو وہ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔



آج کرن بھی نشے میں تھی کامران نے اسے کچھ زیادہ پیادی تھی وہ اب بے خود ہوئی جارہی تھی۔ کامران کی گاڑی بارش میں نہائی ہوئی اپنے زرعی فارم میں داخل ہو چکی تھی۔ کامران اور کرن ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے فارم ہاؤس کے بیڈ روم میں پڑے تھے۔ دونوں جذبات کی آخری حد سے گزر رہے تھے۔ کامران نے نشے میں ہونے کے باوجود اپنی اسکیم کے مطابق چہرے پر کپڑے کی پٹی لپیٹ لی تھی تاکہ کمرہ اس کا چہرہ نہ عکس بند کر سکے۔ کرن کا چہرہ اور جسم کمرے میں محفوظ ہوتا جا رہا تھا۔

اب کرن اس کی مٹھی میں آ جھکی تھی جب کرن کا شادی کا مطالبہ ایک دن زور پکڑ گیا تو کامران نے اس کی اپنے ساتھ اترنے والی انگلی تصاویر اس کے سامنے ڈال دیں کرن شرم و حیا سے کانپ اٹھی۔

امید

○ امید ایک ایسا لفظ ہے جو دل کو تسلی دیتا ہے
○ امید ایک ایسا جگمگا تا جگنو ہے جو بھٹکتے
ہوئے انسان کو حوصلہ دیتا ہے
○ امید انسان کی رگ رگ میں اس طرح
دور قی ہے جس طرح زندہ انسان کے جسم میں
خون دوڑتا ہے۔
○ امید ایک ایسی رہ گزر ہے جو انسان کو اس
کی منزل کے قریب لے جاتی ہے۔
○ امید کے بل بوتے پر دنیا کا نظام چل رہا
ہے

محمد اکرام..... وہاڑی

وجاہت علی خان کے صاحبزادے کی کار ہے وہ تو
بہت محتاط اور شریف لوگ ہیں اور ان کے
صاحبزادے نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تم کیوں
مجھے مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔“

”صاحب جرم تو جرم ہی ہے چاہے کوئی چھوٹا
آدمی کرنے یا بڑا آدمی قانون کو اپنا فرض ادا
کرنا چاہیے۔ میں نے گاڑی کا نمبر دیکھنے میں کوئی
غلطی نہیں کی اگر آپ مجھے اس پانی کے سامنے لے
چلیں تو میں فوراً اسے پہچان لوں گا۔“

”ٹھیک ہے بڑے میاں آپ جاپے میں وجاہت
علی خان کے لڑکے کو چیک کرنے کے بعد آپ کو
بلواؤں گا۔“

”جناب تھانیدار صاحب! گاڑی کے مالک کی
تصدیق کے بعد تو آپ کو یہ پرچہ کاٹنا چاہیے اس تب
ہی یہاں سے اٹھوں گا۔“ بوڑھے نے کرسی سے ٹیک
لگا کر پاؤں پھیلا دیئے پھر اپنے موبائل سے اپنی اس
پارٹی کے مقامی لیڈر سے رابطہ قائم کرنے لگا جن کے

”بے غیرت! کم ظرف! کہیں..... تو نے مجھے
برباد کرو یا میں نادان بھی جو تجھ پر مرمی۔“ کرن غصے
سے کامران کو کوسنے لگی۔ ”کچھ تو خیال کرو میں حاملہ
ہو چکی ہوں اپنے ہونے والے بچے کا ہی خیال کرو۔“
کرن نے کچھ نرم رویہ اختیار کیا لیکن کامران نے چند
نوٹ اس کے سامنے پیش کئے ہوئے کہا۔
”کبھی بھی اتنے ٹیکنک سے اپنا رش کروالو یہ اب ایک
عام سی بات ہو گئی ہے۔“ یہ کہہ کر کامران ہول کے
کمرے سے نکل گیا اور کرن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی
اس کی جوانی کی چوہ کو سیادناگ دس چکا تھا۔



انور بوڑھے شیردل کے ساتھ خود تھانے جا کر
رپورٹ درج کروانا چاہتا تھا لیکن اسے گھر سے بیوی
کا فون آ گیا کہ اگلوتے بیٹے راجہ کو النیاں آرہی ہیں
طبیعت ٹھیک نہیں فوراً گھر آ کے کسی ڈاکٹر کے پاس
لے جائیں۔ انور اپنے ایک دوست سے رائے منہ
کے ایک ہول میں ملنا چاہتا تھا جو اسے مشکوک
مقامات کی اطلاعات دیا کرتا تھا لیکن اب ملاقات
ملتی ہوئی تھی۔

شیردل جس کی جینی کو سفید کراؤن کروانے کچل
ڈالا تھا اس کا نمبر سگریٹ کی ذبیہ پر اپنے خون سے لکھا
ہوا دیکھا کر تھانیدار شجاعت علی جو ٹھوکر نیاز بیگ
پولیس اسٹیشن میں تعینات تھا متثر تو ہوا لیکن جب
گاڑیوں کے رجسٹریشن آفس سے کار کے نمبر کے
متعلق معلومات حاصل ہوئیں تو تھانیدار بے زار اور
العلق دکھائی دینے لگا۔

”بڑے میاں آپ سے نمبر دیکھنے میں ضرور کوئی
غلطی ہو گئی ہے موسم بے حد خراب تھا پھر غصہ کی
حالت میں آپ صحیح طور پر نمبر نہیں پڑھ سکے۔“

یہ گاڑی کا نمبر برسر اقتدار پارٹی کے ایم این اے

تھوہاں سب میرے وفادار ہیں اور میری سرپرستی میں
ہی وہاں جو غیر قانونی کام و بغیر پرمٹ کے شراب
فروخت کی جاتی ہے۔ ہوٹل کا مالک ہماری پارٹی کا
زبردست سپورٹر ہے اس لیے ہم اسے قانون سے
بچائے رکھتے ہیں۔ میں ابھی فون کر کے تمہارا حادثہ
کے مقام سے عدم موجودگی کا ثبوت تیار کرتا ہوں۔ ”ان
الفاظ کے ساتھ ہی وجاہت علی خان نے موہل فون پر
ہوٹل راج محل کے مالک و منیجر اسحاق خان سے گفتگو کی
پھر وہاں تاش کھیلنے والے چند افراد کو لالچ دے کر خرید
لیا اب کامران کو گرفتار کرنا آسان نہیں تھا۔



بوڑھے نے عدالت میں رٹ دائر کر دی جس کی
سماعت کے وقت جھوٹے گواہوں نے بیانات دے
دیئے کہ جس وقت حادثہ پیش آیا تو کامران صاحب ان
کے ساتھ ہوٹل راج محل میں تاش کھیل رہا تھا۔ بیروں کو
بھی خرید کر بیان دیا گیا بوڑھا انور اور سیاسی پارٹی کا
نمائندہ انصاف کے اس خون پر دم بخود رہ گئے۔
عدالت نے وکیل صفائی کے کہنے پر بوڑھے شیردل کی
نظر ثبوت کروائی تو اس کی دور کی نظر کمزور ثابت ہوئی
چنانچہ یہ سمجھ لیا گیا کہ اسے نمبر پڑھنے میں مغالطہ ہو گیا
ہے۔

کامران کو جرم کے باوجود رہا کر دیا گیا بوڑھا شیر
دل اسے گالیاں دینے لگا۔ وجاہت علی خان نے
پریس کانفرنس کرتے ہوئے اخباری وی کے
نمائندوں کو یہ بیان دیا کہ بوڑھا شیردل چونکہ حکومت
مخالف پارٹی سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس نے نمبر
بدل کر میرے بیٹے پر الزام عائد کر دیا حادثہ ہوا ضرور
ہے لیکن میرا بیٹا تو ہوٹل راج محل میں اپنے دوستوں
کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔

کامران کا بھائی عمران بھی اس مقدمے کا فیصلہ

وہ پوسٹر اور بیسنر وغیرہ لگایا کرتا تھا جو اس وقت پر سر
اقتدار پارٹی کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھری تھی۔
غریب عوام کو انصاف دلانا اس کی پہلی ترجیح تھی کچھ
دیر میں ہی انقلابی پارٹی کا نمائندہ تھوہاں تیار ہو گیا
پہنچ گیا اور پھر بوڑھے نے اخباری رپورٹر انور کو بھی
صورت حال سے آگاہ کر دیا انور نے کہا۔

”فون تھانیدار کو دو۔“ بوڑھے نے فون تھانیدار کی
طرف بڑھایا تھانیدار اسے کھا جانے والی نظروں سے
گھور رہا تھا جیسے کچا پی چبا جائے گا۔ انور کرائم رپورٹر تھا
اس سے بھی پولیس والوں کی جان جاتی ہے۔

دو طرفہ دباؤ کے نتیجے میں مجبوراً تھانیدار نے
وجاہت علی خان کے بیٹے کے خلاف پرجہ کات دیا۔
وجاہت علی خان کی کوٹھی تھوہاں تیار ہو گئی کے بڑے
چوک سے شروع ہو کر شیخ زید ہسپتال کی طرف جانے
والے روڈ پر ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھی۔

وجاہت علی خان گاہے بگاہے تھانیدار محمد علی کی مالی
اعدا کیا کرتا تھا اور تھانیدار بھی وجاہت علی خان کی
پارٹی کے افراد کی غنڈہ گردی اور قانون شکنی وغیرہ
اندوزی وغیرہ سے آنکھیں بند کیے رکھتا تھا لیکن اس
بار دو طرفہ دباؤ سے وہ مجبور تھا وہ وجاہت علی خان کے
گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔



کامران نے گروں جھکائے وجاہت علی خان
کے سامنے حادثے کا سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔

”برخوردار! شراب اتنی پیو کہ حواس کنٹرول میں رہ
سکیں میں بھی پیتا ہوں لیکن بھی آپ سے باہر نہیں ہوا
شراب اس کا ایک ہی حل ہے تم گھبراؤ مت ہم اس
بوڑھے کے بیان کو جھٹلا دیں گے رپورٹر انور کے ساتھ
ہونے کے باوجود۔ بس تم یہ بیان یاد کرو کہ تم ہوٹل راج
محل میں فلاں فلاں افراد کے ساتھ تاش کھیل رہے

میں کرن نے ایک اداس نگاہ پھولوں پر اڑتی تئلیوں پر ڈالی جنہیں اس کی زندگی کی مانند منزل کا کچھ پتا نہیں تھا پھر عمران کی طرف گلا کھنکارتو جھپٹا ہوئی۔
”جی فرمائیے چھوٹے سرکار۔“

”مس کرن صاحب! جس محل کے مقدمے میں کامران صاحب ملوث ہیں اور انہوں نے راج محل ہوٹل میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیا اس دن تو میرے قریبی دوست ڈاکٹر حسنین نے آپ کو کامران کے ساتھ رائے ونڈ روڈ پر طوفانی موسم میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ وہ آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہے ہمارے فیملی ممبر کی مانند ہے لیکن آپ نے قانونی رابطہ کے باوجود اس کا اعتراف نہیں کیا کیوں؟“ عمران نے سخت نگاہوں سے کرن کو گھورتے ہوئے کہا۔ کرن چند لمحے خلا میں گھورتی رہی پھر گویا ہوئی۔

”عمران صاحب! کامران صاحب نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن میں اس دن ان کے ساتھ موجود نہیں تھی آپ کے دوست کو غلطی لگی ہوگی دیکھنے میں دھوکا ہو سکتا ہے۔“ کرن نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں۔“ عمران نے ہر زور لہجے میں کہا۔ ”کیوں کہ میں نے بھی کامران بھائی کی کار کو سڑک پر ایک جگہ سفر کرتے دیکھا تھا اور اس کا رخ راج محل سے بالکل مخالف سمت میں تھا۔“

”عمران صاحب کیا وہ کسی اور طرف جا کر واپس راج محل ہوٹل نہیں جاسکتے اور کیا میں ان کے ساتھ تھی اس وقت۔“ کرن نے بھی اپنی تیز نظریں عمران کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

”نہیں اس وقت آپ ان کے ساتھ نہیں تھیں مگر ان کی گاڑی کا رخ اس وقت یتیم خانہ چوک کی طرف تھا۔“ عمران نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

سننے کے لیے آیا تھا اور اس کے بری ہونے پر اسے مسلسل گھور رہا تھا کیونکہ اس کے ایک دوست نے اسے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ دن کے دو بجے رائے ونڈ روڈ پر گزرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن گواہان نے بیان دیا کہ وہ اس وقت ان کے پاس ہوٹل راج محل میں تھا۔ عمران کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ انصاف کا خون ہو چکا ہے اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اصل صورت حال سے پردہ اٹھانے کی پوری کوشش کرے گا۔



کرن یتیم خانے کی تنگ گلی سے باہر نکل کر سڑک پر آئی تو سامنے کھڑی ایک چھوٹی سی خوب صورت گاڑی کا اگلا دروازہ اچانک اس کے سامنے کھل گیا۔ کرن نے چونک کر ڈرائیونگ سیٹ پر نگا ڈالی تو کامران کے بھائی عمران کو دیکھ کر حیران ہو کر ٹھٹک گئی عمران نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر جمائی پھر گویا ہوا۔

”مس کرن صاحب! کامران صاحب تو آج کل ایک اور حسینہ کی زلفوں میں اچھے ہوئے ہیں رنگین مزاج ہیں۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے کیا آپ میرے ساتھ مومن مارکیٹ والے پارک میں چل کر گفتگو کر سکتی ہیں۔“

”لیکن کس سلسلے میں؟“ کرن نے چونک کر سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ گفتگو کامران اور ایک جرم کے سلسلے میں ہے۔“ عمران نے لہجہ کو سرد بناتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔ کرن کامران سے سخت ناراض تھی پھر اسے عمران اس سے مختلف انسان معنوم ہوا وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے ہاں کر دی اور اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

مومن مارکیٹ علامہ اقبال ٹاؤن کے ماڈل پارک

”مقیم خانے کی طرف اور بھی بہت سے کام انہیں ہو سکتے ہیں وہ شہر کا ایک اہم مرکز ہے۔“ کرن نے اعتراف سستہ کر دیا۔

”کرن صاحب آپ کی آواز آپ کے چہرے کے تاثرات کا ساتھ نہیں دے رہی آپ کسی مجبوری کی وجہ سے خاموش تھیں لیکن آپ کو آخریچ بیان ایک نہ ایک دن دینا ہی پڑے گا مجبوری کی وہ ذخیرہ ہم کاٹ ڈالیں گے۔“ عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قدم چل کر مرزا اور مخاطب ہوا۔

”آپ کو کس جگہ ڈراپ کر دوں؟“
”نہیں شکریہ میں رکشہ میں چلی جاؤں گی۔“
کرن نے بچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

مبینہ کی آخری تاریخ بھی اور وجاہت علی خان کی کوٹھی کا تقبی گیسٹ مختاجوں ضرورت مندوں اور بھکاریوں وغیرہ سے بھرا ہوا تھا۔ حکومتی پارٹی کے ممبر قومی اسمبلی ہونے کی حیثیت سے عوام میں مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے وجاہت علی خان سخاوت اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ آنا، مٹی، چینی وغیرہ غریب لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ عمران کا قریب سے گزر ہوا تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

”ذیدی اگر مہنگائی کم کر دی جائے روزگار کے مواقع زیادہ میسر ہوں تو لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں بجائے اس کے کہ حکم پٹن میں خوار ہو کر کچھ لیں۔“

”تم تو ہر اچھے کام میں منفی پہلو ہی تلاش کرتے ہو حالانکہ ہماری پارٹی غریبوں کی سب سے بڑی ہمدرد ہے۔“

”ہاں اس لیے خودکشی کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔“
”تم اخبار کے ایڈیٹر اور کیا کہہ سکتے ہو۔“

وجاہت علی خان کا پارہ چڑھ گیا اور عمران نے کھسک جانے میں عافیت سمجھی۔

عمران تھانہ ٹھوکر نیاز بیگ میں اپنے والد کے پسندیدہ تھانیدار شجاعت علی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ ایک بوڑھا تھا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے شیوہ بڑھا ہوا اور کپڑے میلے پیلے تھے۔ اس کی آنکھوں میں گفتگو سے قبل آنسو ٹپک رہے تھے۔ تھانیدار کی سوالیہ نگاہیں بوڑھے کے ہاتھ میں موجود شراب کی ایک ہنڈی کی بوتل پر جمی ہوئی تھیں جسے بوڑھے نے گردن سے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

تھانیدار نے پہلے عمران پھر بوڑھے کی طرف استغناء مہیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس بوڑھے کے پاس اپنے بیٹے کی چھوٹی سی کہانی ہے وہ سنئے۔“ عمران نے تمہیدی طور پر آغاز کیا اب تھانیدار نے اپنی سرخ آنکھیں بوڑھے پر مرکوز کر دیں۔

”فرما دیجئے بزرگوار“ بوڑھا اپنے آنسو پونچھتا ہوا اندرونی کرب سے کانپ کر ہوا۔

”تھانیدار صاحب! بھول راج محل میں اعلیٰ شراب کے ساتھ سستی سستی بھلی شراب بھی بکتی ہے غریب لوگ اس سستی شراب کا شکار ہو کر بعض اوقات اپنی زندگی کی بازی ہار بیٹھتے ہیں۔ میرے بیٹے کو راج محل ہوٹل کے ایک چہرے نے شراب کی عادت ڈال دی یہ سستی زہریلی شراب ہوٹل کے بجائے ٹھوکر نیاز بیگ کے پرانے آسیب زدہ باغ میں واقع حویلی کے غنچے دروازے سے فراہم کی جاتی ہے جو بدروحوں کا مسکن مشہور ہے۔ شراب کے دیوانے وہاں پہنچ جاتے ہیں نشہ بدروحوں کے قصوں سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے شراب کی چپٹ ہوٹل کے چہرے دیتے ہیں اس ہوٹل کو

مظاہرہ کریں اور میرے سامنے اس پیرے کو چیک کریں میں اس معاملے کی رپورٹنگ کر رہا ہوں چلئے اس وقت۔“ تھانیدار پس و پیش کے بعد تیار ہو گیا جب وہ لوگ پولیس کار میں ہوئے راج محل کے پارکنگ پر اندر داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی خوب صورت لڑکی جو نیم عریاں تھی اس گولڈن گرل سے پیرا نمبر 24 کے متعلق استفسار کیا تو لڑکی کو کوششوں کے پیرے کا کچھ سراغ نہ ملا۔ بوڑھا ٹیپ میں ریکارڈ شدہ گفتگو ساتھ لیے ہوئے تھا۔ ہوٹل کا کونا کونا چھان مارنے کے بعد بھی اس پیرے جابر خان کا کوئی سراغ نہ ملا تو ہوٹل کے منیجر اور مالک نے تھانیدار اور عمران سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں پیرے جابر کے ناجائز اور ملاوٹ شدہ شراب کے کاروبار کا کچھ علم نہیں اگر ملے تو بے شک کھال اٹار دیں حرام زادے نے ہوٹل کی بدنامی کرائی ہے۔“

”کھال تو اب کسی نہ کسی کی اتر کر رہے گی۔“ عمران نے سختی خیز لہجے میں کہا اور ہوٹل کے مالک کے علاوہ انسپٹر بھی عمران کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ہوٹل سے نکل کر بوڑھا قلندر می تو میڈر سائیکل رکشہ میں کہیں نکل گیا اور عمران انسپٹر شجاعت کے ساتھ واپس آئے۔

وہ کسی سوچ میں غم تھا کار میں تین سپاہی بھی سوار تھے جن میں محمد رفیق گجر بھی تھا۔ سوچتے سوچتے عمران کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اس کی طبیعت سراخ رسائی کے موافق تھی۔ اسے وہ جملہ یاد آ گیا تھا جو اس کا باپ اپنے ایک دوست سے کہتے ہوئے اسے دیکھ کر رک گیا تھا۔ وہ جملہ یہ تھا۔

”تھانیدار اپنا خاص آدمی ہے وہ ملے کسی اور پر ڈال دے گا۔“ اس جملے سے عمران سمجھ گیا کہ والی میں کچھ کالا ہے تھانیدار ہوٹل جانے سے پہلے ہاتھ روم میں

سیاتدانوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ میرا بیٹا یہ پتہ نہ رکھنے کی شراب کی بوتل اپنی سالگرہ پر لایا تھا اس سالگرہ کی میز پر موسم بیاں روئی ہو چکی تھیں اس نے شراب دوسری منزل کے بیڈ روم میں چڑھائی تو نیچے آتے آتے اس کی زندگی کی شمع بجھ گئی۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی میرا ایک ہی بیٹا تھا میں نے اسے اس کی ماں اور باپ دونوں بن کے پالا تھا میں سالگرہ کی تقریب میں اس کی شادی کا اعلان کرنے والا تھا مگر میری خوشیاں جھین لی گئیں مجھ کو یاد نہ آیا گیا میرے خواب ٹھہر گئے گھر اجڑ گیا۔ جوان بیٹے کی موت مجھے پاگلوں کی طرح گھمائی سے میں نشہ فروخت کرنے والوں کی تلاش میں نکلتا ہوں بھٹکتا ہوں لیکن میں ناکام رہتا ہوں۔ وہ لوگ بڑے منظم ہیں طاقتور ہیں میں ایک بوڑھا کمزور اور غریب انسان ہوں میں ان سیاتدانوں کے کالے چہرے کیسے بے نقاب کر سکتا ہوں۔ البتہ میں ایک چہرے کو جانتا ہوں جو شراب کے نوکین لوگوں کو فراہم کرتا ہے میں اس کی آواز نوکین لیتے وقت ریکارڈ کر چکا ہوں۔ تھانیدار صاحب اگر آپ نے اپنا فرض نہ پورا کیا آپ بک گئے جھک گئے ذرا دیئے گئے تو اس معاشرے کے بہت سارے باپ ہاتھوں میں شراب کی خالی بوتلیں لیے پھریں گے اور ان کے گھر کے آنگن میں ایک قبرستان بھی ہوگا۔“ بوڑھا سسک کر خاموش ہو گیا تھانیدار عمران کو دیکھ کر مودب تھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں جناب بزرگوار! ہم منشیات فروشوں شراب فروخت کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔ آپ اس پیرے کا نام بتادیں میں اسے جا کر چیک کروں گا آپ اب دو دن بعد آئیے گا۔“ بوڑھا کچھ مطمئن سا ہو گیا لیکن عمران ابھین محسوس کر رہا تھا پھر وہ تھانیدار سے مخاطب ہوا۔

”جناب شجاعت صاحب آپ ذرا شجاعت کا

گیا تھا۔ وہاں جا کر اگر وہ بک چکا ہے تو کسی کو اطلاع دے دینا موہاٹل پر اب بڑا آسان کام ہے اور اخبار انقلاب کی رپورٹس کے مطابق یہ تھانیدار جرائم پیشہ عناصر کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔

”انسپیکٹر شجاعت صاحب! کیا میں آپ کے موہاٹل کی آخری کال چیک کر سکتا ہوں۔“ عمران نے تھانیدار کو گھورتے ہوئے کہا۔

”وہ کس لیے اور کس قانون کے تحت۔“ تھانیدار نے ناگوار سی عمران پر جھلکی نگاہ ڈالی۔

”بس دوستانہ طور پر آپ میری کالز بھی دیکھ سکتے ہیں۔“ عمران نے چیترا بھائی کے

”لیکن اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکت کا کوئی جواز بھی تو ہو۔“ تھانیدار نے پھر ناگوار سی جواب دیا۔

”کیا اس ملک کا ہر ادارہ اپنے فرائض کو ایمانداری سے سرانجام دے رہا ہے۔“ عمران نے ترش لہجے میں کہا۔

”عمران صاحب! آپ انقلاب کے کرائم رپورٹر ہیں اور وجاہت علی خان کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، ہم ان کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کام میں بے جا مداخلت کریں۔“ تھانیدار نے تلخ لہجے میں کہا۔

”خیر آپ اس پیرے کو تلاش کیجیے میں بھی کرتا ہوں، موت کے سودا گروں کو آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا۔ فرض کیجیے اگر آپ کا بیٹا یا بیٹی.....“ عمران نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”بس کیجیے چھوٹے سرکار۔“ تھانیدار چلا اٹھا۔
”گاڑی روک دو۔“ عمران نے مون مار کیت کتے ہی تھانیدار سے ہار عجب لہجے میں کہا۔



ٹھوکر نیاز بیگ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر نیچر وال گاؤں کا ایک حصہ جنگل کی شکل اختیار کر گیا تھا اس جنگل کے دو اونچے اور گھنے درختوں پر وہ بڑے سائز کے بندر بچھ کتے پھر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی بے چین نظروں سے موڑوے سے اس طرف آنے والی ذیلی سڑک کو دیکھنے لگتے پھر ان کی نگاہ گھوم کر درختوں کے درمیان گھری ایک سیاہ تاریکی آسب زدہ عمارت پر جم کر رہ جاتی۔ رات کا وقت تھا اور عمارت سے ابھرنے والی پراسرار خوفناک آوازیں ارد گرد دور دور تک پڑھوں سناٹا طاری کیے ہوئے تھیں۔ ارد گرد کی آبادی پر اس عمارت کی دہشت پوری طرح چھا چکی تھی لوگ بستروں میں دبکے تھر تھر کاہٹے لگتے وہ دروازے اور کھڑکیاں بند کیے سونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ایک بہادر مہمان نے اپنے میزبان کے گھر میں قیام کرنے والے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر اندھیرے میں ٹیلے پر بنی سیاہ تاریکی عمارت پر نگاہ ڈالی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ عمارت کی چھت سے ایک سفید روح اڑتی ہوئی بلند ہوئی جا رہی تھی اس کا چہرہ سفید و جود کے اوپر چمکیلا اور خوفناک تھا آنکھوں کی جگہ دو سرخ انگارے دبک رہے تھے۔ مہمان نے جھرجھری لے کر کھڑکی بند کر دی اور بستر پر گر پڑا۔

اس وقت دونوں بڑے بندروں کی چمکیلا آنکھیں ایک سیاہ ٹرک پر مرکوز تھیں جو مین روڈ سے اندر آنے والی ذیلی سڑک پر سفر ختم کر کے اب پکی سڑک پر سیاہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک بندر نے فضا میں اپنے ریمو الوور سے فلیش لائٹ سنکٹل ڈنغ دیا جس کے نتیجے میں کھنی جھاڑیوں کے درمیان سے آنے والی گولیوں نے ٹرک کے بازو دھماکوں کے ساتھ برست کر دیئے۔ ٹرک سے تین چار سیاہ سائے چوتک

محبت قلب

کچھ لمحے بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں اس وقت یہ طے ہوتا ہے کہ کون شخص کس کا بنایا جائے گا جس طرح کس خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر ٹھوس اور مائع گیس میں بدل جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی خاص گھڑی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اس وقت ایک قلب کی سوئیاں کسی دوسرے قلب کے تابع کر دی جاتی ہیں پھر جو وقت پہلے کا رہتا ہے وہی وقت دوسرے قلب کی گھڑی بتاتی ہے جو موسم جوڑت جو دن پہلے قلب میں طلوع ہوتا ہے وہی دوسرے آسمان میں منعکس ہو جاتا ہے۔ دوسرے قلب کی اپنی زندگی سبکست ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں صرف بازگشت کی آواز آتی ہے۔

اقتباس: راجہ گدھ

مونا شاہ قریشی..... کبیر والہ

عمارت کے کھلے عقی گیسٹ سے ہی برآمد ہوئی تھی۔ پولیس المکار اور وہ دونوں بھی حیران تھے کہ چھٹ قدم کا لمبا چوڑا سرغنہ جو اس عمارت میں منشیات کے کاروبار کا انچارج تھا کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ ساری بلڈنگ چھان مارنے پر بھی نہیں ملا تھا موٹر سائیکل پر وہی لمبا چوڑا سرغنہ سوار تھا۔

عمران نے جلد از جلد پیشاب سے فراغت حاصل کی اور وسل بجا کر پولیس المکاروں کو بلا کر انہیں صورت حال سے آگاہ کیا پھر خود بھی جوش کے عالم میں اپنی اسپورٹس موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ندی کے پل کی طرف نکل گیا کیونکہ پل کی چوڑائی تین فٹ تھی پولیس کی کاریں اس پر نہیں چل سکتی تھیں۔ سرغنہ کافی دور سڑک پر دکھائی دے رہا تھا عمران موٹر سائیکل تیز سے تیز بھاگنے لگا نئے افق ڈائجسٹ کی جاسوسی کہانیاں

کر پستول اور ریوالور ہاتھوں میں لیے اونچے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

اس وقت ٹرک گولیوں کے زخمے میں آ گیا اور جھاز یوں سے نکل کر آگے بڑھتے خفیہ پولیس نے ٹرک کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ٹرک سے فائر کرنے کی کوشش کرنے والوں کو زخمی کر دیا۔ کچھ دیر بعد پولیس کا ٹرک پر قبضہ ہو چکا تھا ہنسی مٹی جھان یوں کے سلسلے سے کافی تعداد میں سپاہی نکل کر عمارت کی عقی جانب بڑھنے لگے۔ اس وقت عمارت سے روشنی کی لائیں باہر پڑنے لگیں اور پھر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اندر سے دتی ہم بھی پھینکے جانے لگے بچ کر پولیس نے پیش قدمی جاری رکھی اور بڈا خرپس منٹ کی فائرنگ اور تصادم کے بعد پولیس نے عمارت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت دونوں بندروں نے درختوں سے چھٹائیں لگا میں اور پھر اپنا اوپری لباس اتار ڈالا اب بندروں کی جگہ کرائم رپورٹر عمران اور انور موجود تھے جن کے مخبروں کی رپورٹوں کی روشنی میں اس جگہ چھاپہ مارا گیا تھا۔ جہاں پشاور کی طرف سے منشیات اور جعلی ادویات ایک ٹرک میں ڈال کر پولیس ٹاؤن وغیرہ پر پیسہ استعمال کر کے اسے آسبی عمارت میں لایا جاتا تھا پھر عمارت کے تہہ خانے سے نکلنے والی سڑنگ کے راستے ٹھوکر نیاز بیگ کے بڑے پلازہ کے تہہ خانے میں منشیات پہنچا کر اوپر موجود میڈیکل اسٹور پر مال پہنچا کر لوگوں کی رگوں میں نشہ اتارا جاتا تھا۔

اچانک عمران کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ انور کو بتا کر ندی کی طرف نکل آیا جو عمارت کے عقی حصے میں بہہ کر دور نکل گئی تھی اس وقت وہ چونک کر رک گیا۔ ندی کے پل سے ایک سیاہ موٹر سائیکل تیزی سے گزرتی ہوئی آگے نکلتی جا رہی تھی جو

کوٹھی کے سامنے والے حصے میں آتے ہی وہ شخص دو بارہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ہو۔“ وجاہت نے چونکتے ہوئے کہا۔

”نہیں ڈیڈی وہ شخص کوٹھی سے باہر نہیں نکلا۔“

”کیا مطلب؟“ وجاہت خان اچھل ہی پڑے۔

”ڈیڈی میں نے کوٹھی کے عقبی گیٹ کے سامنے سڑک کے پار گھنے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھنے والے منگ سے اس زخمی کے متعلق دریافت کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس نے زخمی آدمی کو اندر جاتے دیکھا ہے لیکن پھر وہ بارہ بار نکلتے ہوئے نظر نہیں آیا۔“

”بیٹا عمران ہو سکتا ہے وہ شخص دیوار پھلانگ کر باہر چلا گیا ہو پھر اس نشئی منگ کی بات پر اتنا اعتماد نہیں کیا جاسکتا اسے تو بعض اوقات اپنی خبر بھی نہیں ہوتی۔“

”ڈیڈی زخمی کا دیوار پھلانگنا قیاس نہیں اور منگ سے جس وقت میں نے گفتگو کی وہ نشے میں ہرگز نہیں تھا اور پوری طرح چاق و چوبند تھا۔“ عمران نے ٹٹنی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”پھر بیٹا اور کیا ہو سکتا ہے ایک دفعہ پھر کوٹھی کی اچھی طرح تلاشی کی جاسکتی ہے۔“ وجاہت علی خان نے کہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بستر کے کنارے ٹٹنی مسلسل بجانے لگے۔ جلد ہی ان کے سامنے ان کے ملازم اور حفاظتی گارڈ باادب کھڑے ہو گئے وجاہت نے انہیں لمبے چوڑے زخمی سرغنہ کے متعلق بتا کر حکم دیا کہ ساری کوٹھی اور باغ میں اسے تلاش کیا جائے اگر مل جائے تو اس کے ہاتھ باندھ کر پیش کرو۔ ملازم اور گارڈ ”جی اچھا حضور“ کہہ کر کمرے سے نکلنے لگے۔

عمران پچھ سوچتا ہوا کمرے میں ٹھنسنے لگا وجاہت بستر پر لیٹ گئے وہ تھکے ہوئے اور بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ پچھ دیر بعد عمران نے تہلنا بند کر دیا اور وجاہت کے قریب بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگا

پڑھ پڑھ کر اس کے اندر ایک عدد جاسوس تیار ہو چکا تھا۔ پچھ دیر بعد وہ محتاط انداز سے سیاہ پوش کے پیچھے از جا رہا تھا اب اس نے دیکھا کہ سرغنہ زخمی تھا اور اس کی دائیں ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا کافی دیر تک تعاقب جاری رہا پھر عمران بڑے زور سے چونکا سرغنہ کا رخ ان کی کوٹھی کی طرف تھا۔ وہ عقبی دروازے سے موٹر سائیکل پھینک کر اندر داخل ہو گیا عمران عقبی دروازے پر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ گھوم کر اپنی کوٹھی کے سامنے والے حصے سے گیٹ کھلوا کر اندر داخل ہوا اور باغ کی طرف بھاگنے لگا لیکن باغ اور ساری عمارت چھانسنے کے بعد بھی اس زخمی سرغنہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وجاہت گھروٹ کر اپنے کمرے بہانے کے بعد اپنے بیدروم میں چائے پی رہے تھے ان کے سر میں درد تھا وہ ایسنا چاہتے تھے۔ اس وقت عمران ان کی گاڑی پر نگہ ڈال کر ڈرائنگ روم ڈرائنگ ہال اور دوسرے مختلف مقامات دیکھتا ہوا بیدروم میں ان کے سامنے پہنچا کپ کی پرچ و وجاہت علی خان کے سامنے بید سائز میبل پر رکھی ہوئی تھی۔

جب عمران نے انہیں زخمی آدمی کے اندر کھس کر غائب ہونے کی خبر دی تو وجاہت علی خان چونک کر اچھل ہی پڑے چائے نیچے گرتے گرتے پی گئی۔

”اگر کوئی زخمی مجرم وغیرہ پھنسا دروازہ کھلایا کر اندر گھس بھی آیا ہے تو اسے باغ یا عقبی برآمدے وغیرہ میں یا مالیوں کی کوٹھریوں کی طرف ہونا چاہیے۔“ وجاہت علی خان نے متشکرانہ لہجے میں عمران پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”ڈیڈی سب جگہ دیکھ چکا ہوں لیکن وہ آدمی نہیں بھی نظر نہیں آیا۔“ عمران نے فکر مند لہجے میں سوچتے ہوئے کہا۔

”عمران بیٹے یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے گھوم کر

تقریباً آدھا گھنٹے بعد ملازم اور گارڈ سر جھکائے اندر داخل ہوئے اور اپنی ناکامی کا اعلان کیا "عمران ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔"



کرن ایک میڈیکل سینٹر سے باہر نکلی اور موز سائیکل رکشہ کی طرف بڑھنے لگی اس کے چہرے پر اضمحلال اور کرب کے آثار تھے۔ اس نے محبت کا جو شیش محل تصورات میں بنایا تھا اس کی کرچیاں اس کے دل میں اتر گئی تھیں۔ وہ کامران کی ہوس کا شکار ہو کر براہِ مویجی بھی اسے اب معلوم ہو گیا تھا کہ اجلے تن والوں کے من اجلے نہیں ہوتے اور سیاستدان سانپ ہیں تو ان کے بچے بھی سانپ ہی ہوں گے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی مایوسانہ نقل و حرکت کے ساتھ رشتے میں بیٹھ گئی وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کے بڑے بھائی مختار نے اسے میسرنی ہوم سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہے اس کا بھائی افتاح سے ادھر سے گزر رہا تھا اور موز سائیکل کا نامبر برص ہونے کی وجہ سے اب پیدل گھر کی طرف جا رہا تھا۔ کرن کا رکشہ بھی گھر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف رواں دواں تھا۔ کرن کا بھائی موبائل میں اس کی تصویر بھی میسرنی سے نکلتے وقت لے چکا تھا اس نے لمبی کار والے امیر لڑکے کے ساتھ بھی اسے دو مرتباً آتے جاتے دیکھا تھا لیکن زبان بند ہی رکھی تھی لیکن اب وہ اپنے باپ کو صورت حال سے آگاہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

کرن چونکہ سر جھکا کر مایوس اور افسردہ چل رہی تھی اس لیے وہ مختار کو سامنے نہیں دیکھ سکی تھی۔



دونوں ایک دوسرے کے بعد گھر میں داخل ہوئی کرن کے اہمالی حالات نہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی

جھنجھلائے ہوئے تھے۔ مکان کا کرایہ واجب الادا تھا پھر ادھار والے بھی جان کھار ہے تھے ایسے میں مختار نے ان کے کان بھر کر میسرنی ہوم سے نکلتے وقت لی گئی تصویر اپنے ابا کو دکھادی اس کے ابا کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا پہلے تو غصہ سے برا بھلا کہتے رہے پھر مارنے لگے۔

"کس کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی ہو۔"

"غریب کا تو نصیب ہی کالا ہوتا ہے ابا! وہ کیا منہ کالا کرے گا۔" کرن نے غصے سے سلکتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ نے ہمیں کیا دیا ہے ہم نے زندگی میں دکھ ہی دکھا اٹھائے ہیں۔" کرن نے رک کر پھر زبانی وار کیا۔

"نکل جا میرے گھر سے بے شرم بے حیا تیرا تو سایہ بھی دوسری بچیوں پر نہیں پڑنا چاہیے۔" کرن کی ماں سوئی ہوئی تھی وہ شور سن کر اٹھی اور صورت حال جان کر فکر مند ہوئی۔ کرن کے ابا کرم دین نے اسے دھکے مارتے ہوئے گھر سے باہر نکال دیا۔ کرن سڑک پر رکی اور اپنے نصیب کو رو کر اٹھ کھڑی ہوئی وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی مین روڈ پر نکل آئی۔

"کاش ایسے امیر زادوں کو موت آ جائے جو معصوم لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کرتے ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر یہی مصرع تھا۔ مین روڈ پر گاڑیوں کا کافی رش تھا شام کا وقت تھا اور اسٹریٹ لائٹس کے علاوہ گاڑیوں کی روشنیاں بھی جگمگا رہی تھیں مگر اس کے ذہن میں مجروح خیالات کا اندھیرا تھا اس نے ایک بار مڑ کر اپنے گھر کی طرف نگاہ ڈالی۔ میٹھی دلی یادیں اس کے ارد گرد منڈلانے لگیں لیکن پھر اس نے یادوں سے پیچھا چھڑایا اور وہ قدم سڑک پر آگے بڑھ گئی۔ اب اس کی زندگی کا فائدہ بھی کیا تھا وہ اپنی عصمت اچھی

عمران نے تیزی سے کمرن کو کندھے پر ڈالا اس وقت
دوسپاہی اس طرف آنکے لیکن عمران کا کمرائم رپورٹرکا
کارڈ دیکھ کر کھسک گئے۔

”دوست ذرا جلدی چلو میں جس کیس پر کام کر رہا ہوں یہ اس کا ایک گواہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

عمران نے کرن کو چھپلی سیٹ پر لٹاتے ہوئے اپنے دوست سے کہا۔

شوکت تیزی سے گاڑی چلانے لگا وہ خاندانی رئیس تھا عمران نے ایک بار اسے غنڈوں سے بھی بچایا تھا وہ بچپن کے جگرمری یار تھے۔

کچھ ہی دن بعد اسے شیخ زید اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں داخل کروا دیا گیا۔ ڈم معمولی تھے اس لیے جلد ہی کرن کو مرہم پٹی کر کے فارغ کر دیا گیا، وہ اندرونی اور جذباتی صدمے سے نڈھال سی ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے ہارمل ذہنی کیفیت میں رہنے کا مشورہ دیا، چھوٹی ڈرپ لگنے کے بعد اب کرن اپنے پیروں پر چل رہی تھی اور نقاہت بھی کم ہو گئی تھی۔

شوکت پجارد چلا رہا تھا اور عمران کرن کے ساتھ
عقبی نشست پر موجود تھا، کرن نے دھکی دل کے
ساتھ عمران کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور دو بچی
تصویریں بھی اپنے ہینڈ بیگ کے خفیہ خانے سے

نیکال کر دکھا دیں۔ عمران غم و غصے کی کیفیت میں اپنے بھائی کے کالے چہرے پر تھوک رہا تھا جو نہ جانے کئی لڑکیوں کی زندگیوں برباد کر چکا تھا اور لڑکیاں اسے حقیقت سے آگاہ کر چکی تھیں۔

”کرن جو ہونا تھا ہو چکا بہر حال تم حوصلہ رکھو
 کامیابی کو اس کے انجیا بہت میں دو چار کمزوری چھاس
 کے غلبہ و تشویش و تھکی اور بے پرواہی کے لئے ہرگز
 نہیں ہرگز ہرگز میں ہوں فوراً اس سب سے کامیابیوں

1997

”آپ بہت اچھے ہیں کاش میں کامران کی بجائے آپ سے ملی ہوتی۔“ کرن نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”آپ ابھی مجھ سے مل سکتی ہیں آپ کا کوئی قصور نہیں۔“ عمران نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے حوصلہ دیا ”کرن کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خوشی کی کرن جھلکانے لگی۔“



عمران دوست کی سالگرہ میں تھوڑی سی شرکت کرنے کے بعد واپس پلٹ آیا ویسے بھی اب وہاں شراب کا دور چلنے والا تھا اور شراب بالکل پسند نہیں کرتا تھا البتہ شوکت وہیں تھا وہ امیر زادہ تھا اور اکثر امیر زادے شراب کوک کی طرح پیتے ہیں۔

عمران تیار کی جانے والی ”ماسٹر کی“ ہاتھ میں لے کر باغ کے قریب واقع کامران کی چھوٹی سی کھریاب کے دروازے پر پہنچا کامران اس وقت کیڑی کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ عمران سوچ رہا تھا ہونہ ہوا اسی جگہ کامران بلیک میٹنگ کا سامان تیار کرتا ہے آج کرن کی تصویریں دیکھ کر کامران کی کھریاب سے بڑی طرح کھٹک رہی تھی۔ ماسٹر کی سے ملا جلد ہی کھل گیا سانسے چھوٹی سی راہ داری تھی جس سے گزر کر وہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوا جس کے ایک جانب کھریاب لیٹ گئی۔

عمران نے کیمینوں میں گھس کر سامان کا جائزہ لیا سامان استعمال شدہ تھا پھر عمران نے مختلف مقامات کی تلاشی لی لیکن کوئی قابل اعتراض مولو برآمد نہ ہوا اب عمران سیاہ رنگ کی ایک الماری کے سامنے کھڑا ہوا جو لیٹ کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ عمران نے اس کا قفل بے آواز پستول سے اڑا دیا یہاں ماسٹر کی کام نہیں آ سکتی تھی الماری کے پٹ عمران نے ایک جھٹکے

سے کھول ڈالے وہ بالکل ایک جاسوس بن گیا تھا اس نے الماری کا جائزہ لیا یہاں بھی قابل اعتراض مواد نہیں تھا صاف ستھری تصاویر تھیں قدرتی مناظر وغیرہ کی عمران چند لمحے کھڑا رہا پھر کود کھٹکا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے سامنے الماری کی موٹی چادر پر بے درپے کئی بے آواز فائر کیے۔ الماری کی چادر پھٹ گئی جگہ جگہ سے اور اس کے اندر کے لفافے اور تصویریں دیے لگیں۔ عمران نے دو اور فائر کر کے چادر کو کمزور کر کے کچھ حصہ کھینچ کر بڑا کر دیا اب خلا دکھائی دے رہا تھا جسے کھولنے کا طریقہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ عمران نے ہاتھ بڑھا کر لڑکیوں کی نگلی تصاویر اٹھالیں کچھ لفافوں میں بند تھیں کچھ ویسے ہی پڑی تھیں۔ عمران نے بڑی مشکل سے انہیں دیکھا مرد کے چہرے پر نقاب پٹی تھی لیکن عمران نے جسمانی ساخت اور کپڑوں سے کامران کو شناخت کر لیا اس کے سامنے اس کے گھر کا ایک کالا چہرہ بے نقاب ہو چکا تھا۔



رات کے وقت جب عمران گھر کی جانب جا رہا تھا ایک ایک اس کے اٹھے قدم ٹخمد ہو کر رہ گئے۔ اس کے ڈیڑی پور نیو میں اپنی بچاؤ کھڑی کر کے سامان سے بھرا ہوا ایک شاپر بیک نکال کر وقت کے ساتھ سنبھالتے ہوئے داغی دروازے کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ عمران کھن کی طرف آنے والی گلی سے باہر نکل کر آگے بڑھا تھا وہ کچھ سوچ کر قریبی ستون کی آڑ میں چھپ گیا۔ اس کے والد دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے عمران سوچنے لگا اس بڑے سے شاپر بیک میں کیا ہو سکتا ہے حالانکہ پرسوں صبح ہی وجاہت علی خان نے ملازموں کو بھیج کر کچن اور دوسری ضروریات زندگی کی کافی اشیاء منگوائی تھی۔

عمران متحرک ہوا اور گلی سے گزرتا ہوا کچن میں

فارغ کر دیئے تھے اور نئے رکھنے کے لیے اشتہار دے دیا تھا۔ پرانے ملازموں سے انہیں کچھ شکایتیں لاحق ہو گئی تھیں چنانچہ ان دنوں تہہ خانے کا جدید ریموٹ کنٹرول دروازہ فرش میں نصب کر دیا گیا اور تہہ خانہ اس پرانی بلڈنگ کا حصہ ہو گا جو ان کے والد نے خرید کر نئے سرے سے تعمیر کروائی تھی۔

باتیں سوچتے ہوئے عمران کی نگاہ کمرے کے اندر مسلسل فرش کے اس حصے پر جمی ہوئی تھی جو ایک شق ہو کر پھر برابر ہو چکا تھا اور کمرے سے اس کے والد و جاہت علی خان غائب تھے ایک ترکیب ذہن میں آئے ہی وہ مسکرا دیا۔



و جاہت علی خان اگلے روز رات کے وقت بستر پر بے خبر سو رہے تھے لمبل کندھوں تک ان کے شانوں پر موجود تھا۔ اس وقت ان کے بیدروم کا بیرونی دروازہ ماسٹر کی کے گھومنے سے کھل گیا اور ایک سیاہ پوش اندر داخل ہوا اس کا چہرہ سیاہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک وائر پستول تھا سیاہ پوش محتاط انداز سے چلتا ہوا و جاہت علی خان کے بستر کے قریب آ کر رک گیا اس نے جیب سے رد مال نکال کر اس پر کلور فارم ملے پانی والی پھوار ماری اور پھر رومالی و جاہت کی ناک پر رکھ دیا۔ و جاہت بالکل بے سدھ ہو گئے ورنہ وہ کھانستے ہوئے اب اٹھنے ہی والے تھے۔ سیاہ پوش بے فکر ہو کر ان کے اہرامے ہوئے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا جو بستر کی چھبلی دیوار پر موجود راڈ پر لٹکے ہوئے تھے لیکن سیاہ پوش کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی مطلوبہ شے اس لباس کی جیبوں میں موجود نہیں تھی۔ اب سیاہ پوش نے کچھ سوچ کر و جاہت کے سلیپنگ سوٹ اور پھر جب ان کے نیچے کے نیچے ہاتھ مارا تو اس کی انگلیاں کسی ٹھوک شے سے

کھیلنے والے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو کر اندرونی حصے کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ کامیابان اس وقت گھر سے باہر تھا وہ اپنی راتیں باہر ہی رہیں بناتا تھا ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں اور اس کی بہن فرزانہ بھی رات کو دیر سے گھر لوٹی تھی اور آج تو وہ اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ میں شرکت کے لیے خوب تیار ہو کر گھر سے باہر نکلی تھی اور عمران جانتا تھا کہ فرزانہ کی سہیلی ریحانہ کس قدر عیاش طبع لڑکی ہے اور اس کی سالگرہ پارٹی میں ڈانس کے علاوہ شراب کا دور تو لازمی ہی چلا کرتا تھا۔ چھبلی مرتبہ جب فرزانہ سالگرہ پارٹی سے واپس لوٹی تو اس کے منہ سے شراب کی بو اٹھتی محسوس کر کے عمران اسے گھورتا ہوا دور چلا گیا تھا۔

عمران و جاہت علی خان کوررات کے بارہ بجے بڑا شاپر گھیسٹ کر اپنے بیدروم میں جانا دیکھ کر باہر ہی رک گیا پھر دے پاؤں آگے بڑھا اور بڑے بیدروم کی لائٹ آن ہوتے ہی دروازے میں نصب تانبے کے سوراخ سے اندر جھانکنے لگا دوسرے ہی لمحے دو چونک اٹھا جیب سے ایک ریموٹ کنٹرول نکال کر اس کے بہن و باکر فرش کو غور سے دیکھ رہے تھے مخصوص بینوں کے پریس ہوتے ہی ان کے سامنے کا فرش گزرتا ہیٹ کے ساتھ دونوں جانب سمت گیا اور نیچے سر ہٹا دیکھائی دیئے گئیں۔ سر و جاہت علی خان شاپر بیگ ٹھپٹے ہوئے نیچے اترنے لگے عمران کا دل دھک دھک کرنے لگا کہ یہ کیا امر ہے اس کے والد نیچے تہہ خانے میں کیا کرنے گئے ہیں۔ یہ تہہ خانہ کب تیار ہوا اس کا ریموٹ کنٹرول دور سسٹم کب فٹ کیا گیا سوچ سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک مرتبہ کچھ عرصہ قبل جب وہ تینوں بہن بھائی اپنے چچا کے ساتھ جولندن سے آئے تھے سیر کرنے مری گئے تھے اور ان دنوں و جاہت نے کوٹھی کے پرانے ملازم

لشتیں موجود تھیں اور چھت پر خوب صورت قمقمے بھی نصب دکھائی دے رہے تھے ایک بڑی ایل سی ڈی اسکرین کیمبوئر سسٹم انٹرنیٹ وغیرہ کا کیمبن بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ فیکس مشینیں بھی موجود تھیں عمران نے کانفرنس روم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہوئے ماحول کا جائزہ لے لیا۔ ایک دیوار پر مخصوص پوائنٹس کا نقشہ بھی موجود تھا۔

عمران نے تہہ خانے کی تیز روشنیاں آن کر کے موبائل کمرے سے ماحول کی تصویریں اتار کر محفوظ کر لیں پھر جیب سے ریشم کی ڈوری نکال کر تخت پر لیٹے سرغنہ کی طرف بڑھنے لگا اور اس کے قریب جا کر پھرتی سے اس کے ہاتھ پاؤں کھینچ کر جکڑ دے سرغنہ کسمسانے لگا پھر اسے چھینک آ گئی وہ بیدار ہونے لگا اس وقت عمران نے زور سے ایک تھپڑ سرغنہ کے منہ پر مارا سرغنہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمران کو دیکھنے لگا وہ جانتا تھا کہ وجاہت کا بڑا لڑکا عمران جو کراہم رپورٹر ہے کس قدر خطرناک آدمی ہے۔ عمران نے اس کے منہ پر پانی کی پھوار پھینکی جب وہ بے ہوش ہو گیا تو اس کی رسیاں کاٹ دیں۔

عمران تہہ خانے کے وسط میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر میٹرھیوں کی طرف بڑھا اور اسی ترتیب سے مٹن دبا دیئے فوراً ہی اوپر کمرے کا فرش سرک گیا اور وجاہت کا بیڈ روم دکھائی دینے لگا۔ عمران اوپر آ کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا اس نے فیصلہ کیا کہ اب اگلی رات تہہ خانے میں جا کر سامان کو پریس اور میڈیا کی موجودگی میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔



وجاہت علی خان کانفرنس روم میں غصے سے ٹپکتے ہوئے اپنی پارٹی کے سیاستدانوں پر نظریں جمائے

لکرائیں اس نے فوراً اس شے کو کھینچ کر باہر نکالا یہ ریموٹ کنٹرول تھا۔ سیاہ پوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کنٹرول کے مٹن اندازے سے دبانے شروع کر دیئے کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس کے ہاتھ تھک پڑنے لگے اور فرش پر ایک شق ہو گیا۔ سیاہ پوش نے پیچھے جاتی میٹرھیوں کی طرف جھانکا زینہ صاف ستھرا اور خوب صورت تھا بلکی سی روشنی ایک ٹیوب سے پھوٹ کر اجالا کیے ہوئے تھی۔

سیاہ پوش پستول ہاتھ میں لیے پیچھے اترنے لگا ریموٹ کنٹرول اس نے جیب میں ڈال لیا اس کے آخری میٹرھی پر آتے ہی فرش کا خلا سرک کر برابر ہو گیا۔ سیاہ پوش سامنے موجود دروازے کو آہستہ سے دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ ایک بڑا ہال کمرہ تھا جس میں چھوٹے چھوٹے زیرو کے بلب اس وقت روشن تھے سامنے کی سمت ایک تخت پر نیچے گہرے پردہ زخمی سرغنہ موجود تھا جس کا عمران نے تعاقب کیا تھا عمران قدم بدم آگے بڑھنے لگا۔ تخت کے قریب ہی ایک ٹرائی پر کھانے پینے کی اشیاء موجود تھیں کچھ اس بڑے شاپر میں تھیں جسے گھسیٹ کر وجاہت پور ٹیکو سے بند روم میں لائے تھے۔ پانی کی بوتلیں بھی موجود تھیں اب عمران نے کمرے کی دیواروں کے ساتھ موجود سامان کا جائزہ لیا وہاں ڈبوں اور کسوں میں منشیات اور جعلی ادویات موجود تھیں۔ وہ مغرب کی سمت سے تہہ خانے میں داخل ہوا تھا دراز قد زخمی سرغنہ جنوب کی جانب تخت پر پڑا تھا سامان دیواروں کی ساتھ میٹرھیوں کے ساتھ مشرقی سمت اور شمال کی جانب دکھائی دے رہا تھا۔

شمال کی جانب آگے جا کر ایک چھوٹا سا خوب صورت کانفرنس روم تھا جو شیشے کی دیوار سے ڈھکا ہوا تھا اس کے اندر گول دائرے کی صورت میں خوشنما

ہوئے تھے۔ بڑے نیک نام خدمت گار مشہور تھے۔

ایک سیاستدان نے پھل کاٹنے والا چاقو پھینک مارا عمران جھک گیا اور وار خالی گیا وائریستول کا پانی ختم ہو چکا تھا عمران نے دوسرے ہاتھ میں موجود پستول سے کار کی بیڑی کے تیزاب سے پھوار پھینکی وہ سیاستدان مسلسل چیخنے کی مشین بن گیا اس کا جسم جل گیا۔ باقی بچنے والوں کو قریب جا کر عمران نے ریوالور کے بٹ کینشن پر مار کر بے ہوش کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد اس تہ خانے میں پولیس کے بڑے آفیسر میڈیا اور پولیس کے نمائندے موجود تھے۔ وجاہت کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور کامران کو بھی لڑکیوں کی تنگی فلمیں بنانے بلیک میل کرنے کے جرم میں ہتھکڑیاں لگا دی گئی تھیں۔ حکومتی پارٹی کے دوسرے کئی سیاستدان بھی گرفتار کر لیے گئے جب وجاہت کو ہوش آیا تو عمران کی آنکھوں نے اپنے والد کی تمام تر مہربانیوں پرورش کی ذمہ داریوں حسن سلوک کے باوجود قانون کا بول بالا کر دیا تھا۔ کمرے کی الماری سے ایسے شواہد مل گئے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ یہ کالے چہرے والے سیاستدان ملک کی دولت باہر بھیج رہے تھے۔ یہ لوگ منشیات اور جعلی ادویات جعلی شراب کی فروخت سے دولت کماتے تھے یہ سیاست کو جرائم کے لیے استعمال کرتے تھے۔ عمران نے کرن کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔



”یہ تو اتنی بڑی پریشان کن صورت حال ہے آ خر آپ کے کمرے سے ریموٹ کنٹرول کس نے چرایا؟ اور سرغنہ کو کس نے بے ہوش کیا ہم خطرے میں ہیں۔ صبح آپ کا بیڈروم کا دروازہ کئی اندر سے کھلا تھا۔“ ایم این اے شوکت پرویز نے مدتشویش لہجہ میں کہا۔

”میں نے پورے گھر کی تلاشی لے ڈالی ہے بچوں سے ملازموں سے سب سے پوچھا ہے لیکن سب لاطمی کا اظہار کرتے ہیں۔ آج مجھے بھی سرنگ کے ذریعے ہی آنا پڑا ہے پہلے گھر سے نکلا ہجر وال گاہوں کے ایم پی اے کے ویران میٹنگ روم میں داخل ہوا پھر اس کے تہ خانے میں موجود سرنگ کے ذریعے یہاں اپنے گھر کے تہ خانے میں آیا۔ آپ لوگ تو خیر اسی طرف سے آتے ہیں لیکن میں.....“ وجاہت غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”پوری طرح چونکنے رہو۔“ اس نے گفتگو روک کر آئینہ میں ہاتھوں میں لیے محافظوں سے کہا زخمی سرغنہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

اس وقت اچانک کمرے میں دیوار کے پاس رکھے سامان کے ذخیرے کے پیچھے سے عمران کسی جاسوس کی مانند دونوں ہاتھوں میں پستول لیے باہر نکلا اور اس نے تیزی سے بے ہوشی کی دوا ملے پانی کی پوار مسلسل آئینہ گن بردار کے چہروں پر پھینکی دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ سرغنہ کو وہ دوبارہ بے ہوش کر چکا تھا وجاہت علی اور دو سیاستدانوں نے ریوالور نکال لیے لیکن پانی کی پھوار برس چکی تھی وہ بھی بے ہوش ہو کر گرتے چلے گئے۔ دو گولیاں چلیں لیکن عمران پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اس کے سامنے اس کے گھر کا دوسرا کالا چہرہ بھی بے نقاب ہو چکا تھا اس کے ہمراہ کچھ اور کالے چہرے بھی جو معاشرے میں

رومانہ مسائل

حافظ شبیر احمد

سید اعجاز علی لاہور
جواب: یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔

ذاکر علی پتوکی

جواب: ”یا علیم“ اللہ کا اسم ہے 11 مرتبہ پڑھا کریں پڑھنے سے پہلے۔ ”یا قوی“ اللہ کا اسم ہے 11 مرتبہ پڑھا کریں سر پر ہاتھ رکھ کر نماز کے بعد۔

محمد ابراہیم نواب شاہ

جواب: ”یا لطیف یا ودود“ 11 مرتبہ ہر نماز کے بعد پڑھ کر تصور میں لے کر گھر کے تمام افراد پر دم کیا کریں۔

کاظم رضا گجرات

جواب: فجر کی نماز کے بعد سورۃ فرقان آیت 70، 74 مرتبہ اول و آخر 11/11 مرتبہ درود شریف جلد اور اچھے رشتہ کے لیے دعا کریں۔

محمد سلمان میرپور خاص

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ قمر 111 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف جواب اور معاشی حالات اچھے ہونے کی دعا کریں۔ آپ بھی پڑھیں اور شوہر بھی صدقہ بھی دیں۔

ارشاد احمد کراچی

جواب: سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 11 مرتبہ ہر نماز کے بعد پڑھیں۔ (جلد اور اچھے رشتہ کے لیے دعا کریں)۔

محمد نبی لاہور

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ القدر 111 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف جواب کے لیے دعا کریں۔

نوشاد احمد اسلام آباد

جواب: عشاء کی نماز کے بعد سورۃ القدر 111 مرتبہ اول و آخر 11-11 مرتبہ درود شریف آسانی اور جلد ربائی کے لیے صدقہ لازمی دیں۔

امامت علی منڈی بہاؤ الدین

جواب: سورۃ شمس اور سورۃ العصر 11-11 مرتبہ (اول و آخر 3-3 مرتبہ درود شریف) صبح شام پڑھ کر شوہر پر دم کیا کریں ہو سکے تو پانی پر دم کر کے بھی پلایا کریں۔ نیت ہو کہ میری طرف اور میری کی طرف توجہ دیں۔

زین کرامت لاہور

جواب: آپ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھا کریں فجر اور عشاء کی نماز کے بعد 21-21 مرتبہ اول و آخر 3-3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کریں۔

سورۃ یسین 1 مرتبہ فجر کی نماز کے بعد تمام معاملات ٹھیک ہونے کے لیے دعا کیا کریں صدقہ بھی دیں۔

ایس خان سوات

جواب: بعد نماز فجر سورۃ یسین ایک مرتبہ۔

سورۃ فرقان آیت نمبر 70، 74 مرتبہ اول

و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف۔ (جلد اور اچھے

رشتہ کے لیے دعا کریں)۔

جواب: سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 11 مرتبہ ہر نماز کے بعد پڑھیں۔ (جلد اور اچھے

رشتہ کے لیے دعا کریں)۔

جواب: سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 11 مرتبہ ہر نماز کے بعد پڑھیں۔ (جلد اور اچھے

فاخر علی ۔۔۔ رحیم یار خان

جواب:۔ سورۃ فرقان آیت نمبر 74، 70

مرتبہ اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود شریف۔ تصور
رخصت جہاں آپ کا دھیان ہے وہاں کا بھی۔ (جلد
اور اچھے رشتے کے لیے دعا کریں) بچی کا صدقہ
دیں۔ جہاں حق میں بہتر ہو ہو جائے (بچی خود
پڑھے)

سورۃ قریش 111 مرتبہ اول و آخر

11، 11 مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز عشاء دعا بھی
کریں۔ (والدہ بھی پڑھ سکتی ہیں)

سمیرا نورین ۔۔۔۔۔ سرگودھا

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ رحمن کی

تلاوت کیا کریں اور دعا کیا کریں۔



نوٹ

جن مسکلی کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف
انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔
عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی
صورت میں ادارہ کی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail @ gmail.com

میں آئے۔

علی ارشد ۔۔۔۔۔ ساھیوال

جواب:۔ (۱) سورۃ اخلاص 11 مرتبہ
پڑھ کر دم کر لیا کریں۔ اول و آخر 3، 3 مرتبہ درود
شریف۔

(۲) سورۃ عبس روزانہ ایک مرتبہ پڑھ کر
دم کریں پانی پر بھی دم کر کے پی لیا کریں آپ
دونوں۔

(۳) قرآن کریم کی آیات ثواب کی نیت سے
پڑھنا اور کسی دنیاوی مقصد سے پڑھنا دونوں میں
فرق ہے۔

نور الدین ۔۔۔ نیوکراچی

جواب:۔ سورۃ عصر روزانہ 21 مرتبہ
پانی پر دم کر کے پیامیں اول و آخر 3، 3 مرتبہ درود
شریف۔

استخارہ کر لیں۔ سورۃ فرقان آیت نمبر
74، 70 مرتبہ اول و آخر 11، 11 مرتبہ درود
شریف، (جلد اور اچھے رشتے لیے دعا کریں)

اقبال احمد ۔۔۔۔۔ سرگودھا

جواب:۔ امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے
تک روزانہ 3 مرتبہ سورۃ عبس بعد نماز عشاء
پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں اور پانی پر دم کر کے بھی
پیشیں۔

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اپریل 2015ء

گھر کا مکمل پتا

والد کا نام

نام

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں

منوۃ اکھڑ

عفان احمد

مختصر مگر پراثر

امام ابن رہب دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم اور فقیہ جیسا فرماتے ہیں میں نے غیبت سے نہ بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کرتا اس کے دن اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا لیکن بات نہیں بنی اور روزہ رکھنا ایک عادت سی ہو گئی اور سزا میں جانی کی بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا۔ ظاہر ہے جس چیز میں لطف محسوس ہو وہ سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ دینا شروع کر دیا اور یہ سزا نفس کو شاک گزری اور یوں غیبت کے روگ سے نجات مل گئی۔

اقبال احمد..... قصور

پیر کے دن چہ خصوصیتیں

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ پیر کے دن کو آقائے نامدار تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ساتھ ایک خاص مناسبت اور خصوصیت ہے۔

پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔

پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی۔

پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے۔

پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیر کے دن حجر اسود کو اپنی جگہ رکھا۔

پیر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے غار ثور سے سفر کی ابتداء فرمائی۔

پیر ہی کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

(مسند احمد: ۱/ ۶۷۷، رقم حدیث: ۶۵۶)

انتخاب: عرفان اسلم..... کراچی

انتظار

ایک پاگل دوسرے سے ”یارا اگر کوئی ہاتھی درخت پر چڑھ جائے تو اترے گا کیسے؟“

دوسرا پاگل ”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے کسی بچے پر بیٹھ کر خزاں کا انتظار کرے گا۔“

.....

شروعات

ایک شخص نے اپنے بڑوسی سے کہا کہ ”بھائی صاحب! کل تمام دن آپ کا کتا بھونکتا رہا جس کی وجہ سے میری بیوی گانے کی پریکٹس نہ کر سکی۔ عجیب کتا ہے آپ کا؟“

”دیکھئے بھائی صاحب!“ بڑوسی نے جواب دیا۔ ”شروعات آپ کی بیوی ہی کرتی ہے۔“

مقبول جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی

حسن اور دوستی

فن کا منبع، فن کی روح سے جب رونی اور فن مل جاتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے، اہرام مصر بناتا ہے، انھما کے فلسفاتی محلات کی بنیاد ڈالتا ہے۔

کالی داس ”شکنتسا“ ملتن ”گم شدہ جنت“ اور اقبال ”جاوید نامہ“ لکھتا ہے لیکن جب فن سے رونی پھٹ جاتی ہے تو شکنتسا مر جاتی ہے اور جاوید نامہ رذی میں بکھنے لگتا ہے پھر حسن مر جاتا ہے نہ ہب مر جاتا ہے بھوک سب کا گانگوٹ دیتی ہے۔

کمال بھی۔۔۔ گھونکی، منہ

خوب صورت باتیں

جب آدم کی اولاد سے حیا مروت و خلوص اور پاکي اٹھ جائے تو وہ انسان کے بجائے صرف منی ہی رہ جاتے ہیں اور بھلائی سے امیدیں کیسی؟

رشتے اور سودے میں بہت فرق ہے رشتے قائم کیے جاتے ہیں اور سودے طے کیے جاتے ہیں۔ جاوید یوسف۔۔۔ راولپنڈی

کیا آپ جانتے ہیں؟

□ سلطان ابراہیم غزنوی ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھتا تھا۔

□ سونے کے تاروں سے قرآن مجید لاہور میں لکھا گیا ہے۔

□ پنجابی زبان میں سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ حافظ محمد لکھوی نے کیا تھا۔

□ حرم شریف کے اندر دنیا کے چھ زبانوں کی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔

□ دنیا کا سب سے بڑا الپ پچاس کلو واٹ ہے اور یہ جاپان نے تیار کیا تھا۔

□ دنیا میں سب سے زیادہ سگریٹ نوشی امریکہ میں ہوتی ہے۔

□ درختوں میں سب سے پہلا کھجور کا درخت پیدا ہوا تھا۔

□ انارکلی کا اصلی نام ناروہیگم تھا۔

□ رکشا جاپان نے ایجاد کیا تھا۔

□ دنیا کا پہلا پاکٹ ٹیلی فون 28 اگست

1980ء میں بنوایا۔

□ لکھنؤ، شہرِ نور، شہرِ نور

□ لکھنؤ، شہرِ نور، شہرِ نور

□ لکھنؤ، شہرِ نور، شہرِ نور

پینے کی چھ سنتیں ہیں۔

پانی ہمیشہ پیئہ کر بسم اللہ پڑھ کر سپدھے ہاتھ سے دیکھ کر تین سانس میں پینا چاہیے۔ پانی پینے کے بعد الحمد للہ کہنا چاہیے اس لیے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق پانی پینا چاہیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی نہ پینے کے بہت سے نقصانات ہیں جو درج ذیل ہیں۔

□ کھڑے ہو کر پانی پینے والا انسان شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے۔

□ کھڑے ہو کر پانی پینے سے پیاس نہیں بجھتی۔

□ کھڑے ہو کر پانی پینے سے انسان کا پیٹ بڑھتا ہے۔

□ کھڑے ہو کر پانی پینے سے مثانہ میں پتھری پیدا ہوتی ہے۔

□ کھڑے ہو کر پانی پینے سے شوگر کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

□ کھڑے ہو کر پانی پینے سے انسان کا نظام انہضام خراب ہو جاتا ہے۔

□ ان تمام بیماریوں سے بچنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پانی پینا چاہیے۔

محمد حنیف۔۔۔ منڈی بہاؤ الدین



خوشبو سنر

عمر احمد

شہر تمنا

اک شہر تمنا ہو

جہاں پھولوں کا بسیرا ہو

کانٹوں کی چھین رنحوں کی رفوگر ہو

سورج کی پیش ہر گھر کے لئے شبنم ہو

جہاں چاند کی کرنیں

ہر دل کے لئے روشن ہوں

اک ایسا شہر تمنا ہو

سب موسم اللہ کی عنایت ہوں

جہاں مقدر کا ستارہ

ہر اک کے لیے چمکتا ہو

اک ایسا شہر تمنا ہو

اک ایسا شہر تمنا ہو

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

غزل

میں ظلمتوں کے دیے اس طرح بجھاؤں گی

کہ اپنے فوں سے اندھیروں کو پھر مٹاؤں گی

کبھی نہ شکوہ شکایت زبان پر آئے گا

ہزار ظلم بھی سہ کر میں مسکراؤں گی

میرے وجود سے عالم میں روشنی ہوگی

میں بوئے گل کی طرح جگ میں پھیل جاؤں گی

ہر ایک دل میں میرے عشق کے تہ کرے ہوں گے

میں جاننا دے کر تیری انجمن سجاؤں گی

جو اپنے غم کو دلوں میں چھپا نہیں سکتے

میں کیسے دکھ کی کہانی انہیں سناؤں گی

بھٹک نہ جائے اندھیرے میں راہبر کوئی

میں آنسوؤں کے دیے راہ میں جلاؤں گی
کبھی تو میری صدا عرش کو ہلائے گی
کبھی تو حال میں اپنا انہیں سناؤں گی
نجانے کس نے بچھائے ہیں خار راہوں میں
میں پھول بن کے تیری راہ پھر سجاؤں گی
میرے وطن کی فضا میں ہیں سو گوار غزل
میں جان دے کر انہیں پھر سے جگمگاؤں گی
سکھائی غزل..... گلشن، کراچی

غزل

وہ حسن جمال رکھتا ہے

غم سے رشتہ بھال رکھتا ہے

مجھ کو اس نے اداسیاں بخشیں

کتنا میرا خیال رکھتا ہے

رونے دیتا نہیں جو روں تو

وہ ہنر باکمال رکھتا ہے

گرنا چاہوں تو گرنے نہیں دیتا

کون مجھ کو سنبھال رکھتا ہے

مجھ کو اس کی تلاش ہے رانا

چہرہ جو بے مثال رکھتا ہے

قدیر رانا..... راولپنڈی

غزل

دلوں میں رہتے زمانے میں نام بھی کرتے

جو اور روز جہاں بھی قیام بھی کرتے

ہمارے حق میں بھی کچھ فیصلے ہوتے

جو ہم سخن کے سوا اور کام بھی کرتے

کہاں نصیب تھی خوش قسمتی نصیبوں سے

ہمارے گھر بھی وہ آتے قیام بھی کرتے

ہمیں بھی کرتے زمانے میں رشک کے قابل

ہمارے نام کوئی اپنی شام بھی کرتے

خبر جو ہوئی کہ تم لوٹ آؤ گے اک دن

ہم اپنے جینے کا کچھ انتظام بھی کرتے
کہاں نصیب تھیں آزادیاں کہ ہم تیری
سفر بھی ساتھ میں کرتے قیام بھی کرتے
نیرضوی..... کرچی

جب میرے دل کے سمندر میں
مدوجز پیدا کرتی ہیں
تو کتنے ہی ارماں
لاوارث لاشوں کی طرح
اس میں بہہ جاتے ہیں

مہر پرویز احمد دلو..... چک 123 میاں چنوں

گر میری امانت ہے وجود تیرا
تو پھر یہ دوری نصیب کیوں ہے
میں مانتا ہوں حیا ہے تیری
جو تجھ کو مجھ سے ہے دور رہتی
دکھ میراں بات کا ہے
کوئی غیر تیرے قریب کیوں ہے
وہ جو کل کھڑا تھا تیرے در پر
وہ جس سے مل کے تو گل اٹھی تھی
کیا لگاڑا ہے میں نے اس کا
وہ شخص میرا قریب کیوں ہے
جب پوچھے اس نے میرے اٹاٹے
دکھائیے میں نے دل کے جذبے
مسکرا کر پھر کہا اٹھی
تو سب سے اتنا عجیب کیوں ہے
لوگو! ذرا انصاف کرنا
خدا را یہ انصاف صاف کرنا
وہ اس بات سے ہیں مجھ پر برہم
کہ میرا عشق حد سے شدید کیوں ہے
بن گیا ہوں سرعام مجرم
پھر وضاحتوں کی اب کیا ضرورت
جرم تیرا فارق یہ ہے
کہ آخر تو غریب کیوں ہے

نعمۃ روق ارشد..... فورٹ عباس

یادیں

یادوں کی لہریں

یادیں
میں نے اپنے رخ روشن کو بہت یاد کیا
آج نونے ہوئے در پن کو بہت یاد کیا
ایک دوشیزہ گلشن کو بہت یاد کیا
میں نے جب اپنے شمعیں کو بہت یاد کیا
آئینہ جب کبھی حالات کا دیکھا میں نے
اپنے بیٹے ہوئے جیون کو بہت یاد کیا
پھر لگا تار برستے رہے آنسو میرے
جب بھی میں نے تیرے دامن کو بہت یاد کیا
جس سے رہتی تھیں دھنشاں میری راتیں اکثر
میں نے اس چاند سی دہن کو بہت یاد کیا
دیکھ کے روتی ہوئی اپنی جوانی میں نے
اپنے بیٹے ہوئے بچپن کو بہت یاد کیا
جب بھی تنہائی میں چھینرا غم جاناں نے مجھے
میں نے خوشیوں بھرے آنکھن کو بہت یاد کیا
محفل دوست سے اک زخم تمنا کھا کر
آج دل نے میرے دشمن کو بہت یاد کیا
جس نے بخش تھی میرے جسم کو خوشبوئے چمن
اس مہکتے ہوئے ساون کو بہت یاد کیا
ادیب سمیع چمن..... خید آباد



جنگ سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی بلنگاز داستان جو کلاسیک داستانوں میں شمار ہوتی ہے..... جو روحوں کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھروں کا احوال جو حادثات غریب کے کوساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکرا جاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانہ عورت ہے جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور نشیمن کے جنابت منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سانھے نوجوان "جنگ سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جنگ سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہانوں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جنگ سنگھ" کے کردار کا روحانی پہلو جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جنابت رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔ "جنگ سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا؟ آئیے قارئین یہ جانتے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جنگ سنگھ" کے ساتھ ساتھ گانوں کے سرسبز کھلیانوں اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

بمقابل پندرہ دن گزرے ہوں گے کہ اچانک ایک مصیبت کھڑی ہوئی اس پاس کے رہنے والوں کو پتہ چل گیا کہ نیا کرائے دار اپنے وقت کا خطرناک ڈاکو ہے جو پیر دل پر چھوٹ کر آیا ہے۔ ڈر کے مارے وہ گھر میں رہنے لگے۔ چالی میں سونے والے اندر سونے لگے۔ چندن کو تنہا ہوئی تو عورتیں کراسے کہتیں۔

"بہن! تم لوگ مکان نہیں چھوڑ سکتے؟ ہم رات کو سو نہیں سکتے کیونکہ اعصاب پر تمہارے شوہر کا خوف مسلط رہتا ہے۔"

چندن گڑ گڑاتی۔ "اب صرف دیر نہ رہ گیا ہے۔ میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تم لوگوں کو ہم سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔" پھر حلق صاف کر کے کہتی۔ "وہ ڈاکو تھے مگر انہوں نے دشمن کے علاوہ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔" مگر یہ بات کسی کے دل میں نہ اتری۔ تب چندن کو رک کا دل گھبرانے لگا۔ نہ تو وہ کسی کو اپنی بات پر مجبور کر سکتی تھی اور نہ ہی جگت سے کچھ کہہ سکتی تھی۔

"تم اداس کیوں رہتی ہو؟ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟"

جگت نے کئی بار اس سے پوچھا۔

آخر چندن اس کا سوال برداشت نہ کر سکی۔ وہ رو دی۔

"تم سے کہتے ہوئے زبان نہیں کھلتی۔"

"چندن! جو کچھ ہے بتاؤ میں تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔"

چندن اسے دیکھتی رہی۔ جگت کے لہجے میں اسے سچائی نظر آئی۔ اس نے دل مضبوط کر کے کہا۔ "یہاں کے لوگ مکان خالی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ ان کو تم سے ڈر لگتا ہے۔"

یہ سن کر جگت کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ صبح سے شام تک باہر رہتا تھا کسی سے نظر تک نہ ملاتا تھا بلند آواز سے بات نہ کرتا تھا پھر بھی لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ ڈاکو کا مافیہ پر چھائیں کی طرح اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ سماج کیا پھر اسے اسی راہ پر ڈال دینا چاہتا ہے؟ وہ سوچتا۔ اچھا آدمی بننے کے لیے مزدوری کی بے عزتی برداشت کی۔ نصف روٹی

ہے، جہاں ہوں گے اپنا باضی چھپا کر جی رہے ہوں گے۔
بھگوان کرے ان کی زندگی پر پولیس کا سایہ نہ پڑے۔ اسی
لئے راستے سے ایک سایہ بلند ٹک میں داخل ہوں۔ جگت نے
آنکھیں تیز کر کے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی مگر سفید
دارچی کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ تب اس نے آواز دی۔

”کون ہے.....؟“

وہ شخص لرز گیا۔ ”میں ہوں۔“ جواب ملا۔ ”کون سے کی
کوٹھری والا سردار جی۔“

”اوہ؟“ جگت جھینپ گیا۔ ”ست سری اکال۔“ کہہ کر
خاموش ہو گیا۔ اس نے سوچا جس مکان کے کرائے داروں
کو اس کا بڑا بی اچھا نہیں لگتا اس کی چوکیداری کرنے کی
کیا ضرورت تھی؟ پھر رانت نہیں کر بڑا دیا۔

”کوٹھری خالی کرنے کی فکر میں کیوں اپنی غیند حرام
کر رہا ہوں؟ ایک بار فیصلہ کر لیا کہ نہیں جانا تو بس اپا ت ختم
ہوئی۔ کرایہ داروں کی ایسی تھی۔ جگا زیادہ بھلائی دکھاؤ گے
تو بڑا دل بن جاؤ گے۔ سائے میرے سامنے آنکھیں نہیں
اٹھاتے اور میری بیوی کو مکان خالی کرنے کے لیے پریشان
کرتے ہیں۔ بس اب ادھر یا ادھر.....!“

خیالات کو ذہن سے جھٹک کر جگا سونے کی تیاری
کرنے لگا۔ وہ برابر سوئی ہوئی چندن کو کور کو چار اور بھانا
چاہتا تھا کہ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس کے ٹوٹے
پھوٹے الفاظ دگا کے کانوں سے ٹکرائے۔

”نہیں نہیں..... وہ ایسے نہیں ہیں۔“ چندن غیند میں
بڑبڑائی۔ پھر چار چھ الفاظ کچھ میں سنائے۔ البتہ خری جملہ
یہ سنائی دیا۔ ”وہ خاندانی ہیں۔ تم سے بڑھ کر ہیں۔“

جگت نے مرداؤ بھری۔ غیند میں بھی وہ میری فکر کرتی
سے اس نے سوچا پھر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کہیں
یہ فکر اسے پاگل نہ کر دے۔ میرا ایک غلط قدم اس کی زندگی
برباد کر دے گا۔ سے سو پر مہتا پر فضا آیا۔ مجھے انہوں نے
اسے سخت امتحان میں کیوں ڈال دیا؟ اسی طرح جگت نے
ساری رات گزار دی۔

صبح چندن نے اٹھ کر دیکھا تو چونک پڑی۔ جگت گھر کا

پر گزرا کیا پھر بھی سب لوگ اسے اچھا آدمی بننے سے روک
رہے ہیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ چندن کوہ نے اسے
خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

”اب کیا کریں گے؟“

”اس کا جواب کل صبح دوں گا۔“ یہ کہہ کر جگت پھر سوچ
میں ڈوب گیا۔



وہ رات جگت نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ صبح تک
اسے فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ جیل میں لوٹ جانا یا چالی کے
کرائے داروں سے کہہ دینا کہ ہم نہیں رہیں گے۔ تم کو اگر
ڈر لگتا ہے تو تم لوگ چلے جاؤ۔ دیکھتا ہوں کون مجھے نکالتا
ہے؟ مجھے سیدھی طرح جینے دوور ضرور نہ کیا.....؟ جگت کے
دل نے آواز دی۔ سوال پوچھا گیا جو سامنا کرے گا اس کا
گلا دباؤں گا ابھی کھائیوں میں اتنی طاقت ہے میں بغیر
اسلحہ کے بھی دو چار لاشیں گرا دوں گا۔

”لاشیں گرا کر کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟“

”بدلہ لوں گا..... جیسا تھا ویسا ہو جاؤں گا۔“

”بدلہ..... اب کون ہے جس سے تم بدلہ لو گے؟“

”سامج سے بدلہ لوں گا جو مجھے چین سے جینے نہیں
دیتا۔ یہ مطلب دنیا میری دشمن ہے مرتے وقت تک کسی کو
چین سے نہیں جینے دوں گا۔“

”پھر دوست کی ضمانت نہ بتا کا اعتماد؟ اور چندن کوہ کی
حسرتوں کا کیا بے گار؟“ اس کا جواب نہیں مل سکا تو وہ رضائی
ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کھلی کھڑکی سے سنسان محلے کو دیکھنے
لگا۔ وہ اپنے باضی میں ڈوب رہا تھا جیسے سب کچھ کل کی بات
ہو۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ختم ہونے والے دشمن پھر نظر
میں آ گئے ہیں۔ جدا ہونے والے سا بھی یاد آئے۔ بغیر کسی
دوست یا دشمن کے زندگی کیسی بھٹکی ہے؟ اس نے سوچا بچپن
اور اچھا کہاں ہوں گے؟ ہوشیار کیا کرتا ہوگا؟ کیا وہ لوگ
مجھے بھول گئے ہوں گے؟ وہ اپنی زندگی کے جھمیلوں میں
اسنے الجھ گئے ہوں گے کہ میری کچھ خبر ہی نہیں لیتے؟ مگر
اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے خود ان کو جدا کیا

سامان چھیلوں میں بھر رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ چندن نے حیرت سے پوچھا جیسے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہ ہو۔ ”تم کب بیدار ہوئے؟“

”سو یا ہی کون ہے؟“ جگت نے نصف بھرے تھیلے کو بلا کر کہا۔ ”دن طلوع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔“

چندن کو جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ وہ جگت کا دادہ سمجھ گئی تھی۔ ”دوسرا سہارا تلاش کیے بغیر ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟“ چندن محبت بھرے لہجے میں بولی۔

”یہ تو پتہ نہیں۔“ جگت سنجیدہ ہو گیا۔ ”اب یہاں سے دل اٹھ گیا ہے۔“

سواؤیزہ ماہ دکھ سکھ کی طرح کاٹ ہی دیں گے۔“

چندن کو کور کے چہرے پر صبح کی دھوپ کا سا اجالا پھیل گیا۔ پچھلی رات اس نے بھیا تک خواب دیکھا تھا۔ جگت پڑوسیوں سے مارواھا کر چکا تھا۔ دو چار بڑی کردیے تھے۔ پولیس آئی اور اسے ہتھکڑی پہنا کر لے گئی۔ وہ اور ست پال روٹے رہ گئے تھے۔ وہ بند آنگوں سے دیکھے ہوئے خواب کی کھلی آنکھوں سے اپنی تعبیر دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں اٹھتے ہی چل پڑنے کے لیے کس نے کہا تھا؟“ پھر ہاتھ سے سامان چھین کر بولی۔ ”آج تمہاری چھٹی ہے اس لیے رام سے جائیں گے۔“

جگت اس کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کھڑے ہو کر چندن کو گواپنے قریب کھینچ لیا اور بازوؤں میں سمجھ لیا۔ ”غلام تمہارا حکم ماننے کے لیے آمادہ ہے۔“

”ارے چھوڑو! کھڑکی کھلی ہے۔“ چندن نے مصنوعی غصے سے کہا تو جگت نے پورز ونا زمایا۔

”کھلی رہنے دو پڑوسیوں کو بھی تو پتہ چلے کہ انکو بھی پیار ہے۔“

چندن ابل رہی تھی۔ ”یہ سنی کر چندن نے اپنے بازوؤں کی پشت کے کنارے لے لیے۔“

جگت نے شانے پر تھیلا اٹھایا اور چندن کو رنے ست پال کو ساتھ لیا۔ ان کو سامان کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ کر پڑوسیوں کو تعجب ہوا اور ساتھ ہی سکون بھی ہوا۔ جگت ساتھ تھا اس لیے کوئی عورت چندن سے پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی کہ کہاں جاؤ گے؟ کیا دوسری جگہ مل گئی ہے؟ قینوں چپ چاپ سیرھیاں اترنے لگے۔ جگت نے سب کی طرف ناراضگی کی نظروں سے دیکھا اور آنکھوں میں ڈانٹا سائے بزدل۔

اس نے سوچا اگر کسی سے کچھ نہ کہنے کی چندن کو یقین دہانی نہ کرائی ہوئی تو وہ سب کو کھڑی کھڑی سنا دیتا۔ وہ چھوٹا سا میدان عبور کر کے بڑے دروازے کے قریب رک گیا۔

گھوم کر اس نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکتے ہوئے لوگوں کو تیز نظروں سے گھورا۔ وہ بے چارے مارے بڑے گھروں میں چھپ گئے۔ ان کی حالت پر جگت مس دیا۔

”چلو!“ کچھا گئے گی ہوئی چندن نے آواز دی اور جگت نے قدم بڑھائے۔

”ارے..... تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“ سامنے سے آنے والے سردار جی نے حیرت سے پوچھا۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ تم لوگ ابھی یہیں رہو گے۔“ اس کی سفید واڑھی اور آواز سے جگت پہچان گیا کہ راست جسے آواز دی تھی وہی سردار جی ہیں۔

”ہم تو رہنا چاہتے تھے مگر تم لوگوں کو ہمارا پڑوس کھٹکتا ہے۔ اس لیے جا رہے ہیں۔“ جگت نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

چندن کو کوڑ لگا کہ کہیں جاتے وقت وہ بڑ نہ پڑے اس لیے فوراً بول پڑی۔ ”یہ ڈاکو تھے جنیل سے آئے ہیں لہذا سبے چارے پروسی گھبرا رہے ہیں۔“

سردار جی لمبی واڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”اب کہاں جاؤ گے؟“

”یہ تو ہمیں بھی پتہ نہیں ہے۔“ چندن کو کور کی آواز میں دھیر دھیر۔

دھیر دھیر۔

257

دیگرہ کا ڈرنہیں رہتا۔ پھر وہ بلند آواز میں بولے۔ "کل رات میں مکان میں داخل ہوا تو انہوں نے ایسی آواز دی کہ میں اے گھر میں نے کے پاؤں جو ڈر گیا۔"

جگت کو گھر سا ہوا یہ آواز ایسے پوری طرح پہچان گیا ہے۔ پھر بھی اونٹنا چھوٹی بات تھی۔

"سردار جی! تمہاری ہمدردی کا شکریہ۔ مگر دوسرے لوگ تمہارے جیسے سمجھدار نہیں ہیں۔" مگر سردار جی نے جگت کے شانے سے تھمیا اور لیا اور اندر جانے لگے۔ "تم لوگ اس طرح گھر چھوڑ کر جاؤ اس میں ہماری عزت جانے لگی۔"

پھر بھی جگت اور چندن دروازے پر کھڑے رہے۔ سردار جی ان کی آنکھیں سمجھ گئے۔ وہ زور سے بولے۔ "ارے کر اے وارو! اپنے چہرے تو دیکھو ایسے مرد کو یہاں سے نکالنے کی تمہاری کیا حیثیت ہے؟" مگر کون جواب دیتا؟ سردار جی کا جوش بڑھا۔ انہوں نے پھر ہانک لگائی۔ "یہ جگہ اب نہیں رہے گا۔ جسے اختلاف ہو باہر آئے۔" جگت کو کھف آ گیا۔ اس نے چندن کو دیکھا۔ دیکھا۔ اس سے پہلے کہ دونوں سوچتے کہ کیا کریں سردار جی میرے بھیاں چڑھنے لگے۔ وہ کوٹھری کھلی کر سامان اندر ڈالتے ہوئے بولے۔ "اب وہاں کیا کھڑے ہو؟ اوپر آ جاؤ۔" پھر نرم لہجے میں کہا۔ "اس بڑے کے خلید ہاؤس کی عزت رکھ لو۔"

چندن کورتا گئے جی۔ پھر جگت بھی اس کے پیچھے چلے گئے۔ جس کوٹھری کو پانچ منٹ قبل وہ خالی کر گئے تھے اسی کوٹھری میں داخل ہوتے ہوئے دونوں کو عجیب سا لگا۔ سردار جی خوش ہوتے ہوئے بولے "اس خوشی میں جگہ آج رات گانے بجانے کا پروگرام کریں گے۔ مالک مکان مہمان لعل کو بلا میں گے۔ سارے گاؤں کو پتہ چل جائے کہ جگہ ہمارا پڑوسی ہے۔"

ان کی مسرت دیکھ کر چندن کو کابل بھرا آیا۔



بعض اوقات فتنہ بھی رحمت بن جاتی ہے جگت کو اس

کا تجربہ ہونے لگا۔ جو پڑوسی چندن کو کوٹھری خالی کرنے کے لیے آمد رہے تھے وہی اب اسے منہ جال کر رکھنے گئے۔

"بہن! آج منگائی بنائی ہے اصلی گھی کی اپنے شوہر کو پکھانا۔" پڑوسیوں کی محبت نے چندن کو بڑی اطمینان سے آواز کر دیا۔ مالک مکان کی دو جوان لڑکیاں چندن اور ست پال کو اپنے گھر لے جاتیں۔

"ہمیں جنگا کی باتیں سناؤ۔" ویرو کی بات آتی تو دونوں ہمیشہ تعجب سے پوچھتیں اپنے شوہر کی محبوبہ کی اس طرح کھلے دل سے بات کر رہی ہو جیسے تم کو ویرو سے ذرا بھی جلن نہ ہو۔"

چندن مستراتی۔ "مجھ میں یہ بات نہیں ہے اور مجھے سیکھنی بھی نہیں ہے۔"



پیرول کے پونے تین ماہ جگت نے بحفاظت گزار دیے تو پولیس والوں کو فکر ہوئی۔ جگہ ذرا بھی گزیرے بغیر پیرول کے تین ماہ گزار دے گا۔ اس ڈاکو کو ایک بار بھی جوش میں نہیں لایا جاسکا؟ پولیس افسر سوچتے۔

جگت پر گہری نظر رکھی جاتی۔ کوئی نئی آفت کھڑی ہوتی تو پولیس فوراً پراسسٹ اس کی ہدائی کے لیے شکایت کی طرح تیار ہو جاتا مگر آخری لمحے آفت کے ہادل چھٹ جاتے اور وہ مایوس ہو جاتے۔

اس آدمی کو کسی بھی قوت کا سہارا ہے۔ درندہ سارے اڈا لئے نہ ہو جاتے۔ پوہس چیف کے کان میں یہ بات بھی آئی تھی کہ وزیر اعلیٰ نے جگہ پر نظر رکھنے کے لیے اپنا خاص آدمی بھیجا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پوہس ڈر کے مارے جگہ کو کسی جھوٹے کیس میں پھانسنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی مگر پیرول کا ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو ان کا ضبط جواب دے گیا۔ ان کو جگہ کو جذبات میں لانے کا کھلا تجربہ کرنا پڑا۔ !

چھٹی کا دن تھا جگت کی انگلی تھامے ست پال جگت کے ساتھ حاضری لگوانے جا رہا تھا۔ پیرول کے دن کم

ہوتے جا رہے تھے۔ ہر دن اسے سزائیں سے کم ہوتا دکھائی

دے رہا تھا۔ کیونکہ جیل میں رہنے سے باہر کا ماحول اسے سزا جیسا معلوم ہوتا تھا۔ قیام قدم پر اسے احتیاط رکھنا بھی۔

بے عزتی برداشت کرنی تھی۔ کوئی نا انصافی ہو رہی ہو تو درمیان میں نہیں پڑتا تھا۔ یہ سب اصول قید کی زنجیروں سے زیادہ وزن دار تھے۔

”باپو! تم روز روز جیل کیوں جاتے ہو؟“ راستہ چلتے

ہوئے ست پال نے پوچھا۔ ”وہ ہمارے گھر کے پاس

جوڑ کا رہتا ہے کہہ رہا تھا کہ خراب دی جیل جاتے ہیں۔ تم

تو خراب دی نہیں ہو پھر بھی.....“ اس کی بات ختم ہوا اس

سے پہلے عصب سکتی ہوئی تیز رفتار پولیس جیب نے

جگت کو ہشیار کر دیا۔ پہلے تو گھوم کر دیکھنے کا ارادہ کیا مگر پھر

جیسے جگا کے اندر سے کسی نے کہا ہٹ جاؤ! جلدی سے

ہٹ جاؤ اور پھر جگت نے جلدی سے لڑکے کو راستے سے

دور دھکیل دیا اور جسم کو سمیٹ لیا۔ اسی لمحے جیب سرسراہی

ہوئی قریب سے گزر گئی مگر کہنی کے قریب کرتے گی آستین

پھٹ گئی۔ کئی لوگ چیخے بھی۔ ”ارے کیا ہوا؟ بے چارہ ذرا

سناچ بچ گیا۔“ پھر کچھ دور بریک کی آواز کے ساتھ جیب رکنی

بجی ہوئی آستین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جگا کا دماغ قابو

سے باہر ہو گیا۔ اس نے پولیس جیب کو گھورا اور دانت چرس

لیے۔ گالی دینے کے لیے زبان میں پلچل سی ہونے لگی مگر

ست پال اس سے چمٹ گیا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے

پوچھ رہا تھا۔

”باپو! تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟“

مئے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جگت کے دوسرے

ہاتھ کی ہتھی دھجلی پڑ گئی۔ ست پال ساتھ نہ ہوتا تو وہ اس

طرح کھڑا نہ رہتا بلکہ جیب کے ذرا نیور کی گردن پکڑ کر دو

تین پھین ضرور لگا دیتا۔ ابھی ارادہ ملتوی نہیں ہوا تھا کہ گھڑی

ہوئی جیب سے افسر نائب کا ایک آدی دکھائی دیا۔ وہ آدی

قریب آیا تو ہاتھ زانوؤں گا۔ جگا سوچ رہا تھا مگر وہ بیٹھا بیٹھا

ہوٹ چاہا ہاتھ۔ شاید جگا کے مزاج کا اندازہ کر رہا تھا۔

آٹھ دس آدی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ دھیسے لہجے میں ایک

نے گالی دی۔

”سارے! اندھوں کی طرح چلاتے ہیں..... ان سے

کون پوچھنے والا ہے؟ کون پوچھنے والا ہے؟“ یہ الفاظ جگت

کو کھٹکے۔ وہ آستین چڑھا کر لوگوں کے درمیان سے راستہ

بناتا ہوا آگے بڑھا مگر جیب دوڑنے لگی۔ جگت کو شرمندگی

ہوئی۔ حالانکہ اسے خبر نہیں تھی کہ امتحان کی گھڑی گزار کر

قدرت نے دوسروں کو شرمندہ کیا تھا۔



”اب دو دن باقی رہ گئے ہیں۔“ چندن کور نے مسرت

اور دکھ کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ ”پھر وہی جدائی۔“

”دو نہیں صرف ایک دن چندن!“ جگت نے مسکرا کر

کہا۔ ”کل صبح کی گاڑی میں تمہیں بھیج کر شام کو میں جیل

چلا جاؤں گا۔“

”نہیں..... میں تمہیں جیل روانہ کر کے پھر گاڑی

پکڑوں گی۔“ چندن کور مضبوط لہجے میں بولی۔ ”تمہیں ہبتا

کے سپرد کر کے جاؤں گی۔“

”جج کہنا چندن! تمہیں ڈر ہے کہ میں بارہ گھنٹے تھا

رہا تو کوئی طوفان اٹھاؤں گا؟“ جگت نے پر مذاق انداز

میں پوچھا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”ابھی تم کو مجھ پر اعتماد

نہیں ہوا۔“

چندن نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم پر تو پورا اعتماد ہے مگر تقدیر آخری لمحے میں دغا نہ دے

جائے بیڈر لگتا ہے۔ میرے نصیب میں یہی چکر رہا ہے۔“

جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ جدا ہوتے ہوئے

چندن کور کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنی بیوی بیٹے کو

گاڑی میں بٹھا کر رخصت کرنے کا زندگی میں ایک موقع

مل رہا تھا وہ اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ رشتے دار

گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہوں! انجمن کی سیٹی بجے اور گاڑی

حرکت میں آئے وہ گھڑی عجیب ہی پر لطف ہوتی ہے۔

آج تک ہمیشہ چندن سے چھپ چھپا کر ملنا اور جدا ہونا

یہی ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں کے سامنے اسے ”پھر ملیں

گئے“ کہنے کی خواہش وہ دہانہ کا۔ اس نے درمیان کا راستہ

ہوئی گاڑی کے ساتھ پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے اس نے پیار بھری نکتی سے پوچھا۔ ”بتاؤ! اس بار لڑکا ہوگا یا لڑکی؟“ وہ دوسروں کی موجودگی بھول کر پوچھنے لگا۔ گاڑی تیز ہو رہی تھی۔

”جو بھی ہو.....“ چندن کور نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ ”تمہیں تمہارے بچے کی قسم دے کر کہتی ہوں کہ سیدھے جیل پہنچ جائیگا۔“ چندن کوڑکی آواز دور ہوئی گئی اور گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ گئی۔ جگت کافی دیر تک نظروں سے اوجھل ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔



”جگا آیا..... جگا آیا.....“ جگت جیل کے دروازے میں داخل ہوا اور قیدیوں نے شور مچا دیا۔ وہ سرت سے چیخ رہے تھے۔ سلامت واپس آ گیا۔ جگا روز جیل میں حاضری دینے آتا تھا اس کے باوجود آج وہ بیروں سے لوٹا تھا اس کی خوشی سب سے انوکھی تھی۔ کبھی قیدیوں نے سوچا کہ بھگوان نے ان کی دعا سن لی ہے۔ جگت کے نقش قدم پر چل کر کبھی ہمارے قدم بھی جیل سے باہر جائیں گے۔

”باہر کس بات کا شور ہے؟“ مہتاب نے سراٹھا کر پوچھا۔ ”صاحب! جگا آ گیا ہے۔“ ابھی میٹ نے اپنے الفاظ مکمل ہی کیے تھے کہ جگت نے آفس میں قدم رکھا۔ سوپر مہتاب کے چہرے پر حیرت ابھرائی۔

”جگا.....!“ ان کی آواز پیار سے بھیگ گئی۔ وہ کچھ رکے پھر بولے۔ ”تم آ گئے؟ شام کی بجائے صبح ہی آ گئے؟“ سوپر کھڑے ہو کر میز کی دوسری جانب آ گئے جگت سرت بھرے انداز میں اندر آ کر جھکے جہاں تھا مگر مہتاب نے اس کے بازو تھام کر کہا۔

”نہیں جگا! آج تو تم سے بغل کیر ہوتا ہے۔“ ایک دبلا پتلا اور دوسرا کیم کیم۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہ دیکھ کر دوسروں کے دل بھر آئے۔ ”تین ماہ مختصر رہے کیوں؟“ سوپر نے مزاج چڑی میں پوچھا۔

”نہیں صاحب! بھاری پڑ گئے۔“ جگت سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں دج ہے کہ بارہ گھنٹے پہلے ہی آ گیا۔ باہر کی دنیا

”ہم ایسا کریں گے شام کی بجائے صبح جیل لوٹ جاؤں گا۔ تمہاری گاڑی روانہ ہو اس کے بعد اسٹیشن سے سیدھا مہتاب کے پاس چلا جاؤں گا۔ اب تو مطمئن ہو؟“ جواب میں چندن صرف مسکرا دی۔ اسٹیشن سے جیل تک کا راستہ بھی اسے لمبا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے سارے راستے فکر رہے گی۔ اس نے یہ بات جگت کو بتائی۔

زندگی میں پہلی بار تین ماہ تک کھلے عام ساتھ رہنے کے بعد دونوں جدا ہو رہے تھے۔ گاڑی کی روانگی میں چندرہ منٹ کی دیر تھی۔ ست پال کو اب باپو سے محبت ہو گئی تھی۔

”باپو! تم بھی پیارے ساتھ چلو۔“ وہ کئی بار کہہ چکا تھا۔ چندن خاموش رہی تھی پھر بھی اس کی آنکھیں جگت کو مشورہ دے رہی تھیں۔ ”سنجیل سنجل کر۔“ جیل پہنچ جانا! آخری ڈیڑھ ماہ سے ایک خاص بات اس کی زبان پر آ کر لوٹ جاتی تھی۔ ابھی کہے یا نہیں؟ اس کا صحن میں تھی۔ ”پہنچ کر فوراً خط تحریر کرنا۔“ جگت نے اسے پانچویں بار کہا تب چندن بولی۔

”اس سے پہلے آپ جیل پہنچنے کا تار دیں گے۔ گھر جاتے ہی مجھے خوشخبری سننی ہے۔“ دونوں کی نظریں بار بار ٹکرا کر لوٹ جاتی تھیں۔ سیٹی بجی تو جگت نے چندن کو رکا ہاتھ دبا کر کہا۔

”ست پال کا خیال رکھنا۔“ چندن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ جی بھر کر جگت کو دیکھ لینا چاہتی تھی۔ کہیں آنسو درمیان میں نہ آ جائیں اس لیے اس نے جلدی سے آنکھیں خشک کر دیں پھر اس نے بمشکل کہا۔

”اب اکیلے ست پال کا نہیں تمہارے دوسرے بچے کا بھی خیال رکھنا ہے.....“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ شرم سے نیچے دیکھنے لگی۔

”اچھا.....؟“ جگت چونک پڑا۔ جوش سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ پلیٹ فارم سے بوٹی میں جا کر چندن کو پیاد کرے۔

”تم نے آج تک مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ حرکت کرتی

”یار! مجھے کہاں گھر جانے کی جلدی ہے؟“ جیسا میری سمجھ میں آتا کہہ دیتا۔ ”یہاں مزے ہیں۔ تم سب کو چھوڑنے کے خیال سے دل گھبراتا ہے۔“ مگر سچا سچ میرا دل سمجھ گیا۔ کبھی میں تنہائی میں بیٹھا خیالوں کی وادی میں گھوم رہا ہوتا تو وہ مجھے ٹوکتا۔

”جگا! گھر یا آ رہا ہے؟“ جگا کہنا! ابھی سے جدا ہوتے وقت تمہیں دکھ ہوا تھا؟“

”گھر کے یاد آئے گا؟“ میں نے ٹالنے والا جواب دیا۔ ”جدا ہوتے وقت مجھ سے زیادہ چندن کو دکھ ہوا تھا۔“

جگا بات تو یہ تھی کہ میں زیادہ تر ویر کے خیال میں گم

رہتا تھا۔ بیروں کے تین ماہ میں ایک بار بھی اسے ملنے کی

سوچ دھوکا ٹھٹھکا ہوا اس کا بہت صدمہ تھا۔ چندن کو فیروز

پور رخصت کرنے کے بعد پہلا خیال میرے ذہن میں

آئی تھا کہ میں چپ چاپ لہریاں چکر لگاؤں۔ ویر کو

تلاش کروں۔ تب یہ سوال نہیں تھا کہ ویر کا میرے پاس

پتہ نہیں ہے۔ پورے بارہ گھنٹے ہاتھ میں تھے پھر ملنے کی

ترپ تھی ہے؟ محبوب سے ملاپ کے لیے دل ترستا تو دل

میں انگارے سے بھر جاتے ہیں اور مصیبتوں سے انسان

جان بچانے لگتا ہے مگر چندن کو نے اسٹیشن سے سیدھے

جیل جانے کی قسم دے کر میرے بھر بانہ دیے تھے۔

لہریاں جاکر ویر کو ملی یا نہیں؟ ملاپ ہوتا تو خون خرابہ کیے

بغیر لوٹا یا نہیں؟ اسے پھر واپس ہی کیوں آتا؟ ممکن ہے کہ

چندن کو اس خطرے کو پہچان لی ہو۔ میرے ساتھ کم رہنے

کے باوجود ویر میری رگ رگ سے واقف تھی۔ سو پرہتا سے

ملنے جاتا مگر کبھی یہ معلوم نہیں کیا کہ ”میری رہائی کا کیا

ہوا؟“

پھر بھی وہ خود کہتے۔ ”جگا! بات آگے بڑھ رہی ہے۔

زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

”صاحب! آپ دل پر زیادہ بوجھ نہ رکھیں۔“ میں ان کا

اور اپنا دل سمجھانے کے لیے کہتا۔ ”آپ کی مہربانی سے

مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ باہر تین ماہ میں پریشان ہو گیا تھا۔“

”سکھ دکھ کی بات نہیں ہے جگا!“ وہ جوش میں کہتے۔

مجھے بڑی جیل دکھائی دی۔ وہاں بٹھآپ جیسا کوئی سوپا نظر نہ آیا اس لیے میں پور ہو گیا تھا۔ آج ایسا لگ رہا ہے جیسے چھٹکارا ملا ہو۔

”ایسا نہ کہو جگا؟“ سوپا نے چٹھہ تھپک کر کہا۔ ”تمہیں

ہمیشہ کے لیے جیل سے رخصت کروں گا تو صحیح آزادی

سمجھوں گا۔“

جگت ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس انسان کو کہنی لگن ہے؟

مگر ہمیشہ کی رہائی کی بات اسے خواب ہی نظر آتی تھی جس

کا ماضی خون سے رنگا ہوا ایسے قیدی کو حکومت کیسے رہا

کر دے گی؟

”جگا! ایک چیز بھول گیا۔“ یہ کب کر مہتا نے الماری

کھولی۔ جگت پچاس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مہتا نے

الماری میں سے بڑا سا ڈکالا۔ ”تم امتحان میں کامیاب

ہو گئے ہو اس کی خوشی میں تم کو یہ سنا رہے ہیں۔“ جگت

نے سنا ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اس پر جگت کی اٹلی پڑتے ہی اس

کے تاروں سے ایک بیٹھا سا سر نکلا۔ جگا کو ایسا محسوس

ہوا جیسے وہ مہتا کے نرم دل کی آواز ہو۔

”تمہاری رہائی کا حکم آئے تب تک اس پر ہاتھ بھالو

قدرت نے تم کو پیاری آواز دی ہے۔ بیا واز سارے ملک

اور پوری دنیا میں پھیلے یہی میری خواہش ہے۔ یہ خواہش

پوری کرنی ہے یا نہیں؟ تمہارے اختیار میں ہے۔“

جگت کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان

اس نے اٹلی ذات سے سوال کیا۔

”جس ہاتھ نے آج تک رائفل اٹھائی ہے اس ہاتھ

میں سارا ڈھکرا ہر لٹکا تو میں کیسا دکھائی دوں گا۔“



اب یہ کھدا تعات خود جگا کی زبانی سنئے!

”بیروں کی سعاد پوری کر کے جیل میں آنے سے چار

پانچ ماہ تک میں نے ایسی اچھٹن میں گزرے کہ آج ان

کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے۔

”کیوں جگا۔۔۔ کب گھر جاؤ گے؟“ تقریباً دو چار

قیدی ہر روز یہ سوال کرتے۔

زندگی پر بھی ایک گیت گایا۔ جب قیدیوں کو سنایا تو وہ سب حیران رہ گئے۔ کسی نے ٹوکا بھی کہ ایسے جوش والا باہر نکل کر سکون سے نہیں رو سکے گا۔ جیل واپس آئے گا۔



دن گزرتے رہے۔ ”بس اب تھوڑے دن باقی ہیں۔“ بار بار یہی سننے کو ملتا۔ سو پر مہتا اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی حالت سے پتہ چلتا کہ میری رہائی کرائے بغیر انہیں چین نہیں آئے گا۔ زندگی میں قدرت کی بڑی مہربانی رہی ہے کہ جو بھی ملا اسے میں نے بھرپور پیار دیا۔ نہیں تو یہ مہتا کو مجھ سے کیا لینا دینا ہے؟ نہ کوئی رشتے داری نہ کوئی قربت رہی ہے پھر بھی میرے جیسے بدنام آدمی کے لیے اتنی جدوجہد کیوں کر رہے ہیں؟

ایک دن گیت گارہا تھا۔ ساز کے تار پراٹھکیاں گھوم رہی تھیں۔ آواز بلند کرتا گیا اسی لمحے کسی کی کھٹکتی ہوئی چیز کی آواز کان سے نکرائی۔ گیت پورا ہونے تک خاموش کھڑا رہا۔ اچانک نظر اٹھی تو چونک پڑا۔

”گوں چننا..... کب آیا؟“ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ اتنا زور ہو گیا کہ بہت دیر تک بول نہ سکا۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔

”یاماچی!“ اتنا کہہ کر وہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگا۔ میں سمجھ گیا جیل کی تنہائی نے اس کی جوانی کے جوش کو ختم کر دیا ہے۔

”اچھا ہوا تم آ گئے۔ یہاں سو پر مہتا تمہیں سنبھال لیں گے۔“

”افسوس! کہ میں دیر سے آیا۔ تم تو اب رہا ہو جاؤ گے۔“ اس نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ تمہاری زندگی بدل گئی ہے۔“

”تمہاری زندگی بھی بدل جائے گی۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”میں وجہ ہے کہ میں نے تمہاری بدلی یہاں کرائی ہے۔“ پھر بات بدلنے کے لیے پوچھا۔ ”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

”پتہ نہیں.....“ وہ نیچے دیکھ کر بولا۔

”جیل آ خر جیل ہے۔ ذمہ دار یوں سے آدمی بے فکر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی سچا سنگھ نہیں ہے اس لیے کہتا ہوں کہ میں تم کو گھر رخصت کرنا چاہتا ہوں۔“

”گھر..... صاحب میرا کوئی گھر نہیں ہے۔“ میری اس بات پر وہ ناراض ہو جاتے۔

”جگا! ابھی تمہارے دل میں ماں باپ کی طرف سے ناراضگی کم نہیں ہوئی ہے؟ کیوں جھوٹی ضد پڑا ہے ہوئے ہو؟ تمہارا گھر ہے ماں باپ ہیں، کھیتی باڑی ہے، بچی بچے ہیں سب کچھ ہے تم پرانے کو اپنا کر لیتے ہو انہوں کو کیوں پرانے کہتے ہو؟“

”یہ ضد نہیں! آن کی بات ہے۔ ویرو کی بات پر میں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب ویرو کو لیے بغیر گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر جاؤں گا پھر بھی گھر کے فرد کی طرح نہیں مہمان کی طرح رہوں گا۔“

مہتا ٹھنڈی سانس بھرتے۔ جب بھی ویرو کی بات پھینچتا تو وہ پراسرار طور پر خاموش ہو جاتے مگر ان کی آنکھیں جیسے کسی سوچ میں ڈوب جاتیں۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور ویرو کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

”جدائی میں بھی ایک طاقت ہے جگا۔“ وہ سنجیدہ ہو کر کہتے۔ ”پیار میں ماویں ہونے والا فنکار اپنے فن کے ذریعے اپنے درد کا اظہار کرتا ہے۔ خون خرابے سے نہیں۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دوں وہ فوراً بول اٹھتے۔ ”تم یہاں ہو! اس دوران کچھ گیت کہہ لو! تمہاری آواز میں تمہارے گیت میں لوگوں کو سناؤں گا۔“

”لوگوں کو یا قیدیوں کو؟“ میں شک ظاہر کرتا۔

وہ پر یقین لہجے میں جواب دیتے۔ ”پہلے قیدیوں کو اور پھر لوگوں کو سناؤں گا۔ اتنا یاد رکھنا کہ وقت بڑا منصف ہے۔“

میں ان کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور ویرو کی یاد میں پیار کے گیت کہنے لگا۔ بیٹھا ہوا ساز بجایا کرتا اور گاتا رہتا۔ سچا سنگھ کی صحبت میں کتاب پڑھنا بھی ہوتا۔ گرونا تک کی سوانح عمری نے مجھ میں ایسا جوش پیدا کیا کہ میں نے ان کی

“*Ugola*”

”میں نے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پنا سنگھ کا لڑکا لے کر آئی ہے جو مجھے کھٹکتا ہے۔“ چتا کے چہرے پر نفرت پھیل گئی۔ میں نے بات سمیٹ لی۔

”آخروہ تمہاری ماں ہے۔ جب تک میں ہوں تب تک ایک بار اسے ملنے کے لیے بلاؤ تمہاری بھائے میں بات کروں گا۔“ اس نے اختلاف نہیں کیا۔ چنانچہ ایک ایسا تھا جس نے آخروہ تک میرا ساتھ دیا تھا۔ میری خاطر وہ اپنی زندگی برباد کرتے ہوئے بھی نہیں ہنچکیا۔ ابھی اسے دس سال گزرنے تھے۔ دس سال میں اس کی جوانی دم توڑ دے گی مگر میں لاچار تھا پھر بھی دل میں خیال آیا کہ باہر نکل کر اس کے لیے کچھ کروں گا۔

”جگا! تمہاری رہائی کا حکم آ گیا ہے۔“ سو رہتا ہے
اپنے آفس میں بلا کر خبر دی تو جیسے زمین کی گروش ختم ہوئی۔
میرے ذہن میں آنہاں ہی چلنے لگیں۔ مجھاپی سامعت
برہمن شاپا۔

سہتا نے میری پیچھے تھوپک کر کہا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ تم کو رہا کرانے بغیر نہیں رہوں گا۔ نوہ خط پڑھ لو۔“ راز تھے ہاتھوں سے میں نے خط لیا۔ مگر لکھائی سمجھ میں نہیں آئی مگر میں نے ان کے چہرے سے پڑھ لیا کہ وہ جیت گئے ہیں۔

”آج تک میں نے کسی کا احسان نہیں لیا تھا..... مگر آپ کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے مجھے دوسرا جنم لینا پڑے گا“ میں اتنا ہی کہہ رکھا۔

”ارے یا گل! تمہارا دوسرا جہنم بہت پہلے ہو چکا ہے۔“ مہتا نے جس ٹکرمیرا ہاتھ تھاما۔ ”جب سے تمہارے ہاتھ میں راکفل کی جگہ ساز دیا ہے اس وقت سے۔“ میں نے پیار بھرے انداز میں ان کا ہاتھ دبایا۔ نیوؤں پر بمشکل قابو کیا۔ مہتا کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔

”جگا! ابھی تم کو ایک حیل اور چھپائی ہے۔“ میں چونک پڑا۔ وہ ہنس دئے۔ ”صرف ایک یا دو دن کے لیے وزیرِ اعلیٰ پنجاب پھر صاحبِ جان نہ ہر جانے والے ہیں۔ وہاں سے تمہاری رہائی ہوگی۔“

”تم کو حکومت کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنا ہے۔ کرو گے؟“ میں نے اقرار کر لیا۔ سو پر مہتا نے رخصت کرتے وقت مشورہ دیا تھا۔

”جگا جیل سے باہر بھی اگر کوئی زنجیر پہنی پڑے تو اس کے لیے تیار رہنا اسی لیے شاید جیل سے باہر آنے سے پہلے ہی ملازمت کی زنجیر میں جکڑ لیا گیا تھا۔

گھر منہ بچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ گھر یہاں ست پال کا بچپن گزرا ماں اور باپ کا بڑھاپا کتنا چندن کی جدائی نے آجس بھریں۔۔۔۔۔ وہ گھر دور سے دکھائی دیا اور جیر درد

کرنے لگے۔ دل وہاں جکڑنے کی جلدی کر رہا تھا مگر ذہن روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ”مگر کیوں؟ میرے باپ میرے دشمن نہیں تھے۔ ہمیشہ میری بھلائی چاہتے پھر بھی

دل سے کدورت کیوں نہیں جاتی؟ جالندھر جیل میں جانے سے پہلے فیروز پور سے مہتا نے آخر خط لکھ کر بتا دیا تھا کہ تمہارا بیٹا ہمیشہ کے لیے جیل سے رہا ہو کر گھر آ رہا ہے۔

کھویا ہوا بیٹا دو دن میں تمہیں واپس مل جائے گا پھر خط میں آخری جملہ لکھا تھا۔ مجھے لینے کوئی مٹائے میں سب سے

ملنے خود آ جاؤں گا۔ میں ایک دم پہنچ کر سب کو ہونکا دینا چاہتا تھا۔ سورج وہاں رہا تھا۔ کچھ گھنٹوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ درخت پر چڑیاں جھیں جھیں کر کے ان کا استقبال کر رہی تھیں۔ مجھ کو کچھ درست پال سرت سے

چینا آئے گا۔ میں چپ چاپ گھر میں داخل ہوا مگر اسی لمحے چیخ مٹا دی۔

”آ آ گئے۔ آ آ گئے۔ آ گئے۔۔۔۔۔ ایک ساتھ مختلف آوازوں کا شور مچ گیا۔ میں ہنسیپ گیا۔ چوری نیچے

جانا تھا اس کی بجائے حل کرتا گیا پھر دوڑا ہاتھ پھینکا کر بڑی بڑی ہست بھرتا ہوا سامنے کھڑے ہوئے سب کو ایک ساتھ ہانپیدوں میں بھر لینے کے لیے۔

سامنے سے چھوٹا ست پال۔ ”باپو۔۔۔۔۔ باپو“ کی چیخ مارتا ہوا منھیاں کس کس کا کھیں بند کیے دوڑا آ رہا تھا۔ اس بو میں نے اٹھا لیا ماں باپ اور چندن کور کی مسرت کا اظہار ان

کے چہروں سے ہور ہاتھا۔ ”آپا میرا بیٹا۔“ ماں پاگل کی طرح پٹ گئی۔ بہت دیر تک روٹی رہی۔ سینے اور پشت پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

”بھٹوان نے آخر ہماری جانب دیکھ لیا۔“ پھر آنسو خشک کرتے ہوئے چندن کو کہنے لگی۔ ”کھڑی کیا ہو بہو؟ میرے بیٹے کے سر پر سے لمبوں اتار۔ اب کسی کی نظر نہ

لگے۔“ میں اپنے باپ کے قدموں میں گر گیا۔ انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگایا پھر چندن کی طرف دیکھا۔ شرماس نے سر جھکا لیا۔ اس کے رخساروں پر ہستے ہوئے آنسو

اس کی مسرت کا اعلان کر رہے تھے۔ ”ماں۔۔۔۔۔ اب کیوں رو رہی ہو؟ باپو تو آ گئے۔ اب ہمیں چھوڑ کر تین سہیں جا میں گئے۔“ میری بجائے ست

پال نے چندن کو کور کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر لڑائے کہا۔ اس کی پتلی انگلیوں پر لگے ہوئے چندن کتا نسو چومنے کے لیے میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔



”میں کل شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔“ رات کو سونے سے پہلے میں نے دھماکا کیا۔ ماں اور باپ سنا لے

تیں آ گئے۔ ”چندن اور ست پال کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ ”کہاں لے جاؤ گے؟“ باپو نے چٹکچاتے ہوئے

پوچھا۔ ماں کی آنکھوں سے روشنی اڑی۔ چندن کا چہرہ دھچکا پڑ گیا۔

”میں تم سب سے ملنے آیا ہوں۔“ میں ہنسی جانب دیکھے بغیر بولا۔ ”اب کام دھندے سے لگ جانا پڑے گا۔“

”کام دھندہ؟“ باپو نے بھاری لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کبھی باڑی تمہاری ہے۔ کہاں تک بوز حصے سے محنت کراؤ گے؟“

”میرا کچھ نہیں ہے باپو؟“ میں غصے اور چاہت سے بولا۔ ”میں اس گھر کا ایک مہمان ہوں۔“

”چھر زمین جا نیدا کو میں گئے سے لگا کر پھر دوں گا؟“

باپو کچھ سخت ہوئے۔ ”جانے سے پہلے اپنے ہاتھوں فروخت کر دو! پیسے آئیں وہ لے کر ہم سب ساتھ چل دیے ہیں۔“

”یہ بھی نہ ہو سکے گا باپو۔“ ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں رک گیا۔ ”میرا کوئی نھروہ نہیں۔ ملازمت صرف نام کی ملی ہے۔ ورنہ مجھے باہر رز یادہ بھٹکا پڑے گا۔“ ”ملازمت.....؟“ ماں اب چیخ پڑی۔ ”تمہیں ملازمت کرنی ہے؟ ہمارا بڑھاپا شرماتا ہے۔ جگت! تم کس جرم کی ہمیں سزا دے رہے ہو؟“ پھر وہ بول نہیں سکیں۔ رونے سے ان کا گھارندھ گیا۔

”مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے دو۔“ میں نے فیصلہ ظاہر کر دیا۔ ”تمہارا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے حق بھی نہیں ہے۔ ویسے تمہارا بیٹا ہوں یہ بھولا نہیں جاسکتا۔ اب میں اپنا گھر بساؤں گا۔ زمین جائیداد لوں گا۔ تب تم لوگوں کو ساتھ بلاؤں گا۔“

کوئی کچھ نہیں بولا۔ رات کو کوئی سو نہیں سکا۔ دوسرا سارا دن بھی سب نے اوپری دل سے گزارا۔ شام ہوتے وقت میں نے صرف اتنا کہا۔ ”یہاں سے لدھیانہ جا رہا ہوں۔ وہاں سے خط لکھوں گا۔“ ماں اور باپو نے چپ چاپ سن لیا۔ جب کہاں خبر تھی کہ ان کی آہوں سے بدلتی ہوئی زندگی میں کیسے سخت سوڑا آئیں گے.....!



ہسم پر موجود لباس میں گھر سے تو نکل گئے مگر جگت اور چندن نے یہ نہیں سوچا تھا کہ لدھیانہ جا کر کہاں رہیں گے؟ چندن کو کوئی یہ خواہش تھی کہ جگت تین چار ماہ باپ کے ساتھ رہے تو بہتر ہے۔ اس وقت تک وہ زچگی سے فادش ہو جائے گی۔

”تم یہاں رہ جاؤ۔ مجھے تو جلدی ملازمت پر پہنچنا ہے۔“ جگا بولا۔

”ملازمت کی یاد دہانی تلاش کرنے کی جلدی ہے؟“ چندن نے اس کے رخسار پر ہنسی کے دے کر کہا۔ جگت اس کا کان پڑ کر ہنسنے لگا۔

”دونوں کی۔“ جگانے جواب دیا۔ چندن کو سوچنے لگی کہ جگت کو اس طرح تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر وہ پھر پڑی سے اتر گیا تو چندن کے ہاتھ سے چلا جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا پھر جگا سے مخاطب ہوئی۔

”پھر تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لدھیانہ میں میری خالہ کی لڑکی رہتی ہے اسے زچگی کے وقت بلاؤں گی۔ مگر تم نے کوٹھری لے لی ہے یا اسی طرح چل پڑے ہو؟“

”نہیں چندن! میں بے منزل مسافر ہوں۔ جہاں راستہ لے جائے گا چلا جاؤں گا۔ جہاں گھر مل جائے گا وہاں لوں گا۔“ پھر اس نے جیب سے پیسے نکال کر دکھائے۔ ”دیکھو! یہ ساٹھ روپے جیل کی کمائی پر گزارہ کرتا ہے۔“ چندن نے روپے گن کر دیکھے۔ ”انسٹھ ہیں۔“ کہہ کر مچی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔ ”تج کہنا کتنے خرچ کر دیئے؟“ جگت سکرایا۔ اس نے سوچا چندن گھر بسانے سے پہلے ہی حساب کتاب پوچھنے لگی۔

”سنو! جب جیل سے رہا ہوا تھا تو اکاؤنٹٹ نے پچاس روپے اور کچھ کھلے پیسے دیئے تھے۔ چند روپے کی لی پانچ دن روپے کا کھانا کھایا۔ دو دن لیٹ آتا تو سب خرچ ہو جاتے۔“ چندن نے دوپے کے آنچل میں روپے باندھ لیے۔

”اب تمہیں کتنا اور مجھے خرچ کرنا ہے۔ بتاؤ کب سے ملازمت پر لگ رہے ہو؟“

”پہلے لدھیانہ پہنچنے دو۔ گھر تلاش کر کے۔“ نہیں گئے تو پھر ملازمت کے لیے سوچا جائے گا۔“ چندن حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ساٹھ روپے کی رقم میں یہ شخص آرام سے رہنے کی بات کر رہا ہے؟ گھر کس طرح چلتا ہے اسے کیا خبر؟

”گھر چلانے کی فکر مجھ پر چھوڑ دو۔“ چندن نے کہا۔ ”چھ دن۔“ بہن کے ہاں رہیں گے۔ اس وقت تک ملازمت پتی کرو۔ تنخواہ ملے گی؟“ چندن نے ادا سے پوچھا۔

”یہ تو پوچھنا بھول گیا۔“ جگت اسحق کی طرح سر ہلا کر بولا۔ ”ہم ڈھائی آدمیوں کا گزارہ ہو جائے اتنی تنخواہ تو دے گا۔“

”جتنی بھی تنخواہ ملے اسی کے مطابق خرچ کریں گے۔“ چندن کور نے اطمینان دلایا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر دنیا داری بالکل نہیں جانتا۔ زیادہ تنخواہ کی بات کروں گی تو ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ”مجھے کم بیسیوں سے گھر چلانا آتا ہے۔“ چندن نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

”ارے..... آپ لوگ؟“ جگت اور مست پال کو دیکھ کر خالد کی لڑکی سنائے میں آگئی۔ ”جی جی جیل سے رہا ہو گئے یہ خبر تو اخبارات میں پڑھی تھی لہذا مبارکباد دینے تمہارے گھر آنے والے تھے۔“ بچے کو گود سے اتار کر ساونت کور چندن سے گئے ٹی پھر بہنوئی کے لیے فخر کا اظہار کیا۔

”اخبار میں تمہاری تصویر دیکھ کر تمہارے بھائی کی مسرت کا نمک نہ نہیں تھا۔ جب میری بہن چندن کور کو بیاہنے آئے تھے اس وقت بھی تمہارا ایسا رعب نہیں تھا۔“ ساونت کور نے آخری الفاظ جگا کی طرف دیکھ کر کہے۔

”تب تو ڈاکو تھا..... خاموشی سے بیاہنے آیا تھا۔“ جگت نے لڑکھی کو نے میں رکھ کر کہا۔ ”ملکہاں سنگھ گھر میں نہیں ہیں؟“

”نہیں..... گاڑی لے کر جالندھر گئے ہیں۔“ ساونت کور کا شوہر انجن کا فائر مین تھا۔ چھوٹی لائن پر کام کر رہا تھا۔ صبح جاتا تو دوسرے دن واپس ہوتا تھا۔ ساونت کور کو پتہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس کے گھر مہمان بن کر آئے ہیں۔ ”ان سے خاص کام تھا؟“ ساونت کور نے پوچھا۔

جگت نے اس دوران دو چھوٹی کونھریوں والے مکان میں نظر گھمائی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں ان کا گزارہ ہو گیا نہیں؟

”بہن! ہم تمہارے گھر مہمان ہو کر آئے ہیں۔ جب تک لدھیانہ میں کوئی مکان کرائے پر ملے اس وقت تک کے لیے ہم تمہارے مہمان ہیں۔“ چندن نے ساونت

سے کہا۔

”ایسا؟“ ساونت کور کی آواز میں حیرت تھی۔ ”لدھیانہ میں رہو گے۔ میں کبھی جی جی جی ہم سے ملنے آئے ہیں۔ اچھا ہوا تم لوگ آ گئے۔ ہماری جھوپڑی تمہیں موافق نہیں آئے گی۔ ملازمت پیشہ آدمی کے گھر آرام کہاں؟“

”ہم بھی ملازم پیشہ ہیں۔“ چندن خفت سے بولی۔ ”ہماری ملازمت دو ایک دن میں پکی ہو جائے گی۔ اس وقت تک ارد گرد مکان مل جائے گا۔“ ساونت کور کو یقین نہیں آ رہا تھا عیش و آرام سے بسر کرنے والے زمین جائیداد والے لوگ ملازمت کی بات کر رہے ہیں۔ مگر جگت کی موجودگی میں وہ کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔

جگا دوپہر حکومت کے پبلک ڈیپارٹمنٹ کے دفتر پہنچا۔ وہ پبلک ریلیشن آفیسر کے کیمپ کے قریب رعب سے کھڑا ہو گیا۔ ”صاحب! جے ملنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولنے جا رہا تھا اسی لمحے فیس بوائے نے اسے روک دیا۔

”اے ٹھہرو! تمہیں کس سے ملنا ہے؟ کیا نام ہے؟“ جگت نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ اس کی بات نے اسے غصہ دلایا۔ دوسرے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے اس نے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔

”جگت سنگھ جگا۔“ پھر بھی اس پرائز نہیں ہوا تو بلند آواز میں بولا۔ ”جگا ڈاکو۔“ آفس بوائے سمجھ بولے انداز میں غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہ ہو گیا کہ یہ وہی جگا ہے جس کی تصویر اس نے اخبار میں دیکھی تھی۔ اسی لیے وہ نرم پڑ گیا تھا۔ اب وہ صوبہ نظر آنے لگا تھا۔

”ذرا ٹھہرو! میں صاحب کو بتاتا ہوں۔“ پھر اس نے ایک کانڈہ جگا کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”اپنا نام صاحب کا نام اور کام لکھ دو۔“ جگت نے کانڈہ لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تو وہ بولا۔ ”یہاں کا یہی اصول ہے جگا جی۔“

جگت ہنس دیا۔ اس نے سوچا مہتا سو پرچ کہتے تھے کہ باہر بھی بیڑیاں پہننی پڑتی ہیں۔ اصول کی بات جگت کو بیڑیوں کی زنجیر نظر آئی۔ مگر وہ ملازمت کرنے آیا تھا اس لیے رعب سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے نام پتہ اور

سجھ لو

۱۔ نہ اتنا بیٹھا بنوں کہ لوگ تمہیں نگل لیں، نہ اتنا کڑوا بنوں کہ لوگ تمہیں تھوک دیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو جتنا تم اس کے محتاج ہو۔

۳۔ آخرت کی اتنی ہی تیاری کرنا جتنا تم نے دہاں جا کر رہنا ہے۔

۴۔ گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ ہو۔

۵۔ جب کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرے تو پھر ایسی جگہ تلاش کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ نہ دیکھ سکے۔

یوسف رضا پرویز..... ذریعہ غازی خان

نہیں دیا تو صاحب نے دوسرا عذر پیش کیا۔ ”بخواب معمولی ہوتی ہے۔ ساٹھ روپے میں گھر کا پورا بھی نہیں ہوتا۔“

ساتھ کا ہند۔ جگت کو کھٹک گیا۔ پھر سوچنے لگا صاحب اس کی اتنی فکر کیوں کر رہا ہے؟ وزیر اعلیٰ جیسے بڑے آدمی نے اس سے ملازمت کی درخواست کی تھی اور وہ افسر اسے اتنی بات سمجھا رہا ہے۔ اس نے سنا تھا کہ رشوت دیئے بغیر سرکاری محکموں میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسے یہ صاحب ایسا دکھائی نہ دیا مگر پھر بھی اسے اس کی بات میں ایسی جھٹک محسوس ہوئی۔

”میں سمجھتا ہوں مجھے آؤر لینے کے لیے چند ہی گڑھ جانا پڑے گا۔“ جگت نے کھڑے ہو کر کہا۔ افسر سمجھا جگا اسے رعب میں لینا چاہتا ہے اس لیے صاف الفاظ میں بولا۔

”چند ہی گڑھ کیوں؟ دہلی جاؤ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔“ پھر ذرا نرم آواز میں بولا۔ ”وزیر صاحبان بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ بات کر کے بھول جاتے ہیں۔ ممکن ہے تمہیں اپنی بیچان کرانی پڑے تب انہیں یاد آئے کہ تم کون ہو؟“

کام کاغذ پر لکھ دیا۔ آفس ہوائے اندر چلا گیا۔ جگت سمجھا تھا کہ اسے بھی اندر بلا لیا جائے گا۔ مگر آفس ہوائے نے آکر کہا۔

”بیٹھو! تھوڑی دیر کے بعد صاحب بلائیں گے۔“

جگت نے آس پاس دیکھا مگر بیٹھنے کے لیے جوتی تھی۔ وہ خالی نہیں تھی۔ اسے کھڑا رہنا پڑا۔ پون گھنٹہ بیت گیا پھر بھی باری نہ آئی۔ پھر تھکنے لگے۔ ایک دو بار خیال گزرا وہاں چلا جائے۔ جہنم میں جائے ملازمت مگر چند دن کوڑ کو کیا جواب دیتا؟ بڑے رعب سے باپ کا گھر چھوڑ کر نکل پڑا تھا۔ ملازمت ملنے کا رعب بھی جمایا تھا۔ اب اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

تقریباً سو گھنٹے بعد آفس ہوائے نے کہا۔ ”اب تمہاری باری ہے۔“

جگا مونچھوں کو بل دیتا ہوا اندر گیا۔ اس نے جیب سے سفارشی خط نکال کر صاحب کی میز پر رکھا۔ پرکاش دیو نے اس کی جانب دیکھا پھر خط پڑا لئی ہوئی نظر ڈالی۔ جگت کو اس وقت تک کھڑا رہنا پڑا۔ بیٹھنے کو کہنے کے لیے صاحب نے سات منٹ ضائع کیے۔

”ابھی میرے پاس آفیشل لیٹر نہیں آیا۔“ صاحب نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار کیے بغیر کہا۔ ”دونوں کے بعد آنا۔“ جگت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کوئی ٹکڑ فائل پر صاحب کے دستخط لینے آیا۔ صاحب مصروف ہو گیا اور جگا کو باہر آ جانا پڑا۔

جگا بمشکل دو دن گزار کر پھر دفتر پہنچ گیا۔ اس بار ملاقات کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ صاحب نے فوراً بیٹھنے کو کہا مگر جواب اندازے سے مختلف تھا۔

”ابھی آؤر نہیں آیا۔ ایسے کام میں دیر لگتی ہے۔“ جگت ڈھیلا پڑ گیا۔ صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ڈاکوؤں اور جیل کی زندگی کے لیے پوچھ گچھ گھر بار کے متعلق معلوم کیا پھر آہستہ سے بولے۔ ”تمہارے جیسے خاندانی شخص کے لیے گانے بجانے کی ملازمت اچھی نہیں۔ یہ تو چھوٹے لوگوں کا کام ہے۔“ جگت نے جواب

”اچھا.....“ جگت نے ہونٹ چبائے۔ ”میں چند ہی گڑھ ہواؤں پر چڑھ چکا ہوں۔ آؤ رلا کر ہی دکھاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ جوش میں باہر نکل گیا۔ جگا کو اپنے پیچھے صاحب کی ہنسی سنائی دی۔ جگت کو محسوس ہوا جیسے یہ ہنسی اس سے کہہ رہی ہو کہ بیڑا کا ڈالنے سے سامان کا نہیں ہے۔ چند ہی گڑھ جا کر پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہیم سین لچر سے ملازمت کا آرڈر لے کر جگت لوٹ رہا تھا تو بہت خوش تھا جیسے کوئی بہت بڑا اور کاڈال کرتا رہا ہو۔ دنیا داری میں چڑنے کے بعد انسان معاشرتی پابندیاں بہر حال قبول کر لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جگا ساٹھ روپے تنخواہ کس طرح قبول کر لیتا؟ جگت کو اپنی لیاقت ثابت کرنے کا پروانہ مل گیا تھا۔ جگت کو صرف آمدنی ہی کا خیال نہیں تھا بلکہ دیرو کا خیال بھی اب اسے پریشان کرنے لگا۔ کسے پتہ کہ اب تک دیرو لدھیانہ میں ہی ہوئی یا کسی اور گاؤں میں رہنے لگی ہوگی؟ پوچھ گچھ کرنے سے دیرو کا پتہ ملنا مشکل تھا۔ وہ سرکار کی پبلیٹی کے لیے گاؤں گاؤں گیت گاتا پھرے گا تو بھی نہ سمجھی دیرو سے بھی مگراؤ ہو جائے گا۔ وہ جیل سے باعزت طور پر رہا ہوا تھا اس کا پتہ دیرو کو پتل گیا ہوگا۔ وہ سوچتا کہ اگر ایک بار دیرو مجھے مل گئی تو پھر میں اسے بھی نظر سے دور نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے لیے مجھے چاہیے کچھ بھی قربانی دینی پڑے۔ ایسے ہی خواب دیکھتا ہوا ملازمت کی زنجیر پھین کر جگت لدھیانہ پہنچا۔

ملازمت پکلی ہو گئی۔ یہ جان کر چندن کو کتنی خوش ہوئی؟ مگر گھر میں قدم رکھتے ہی اسے لائین کے اچالے میں چندن کا اداس چہرہ نظر آیا تو جگت کی مسرت غائب ہو گئی۔ ساؤنت کو رات بنائے تھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ناراضگی تھی۔ چندن کے رخسار پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں چغلی کھا رہی تھیں کہ دونوں بہنیں جھگڑا کر بیٹھیں۔ اچھی طرح جھگڑا ہوا تھا۔ ست پال نیچے زمین پر سو گیا تھا۔ نیند میں بھی اس کی سسکیاں بند نہیں ہوتی تھیں۔ ساؤنت کو کھڑی ہو کر اندر چلی گئی۔ جگت نے چندن کی جانب دیکھا جیسے چندن حلق میں پھنسی ہوئی کسی چیز کو اندر

اتارنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جگت نے محسوس کیا وہ حلق پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”ملازمت مل گئی ہے۔“ جگت نے ماحول کی اداسی دور کرنے کے لیے بات کی۔ ”دو دن بعد کام پر لگ جانا پڑے گا۔ پہلے مکان کرائے پر لیں گے۔“ چندن کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہونے لگا۔ مگر آنکھیں گھومتی ہوئی گھر کے سامان کے تھیلوں پر جا کر رک گئیں۔ جگت کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”ہمیں اسی وقت یہاں سے چلنا ہے۔“ مدھم مگر مضبوط آواز میں چندن ہوئی۔ ”تم آ جاؤ میں اسی کا انتظار کر رہی تھی۔“ سخت سے سخت باتیں برداشت کرنے والی چندن کو یہ کہہ رہی تھی۔ اس لیے جگت سمجھ گیا کہ بات حد سے بڑھ گئی ہے۔

”تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا یا نہیں؟“ جگت نے پوچھا۔

”کھانے پینے کو آگ لگ گئی۔“ چندن بمشکل آنسوؤں پر قابو پا کر ہوئی۔ ”یہ نادان بچہ دو مھینے دو روز زیادہ بی گیا اس میں اس کی خالہ وہ باتیں تک کہہ گئی جو کہنے کی نہیں ہوتیں۔“ وہ کچھ دیر کی۔ جگت کے چہرے پر جوش جھلکنے لگا۔ ”اس بار وہ کہہ چکی ہے کہ مہمان ہو کر پڑے ہیں تو کیا ہماری عزت ہو گئی؟“

جگت کا غصہ چڑھ گیا۔ ملکھان تنگ گھر نہیں تھا۔ عورت سے لڑنا اچھی بات نہیں تھی۔ چندن کو چار پائی سے اٹھ گئی۔ اس نے سوئے ہوئے ست پال کو گود میں اٹھایا۔ ”تم سامان کا تھیلہ اٹھاؤ آج کی رات ہی دھرم شالا میں گزاردیں گے۔“

جگت ابھن میں پڑ گیا۔ اس طرے رات کے وقت گھر سے باہر نکلنے کا چندن کو فیصلہ کرنا پڑا اس کی وجہ سے اسے ساؤنت کو در غصہ آیا۔ وہ اندر بیٹھ کر سب کچھ سننے کے باوجود بھی صرف رات بھر ٹھہرنے کے لیے نہیں کہہ رہی تھی۔ یہ بے عزتی جگت سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے جھٹکے سے تھیلہ اٹھا لیا اور دروازے کی جانب بڑھ کر

چند دن سے بولا۔

کے شانے پر تھیلے کا بوجھ تھا پھر بھی اس نے کہا۔
 ”لاؤ چند دن! میں دوسرے شانے پر ست پال
 کو اٹھائے لیتا ہوں۔“ اسی لمحے سامنے سے ایک سانگھل
 رکشہ آنا نظر آیا۔ جگت نے ہاتھ اٹھایا۔ جوش میں پیڈل
 گھماتا ہوا رکشے والا آہستہ ہوا مگر اس نے دور ہی سے کہہ
 دیا۔

”ابھی سواری نہیں لوں گا۔ میرے گھر کی طرف چلنا
 ہے تو چلو۔“

”نہیں... سرائے جانا ہے۔“ جگت نے نرم آواز میں
 کہا۔ ”ساتھ میں چھوٹا بچہ اور سامان ہے۔ نہیں تو پیدل بھی
 چلا جاؤں۔“ رکشے والا اٹھھٹن میں پڑ گیا۔ پر غور سے
 اندر دیکھ کر جگت کا چہرہ دیکھنے لگا۔ بچہ دیر بعد وہ رکشے
 سے اترتا ہوا چنچا۔

”ارے... جگت سنگھ جگا۔“ جگت کو یہ آواز جانی پہچانی
 لگی۔ وہ قریب گیا۔

”کون... تاک سنگھ؟“ جگت بھی پر مسرت انداز
 میں چنچا۔ مصیبت کے وقت اگر کوئی جاننے والا مل جائے تو
 خوشی ہوتی ہے۔

”ارے یار! یقین نہیں آ رہا۔ جیل کو رزادینے والا جگا
 اس طرح مزدور بن کر تھیلے اٹھائے نظر آئے۔ تھوڑے دن
 پہلے ہی تو تمہاری تصویر اخبار میں شائع ہوئی تھی جس میں تم
 ٹھانڈے ہاتھ سے بار پٹنے نظر آ رہے تھے۔“ جگت جھینپ
 گیا۔ تاک سنگھ نے شانے پر سے بوجھ اٹھایا۔ ”چلو
 بھائی! رکشے میں بیٹھ جاؤ۔ بندہ نہیں جنت تک پہنچا دے
 گا۔“ تاک سنگھ فخریہ لہجے میں بولا۔

”یار جنت تک نہیں! ہمیں سرائے تک جانا ہے۔“
 جگت مذاق کے رنگ میں بولا۔ ”تمہاری بھانجی کے ایک
 رشتے دار کے مہمان بنے تھے مگر بھی نہیں اس لیے کھڑے
 کھڑے جیل دینے۔“ تاک سنگھ سوچ میں ڈوب گیا۔
 جگت کو رکشہ میں بٹھا کر اس نے پیڈل پر زور دیا۔

”ارے یار! تم بہت وزنی آدمی ہو۔“ تاک سنگھ کی
 بات سن کر جگت اور چند دن کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ادا

”چلو۔“ چند دن کوڑے نکلنے میں دو منٹ دیر کر دی۔
 دوپے کتا ٹچل میں بندھی ہوئی رقم میں سے پانچ کا نوٹ
 نکال کر پالنے میں سوئی ہوئی سادنت کوڑی لڑکی کی منھی میں
 رکھ دیا۔ اب تک ہمشکل بچی ہوئی اس روپے کی رقم کے بل
 پر وہ ڈھائی افراد گھر کی چوکھٹ سے نکل کھڑے ہوئے۔
 ابھی چند قدم بڑھے ہوں گے کہ سادنت کوڑے نے پوری قوت
 سے دروازے بند کر دیے۔ اس وقت جگت کا جی چاہا کہ
 جا کر بند دروازے پر زور دار لات مار کر اسے اکھاڑ دے۔
 مگر چند دن ساتھ ہی جو بے عزت ہو کر بھی جاتے ہوئے
 بہن کے بچے کے ہاتھ میں پانچ روپے دینا نہیں بھولی
 تھی۔ اس چند دن کے ملام دل کو صدمہ پہنچانے والا کام وہ
 نہیں کر سکتا تھا۔ شدید سردی میں ایسا لگ رہا تھا جیسے اندھیرا
 جم گیا ہو۔ لوگ سو رہے تھے۔ گلیاں سنسان تھیں۔ جگت اور
 چند دن گھٹے سے باہر آئے۔ بڑے راستے پر آ کر وہ لوگ
 رک گئے۔ کہاں جانا ہے؟ اس سے وہ لاعلم تھے۔ سرائے کا
 پتہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ دونوں لاچار نظروں سے ایک
 دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اب چند دن کوڑے محسوس کر رہی تھی
 رات سادنت کوڑے کے گھر میں گزارتے تو بہتر تھا۔ راستے
 سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے جگت نے پوچھا۔

”سردار جی! مزدور ایک کوئی سرائے ہے؟“ وہ سکھانچا نے
 مسافروں کو دیکھ لگا۔

”مزدور ایک تو نہیں البتہ اسٹیشن پر ملے گی۔ اسٹیشن کی
 جانب دو میل کے فاصلے پر۔“

دونوں نے قدم بڑھائے۔ ”ماں! مجھے سردی لگ رہی
 ہے بھوک بھی لگی ہے۔“ بھوکا سویا ہوا ست پال میند میں
 بڑبڑایا۔ چند دن اسے تھیلیاں دینے لگی۔

”بیٹا! کچھ دیر رک جاؤ۔“ جگت کے دل پر یوت سی
 لگی۔ اس نے سوچا راستے میں کوئی ہوئی ہو تو لڑکے کو کھانا
 کھلا دیا جائے۔ دو فرلانگ مزید چل کر چند دن باپنے
 لگی۔ پیٹ میں بھی بچہ تھا اور گود میں بھی۔ اس طرح دو
 بچوں کا بوجھ ایک ساتھ اٹھا کر چلنا بہت مشکل تھا۔ جگت

غائب ہو گئی۔ جگت کو اچانک خیال آیا کہ رکشا سٹیشن سے اتنی سمت جا رہا ہے۔

”ارے نایک! کدھر لے جا رہا ہے؟ سرائے تو اسٹیشن کے قریب ہے۔“ جگت اور چند دن نیچے اتر کر اس پاس دیکھنے لگے۔ انہیں سرائے کی عمارت نہیں نظر نہ آئی۔ وہاں اور گرد کوئی ایسی بڑی عمارت نہیں تھی جس پر سرائے ہونے کا قیاس کیا جاسکتا۔ اتنی دیر میں نایک تھیرا اٹھا کر پہنچا۔

”میرے پیچھے چلاؤ۔“ اس نے ایک کوٹھری کا دروازہ کھول کر تھیرا اندر رکھا اور چراغ جلایا۔ پھر جگت کی جانب مڑ کر بولا۔ ”یہ ہے بندے کی سرائے۔“ جگت سمجھ گیا نایک نے انہیں اپنا مہمان بنالیا ہے۔ وہ جیل کی دوستی بھولا نہیں تھا۔ چند دن کور نے ست پال کو چار پائی پر سلا یا۔ اتنی مختصر کوٹھری تھی کہ اس میں دو آدمی بمشکل سو سکتے تھے۔ جگت نے سوچا کہ وہاں سب کس طرح سہائیں گے؟

”کھڑے کیا ہو؟ چلو ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالیں۔“ نایک سنگھ نے کھانے کا ڈبہ کھولا۔ چار پرانے اچار اور دھا گلاس دو دھ تھا۔

”یار! تم کھالو۔ میں بھوک نہیں ہے۔“ جگت نے تکلف کیا۔ مگر ست پال آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

”باپو مجھے بھوک لگی ہے۔“ دونوں شرمندہ ہو گئے۔ نایک غصے ہو گیا۔

”یار! دوست سے جھوٹا تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ پیسے سے غریب ہوں مگر دل بڑا ہے۔ جو کچھ ہے بانٹ کر کھالیں گے۔“ ایک ایک پرانھا تین تین پیالے پانی سے سب نے پیپٹ کی آگ بجھائی۔ اس رات جگت سوچ رہا تھا وہ اس تنگ دنیا داری سے کب تک مقابلہ کر سکے گا؟

پانچ روپے مہینے کے کرائے والی کوٹھری مل گئی تو گھر چلانے کا بوجھ چند دن پر ڈال کر جگت ملازمت سے لگ گیا۔ مگر پہلے ہی دن کام پر جاتے ہوئے وہ چند دن سے کہنا نہیں بھولا۔

”تم باہر جاتے ہوئے دیرو کی تلاش نہ بھولنا۔ گردوارے بھی جلتی رہنا۔ وہاں ملاپ ہونے کی

امید ہے۔“

”مٹے گی تو اس کوٹھری میں بند کر دوں گی۔ تم لوگوں سے تب تک جانے نہیں دوں گی۔“ چند دن کور نے مذاق میں جواب دیا۔ ”اپنی نہ بچی کا کام بھی اسی کے ہاتھ سے کرائیں گے۔“

جگت آدھ بھر کر چلا گیا۔ اسے اندر ہی اندر ڈر تھا کہ دیرو اب کبھی نہیں ملے گی۔

جگت نے گاؤں گاؤں بھٹکتا شروع کر دیا۔ سرکاری منصوبوں کی تعریفیں کرنا لوگوں کو جمع کرنا اور تماشے کر کے دوسرے گاؤں بھاگنا۔ پہلے لوگ پیلنی کے گاؤں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے مگر جگاڈا کو گیت گانے آیا ہے یہ سن کر دوڑ کر آئے۔ گئے۔ پہلے تماشے میں شور مچاتے جھگڑے کرتے مذاق اڑاتے مگر جگت کا رعب تھا اس کے ڈاکو ہونے کی دھاک کہ لوگ اب چپ چاپ سنتے تھے۔ آہستہ آہستہ جگت اپنے گیت شامل کرنے لگا۔ وہ ہر پروگرام کے آخر میں دیرو کے فراق میں گیت گاتا نہیں بھولتا تھا۔ وہ عورتوں کی جانب نظر کر کے دردمجری آواز میں گاتا۔

میرے گیتوں میں تم ہو خیالوں میں تم
میرے دل میں بھی تم ہو جواہوں میں تم
میری سانسوں میں تم میری آہوں میں تم
چاہے مجھ سے دور ہو تم مگر ہو نگاہوں میں تم

گیت پورا ہونے کے بعد ہاتھ میں ساز تھام کر بہت دیر تک وہ انتظار میں کھڑا رہتا کہ عورتوں کی بھیڑ میں سے وہ دوڑی دوڑی آئے گی اور جواب دے گی۔ ”نہیں جگت سنگھ! میں دور نہیں واقعی تمہاری نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں ہی تمہاری دیرو ہوں۔“ مگر اس کی بجائے ہمیشہ ایک بھاری آواز سنائی دیتی۔

”جگا! کھڑے ہوئے کیوں ہو؟ لوگ چلے گئے۔ اب کس کا دھیان کر رہے ہو؟“ تب اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ ٹھنڈی سانس نھر کر گئے میں پہنے ہوئے تعویذ پر ہاتھ پھیر لیتا۔ تنخواہ کے ساتھ روپے میں سے تیس روپے جیب خرچ میں ضائع ہو جاتے باقی میں وہ گھر بھیجتا جن

میں سے چند دن بھیجیں روپے گھر میں خرچ کر کے پانچ روپے بھائی۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر چند دن نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ پڑوس میں رہنے والی عورت کو اس کی غریبی پر رحم آیا۔ لڑکی میں دن کی ہوئی تو اس نے چند دن سے کہا۔

”بہن! تمہیں دودھ نہیں آتا اور بچی کو پالنے کی ہمت نہیں ہے۔ اسے مجھوے دو کھانے پینے سے کبھی رہے گی۔“ چند دن سنانے میں آ گئی۔ بائے رے غریبی۔ پیٹ کا جنا دوسرے کو دینا پڑتا ہے۔ بھگوان نے ایسا دن دکھایا مگر پڑوس کا دل نہ کھانے کی خاطر کہنے لگی۔

”بہن! بیٹی بڑا نصیب ساتھ لاتی ہے کسے پتہ اس کے جنم سے ہماری غریبی دور ہو جائے۔“

سال بیت گیا۔ مگر غریبی نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ چند دن کو لیریا ہو گیا۔ پانچ پانچ کر کے بھائی ہوئی سو پچاس کی رقم بیماری کھا گئی۔ جگت اداس رہتا تھا۔ اسے چاروں جانب مایوسی اور اداسی نظر آتی تھی۔ ماضی کی یاد اسے ستانی تب رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ دیرو کی یاد میں دل بے چین ہو جاتا۔ ملازمت سے نفرت ہونے لگی۔ تنخواہ بڑھ کر بمشکل پچھتر تک پہنچی تھی۔ دوسرے سال چاندھر بنے جانا پڑا۔ سو پر مہتا رہنا ہو کر چاندھر میں ہی رہتے تھے۔ ان سے ملنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ دو سال میں اس نے نہ تو نام ہی کمایا نہ ہی خوشحال ہوا۔ پھر بھی منہ دکھانے کے لیے ہٹا یا۔

”جگا اچھا ہوا تم ملنے آ گئے۔ امرتسر میں کانگریس کا کنونشن ہونے والا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر وہاں آئیں گے۔ میں تمہیں سفارشی خط لکھ دیتا ہوں۔ گیتوں کے پروگرام میں تمہیں بھی موقع ملے گا۔“ جگت کو مسرت نہیں ہوئی۔ پھر بھی پچاس روپے ملنے کا سہارا تھا۔ اس کے پاس پہننے کے لیے صرف ایک جوڑی لباس تھا۔ لیڈروں کے سامنے جانے کے لیے اس نے ایک جوڑا اور سلوانے کے بارے نے گز کا کپڑا خریدا۔

ملک کے مشہور لیڈروں کے سامنے ایک کے بعد ایک آئٹم پیش ہونے لگا۔ جگت کا نمبر بار ہواں تھا۔ فکر اور جوش میں وہ پروے کے پیچھے ٹبل رہا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ میں تھامی ہوئی لائٹ سے کھیل رہا تھا۔ گیارہواں آئٹم شروع ہوا تب جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ حلق میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ دو گھنٹ پانی پیا۔ اب اس کا نام لیا جائے گا۔ اس کے کان کھڑے ہوئے مگر دوسرے کا نام پکارا گیا۔ اس کا دماغ گرم ہو گیا۔ اس نے پروگرام کے منتظم سے فریاد کی۔ ”دوسرے جانے پہچانے آرٹسٹوں کو پہلا چانس دینا پڑا۔ دو چار آئٹم کے بعد تمہارا نام بھی پکارا جائے گا۔“ اس نے جواب دیا جگت نے ہونٹ چبائے۔ اس لا چاری کے لیے وہ کیوں یہاں آیا؟ اسے اپنی ذات پر غصا آیا۔ سب جگہ سفارش چلتی ہے۔ خوشامد سے کام ہوتا ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ آخر سولہویں آئٹم میں اس کا نام پکارا گیا۔ صافے کے سرے کو بلند کرنا ہوا جگت سب کے سامنے پیش ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لائٹ تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ بلند کر کے اوچی آواز میں کسی پنوں کا فراقیہ گیت چھیڑا۔ اس کی آواز میں ویرو کا درد شامل تھا اور ساتھ ہی بے درد دنیا کے خلاف غصہ بھی۔

”یہ کون ہے؟“ ایک آواز سنائی دی۔ گیت پورا ہونے کے بعد خاموشی میں یہ بھاری آواز تھی۔ یہ پنجاب کا گنگرلس کے صدر پر تائب سنگھ کیروں کی آواز تھی۔ ”اس کا ایک اور آئٹم ہونا چاہیے۔“

جگت گیت ختم کر کے ڈانس کے پیچھے چلا گیا۔ منتظم نے آ کر اس کی پیچھے ٹھوکی۔ ”پاپا جی! تم چھا گئے۔“ پھر آہستہ سے بولا۔ ”کیروں صاحب نے تمہارے دوسرے آئٹم کا مطالبہ کیا ہے۔“ جگت کن آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب قیمتی بننے کا موقع تھا۔

”مجھے کچھ دیر آرام کرنا پڑے گا۔ پندرہ بیس منٹ جانے دو۔“

”بالکل..... آرام کرلو۔“ وہ اب ادب سے پیش آ رہا تھا۔ ”تمہارے لیے کچھ مشکواؤں؟“



میں بھی آتی رہوں گی۔" ماں کے چہرے کی سرفی دیکھ کر جگت کے دل میں کانٹا چبھ گیا۔

"ماں جی! تم کبھی مجھے خدمت کرنے کا موقع دو۔" چندن گڑگڑائی۔ "بیٹے کی طرح ضد کرو گی یہ کیسے چلے گا؟" "بسو بیٹی! تم عورت ہو۔ ماں کا دکھ جانتی ہو۔ انکار کرتے وقت خود میرا دل بھی دکھا ہے مگر اس سے زیادہ اس وقت دکھا تھا جب جگت نے یہاں رہنے سے انکار کیا تھا۔ وہ گھاؤ ابھی متدل نہیں ہوا۔" وہ بلند آواز میں بول گئیں۔ پھر ہانپتے لگیں۔ سانس لینے کے لیے پتھر رکنے کے بعد مزید بولیں۔ "اس کی طرح میری رگوں میں بھی ایک جاٹ کا خون رواں رہا ہے۔"

ماں نے یہ کبہ دیا۔ جگت سمجھ گیا۔ بالوں کی موت اور ماں جی کی ضد کا اسے گہرا بعد رہا ہوا۔ پوچھل دل سے وہ جانتا تھا۔ موت گیا۔



"جگاجی! ایک کام کے لیے آئے ہیں۔" محلے کے دو چار بڑے آدمی جگہ سے مخاطب ہوئے۔ "اپنے علاقے میں ایک رفداع عائد اسکول قائم کرنا ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" "نہ تو سمجھا کرنے کے لیے؟" جگت نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں..... زمین دلانے میں مدد کرنی ہے۔" ایک شخص نے کہا۔ "راستے کی اس جانب لالہ جی کا پلاٹ خالی پڑا ہوا ہے۔ وہاں اسکول بنایا جاسکتا ہے مگر.....؟"

"لالہ جی زمین فروخت کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟" جگت انہن میں پڑ گیا۔ دو لوگ کچھ دیر خاموش رہے پھر ایک نے ہمت کی۔ "تھوڑا رعب دو! وہ ڈھیل پڑ جائے گا۔" جگت سمجھ گیا۔ دل میں ہنسا۔ "یہ لوگ میرے رعب کو استعمال کرنا چاہتے ہیں مگر اچھے کام میں ساتھ دینا چاہیے۔ ہستی کے بچوں کا

"منگولانا ہے تو شراب منگوا دو! آواز اور کھل اٹھے گی۔" جگت کو میدان ملا۔ اس لیے دوسرے گیت میں اس نے دیس کے لیڈروں کو جھڑکا۔ اس کا رچا ہوا گیت "جاگتے رہنا" سن کر کانگریس کے لیڈر یہ سوچ کر خوش ہوئے گیت میں اکالی لیڈروں پر چوٹ ہے۔ جگت کا یہ گیت فائدہ مند ثابت ہوا۔ لیڈروں نے پانچ سو روپے انعام دیئے۔ دوسرے لوگوں نے دس دس پندرہ پندرہ روپے دے دیئے اور فنکار کی قدر کی۔ ہر زبان پر جگہ کا نام چڑھ گیا۔ وقت پلٹ گیا۔ ملازمت کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں اور وہ گاؤں گاؤں خود پر مرام کرنے لگا۔

تین سال بیت گئے۔ جالتھر کی ماڈل باؤس کا لونی میں چھوٹا سا ایک مکان بنا جس کے دروازے پر تختی لگ گئی۔ "جگت سنگھ جگا ریڈیو آرٹسٹ اور سنگر" چندن کے چہرے پر عیب سی چمک آئی۔ ایک وقت کے ڈاکو شوہر نے ساری دنیا کے سکھ اس کے قدموں میں رکھ دیے۔ وہ فخر کے ساتھ جگت کو دیکھتی۔

"چندن! اب ماں اور باپ کو بلا لیں۔ لانے کے لیے کوئی اچھا دن منتخب کر لیں۔ کیوں؟" دونوں طویل عرصے سے ماں جی اور باپ سے نہیں ملے تھے۔ صرف خط سے غیریت معلوم کر لیتے تھے۔ انہیں بلانے کو جگانے خط لکھ کر وہ انہیں بیٹے آنے والا ہے تو اس کے جواب میں جاتا یا۔ تار پڑھ کر دونوں کے دل ٹوٹ گئے۔

"تمہارے باپو بارت ٹیل سے گزر گئے۔" جگت نے ماں کے پاس پہنچتے ٹکٹ اسود کے رکھے۔ گھر ماں نے جب کہا۔

"بیٹا! تمہارا عہد پڑھ ران کی خوشی دل میں نہیں ملتی تھی۔ میرے بدنام بیٹے نے نام پیدا کیا وہ فخر سے مانج اٹھتے تے۔" تو جگت کتا نسو بہنے لگے۔ اس نے ماں کی گود میں سر رکھ کر دل ملا کیا لیکن اس سے بڑا صدمہ اسے اس وقت ہوا جب ماں کو ساتھ لے جانے کی بات کی۔

"نہیں جگت! میں یہ گھر چھوڑ کر تپت نہیں جاؤں گی۔ تم جس طرح میرے گھر مہمان آتے ہو اسی طرح مجھی بھی

ہوئی۔“چندن کور نے مذاق میں کہا مگر جگت کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے دیر شدت سے یاد آنے لگی۔ چندن سمجھ گئی۔ جگت کو نیل سے رہا ہوئے سات آنکھ سال ہو گئے اور دیر دلب تک نہیں ٹپٹی تھی۔ پھر اس کی یاد تازہ کرنے سے فائدہ کیا؟ جگت آئین میں پیچھی ہوئی چار پائی پر لیٹ گیا۔ سردی کی دیر پھر تھی اس لیے دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ آسمان پر تیرتے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کو دیر کی یاد تھکیاں دے رہی تھی۔ چندن کور نے اسے چھینرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اچانک جگت اٹھ کر صافہ باندھنے لگا تو چندن ڈر گئی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”اس لالہ جی کے پاس اسکول کا سودا کرنے۔“

”سودا کرنے یا چھین لینے؟“ چندن نے کہنا چاہا مگر ارادہ بدل دیا اور بولی۔ ”سمجھانے سے کام نکل جائے تو بہتر ہے۔ ہو سکے تو محلے والوں میں سے ایک آدمی کو ساتھ رکھ لینا۔“

”دوسرا کوئی مشورہ دینا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلا گیا۔

”وہ زمین مجھے فروخت نہیں کرنی۔ سودا کرنے کی بات کہاں ہوئی ہے؟“ لالہ جی نے کہا۔

”تم نے پانی کے مول خریدی تھی۔ سونے کے دام لینے میں کیا اعتراض ہے؟“ لالہ جی میں جگا سے زبان چلانے کی ہمت نہیں تھی۔ ان لوگوں نے یہ کام جگا جیسے سر پھرے پروا دل دیا تھا اس سے لالہ جی دل میں ناراض تھے۔ انہوں نے جلدی سے بات مختصر کی۔

”ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں میں وہ زمین فروخت نہیں کروں گا۔“

جگت کچھ دیر تک لالہ جی کو گھورتا رہا۔ لالہ جی نے سر جھکا لیا جیسے وہ جگا کی نظریں برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ جگت سمجھ گیا کہ اس شخص کو لالہ جی نے گھیر لیا ہے۔ زمین کے بڑھتے ہوئے دام دیکھ کر یہ مزید لالہ جی نہیں چھوڑے گا۔ ”جیسی تمہاری مرضی۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ سر سر ہٹا ہوا ہانکل

بھٹا ہوا وہ چاہے برا بن جائے کوئی بات نہیں۔ اس نے کہہ دیا۔

”تم لوگ جاؤ ارات ہوتے ہی راج اور مزدوروں کو اس جگہ پر بھیج دینا اسکول بن جائے گا۔“

”مگر خریدے بغیر چنالی؟“ سب کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”جگا سے کام کرنا ہے تو اسی طرح ہوگا۔“ جگت جوش میں آ گیا۔ ”تم لوگ آرام سے سوتے رہنا چنکی بجاتے میں کامیاب ہوں گا۔“

”بہتر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے اور جگا سوچنے لگا کہ رائل کس سے لی جائے؟ وہ چودہ سال بعد پہلی بار رائل اٹھانے والا تھا مگر ایک نیک کام کے لیے۔



خیراتی اسکول کی عمارت بنانے کے لیے زمین دلانے کا فرض جگت نے اپنے سر لیا تو چندن نے جگت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ سب تمہیں ہوئی کا نارمل بنا رہے ہیں۔“ چندن اتم سمجھتا تھا متقی سمجھتی ہو؟“

”بیوقوف تو تم کو تمہارے دشمن نے بھی نہیں سمجھا ہوگا۔“ چندن جلدی سے بولی۔ ”مگر یہ سچ ہے کہ میں تمہیں جھگڑا و ضرر مانتی ہوں۔ زبان چلاتے چلاتے نہ جانے تم کب ہاتھ اٹھا دو۔“ جگت ہتھیلیاں مسٹنے لگا تو چندن نے طنز کیا۔ ”کیوں۔۔۔۔۔ ابھی سے ہاتھ میں گھمکی ہو رہی ہے؟“ جگت کے ہاتھ رک گئے پھر اس نے پیار بھرے انداز میں نیس کراپٹی سرخ ہتھیلیوں کے ہالے میں چندن کا چہرہ ہالایا۔

”تمہارے خسار مسٹنے کے لیے کھلی ہوتی ہے۔“

”ارے ذرا شرم کرو! چار بچوں کے باپ ہو گئے ہو پھر بھی ابھی دل نہیں بھرا؟“

جگت نے دونوں رخساروں پر چٹکیاں بھر لیں۔ ”بچوں سے بھر پایا مگر تم سے نہیں۔“

چندن رخسار سہلانے لگی۔ ”کیسے جنگلی ہو؟ اگر مجھ سے دل نہیں بھرا تو دوسری سلا ڈاؤ پروا بھی اونٹنی نہیں ہوئی

گیا۔ اس کی چال میں جوش تھا جو لالہ جی کی نظر میں نہیں آیا ہوگا۔

اندھیرا پھیلنے لگا۔ جگت جسم پر کھل اوندھ کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اس سے پہلے چند دن بچھ پوچھے جگت نے کہا۔ ”پینے کے لیے دوست کے گھر جا رہا ہوں۔“ پھر مزید بولا۔ ”اگر زیادہ پی گیا تو رات وہیں رہ جاؤں گا۔ انتظار نہ کرو۔“ پھر بھی چند دن رات بھر انتظار کرتی رہی۔ دوست کی رائفل لے کر وہ لالہ جی کی زمین پر پہنچ گیا۔ شام ان لوگوں سے کہنا یا تھا۔

”میں لالہ جی سے مل آیا ہوں۔ کام شروع کر دیں۔ پھر مصالحت ہو جائے گی۔“ لہذا کاریگر مزدور اور سامان وغیرہ جگت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔

”چلو! کام شروع کر دو۔“ جگت نے شانے پر رائفل رکھ کر کہا۔ ”پہلے بنیاد ڈالو! رات بھر میں چار دیواری کھڑی کر دو۔“ سب کو جوش میں لانے کی غرض سے جگت لوگ غیرت گانے لگا۔ پیٹرو میکس کے اجالے میں بنیاد بھردی گئی۔ نصف شب کے بعد چٹائی شروع ہو گئی اور صبح تک چار دیواری کھڑی ہو گئی۔ ”ماڈل اسکول“ کا عارضی بورڈ لگا کر جگت روانہ ہو گیا۔ راستے میں دوست کو رائفل لوٹا کر گھر جا کر سو گیا۔ محلے کے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کل تک تو میدان تھا اور آج رات بھر میں اسکول کی عمارت کیسے کھڑی ہوئی؟ یہ چارو کس نے کیا؟ یقیناً یہ تو جگا کا کام ہے۔ گاؤں کے قریب بچے چار میل پیدل چل کر پڑھنے جاتے۔ یہ دکھا بٹل گیا۔

دھوپ سر پڑ گئی تب چند دن نے جگت کے سر پر سے چادر ہٹائی۔ ”اٹھو! پولیس چیف آئے ہیں۔“ سورج کی کرنیں پلوں میں چھینے لگیں۔

”اسے کیا کام پڑ گیا؟“

”پھر انجام بنتے ہو؟“ چند دن بڑبڑائی۔ ”تمہارے کارنامے کاؤ ہندو اور سارے گاؤں میں بچ گیا ہے۔“ یہ سن کر جگت چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ چند دن سے نظر نہیں ملا۔ کا۔ ہاتھ منہ دھو کر ڈرائنگ روم میں گیا۔

”آئیے صاحب! اچانک اس طرف؟“ اپنے چہرے کے تاثرات ظاہر نہ ہو جا میں اس کے لیے تو یہ سے مسلسل چہرہ صاف کر رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر صاحب نے نوکا۔

”آنکھوں میں ساری رات جاگنے کا خمیر معلوم ہوتا ہے جگا۔“

”ہاں صاحب! ذرا کھانا تو بیداریاں کھنکھتی نہیں تھیں۔“ پھر ہلکی سی آواز میں بولا۔ ”اب گھر والی نے بارہ بجے کے بعد باہر رہنے کی ممانعت کر دی ہے۔“

”پھر بھی رات تم نے ممانعت ٹھکرا دی۔“ چیف نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں تھا نے بلانے کی بجائے دوستی کا لحاظ کر کے گھر آیا ہوں۔“

”اوہ..... یہ بات ہے؟“ جگت فس دیا۔ ”لالہ جی نے فریاد کی ہے کہ کسی نے ان کی زمین پر رات بھر میں غیر قانونی چٹائی کر لی ہے۔“ پھر مسکرا کر بولا۔ ”مگر لالہ جی نے تمہارا نام نہیں لیا۔ کل شام تم ان سے ملنے گئے تھے؟“

”تب تم کو سب کچھ معلوم ہے کھنکھ صاحب!“ پھر اقرار کے انداز میں بولا۔ ”میرے سب بچے انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں اس میں میرا مفاد نہیں۔ میں نے یہ سب گاؤں کے غریب بچوں کے لیے کیا ہے۔ تمہارا قانون اعتراض کرتا ہے تو گرا دو اور کیا؟“ آخری الفاظ جوش کی بجائے پیار میں کہے گئے تھے۔ چیف کو حیرت ہوئی جگا نے غلط رویہ نہیں رکھا۔ رعب نہیں دکھایا۔ اسنے ذہن میں سوچا ہوا کام کتا یا ہے پھر بھی کہتا ہے کہ دیواریں گرائی ہیں تو گرا دو! ایک اچھے کام کے لیے غلط قدم اٹھایا ہے۔ چیف کے دل میں ہمدردی جاگی۔ اسے لالہ جی پر غصہ آیا۔ زمین فروخت کرنے میں اس کے باپ کا کیا جاتا تھا؟ وہ چائے پی کر کھڑا ہو گیا۔

”لالہ جی کو جو کچھ کرنا ہو کر گزرے۔ مگر تمہیں ایک بات کہے دیتا ہوں جگا! بغیر لائسنس رائفل رکھنا جرم ہوتا ہے۔“

حکومت ملک گیر بنیاد پر نو جوانوں کو فوجی تربیت دے رہی تھی اور رضا کار دستے منظم کیے جا رہے تھے۔ چاندھر رضا کار دستوں کی ذمہ داری جگت کے سپرد کی گئی۔ جوان لڑکے اور لڑکیوں کو رائل ٹریننگ ویسے میں اسے لطف آتا تھا۔

ایک شام کی بات ہے رضا کار دستے کی چھاؤنی سے گھر جانے کے لیے وہ صاف ٹھیک کر رہا تھا کہ کسی نے آ کر کہا۔ ”جگاجی! وہ لڑکی آپ کو بلارہی ہے۔“ اس نے دور کھڑی ہوئی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

جگت نے اس جانب دیکھا۔ صاف پر اس کے ہاتھ جم گئے۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ کچھ فاصلے پر لڑکی خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ جگت چونکا وہ بیس سال پہلے کی دیر وکھائی دے رہی تھی۔ لڑکی رائل کی نال پر انگلیاں پھیرتی ہوئی دوپٹے کا پلو دانتوں تلے دبائے سر جھکائے کھڑی تھی۔ جگت کا دوزخ اس کے قریب جانے کو دل چاہا مگر خود پر قابو پالیا۔ دوزخ نے کی بجائے وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ ایک جذبہ ایک سنسنی اور دھڑکتا دل..... پانچ چھ قدم کا فاصلہ گزرا تو اس کے پاؤں رک گئے۔ جوش میں وہ بھول گیا کہ بیس سال کے بعد ویرا اس طرح جوان کیسے دکھائی دے سکتی ہے؟ اسی لمحے لڑکی نے گردن گھمائی قدرت کی کاریگری نے جگت کے دل پر اثر کیا۔ چہرہ مہرہ وی ہونے کے باوجود وہ ویرا نہیں تھی! سنسنی ہو سکتی تھی۔ پھر بھی بیس ایکس سالہ لڑکی میں اسے ویرا نظر آئی۔ جیسے رائل لے کر کہنا چاہتی ہو جگت سگھ! تمہیں میری ادھوری آس پوری کرنے کے لیے اس سماج سے انتقام لینا ہے۔ کیا سوچ رہے ہو؟ مجھے بھول گئے؟ پہچان نہیں سکے؟ جگت ابھٹتی ہوئی پڑ گیا۔

”تم نے مجھے بلایا ہے؟ مگر میں تو تمہیں نہیں جانتا۔“ لڑکی کے تازک ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ رائل کے سہارے دو قدم آگے بڑھی۔

”میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں رضا کار دستے کی

”تمہیں اس کا بھی پتہ چل گیا؟ میں سمجھتا تھا کہ بغیر لائسنس رائل رکھنا جرم نہیں استعمال کرنا جرم ہے۔“ جگت نے ہنس کر کہا پھر مذاق میں بولا۔ ”وہ تو کبھی کبھی شانے پر رائل رکھنے کو مل ہو جاتا ہے۔ برسوں پر اپنی عادت ہے۔“

”پھر کبھی رائل چلانے کو بھی دل چاہے گا۔ خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر پولیس چیف چلا گیا۔

جگت اور ویرا نے ٹیک اسے چھوڑنے گیا۔ لونا تو چندن راستہ روکے کھڑی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ ”اب تمہیں بھی کچھ فریاد کرنی ہے؟“ جگت نے تڑپتی نظروں سے اسے دیکھ کر سوال کیا۔ چندن نے ہٹ کر اندر جانے کا راستہ دیا۔

”دوست کے ہاں دکنے کا کہہ کر یہ کارنامہ کرنے گئے تھے؟“

”چندن! تم ہی کہو۔ لالہ جی کے پاس کافی زمین ہے۔ اس میں سے ایک ٹکڑا ایسے ٹیک کام کے لیے دینے میں ان کے باپ کا کیا جاتا ہے؟“

”اور تم ہی کہو کہ اس طرح رائل لے کر دادا گیری کرنے نہ گئے ہو؟ تو تمہارا بیٹے کا کیا جاتا ہے؟“

”اب تمہاری اجازت لے کر جاؤں گا۔ بس؟“ جگت نے بات نالنے کے لیے محبت سے کہا۔

”یعنی آپ پھر رائل اٹھائیں گے؟“ چندن نے آنکھیں دکھا کر پوچھا تو جگت ہنس دیا۔

”یار ایہ قدرت کی بھی کیسی بلہاری ہے۔ پولیس والے سب دوست بن گئے لیکن گھر کی بیوی پولیس کی طرح پوچھ گچھ کر کے پریشان کرتی ہے۔“ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”ایک جرم معاف کر دو بادشاہ! پھر یہ غلام بھی گستاخی نہیں کرے گا۔“

”تب چاروں بچے مسرت سے تالیاں پیٹنے لگے۔

”شاپائیں باپو! گھر میں ڈرامہ کرنے لگے۔“ یہ سن کر چندن شرمائی۔ جگت دونوں بچوں کو ہاتھوں پر اٹھا کر گھمانے لگا۔

”ڈرامہ پورا ہوا۔ اب تماشا دیکھو۔“ گھر کی فضا خوشگوار ہوئی۔

کہ بیٹی کو غلیٹ سکھانے کے لیے کہے گی۔" اس کو بھی کانصاف حصہ ہم نے کرائے پر دیا تھا۔ کرایہ دار ایسے جس آئے ہیں کہ خالی نہیں کرتے۔" ماں نے عاجزی سے کہا۔ "تم انہیں سمجھا کر خاموش کرادو۔"

جگت کو یہ عجیب سا لگا۔ اس نے دیکھا ماں نے جو کام بتایا گرود یو کور کو اچھا نہیں لگا۔ لڑکی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی جگت بولا۔ "ماں جی! سمجھا کر کام نکالنا مجھے کم آتا ہے۔ میرا ماضی چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"اسی وجہ سے تمہیں یہ کام بتایا ہے۔" ماں جی نے سچ بول دیا۔ "انہیں سمجھانے میں ہم نے کمی نہیں رکھی۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ آپ کا کام ہو جائے گا یہ سمجھ لیں۔" یہ کہتے ہوئے گرود یو کور پر نظر ڈال کر جگت رخصت ہو گیا۔ راستے کے موڑ پر آیا تو ویسے ہی گردن گھما کر دیکھا۔ گرود یو کور کھمبے کے سہارے کھڑی تھی۔ جگت نے شرما کر قدم تیز اٹھا تا شروع کر دیے۔



گرود یو کور ایک دن خوش ہو کر جگت کے گھر آئی۔ "جگتی! خوشخبری دینے آئی ہوں۔ وہ کرائے دار مکان خالی کر گئے۔" پھر چند دن کور سے کہا۔ "بہن جی! انہوں نے ہماری مشکل حل کر دی۔ تین سال سے ہم تنگ آ گئے تھے۔" جگت اس کی حسین مسکراہٹ پر خوش ہو رہا تھا۔ گرود یو کور شرما گئی۔ پھر جگت نے تیزی سے نظر گھمائی۔ "تم نے انہیں تین ہی دن میں اس طرح تنگ کر دیا؟ یہ تو بتاؤ۔" لڑکی سوال کر بیٹھی۔ چند دن کو بھی مذاق سوچ گیا۔

"تنگ کرنے کے لیے انہیں تین دن تو کیا تین گھنٹے کافی ہیں۔"

"انہیں چند دن! اس میں واقعی تین دن لگے تھے۔" جگت نے خلوص سے کہا۔ "تم ناراض نہ ہو تو بتاؤ؟"

"یہ ناراض نہیں ہوں گی اس کا میں یقین دلاتی ہوں۔" گرود یو کور جوش میں بولی۔ چند دن کو اس لڑکی سے محبت سی محسوس ہوئی۔ اسی لیے وہ اسے خوش دیکھتا

راغل فورس میں ہوں۔ بہت دن سے آپ سے ملنا چاہتی تھی۔" جگت کو اب خیال آیا کہ اس نے لڑکی کو پہلے بھی دیکھا تھا مگر نام سے واقف نہیں تھا۔ یہ ویرو نہیں ہے؟ پھر بھی اس کا نام ویرو ہو تو.....؟ جگت نے سوچا۔

"میرا نام گرود یو کور ہے۔" لڑکی کے ہونٹوں سے پھول جھڑے۔ "مجھے غلیٹ کا شوق ہے۔ کچھ گانا بھی آتا ہے۔ آپ ایک بار ہمارے گھر آئیں چائے وغیرہ پیئے۔" "تمہارے گھر؟" جگت ابھی تک ویرو کے خیال میں تھا۔ "میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔"

"یہاں سے آپ کے گھر جاتے ہوئے راستے میں ہماری کوٹھی پڑتی ہے۔" پھر جلدی سے بولی۔ "ابھی چلیں۔" ویرو اسی طرح بولتی تھی۔ بولتے وقت دہا نکھوں کی چٹلیوں کو اسی طرح گردش دیتی تھی۔ انجانی ہونے کے باوجود یہ لڑکی اسے جانی پہچانی نظر آئی۔ "چل رہے ہیں؟" اس نے شیریں لہجے میں پوچھا تو جگت انکار نہ کر سکا۔ وہ لڑکی کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گیا۔

"آپ بیٹھیں! میں ماں کو بلاتی ہوں۔" یہ کہہ کر لڑکی کمرے میں چلی گئی۔ جگت کو یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ دل کے طوفان کو چھپانے کے لیے اس نے میز پر پڑی دعوتی نوٹ بک اٹھائی۔ کھول کر دیکھی جو گیت وہ اکثر گاتا تھا پہلے صلیحہ پر تھا۔ "میرے گیت میں تم ہو خیا لوں میں تم" ویرو کی یاد میں اٹھا ہوا گیت یہاں؟ جگت کے ذہن میں سنسنی ہونے لگی۔ دوسرے گیت بھی اسی کے تھے۔

"آپ نے میری نوٹ بک دیکھی؟" لڑکی کے سوال نے اسے چونکا دیا۔ "میں نے آپ کے سارے گیت اتار لیے ہیں۔" پھر عقب میں آتی ہوئی ماں سے بولی۔ "یہ جگت تنگ ہیں ماں جی! اس دن ہم پروگرام دیکھنے گئے تھے وہی۔" جگت نے ہاتھ جوڑ کر مسرت کا اظہار کیا۔ کچھ دیر دھڑکی باتیں ہوئیں۔ چائے پینے کے دوران گرود یو کور پیار بھری نظروں سے جگت کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ جگت چپنے کے لیے کھڑا ہوا تو لڑکی کی ماں نے کہا۔

"بھائی! تم سے ایک کام کرنا ہے۔" جگت نے سوچا

چاہتی تھی۔ پھر بھی اسے جڑانے کے لیے چند دن لے اس کے بازو پر چٹل جھڑک رہا۔

”اربی میری بجائے یقین دلانے کا حق تم نے کب سے لے لیا؟“

”گرود یو کور فیس پڑی۔“ ہاں بتائیں انہیں کس طرح تنگ کیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک دن ہم اس کی دکان پر گئے۔“ جگت کہنے لگا۔ ”میرے ساتھ تین چار دوست تھے۔ میں اپنے ہمراہ ایسے

لوگوں کو لے کر گیا تھا جو صورت سے ہی غنڈے دکھائی دیں۔ ہم مارٹر خریدنے کے بہانے گئے تھے۔ ہم لوگ

آپس میں اس طرح سرگوشیاں کرنے لگے کہ سینٹھ اور لڑکوں کا دھیان ادھر جائے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک

آدھ تھپتھپا تھا۔ جیسے میں مارٹر دیکھنے نہیں بلکہ باپ بیٹوں کی پہچان کرانے دوستوں کو ساتھ لایا ہوں۔ میں نے ایسا ظاہر

کیا۔“

”اور وہ ڈر گئے؟“ ”گرود یو کور درمیان میں بولی۔ ”سنو تو سہی۔“ جگت نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اس طرح

ڈر کر وہ اتنا خوبصورت مکان خالی کرنے والے نہیں تھے۔ میں نے دوسرا طریقہ آزمایا۔ میں رہا بدنام آدمی لہذا فریاد

کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے ایک کراسے کے جوتی کو میں نے اس کی دکان پر بھیجا۔ اس نے سینٹھ کو

بھڑکا دیا۔ فلاں ستارہ کھرا رہا ہے۔ کوئی اچانک آفت آنے والی ہے۔ موت کا سایہ نظر آ رہا ہے۔“ اور بے چارے کے

پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ ”جگت کچھ رکا پھر آگے کہنے لگا۔ ”آخری جھکادو دن پہلے دیا۔ تم لوگوں کو ایک رات دوسری

جگہ گزارنے کی کہہ کر چار پانچ آدمیوں نے گھر میں ایسا شور مچا دیا جیسے نشے میں چور ہوں۔ کچھ اندر اندر بھگڑے

جیسے تھریاں چلنے والی ہوں ایسا خطرناک ماحول پیدا کر دیا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ گئے کہ اب روز رات

کو ہم یہاں محفل جمائیں گے۔“ پھر جگت اس طرح بولا جیسے ان لوگوں پر رحم کھا رہا ہو۔ ”بے چارے بری طرح پریشان ہو گئے۔“

”ہاں! وہ جاتے جاتے بڑبڑا رہے تھے کہ جو بد معاشوں کو گھر میں لا کر تماشہ کریں ان کے پڑوس میں

رہنا اچھا دمیوں کا کام نہیں۔“ ”گرود یو کور فیس کر بولی۔ ”بے چارے شریف آدمی۔“ جگت نے طنز سے لہجے

میں کہا۔ ”عارضی طور پر رہنے لگے اور بنگلہ تھپتھپا لیا۔“ ”جیسے آپ نے بھی کسی کا کچھ نہیں تھپتھپایا ہو۔“ چند دن

نے منہ بنا کر کہا۔ ”گرود یو کور کی موجودگی میں اسے جگت کو چڑانے کا لطف آتا۔“

”تم میاں بیوی لڑ پڑو گے بھی۔“ ”گرود یو کور جلدی سے بولی۔ ”جگاتی! مجھے آپ کو گرو بنانا ہے۔“

”گرو...؟“ ”جگت چونکا۔ ”اور میرے جیسے بدنام شخص کو؟“

”بدنام نہیں بلکہ ایک اچھے فنکار کو۔“ ”گرود یو کور اب آزادی سے بول رہی تھی۔ ”کل سے میں سنگیت سیکھنے

آنے والی ہوں۔“ ”جگت سوچ میں ڈوب گیا۔ ”گرود یو کور کا شوخ مزاج اسے پسند تھا۔ مگر اسے دیکھتے ہی دیرو کی یاد

آ جاتی اور وہ بے چین ہو جاتا۔“

”بڑے آدمی کی طرح کس سوچ میں ڈوب گئے؟“ ”بشکل تمہیں ایک چیلی گرو بنانے کے لیے تیار ہوئی ہے۔

”ہاں سیدو۔“ ”چند دن کور نے جلدی سے کہا۔ ”جگت فیس دیا۔“ ”تمہارے ماں باپ کی اجازت لی ہے؟“

”بالکل! وہ دھن گڑ خوش ہوئے۔“ ”گرود یو کور نے جواب دیا۔

”اس طرح نہیں تمہارے باپو مجھ سے کہیں تو میں مانوں گا۔“ ”جگت نے صاف لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے سیکھنے

کے لیے تمہیں یہاں رہنا پڑے گا۔“ ”اس کی اجازت بھی میں نے لے لی ہے۔“ ”گرود یو کور پر جوش انداز میں بولی۔

”پھر بھی اپنے باپو کو لے دو تو بات کریں گے۔“ ”چند دن کور کو جگت کی بات مناسب لگی۔

”ہاں! یہ ٹھیک کہتے ہیں۔“ ”چند دن نے جگت کی تائید کی۔“



گروہ یو کور اپنے باپ کی طرف دیکھ کر اشارہ کر رہی تھی۔

”کہئے اب کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟“

اس کے باپ خاموش بیٹھنے رہے۔ جگت نے خاموشی توڑنے کی غرض سے چندن کو مخاطب کیا۔ ”بزرگ کے لیے کچھ بنا کر لاؤ۔“ پھر مہمان سے ہی پوچھا۔ ”کیا پیئیں گئے چائے یا لسی؟“

چندن کو راضی چاہتی تھی کہ اسے گروہ یو کور نے روک لیا۔ ”بہن! میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ باپو کم چینی والی چائے پیتے ہیں۔“ گروہ یو کور کے اندر جانے کے بعد اس کے باپ نے بات شروع کی۔

”جگت سنا! گروہ یو کور کی مرضی تم سے گانا سیکھنے کی ہے۔“ جگت نے یہ الفاظ غور سے سنے۔

”آپ کی کیا مرضی ہے؟“

”صحیح بات کہوں؟“ پھر رک کر آگے بولے۔ ”پہلے تو انکار کیا جو ان بچی ہے اگر عام جگہوں پر گائے گی تو شادی کے سلسلے میں مشکل ہوگی مگر اس کی آواز اچھی ہے۔ پہلے کچھ لوگوں نے کہا بھی تھا کہ اسے سنگیت کی تعلیم دلاؤ ورنہ کی نام پیدا کرے گی۔ یہی سب سوچ کر ہم راضی ہوئے ہیں۔“

”مگر میرے پاس بھیجے میں ایک خطرہ ہے۔ یہ شاید آپ نے نہیں سوچا ہوگا۔“

گروہ یو کور کے باپو جو کئے۔ ”خطرہ.....؟“

”میں رہا بدنام آدمی۔“ جگت کہنے لگا۔ ”میرے ساتھ بہت سی لڑکیاں اکثر پروگرام دینے آتی ہیں۔ ان سے بھی کہتا ہوں کہ لوگوں کی باتوں کی پروا ہے تو میرے ساتھ نہ آؤ۔“ جگت رک گیا۔

گروہ یو کور کے باپو سن رہے تھے۔ وہ کچھ سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ”گروہ یو کور جب یہاں سے جائزہ شہر تک رکشہ میں بیٹھ کر جائے گی تو لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ میرے گھر میں رہے گی تو لوگوں میں مختلف افواہیں بھی گرم ہوں گی۔ ان سب باتوں کے متعلق آپ

نے سوچا۔

اسی لمحے گروہ یو کور اندر آئی۔ وہ چائے لے کر آئی تھی۔ اس نے جگت کے آخری الفاظ سنے۔ اس نے باپو کی جانب تیز نظروں سے دیکھا۔ اپنے ارادے کی مضبوطی دکھانے کے لیے باپو نے آنکھوں کے ذریعے بیٹی کو جواب دیا۔

”تمہاری خواہش میں سمجھتا ہوں۔ میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔“

”جگت سنگھ!“ انہوں نے کھٹکھٹ کر کہا۔ ”تمہارے متعلق مجھ اب تک بہت سی باتیں سننے کو ملی ہیں مگر لوگوں کی باتوں کی مجھے پروا نہیں۔ یہ یہاں رہ کر سنگیت میں ترقی کرے گی تو مجھے سکون ہے۔“ چندن کو گروہ یو کور کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ گروہ یو کور کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نظر آئی مگر جگت ابھی بخمیدہ تھا۔

”بزرگ! میری جانب سے بے فکر رہنا۔ میں اسے تمہاری امانت کی طرح حفاظت سے رکھوں گا۔ مگر.....!“

”رک کیوں گئے چکا؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”ایک بات آپ کو بتا دوں۔ انسان کا کسی چیز کی گمن ہونے کے بعد واپس ہونا مشکل ہوتا ہے۔ دو چار ماہ بعد آپ اس کا ارادہ بدلنا چاہیں گے تو لڑکی شاید آپ کی بات نہ مانے۔“ جگت نے یہ الفاظ محفوظ کر کے کہے تھے۔ چندن کو محسوس کر رہی تھی کہ اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا ڈر تھا مگر گروہ یو کور درمیان میں بول اٹھی۔

”ہاں بالو جی! میں تعلیم شروع کرنے کے بعد مکمل کر کے رہوں گی۔“

”بیٹی! میں تمہاری عادت سے واقف ہوں۔“ چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے وہ بولے۔ ”تم اپنی ضد پوری کئے بغیر نہیں مانو گی۔“

اگر یہ بات انہوں نے ہنستے ہوئے نہ کہی ہوتی تو اس کا مطلب بدل جاتا۔ گروہ یو کور نے خوش ہو کر پہلے پتا کے چمن چھوئے پھر جگت کے چمن چھونے لگی۔ ”آج سے

میں تمہاری شہرہ اور تم میرے گرو۔“ وہ چندن کی جانب بڑھی مگر چندن نے اسے دھکے نہیں دیا۔
 ”تم تو میری چھوٹی بہن کے برابر ہو۔“ یہ کہہ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ مسرت کے دو آنسو گرو یو کور کی پلکوں پر چمکنے لگے۔

”گرو یو کور!“ جگت نے انہیں جدا کرنے کے لیے کہا۔ ”باپ کی موجودگی میں تمہاری تعلیم کی ابتدا ہوگی۔ جاؤ اندر سے بار مونیہ لے آؤ۔“ گرو یو کور ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی گئی اور بار مونیہ اٹھلائی۔ سر ملانے اور گلا صاف کر کے آواز اٹھائی۔

”میرے گیت میں تم ہونٹیا لوں میں تم ہو۔۔۔۔۔“ جگت چونک اٹھا۔ گرو یو کور کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی اور جگت کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔ سر بلند ہوتے گئے اور دردی گہرائی پر جتنی تھی۔ تب مجبور ہو کر اس نے بھیگی پلکوں کو زور سے دبا دیا اور آنسوؤں کا ریلا رخساروں پر بہہ کر عجیب سا گرم لمس پہنچانے لگا لیکن دل میں ٹھنڈک ہونے لگی۔ بار مونیہ پر گھومتی گرو یو کی انگلیاں رک گئیں۔ آواز بھی رک گئی۔ گرو یو کور کی پلکیں بھی جو تھیل تھیں۔ کمرے میں ٹھیکین خاموشی چھا گئی۔

تھوڑے دنوں میں گرو یو کور نے گھر کے سب افراد کو اپنی محبت سے متاثر کر دیا۔ سب کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔ بچوں کو وقت پر سکون بھیجتی ان کے کپڑے سنہاڑتی اور سکی ماں کی طرح ان سے پیار کرتی۔ چندن کو کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیتی۔

”تم نے بہت سال کام کیا اب آرام کرو۔“ یہ کہہ کر وہ شوخی سے ہنس دیتی۔

”گھر کی ذمہ داریاں تم نے اس طرح سنبھال لی ہیں کہ جیسے ہمیشہ رہنے والی ہو۔“ چندن کہتی۔

”ہمیشہ کے لیے ہی رہنے آئی ہوں۔“ گرو یو کور رخسار پر بہتا ہوا پسینہ کرتے کی آستین سے پونچھ کر پراٹھا سینکتی ہوئی بولی۔ ”مجھے دھکے دو گئے تب بھی نہیں جاؤں گی۔“

”ارے باپ رہے۔۔۔۔۔“ باورچی خانے کے سامنے چار پائی پر چٹختی ہوئی چندن ہاتھ کا اشارہ کر کے بولی۔ ”کوئی اچھا لڑکا ملا تو تمہیں فوراً نکال باہر کروں گی۔ سمجھیں؟“

مذاق کے باوجود گرو یو کور کا چہرہ بچہ گیا جیسے پراٹھا اتارتے ہوئے انگلیاں جل گئی ہوں اسی طرح اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ کچھ دیر تک چندن کو رک کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ”میں نہ جانا چاہوں پھر بھی رخصت کر دوں گی کچھ اپنے من کی بات کہنا۔ بہن! میں تمہارا کچھ نہیں اٹھائوں گی ابھی تم نے ایسا محسوس تو نہیں کیا؟“

چندن جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ ایک بار دیرو نے بھی اسی طرح کی بات پوچھی تھی۔ ”تم نے یہ کیا کہہ دیا؟“ چندن بولی۔ پھر پیار بھرنے لہجے میں کہا۔ ”جج جانا چاہتی ہو تو کہہ دوں میرا مطلبی دل چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ یہاں رہو۔ چار دن پہلے ڈاکٹر سے ایکسرے کرائے گئی تھی تو میں نے ڈاکٹر سے صاف کہہ دیا تھا کہ صاحب! جو بیماری ہو کہہ دیجئے۔ مجھے اب سرداری یا بچوں کی فکر نہیں ہے۔“

”تم نے ڈاکٹر سے ایسا کہا؟“ گرو یو کور چونک پڑی۔ ”وہ اپنے ہی آدمی ہیں۔“ چندن کو ہنس دی۔ ”انہیں کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ کہلات ہے کہ ماں مرے مگر خالہ ہے۔“

”کیا مرنے چھینے کی بات چل رہی ہے؟“ جگت نے قریب آ کر پوچھا۔ گرو یو کور چوہے کو پھونک مارنے لگی۔ ”اس طرح چور کی طرح اندر آ کر تم نے ہماری باتیں کیوں سنیں؟“ چندن نے جگت کو کھینچ دیکھا نہیں۔

جگت اپنا صافہ کھونٹی پر تانگتا ہوا بولا۔ ”چندن! اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں تم سے کہہ دیتا ہوں کہ ہمارا چنا پانچویں کور ہا ہونے والا ہے۔ اگلے دن مجھے یاد دلانا۔ میں اسے لینے فیروز پور جاؤں گا۔ اب وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔“

”چنا بھائی رہا ہونے والے ہیں؟“ چندن خوش ہوئی پھر اسے کچھ یاد آیا۔ ”مگر تم ماں بیٹے کو جدا کیوں کر رہے ہو؟“

اتنے سال بعد وہ جیل سے رہا ہوا ہے گھر جانے والا ہے۔
جیت کے ساتھ بچہ دن رہنے دو پھر لے آنا۔“

”چند دن! تم جانتی ہو ماں بیٹے کے درمیان زہر گھل گیا ہے۔ چنانچہ جیل سے سیدھا اپنے گھر جائے گا تو اپنے سوتیلے بھائی سے جھگڑا کر بیٹھے گا۔ ہم اسے یہاں رکھ کر اس کی ماں کی طرف سے خفگی کم کر سکیں گے۔“

”پھر تو یہ عمدہ بات ہے۔“ چند دن کو روٹھ مینا ہوا۔ اپنے دل سے انتقام کی آگ بجھا کر دوسرے کو بھی آگ سے بچانے کی جگت کی دلچسپی دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر اسے مذاق سوجھ گیا۔ ”اے گرو دیو کور! سردار جی کا ایک ساتھی ہمارے ہاں آئے گا۔ وہ بہت اچھا ہے کسی سے تمہارا معاملہ فٹ کر دیں گے۔“

”تم ڈاکو سے بیاہی ہو اس لیے مجھے بھی ڈاکو سے چپکانا چاہتی ہو؟ مجھے گھر سے نکالنے کی اتنی جلدی ہے؟“ گرو دیو کور نے کہا۔ دونوں کے درمیان تھراپ میں حصہ لینے کے لیے جگت کو پڑا۔

”تم فکر نہ کرنا تم کو یہاں سے کوئی نہیں نکالے گا۔ جانا ہو تو چند دن جا سکتی ہے۔“ چند دن نے آنکھیں نکالیں تو جگت نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں! ڈاکو نے تم کو ہسپتال میں داخل ہونے کو نہیں کہا؟ میں اس کی بات کر رہی ہوں۔“ جواب میں چند دن جگت کے سینے پر گھونٹے برسائی ہوئی ہوئی۔

”سردار جی کی نیت خراب ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ کیوں؟“



کار فیروز پور کی جانب تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ پھر بھی جگت کو رفتار کم معلوم ہو رہی تھی۔

”ہنومان! ابھی رفتار کم ہے۔ ڈاکو اسپینڈ بڑھاؤ۔“ جگت نے کار چلانے کے لیے ایک ڈرائیور رکھا تھا وہ اسے اپنے مرحوم دوست جیسا دکھائی دیتا تھا اس لیے وہ اسے ہنومان کے نام سے پکارتا تھا۔ پہلے وہ ہنومان کہنے پر چونکا کہ جگت اس کو اصلی نام کی بجائے ہنومان کیوں کہتا ہے؟ مگر جب جگت نے ہنومان کی دوستی کی داستان سنائی تو وہ خوش

ہو گیا۔ ”پھر تو مجھے یہ نام بھی منظور ہے۔“ اس کا مزاج بھی ہنومان جیسا تھا۔ کار چلانے پر اکثر جگت کو کنا پڑتا۔

”بھائی صاحب! ڈاکو اسپینڈ کم کر دو۔ ورنہ اختیارات میں پھر خیر آئے گی کہ جگا ڈاکو کے ہاتھوں ایک اور قتل۔“ مگر جگت نے اب جس وقت رفتار بڑھانے کی بات کی تو وہ ہنس دیا۔

”کتنے لوگوں کو لیڈٹ میں لینا ہے یہ بھی کہہ دینا چنا کو جیل سے لینے جا رہے ہو اس کے ساتھ کیا مجھے جیل چھوڑ آنے کا خیال ہے؟“ مگر جگت چنا کے خیال میں کم تھا۔ جس سے رہا ہوئے اسے دس سال ہوئے مگر وہ بمشکل سات آٹھ مرتبہ اس سے ملنے جاسکا تھا۔ اب چنا اپنی ماں سے جیل میں ملاقات کر لیتا تھا۔ ماں اس سے کہتی تھی۔

”گھر آؤ تو تمہاری شادی کر دوں گی۔“ چنا زیادہ خوشی کا اظہار نہ کرتا۔

”جیل کاٹ کر آئے ہوئے شخص سے کون شادی کرنے کو تیار ہوگی ماں! اس کی بجائے اپنے اجیت کا گھر بساؤ۔“

”نہیں بیٹا! پہلے بڑا بھائی بیابا جائے گا پھر چھوٹے کی باری پھر وہ ابھی بمشکل پندرہ سولہ برس کا ہے۔ ابھی تو اسے پڑھانا ہے۔ یہ ہم جیت حسب یہ بات کہتی تو چنا اپنے سوتیلے بھائی سے نفرت کا اظہار چہرے سے نہ کرتا۔ آخری بار جگت جیل میں پروگرام کرنے گیا تھا تو چنا نے تمام قیدیوں سے کہہ رکھا تھا۔

”جگا باہر پروگرام دینے جاتے ہیں تو پانچ سو یا ہزار روپے لیتے ہیں ہم بھی انہیں خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔“ پروگرام پورا ہونے کے بعد قیدیوں کی جانب سے آنکھی کی ہوئی رقم جگت کو دینے کا کام بھی چنا کے سپرد کر دیا گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ چنا نے پیسے دیئے تو جگت غصے میں آ گیا۔ ”تم لوگ مجھے پیسے دے رہے ہو؟“ پھر اس کی جانب نظریں گھما کر بلند آواز میں بولا۔ ”جیل کے برے دنوں میں تم لوگوں نے ساتھ دیا۔ مجھے اپنا سمجھ کر بیمار دیا اور

دو گھنٹے تم کو خوش کرنے آیا ہوں تو اس کی قیمت دے رہے ہو؟

”پاپاجی! تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم قیمت دے رہے ہیں؟“ چنا ہنسیکے ہوئے کچھ نہیں بولا۔ ”ہم سب کے پیار کا نذرانہ ہے چکا جی! یہ لینے سے انکار کرو گے تو ہمارے دل دکھیں گے۔“ کچھ بحث کے بعد چنا نے رقم لے لی۔

”میں یہ پیسے رکھ لیتا ہوں مگر اپنے لیے نہیں، جیل کا نئے ہوئے کی قیدی کے بچا سر اخاندان کو تم لوگوں کی طرف سے دے دوں گا۔“ جدا ہوتے وقت جب چنا نے کہا کہ میں ایک ماہ بعد رہا ہو رہا ہوں تو جگت کو خیال آیا کہ دس سال کتنی تیزی سے بیت گئے تھے؟

”چنا! باہر آ کر کام سے لگ جانا۔“ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دروازے تک ساتھ جاتے ہوئے جگت نے سمجھایا۔ ”گھر جاتے ہی تمہاری ماں کو صدمہ ہو کوئی ایسی حرکت نہ کرنا۔“

”بہت کوشش کرتا ہوں پاپاجی!“ چنا نے دل کی بات کہہ دی۔ ”ماں کی جانب سے نفرت نہیں جاتی۔“ مومن ہے ماں کی طرف سے نفرت دل سے نکل جائے مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ پنا سنگھ کے لڑکے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون نہیں اترے گا۔“

جگت واس کی حالت پر مدد دی جائی۔ باہر نکلتے ہی اُتر چنا سنگھ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تو زندگی مڑ جائے گی۔ اس نے فوراً فیصلہ کر لیا۔

”چنا! رہائی کے دن میں تمہیں لینے آؤں گا۔“ کچھ دن میرے ساتھ رہنا۔ ٹھیک لگے تو میرے ساتھ جیتی باڑی کرنا۔“ چنا کو یہ بات پسند آئی۔ جس کے ساتھ ڈاکے ڈالے اس کے ساتھ جیتی باڑی۔ باقی زندگی گزارنے کو ملے تو یہ خوشی کی بات تھی۔ اس نے جگت کا ہاتھ دبا یا۔

”پاپاجی! میرے دل کی بات تمہاری زبان پر آ گئی۔“ پھر دروازے کے پاس سے واپس لوٹتے ہوئے بولا۔ ”مگر تم اس دن جلدی آ جانا! ماں کو میں نہیں سمجھا سکوں گا۔“ جگت ڈرائیور کو اسی لیے جلدی چلانے کو کہہ رہا تھا۔

اجا تک کار کو بھٹکا لگا۔ ”کیا ہوا؟ گاڑی کیوں روک لی؟“ وہ چیخا پڑا۔

”گاڑی کے اسپرنگ سے کچھ گرنے کی آواز آئی ہے۔“ ڈرائیور نے باہر آ کر کہا۔ ”میں ڈراؤ کچھ لوں۔“ نیچے کے دو بولٹ نکل گئے تھے۔ ابھی دس میل کا فاصلہ تھا۔ رہنرنگ کے بغیر آگے بڑھنے میں ڈرائیور کو خطرہ نظر آیا اور ایک گھنٹہ ضائع ہو گیا۔

”چنا تو گھنٹہ بھر پہلے چلا گیا ہے۔“ فیروز پور جیل کے گیٹ پر اسے خبر ملی۔ ”اس کی ماں کل رات سے آئی ہوئی تھی۔“ سچ رہا ہوتے ہی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ ”مگر میں اسے لینے آنے والا تھا۔“ جگت کو ذرا سا غصہ گیا۔

”چنا نے بہت انکار کیا مگر ماں نے کہا کہ پہلے ایک بار گھر آ جا پھر جہاں بھی جانا ہو چلے جانا۔ وہ پھر بھی نصف گھنٹے تک رکا رہا۔ جاتے ہوئے کہتا گیا پاپاجی! میں تو ہم انیشن پر ہیں۔ وہیں بھیج دینا۔“

”گاڑی کب روانہ ہوئی ہے؟“

”وہ تو اب جا چکی ہوگی۔“ جواب سن کر جگت کار کی جانب جھپٹا۔

”اس کی گاڑی امرتسر کی جانب دوڑاؤ۔“ اس کی آواز میں غم تھا۔ ”اس کی سہیلی کی انجی نے ڈرنی وجہ سے۔“

”چنا! تم آنے والے ہو یہ جان کر اجیت دونوں سے کیسا خوش ہے۔ کہتا ہے کہ بڑے بھائی سے ملنے کے لیے میرا دل بے چین ہے۔“ سارے راستے ماں نے یہ بات مختصر طریقے سے دہرائی۔ چنا بار بار اپنے دل کو سمجھا رہا تھا اب پرانی عداوت بھول جاتا تھے پنا سنگھ سے دشمنی تھی عراجیت نے تو تمہاری ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ سگا بھائی نہ سہی پھر بھی نصف بھائی تو ضرور ہے۔ امرتسر سے گھر جاتے ہوئے اس نے اپنے دل کو مضبوط کر لیا تھا۔ راستے میں دکاندار ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو! پریم جیت کا چنا جیل سے رہا ہو کتا رہا ہے۔ ماں ایک سال

سے اس کی رہائی کے لیے تسبیح پڑھ رہی تھی۔ آخر اس کے سکھ کا سورج طلوع ہو ہی گیا۔

سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ماں چنا کو جلدی چلنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

”بیٹا! مغرب کے وقت گھر میں تدمر کھانا محسوس ہوتی ہے۔ پہلے پہنچ جانا بہتر ہے۔“ ماں اپنے اگلی ٹلی میں داخل ہوئے۔ چنا کے دل میں الجھن ہونے لگی۔ سولہ برس کے بعد گھر لوٹا تھا۔ اس کے پیچھے ماضی کی پرچھائیاں تھیں اور سامنے مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے گھر کے پاس برسوں سے کسی پرہیزگار کی طرح کھڑے ہوئے اٹلی کے بوڑھے درخت کو دیکھا۔ اس کے تنے کے پیچھے اس کا سوتیلا بھائی اجیت چھپ کر کھڑا ہوا تھا۔ تنے کے پیچھے چھپے ہوئے اجیت کے کانوں میں یہ الفاظ سنائی دے رہے تھے۔

”چنا! گھر جاتے ہی اجیت کو سینے سے لگا لینا۔ اپنے رہا ہونے کی خوشی میں اسے منھائی دینا۔ تم دونوں میری دو آنکھیں ہوں۔“ ابھی یہ الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے کہ تنے کے پیچھے سے اجیت باہر آ گیا۔ چنا کے سینے پر چھری سے وار ہوا۔ اس وقت تک دونوں میں سے کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہو گیا ہے؟ اجیت کے چہرے پر خون جھٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے زہر برس رہا تھا۔ اچانک جھیلے سے نیچے پینٹے ہوئے بدحواس چنا کو لات مار کر اجیت نے چت لٹا دیا اور اوپر بیٹھ کر کئی وار کیے۔ پرہیزگار کی آنکھیں

”اجیت! اجیت۔“ وہ اس سے لپٹ کر اسے روکنے لگی۔ گھر سولہ سال کے لڑکے نے ماں کو دھکا دے دیا۔ اس کا چہرہ غصے اور نفرت سے بھر گیا تھا۔ چنا نے اس کے حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ بلند کیا تو چھری کی تیزانی بازو میں اتر گئی۔ پاگل کی طرح اجیت نے چنا کا سینہ چیر دیا۔

”میں اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ لے..... لے..... لے۔“

”کوہ..... کوہ! پچاؤ! پچاؤ!“ کی چیخوں سے لوگ دوڑتے ہوئے آگئے۔ غروب ہوتے سورج کے پانچ سات

منٹ کے درمیان یہ سب کچھ ہو گیا۔ چار چھ آدمیوں نے اجیت کو پکڑ لیا۔

”سارے آپے وقوف۔“ لوگوں نے چائے مارے اور اس سے چھری چھین لی۔ مگر اب اجیت کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ خون میں لت پت چنا کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ پتھر کے ساتھ سر ٹکرا کر پرہیزگاریت بے ہوش ہو گئی تھی۔

اجیت ہانپتا ہوا خون سے بھرے ہوئے ہاتھ مسل رہا تھا۔ کار کا ہارن سنائی دیا۔ مجمع کے درمیان راستہ پیدا کرنے کے لیے ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا تو دو چار آدمیوں نے ایک ساتھ کہا۔

”آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ہے۔ لاش پڑی ہوئی ہے۔“

جگت کار سے باہر آ کر جھپٹا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا اندر پہنچا تو قدموں کے قریب چنا کی لاش نظر آئی اور وہ دل دہلانے والی آواز میں گر جا۔

”چنا.....؟“ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں سرخ زور سے حیرنے لگے۔ اسے نظر کے سامنے پولیس کے درمیان کھڑا ہوا اجیت نظر آیا۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ جگت نے منھیاں کس لیں، کلائی کی رگیں ابھرا لیں۔ اس کے جڑے بھجج گئے۔ وہ خونی نظروں سے اجیت کو دیکھنے لگا۔ اجیت نے منہ پھیر لیا جیسے جگت کی تیز نظریں برداشت نہ کر سکا ہو۔

کچھ ہی دیر میں جگت کے ذہن پر شہطان سوار ہو گیا۔ چنا کے بہیمانہ قتل نے اس کے خون میں آگ لگا دی تھی۔ وہ لاش کے پاس پڑی ہوئی خون آلود چھری کی دھار پر نظر ڈال کر قدم بڑھائے جا رہا تھا اسی لمحے ہوش میں آئی ہوئی پرہیزگاریت اس سے لپٹ گئی۔

”بیٹا! جگا! اس میں کسی کا قصور نہیں! یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔ میں پیار میں بے قابو ہو کر چنا کو یہاں لے آئی۔ دو بھائیوں کی دشمنی دور کرنے کی مجھے جلدی تھی۔“ روتی ہوئی تڑپتی ہوئی جگت کے سینے پر سر مارتی وہ بڑبڑاتی تھی۔ پھر دوڑ کر اس نے نیچے سے چھری اٹھالی اور مجرم بیٹے کے

ساتھ لڑی۔

رہ گیا۔ پھر مزید کچھ نہ کہنا چاہتا ہوا اس طرح سے پہلو بدل کر سو گیا۔ پھر بھی چند دن سوال پوچھے بغیر نہ ہو سکی۔
”بے چاری چنا کی ماں..... اس پر کیا گزری ہوگی؟“
”وہ پاگل ہو گئی ہے۔“ جگت بڑبڑایا۔ ”سولہ برس بعد گھر آئے بیٹے کو سولہ سال تک جمن سے بالے ہوئے بیٹے نے قتل کر دیا۔ پیاس سے کیسے برداشت ہو سکتا تھا؟“



دوسرے دن کافی دھوپ نکل آنے کے بعد چند دن نے اسے اٹھایا۔ ”اٹھو اس بجے ہیں۔ کل سے کچھ کھایا نہیں ہے۔“ جگت گھڑائی لے کر بیٹھ گیا۔ جسم میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ کتنا سویا اسے اس کا ہوش نہیں تھا۔ قتل پر جا کر منہ دھونے کے بعد چہرے پر تازگی آ گئی۔ چند دن کور ناشتہ لے کر آئی۔ جگت نے گھر میں نظر گھمائی۔

”بچے اسکول جا چکے ہیں؟“ چند دن نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے بعد کا سوال نہ پوچھا جائے اس لیے ادھر ادھر ہونے کے لیے چند دن نے قدم بڑھائے مگر جگت نے روک دیا۔ ”ارے گروہ یو کور کیوں نظر نہیں آ رہی؟“ چند دن کا چہرہ اتر گیا پھر بھی کہتا پڑا۔

”اپنے گھر گئی ہے۔“
”مگر میں نے اسے کل بھی نہیں دیکھا تھا۔“ دوسرے سوال سے چند دن اور لڑ گئی۔

”کل سے گئی ہے۔“ چند دن کی آواز میں کینکپاہٹ تھی۔ گروہ یو کور ہفتے میں ایک بار دو چار گھنٹے کے لیے اپنے ماں باپ سے ملنے جاتی تھی مگر کبھی ٹھہرتی نہیں تھی۔ اس لیے جگت کو محسوس ہوا۔

”اس کے گھر سب ٹھیک تو ہیں؟“ تم ہوا نہیں؟“
”ماں.....“ دونوں سوالوں کا جواب دیا گیا مگر دل کی پریشانی کو دبا نہ سکی۔ ”کل ست پال کو بلا نے کے لیے بھیجا تھا۔ آج صبح میں خود ہوا۔“ جگت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہاتھ میں تھا ماہوا پر اسے کا کٹڑا اس نے واپس رکھ دیا۔ ڈری ہوئی چند دن نے بغیر پوچھے کہہ دیا۔ ”اب وہ واپس نہیں آئے گی۔ اس کے باپ نے بیٹے سے انکار کر دیا

”لے..... اب اسے میرے سینے میں مار دے اور اپنی پیاس بجھالے! مجھے زندہ رکھ کر بھی تو نے مار دیا ہے۔“ جگت نے اسے پکڑ لیا تو پرم جیت پاگلوں کی طرح گرجی۔ ”سب بیٹے دشمن بن گئے۔ بھلاؤں اب کبھی عورت کو جمن نہ دینا۔ اگر دے تو ماں نہ بنانا۔“ اس کی لڑش چیتوں تڑپ اور آنسوؤں سے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جگت کا دل بھی آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ اس کا جوش ختم ہو گیا۔ اس نے پرم جیت کو نیچے بٹھا کر چنا کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”دوست! مجھے معاف کرنا..... مجھے دیر ہو گئی۔“ پھر اسی ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کر لیے۔



دوسرے دن دوپہر کو سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ جگت گھر پہنچا۔

”کل شام سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ چند دن نے ٹوکا پھر جگت کے چہرے پر صدمہ دیکھ کر سمجھ گئی۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”کیا ہوا..... چنا کو نہیں لائے؟“

جگت چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چند دن نرم آواز میں پھر ہوئی۔ ”میں کہہ رہی ہوں کہ اس کی ماں اس طرح نہیں بھیجے گی! اچھا ہوا گھر چھوٹا ہے۔“

”چھوڑ آ یا..... مگر.....“ جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”گھر نہیں شمشان میں۔“
”کیا.....؟“ چند دن کی چیخ نکل گئی۔

”اس کے سوتیلے بھائی نے چنا کو گھر پہنچنے ہی نہیں دیا۔ اس سے پہلے ہی ختم کر دیا۔“ جگت ہشکل بولا۔ پھر چارپائی پر لیٹا ہوا بولا۔ ”شراب کی بوتل لے آؤ۔“ چند دن کے بیڑ زمین سے چپک گئے۔ دل میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے ہشکل کہا۔

”اور اس لڑکے کا کیا بنا؟“

جگت نے اسے عجیب طرح سے دیکھا پھر ہونٹ چبا کر بولا۔ ”خاک گیا..... میرے ہاتھوں ایک قتل ہونے سے

ہے۔“ چندن ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

”مگر کیوں؟“ جگت نے تعجب سے پوچھا۔

”کیونکہ.....“ چندن ہچکچاتی آواز میں بولی۔ ”یہاں رہنے سے ان کی بیٹی بدنام ہو جائے گی۔ انہیں یہ ڈر لگا ہوا ہے۔“

”مگر گردو پوکور نے کیا کہا؟“ جگت کی آواز میں سختی بھی تھی۔

”وہ بے چاری تو میرے سامنے بری طرح رو رہی تھی۔ اپنی ماں کی موجودگی میں کچھ بول نہ کی۔“

”یہ بات ہے۔“ جگت نے دانت چرس لیے پھر آگے کچھ کہنے کی بجائے خیالات میں کھو گیا۔ اس کا غضب اور چہرہ دیکھ کر چندن ڈر گئی۔



گھر میں اداسی پکڑ گارہی تھی۔ کوئی اس کا نام نہ لیتا تھا۔ مگر گردو پوکور چاروں طرف چلتی پھرتی نظر آتی تھی چندن کو بے چینی میں اور جگت کو خاموشی میں گردو پوکور کی موجودگی نظر آتی تھی۔ بے چینی کا بوجھ برداشت نہ ہوتا تو چندن چھپ کر رہ لیتی۔ خاموشی ناقابل برداشت ہوتی تو جگت گیت گایت۔

”میرے ریت میں تم ہو جیادیں میں تم ہو۔“

چندن کو موت کے منہ سے بچاؤ تھا۔ وہ اس وقت کے یاد رکھے۔ ریت کا رہا ہے؟ ویرو کیا سردو پوکور؟ سردو پوکور کے جگت کی شاگرد بن کر گھر میں آنے کے بعد ایک دو بار جگت سے چندن نے کہا تھا۔

”جب مجھے موت کا ڈر نہیں ہے۔“

”کیوں..... مرنے کی بہت جلدی ہو رہی ہے؟“

جگت نے اسے جڑایا۔ ”دن بد دن موتی ہوتی جا رہی ہو۔“

”جہنمی بڑھنے سے زندگی نہیں بڑھتی۔ کیا سمجھے؟“

چندن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”عورت کو موت کا ڈر ایک وجہ سے ہوتا ہے۔“

”کون سی وجہ سے؟“ جگت نے پوچھا۔

”بچے بے سہارا ہو جانے کی۔“ چندن نے نظریں جھکا

کر کہا۔ اب مجھے ڈر نہیں، گردو پوکور نہیں سنبھال سکی۔“

”بے سہارا ہونے کی عورت کو فکر ہوتی ہے۔“ جگت

نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”مرد کا کیا ہوگا اس کی پروا بھی ہوتی ہے؟“

”جو میرے بچوں کو سنبھالتی ہے وہ شوہر کو بھی سنبھال

سکے گی۔“ پھر چندن اوپر دیکھ کر بولی۔ ”کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا؟“

”کیا بک رہی ہو؟“ جگت نے غصہ دکھایا۔ ”وہ بھلی

لڑکی آواز ٹھیک کرنے آئی ہے اور تم اپنے بچوں کو اس کے

گھٹے باندھ کر اس کی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو؟“ چندن کو

مسکراتے لگی۔ تب جگت نے سوچا کہ ان دونوں نے آپس

میں کچھ طے کر لیا ہے، وہ ناراض ہو کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر

چندن ٹھکھٹا کر مٹ گئی۔ ”تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ جیسے میں کل

مرجاؤں گی۔“

”چندن! تمہیں مذاق سوچ رہا ہے؟“ جگت نے منہ

بنا کر کہا۔ ”ایسی بات اگر باہر نکل جائے تو رانی کا پرست

ہو جائے گا۔ پتہ ہے؟“

”باہر والوں نے تو رانی کا پرست بنانا شروع بھی کر دیا

ہے۔ مجھے بہت سی سورتیں بغیر پوچھے مشورہ دے گئیں

اور تمہارا دل بے چارہ ہے؟“ گھر میں کنواری لڑکی کو رکھ کر تم

زندگی بکا رہا جا چکی ہو۔ مرد سے دل لگ گیا تو گھر اور شوہر

سب دیکھ لے کر بیٹھ جائے گی۔ انہیں میں کیا جواب دینی

ہوں بتاؤں؟“ جگت نے تجسس نظروں سے اسے دیکھا تو

چندن بولی۔ ”میں کہتی ہوں یہ تم لوگوں کو احاطہ میری فکر

کیوں ہو گئی؟ تین ماہ ہسپتال میں رہی تو کوئی خبر لینے نہیں

آیا۔ کنواری لڑکی کا میرے مرد سے دل لگ جائے تب کی

بات الگ ہے۔ مگر فی الحال تو میرے بچوں کا اور میرا دل

اس سے لگ گیا ہے۔ وہ ہمیں پرانی نہیں لگتی۔“

جگت دل میں چندن کے غلوں پر خوش ہوا مگر چہرے

پر اقلتی رہے وہی۔ ”تم نے ایسا کہا؟“

”میں نے سچ کہا۔“ پھر وہ رک گئی۔ گھر چند لمحے بعد

ہوئی۔ ”یاد ہے کئی سال پہلے ہمایہ کے سدا جھوٹا ہے تھے؟“

تب تم ذاکو تھے۔ سادھو نے کہا تھا کہ جلد یا بدیر گھر میں سوتا آئے گی۔ تم دوسری شادی کرو گے۔“

”تم ابھی تک اس بات کو نہیں سمجھو لیں چندن؟“ جگت جذبات میں بہتا ہوا بولا۔ ”میں سال بیت گئے ابھی میری دوسری شادی نہیں ہوئی۔ اب تک نہیں وہ بات سچ معلوم ہوئی ہے؟“

”سادھو بابا کی بہت ساری باتیں سچ نکلی ہیں۔“ چندن پر جوش لہجے میں بولی۔ ”اب ایک ہی بات باقی رہ گئی ہے۔“

”ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں چندن۔“ جگت نے جذبات میں کہا۔ ”میں تو دیر اتنے سال ہم سے دور کیوں رہتی؟“ جگت بات ختم کرنے کے انداز میں کھڑا ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ ویرواتی تو کچھ اور سوال ہی کہاں تھا؟ مگر اب وہ آس دھوکا تھی۔ گرود یوگور کے باپ نے جگت کے گھر اپنی بیٹی کو اپنے سے روکا تو چندن کو ہی صدمہ ہوا۔ وہ جھوٹے تصور میں کیوں غم رہی؟ کیوں خواب کے محل تعمیر کیے؟ قدرت نے اسی لیے اسے سزا دی تھی۔ گرود یوگور کے مستقبل سے کھیلنے کی اس نے حسرت کی تھی؟ پرانی لڑکی سے کیوں دل لگا نہ تھی؟

اس وقت جگت اپنے دل کو لامت کر رہا تھا۔ چنا کی موت کے غم میں اسے ویرانہ یاد آئے گی تھی۔ گلے میں موجود عویذ پر ہاتھ پھیرتا ہوا وہ ذہن کو خنڈ لے لگا۔ گرود یوگور میں ویرو کو دیکھا یہ اپنی ذات کو دھوکا دینے کے برابر تھا۔ اس کی نوٹ بک میں اپنے گیت لکھے ہوئے دیکھے ویرو کی یاد میں لکھا ہوا گیت وہ خوب چاہ سے گا رہی تھی اسی لیے گرود یوگور میں ویرو دکھائی دی۔ دل کی خالی جگہ میں کسی کو رہانے سے کی پوری نہیں ہوتی۔ تمہارے جیون میں اب کبھی ویرو داخل نہیں ہوگی مگر تمہارے دل سے وہ ابھی نہیں جائے گی۔ قدرت نے گرود یوگور کے لیے جو کچھ کیا شاید اچھا ہی کیا۔ چندن کو صدمہ ہوا ہے مگر آئندہ اس کا دل بھر جائے گا۔

”میں گرود یوگور کے گھر نکلتی۔“ باہر سے آ کر چندن جگت کے برابر چار پائی پر بیٹھ گئی۔ سنی ان سنی کر کے جگت

چار پائی پر لیٹ گیا۔ چندن کہنے لگی۔ ”آج مجھے گرود یوگور سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔“

”کیا بات ہوئی؟“ جگت تجسس نہ روک سکا۔

”پہلے چار پانچ بار گئی تو گرود یوگور کی ماں نے لوٹا دیا۔ مگر آج میں نے سچی کی ہے۔“

”سچی؟“ جگت چونکا۔

”میں نے کہا مجھے گرود یوگور سے ملنے نہیں دو گے تو سردار جی خود آئیں گے۔“

”پھر...؟“

”پھر کیا؟ یہ سن کر اس کی ماں نرم پڑ گئی۔ وہ تمہارا مزارج جانتی ہے اس لیے ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بولی کہ بہن! ہم عورتوں کی بات میں مردوں کو درمیان میں کیوں لاتی ہو؟ پھر کچھ بھاری لہجہ میں بولی۔ ”میں کے مستقبل کو سوچ کر ماں باپ کو سختی کرتا رہتی ہے۔ تم اس سے خوشی سے ملو۔“ چندن اتنا کہہ کر رگ گئی۔ جگت کا منہ کھلا ہوا تھا۔

”تم نے میری دھاک استعمال کی؟“

”ہاں اس کی ماں نے کہا کہ گرود یوگور کو سمجھانا! ہم نے ایک لڑکا تلاش کر لیا ہے۔ شادی کی باں کر دے۔“ یہ الفاظ چندن نے پچھ غصے میں کہے پھر اصل بات پڑائی۔ اسے دیکھ کر دل تڑپ گیا۔ اتنے دنوں میں سوکھ کر کھانا ہو گئی ہے۔ جیسے برسوں کی پیار ہو۔ دونوں کی آہیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر چندن کہنے لگی۔ ”مجھے دیکھ کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ چھوٹے بچے کی طرح مجھ سے پست گئی۔ اس کے بچے ہوئے آنسوؤں نے مجھے تڑپا دیا۔ جیسے اس کے ضبط کا بند نوٹ گیا ہو۔“ یہ کہتے ہوئے چندن آبدیدہ ہو گئی۔ جگت خاموش رہا اور چندن کو روک بولنے دیا۔ ”رونے کے بعد اس نے بچوں کی اور تمہاری خیریت پوچھی ملازمہ کو تنخواہ دی یا نہیں؟ گھر کا حساب کون رکھتا ہے؟ تجھے یاد کرتے ہیں؟ سردار جی کو پروگرام دینے اکیلے جانا پڑتا ہوگا۔ اس نے بہت سارے سوال کیے۔ میں نے مختصر جواب دیے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے ماں باپ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکا بھی تلاش کر لیا ہے۔ تم



دن گزرتے رہے۔ چندن کو گردیو کور کی جدائی پریشان کرنے لگی۔ آنسو بہاتا اس کا محسوس چہرہ ہر لمحہ اس کی نظر کے سامنے رہنے لگا۔ اب وہ بھی واپس نہ آئے گی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور گردیو کور کے کپڑے واپس دے آنے کے لیے الماری کھولی۔ وہ گم صم بنی کپڑوں کو دیکھ کر اس طرح ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے گردیو کور کو اطمینان دلانے کے لیے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر رہی ہو مگر پھر اس کا اطمینان ختم ہو جاتا اور روئے نکتی نہیں کپڑے واپس دے آنے کی تو اس کا دل ٹوٹ جاتے گا۔ چندن نے سوچا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ گردیو کور کا غم بھلانے کے لیے مٹھیں مانگنے لگی۔ وہ کبھی کسی چیز کسی مہاراج کسی جوتھی اور کبھی کبھی جادوؤں نے والے سے ملنے لگی۔ کبھی تنہا جاتی اور کبھی جگت کو ساتھ لے جاتی۔ سب امید دلاتے مگر نتیجہ ہاوی میں نکلتا۔ جگت نہ بھی روکتا نہ ٹوکتا۔ البتہ کبھی کبھی انجھن میں ضرور پڑ جاتا۔ چندن کو کور لڑکی کی اتنی چاہت ہو گئی ہے؟ ابھی اسے ذرا لگتا کہ اس صدمے میں چندن پاگل تو نہیں ہو جائے گی؟ کبھی خود کو سرزنش کرتا کہ دوسروں کے لیے بہت کچھ کیا مگر جس عورت نے تمہارے لیے اتنے دکھ برداشت کیے اس کی خاطر ایک قدم نہیں اٹھایا۔ دن تیزی سے گزرتے رہے۔ چندن کی آس ٹوٹنے لگی۔

”خط.....!“ آواز دے کر ڈاکے نے ایک لفافہ دروازے کی جانب پھینکا۔ دوڑ کر لڑکا خط سلے یا۔ تجسس کی خاطر اس نے لفافے پر نام پڑھا۔ ”کرے ماں! یہ تو تمہارا خط ہے۔“

”اے..... یہ تو گردیو کور کا خط ہے۔“ چندن نے کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ کھولتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بھگوان کا نام لیا۔ اندر سے خط نکالتے ہوئے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ خط کے الفاظ پر نظر پڑتے ہی اس کے آنسو بہنے لگے۔ برداشت باوجود اس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا ہوا؟“ جگت کمرے میں دوڑ کر آیا۔ چندن کے لرزے ہاتھوں اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ دیکھ کر جگت

کیوں..... میں اتنا ہی بولی تھی کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”ہن! انہوں نے زبردستی قید میں ڈال رکھا ہے۔ مگر میں نہیں ڈنگاؤں گی۔ میں ان سے ایک بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ اگر زبردستی کی تو مجھ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“ چندن جوش میں کہہ رہی تھی۔ جگت کو بھی غصہ آ گیا۔

”ویسے لڑکی ہے بہادر۔ یہ سن کر اس کی ماں سنائے میں آگئی ہوگی؟“

”پہلے سنائے میں آگئی پھر چڑھ گئی۔“ چندن کی آواز نرم ہو گئی۔ ”اس نے گردیو کور سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہم تم سے ہاتھ دھوئے کو تیار ہیں مگر عزت نہیں جانے دیں گے۔ اپنی بیٹی کو کہنے سے سکون نہ ہوا تو مجھ سے کہا کہ تمہارے ساتھ چھ ماہ رہی تو ہماری لڑکی کتنی بگڑ گئی ہے۔“

”تمہیں اس نے ایسا کہا؟“ جگت نے منھیاں کس لیں۔

”تمہیں بھی سنا تھا میں ہم کہاں کہنے آئے تھے کیا اپنی بیٹی کو بھیجوں؟ میں ایسا نہ کہہ سکی جگت سنگھ۔“ چندن کی آواز بھرا گئی۔ ”ایسی بے عزتی ہونے کے بعد میں کب تک وہاں رہتی؟ غصے میں پھر بیٹھتے ہوئے چلی آئی۔“ سناٹا چھا گیا۔ چندن کو کور کی سانسوں میں درد جھلک رہا تھا۔ جگت خاموش کھڑا رہا مگر پہلے کبھی ایسا ہوتا تو جگت شاید پوری بات بھی نہ سنتا اور ہاتھ میں لائٹھی اٹھا کر چل پڑتا حساب صاف کرنے، مگر اس کی بجائے وہ چار پائی پر لیٹ گیا۔ چندن ناراضگی کے انداز میں کھڑی ہوئی اور اندر چلی گئی۔

جگت سوچ رہا تھا کہ کون سی کمزوری اسے روک رہی ہے؟ کیا کوئی ان دو بھی قوت؟ ویرو کا دیا ہوا تعویذ؟ مہتا صاحب کی بخشی ہوئی آزادی؟ لوگوں کی طرف سے ملا ہوا پیار؟ یا اولاد کی ذمہ داری؟ نہیں نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ مگر..... مگر کیا؟ اس نے اپنی ذات سے سوال کیا پھر خود ہی جواب دیا۔ آخر میں کس رشتے سے لڑکی کو اس کے ماں باپ سے ٹھہرین لوں؟ اسے لا کر گھر میں کس رشتے سے رکھوں؟ سوالوں کے چکر نے جگت کے ذہن کو تھکا دیا۔

کانپ اٹھا۔ ”کس کا خط ہے؟ ماں کی کوئی خبر ہے؟“ جگت نے بیتابی سے پوچھا۔

”نہیں.....“ چندن بلند آواز میں بولی پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر خط اس کی جانب بڑھا دیا۔

”گرودیو کو کا خط ہے۔“ ان الفاظ میں منوں کا وزن تھا۔ جھپٹ کر جگت نے خط لے لیا۔ پڑھنے سے پہلے بچوں کو باہر بھیجنے کی خواہش ہوئی مگر اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔

”نہن جی! آخری بار تم سے ملنے کے لیے خط لکھ رہی ہوں۔ ماں نے تمہاری بے عزتی کی پھر تم نہیں آئیں۔ یہ اچھا کیا۔ اس بے عزتی کے بدلے میں خود تمہارے گھر آنا چاہتی تھی مگر قدرت کو یہ منظور نہیں معلوم ہوتا۔ جسم اب زیادہ دکھ نہیں جھیل سکتا۔ جسم کا ایک حصہ سن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہارٹ فیل کا خطرہ ہے۔ روح تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے اب جسم کی باری ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا گھر والے مجھے کسی کے گلے نہیں باندھ سکیں گے۔ ذولی کی تمنا ہی اب جنازے سے ان کو سکون ملے گا۔ ہارٹ فیل ہونے والے کو زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ اس موت کے لیے تیار ہوں۔ زندگی کی قید سے آزادی چاہتی ہوں مگر اس سے پہلے ایک بار مل جائے۔“

جگت کی پلکیں جھپک گئیں۔ چندن کور کی آنکھیں سوکھ گئیں۔ پتلیاں پھیلا کر اس نے جگت کی جانب دیکھا جیسے اس کی آنکھیں جگت سے جواب طلب کر رہی ہوں۔ ”بولو اس کا ذمہ دار کون ہے؟“ جگت اس کی آنکھوں کی زبان نہ سمجھا۔ شاید سمجھ کر نا لانا چاہتا تھا۔

”چندن تم جاؤ مل آؤ۔“ جگت نے کہا اور چندن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ دانت پیسنے لگی۔ آنکھوں سے آگ برسانے لگی۔ وہ جگت کو ہر تپا دیکھنے لگی۔ ”چندن! تمہیں کیا ہو گیا؟“ جگت ڈر گیا۔

”تم کو کیا ہو گیا؟ یہ میں پوچھ رہی ہوں۔“ چندن کے الفاظ سن کر جگت شانے میں آ گیا۔

”کون کہتا ہے کہ تم ڈاکو تھے؟“ ڈاکو لفظ اس طرح طر

میں بولا گیا کہ جگت جھٹا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو چندن؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیا کہنا چاہتی ہوں؟“ چندن آنکھیں نکال کر بولی۔ ”ویرڈ کا خط پڑھ کر اسے اغواء کرنے گئے تو تم نے کسی سے یہ سوال کیا تھا؟ نہیں کیونکہ اس وقت تم ڈاکو تھے تمہیں کسی کا ذریعہ نہیں تھا نہ ہی کسی کی پروا تھی۔“ کانپ کر وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر کچھ بھر کر بولی۔ ”اب یہ گھر شگیت بیوی نیچے عزت سب تمہارا راستہ روک رہے ہیں یا جیل کا ڈر لگتا ہے؟“

”چندن.....!“ بھیا نک گرج کے ساتھ جگت چیخ پڑا نیچے لرز گئے چندن کا جسم لرز گیا مگر وہ اسے گھوہلی رہی۔ ”بولو تمہیں کیا کہنا ہے؟ تم نے آج میری مراد کی کٹاؤز دی ہے۔ تم میری خاموشی کو بزدلی سمجھ بیٹھی ہو۔“ چندن خاموش رہی۔ جگت کا جوش کچھ کم ہوا۔ ”چندن! آج تک تم نے مجھے قابو میں رکھا کہیں میں جذبات میں بہہ کر کچھ کرنے گزروں؟ تم اس کے لیے فکر کرنی رہیں۔ اب جبکہ میں اپنی ذات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جذبات کے زہر کو ختم کر رہا ہوں تب تم مجھے طعنہ دے کر جوش دلارہی ہو؟ یہ پوچھ رہی ہو کہ میں کیسا ڈاکو تھا؟“

”جگت سگھ.....!“ چندن کور نے سر جھکا لیا۔ ”تم کو میں نے کبھی بزدل نہیں سمجھا مگر بار بار گرودیو کو کور کا چہرہ نظروں میں گھوم جاتا ہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو کیا تم مجھے اس آگ سے نہیں بچاؤ گی تب میں مجرم کی طرح سر جھکا رہی ہوں۔ آنکھیں بند کر لیتی ہوں مگر اس کی آواز کان سے ٹکراتی راتی ہے مجھے آزاد کراؤ مجھے رہائی دلاؤ۔“ چندن آنسو پونچھنے کے لیے کچھ دیر کی پھر کھٹکار کر بولی۔ ”اسے پاگل پن سمجھو محبت سمجھو یا حماقت مگر دل دکھتا رہتا ہے۔ گرودیو کو کور کچھ ہو گیا تو اس کی پیاسی روح کی آہ ہمارے خاندان کو تباہ کر دے گی۔“

بچے اب باہر جا چکے تھے۔ جگت زخمی شیر کی طرح آگن میں نہلنے لگا۔ چندن جو کچھ بول چکی تھی اسے دل

میں دہرا رہی تھی۔

بار ماں نے چندن کا منہ بند کر دیا تھا اور اس نے دیرو کو گنوا دیا تھا۔ اسے گزشتہ بات یاد آگئی۔

”ہم عورتیں اگر کبھی نیک کام کے لیے سچ کو چھپاتی ہیں مگر نتیجہ اچھا نہ نکلے تو زندگی بھر پچھتاتی رہتی ہیں۔“ چندن مجرم کی طرح بولی۔ ”ایک اور بات تم سے چھپائی ہے۔ وہ آج آٹھ سال بعد قبول کرتی ہوں۔“

”کون سی بات؟“

”دیرو کی بات۔“ چندن کے ہونٹ کپکپائے۔ یہ سن کر جگت کا سانس سینے میں چلا گیا۔ خوف اور شک سے اس کا دل ٹپٹپٹا لگا۔ اس نے آؤ بھری۔

”دیرو کی کیا بات ہے؟“ جیسے اسے پوچھتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہو وہ اس طرح ہانپنے لگا۔

”تمہارے فیصلے کے وقت وہ بڑے مندر میں ملی تھی۔“ یہ تو تم نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ کیا وہ جھوٹ بات تھی؟“

”نہیں جگت سنگھ! وہ بات اوروری تھی۔“ چندن نے ہونٹ چبائے۔ ”دیرو کے ساتھ ایک مرد بھی تھا اور۔۔۔ اور وہ مرد اس کا شوہر تھا۔ دیرو نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں بتا دوں کہ اس نے شادی کرنی ہے اور نکاحی ہے مگر۔۔۔ مگر میں نے تم سے اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ یہ سن کر تمہیں دکھ ہوگا۔ تم شاید یہ برداشت نہ کر سکو۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”جیسے وہ جگت کی نظر کا مقابلہ نہ کرنا چاہتی ہو اس لیے ایک دم اندر دوڑ گئی۔ جگت سنائے میں آ گیا۔ دیرو نے گھر بسایا اس لیے وہ مجھ سے اوجھل رہنا چاہتی ہے؟ ممکن ہے کہ وہ اب تک ماں بن گئی ہو یہ سوچتے ہوئے جگت نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل سے اٹھتا ہوا کچھ درد آہ بن کر ہونٹوں تک آیا باقی دل میں ہی دب گیا۔



جگت بھر کر چندن شام کو گردو گردو کے گھر گئی۔ ”گردو گردو کے کور کے کپڑے دیے آئی ہوں۔“ چندن نے کہا۔

”آئیے آئیے!“ گردو گردو کی ماں بڑے پیار سے بولی۔ پھر جگت اس کے ہاتھ سے لے لیا اور انیسویں کا اظہار

”پھر ایک بات کا جواب دو چندن!“ جگت اچانک رک کر بولا۔ ”کیا میں اسے ماں باپ سے چھڑا کر یہاں لے آؤں؟ چاہے اس کے لیے مجھے قتل کرنا پڑے؟“ جگت بولنا زہا۔ ”مگر یہاں لا کر ہم اس کی زندگی برباد تو نہیں کریں گے؟ یہ سوچ لینا لوگ باتیں بنائیں گے جگہ نے دوسری عورت گھر میں ڈال لی ہے۔ میرے منہ پر بولنے کی تو کوئی ہمت نہیں کر سکے گا مگر تم ان سب کو کیا جواب دو گی؟ تمہارے پاس دفاع کے لیے کوئی جواب ہے؟“

”ہاں!“ چندن نے مضبوط لہجہ میں کہا۔ ”میں کہوں گی میں اسے اپنی چھوٹی بہن مانتی ہوں۔“

”لوگ مانیں گے؟“ جگت نے نہیں کر پوچھا۔ ”لوگوں کا دل چاہے نہ مانے۔“ چندن آنکھوں میں پڑ گئی۔ ”مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ تم اسے نکال لائے پھر بھی لوگوں کو جو کہنا تھا وہ کہہ چکے ہیں۔ یہاں رہ کر پہلے ہی بچاری بدنام ہو گئی ہے۔“

”پھر جاؤ! اس سے مل آؤ۔“ جگت نے فیصلہ کر لیا۔ ”پوچھ لو گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہے۔“

”تیار ہے۔“ چھپائی ہوئی بات چندن جوش میں بول گئی۔ وہ اس طرح ڈر گئی جیسے زبان کٹ گئی ہو۔ بات نالانے کی خاطر جھوٹ بولنا چاہا مگر جگت کی تیز نظر اس کے دل میں اتر چکی تھیں۔ جگت اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ ”آخری بار ملنے کی بھی تب تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ سردار جی سے کہو مجھے یہاں سے نکال لے جائیں۔ نہیں تو میں زیادہ دن تک جی نہیں سکوں گی۔“

”اور تم نے مجھ سے چھپایا چندن؟“ جگت طویل سانس لے کر بولا۔ ”پہلے بتا دیجی تو اسنے طعنے نہ دیئے پڑتے۔ مجھے اتنی پریشانی برداشت نہ کرنی پڑتی۔“

”مجھے اس نے منع کیا تھا۔“ چندن اچانک بولی۔ ”اسے ڈر لگا کہ آپ جذبات میں کچھ کر رہیں گے۔ اس کی ذمہ داری ہی ہوگی۔“ جگت کو یہ دلیل پسند نہیں آئی۔ ایک

جھوٹے تھے ماں! تمہاری خدمت نے مجھے خطرے سے بچالیا ہے۔“

”بیٹا! دل تو پاگل بیچے کی طرح ہوتا ہے۔ جھوٹی لگن باندھ لیتا ہے۔“ ماں نے سمجھائی۔ ”جنگا کا پیار بھلا دیا ہے۔ جب سے چندن بیگ دے کر گئی تھی گردو یو کوور نے جنگا کے متعلق کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے ماں بیٹی کو مشورہ دے رہی تھی۔“ تھوڑے دنوں کی جدائی میں بات ختم ہو جاتی ہے۔“

”ماں! مگر مجھے باغ میں چلے پھرنے دو تو دل اور جسم میں تازگی آئے گی۔“

”نہیں بیٹی! ابھی کچھ دن تم کو نیچے نہیں اترنا۔ ٹھہرنا ہے تو برآمدے میں بس لو۔“ ماں نے حکمانہ انداز میں کہا۔ اس کے جانے کے بعد گردو یو کوور نے ایک بار پھر جگت کا بیجا ہوا خط پڑھا۔

”جمہرات سیاہ کار! سوا چار بجے تمہاری کوشی کے پچھلے دروازے کی دیوار کے برابر۔“

خط کرتے میں رکھ کر وہ برآمدے میں ٹپکنے لگی۔ ابھی یوں ٹھننے کی دیر تھی۔ ماں نیچے جانے دینے کے لیے راضی نہ تھی۔ یہاں سے نیچے جانے کی راہ نکالنی پڑے گی۔ وہ ذہن میں منصوبہ مرتب کرنے لگی۔

سیاہ کار نظر آئی۔ خست لگتے تھانہ تھا۔ اس کے برابر کوئی بیٹھا تھا۔ گردو یو کوور نے مڑے کا دروازہ لگایا۔ ماں باورچی خانے میں شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ منہ میں سناٹا تھا۔ پھرتی سے مگر خاموشی سے تمام کام نمٹاتا تھا۔

برآمدے کی دیوار کو دی تو اس کے جسم میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی۔ لڑکی ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ رہی تھی۔ مگر چوکنٹ سے باجے گا بجے کے ذریعے نہیں برآمدہ کو در... جگت نے کار کی کھڑکی سے دیکھا گردو یو کے پاؤں کمزوری سے کپکپا رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اس طرح چوری چھپے لے جانے کی بجائے سامنے سے صحیح لاؤں مگر چندن نے منع کیا تھا۔ اس بار طاقت سے نہیں عقل سے کام لینا تھا۔

برآمدے سے کچھ دور ایک درخت تھا۔ ابھی گئے سال

کیا۔ ”مگر اب وہ کھڑی ہوگی یا نہیں؟ بھگوان جانے۔“

”بہن! تم ایسا نہ بولو۔“ چندن جاننے کے باوجود انجان بن کر بولی۔ ”ایسا کوئی روگ تھوڑا ہی ہوا ہے۔“

”روگ تو اس نے اپنے ہاتھوں لگایا ہے۔“ وہ کچھ کڑواہٹ سے بولی۔ ”وہ ضد کر کے خود اپنی ذات کی دشمن بنی ہے۔“

”میں ذرا اس سے مل لوں۔“ چندن جلدی سے بیگ اٹھا کر کمرے میں گھس گئی۔ ”کہہ دوں کہ تمہاری چیزیں لے آئی ہوں سنبھال لو۔“

گردو یو کوور کے پیچھے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔ چندن کو دیکھتے ہی وہ ہنسنے لگی مگر چندن نے اسے روک دیا۔ ”لیٹی رہو۔“ وہ ارد گرد دیکھ کر بولی پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے یہاں نے کہہ دیا۔

”تمہارا خط ملا۔ بیگ میں تمہارے ریشمی کرتے کی جیب میں اس کا جواب ہے۔ تم تیار رہنا آج سے پانچویں دن۔“ بہت احتیاط سے اس نے کہا۔ ”ڈھلتی دو پہر سردارچی تمہیں لینے آئیں گے۔“

کچھ دیر رک کر بولی۔ ”اب کھانی کر جسم بنانا۔ گھر کے باہر کار کھڑی ہوگی وہاں تک تمہیں پہنچنا ہے۔ پھر سردارچی سنبھال لیں گے۔“

”جج...“ گردو یو کوور نے ہاتھ دہرایا۔ ”اب میں موت کے فرشتے کو بھی بھگا دوں گی۔“ پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ گردو یو کوور کی ماں اندر آئی تو چندن نے بات بدل دی۔

”برابر دوا بیٹا! بھگوان جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ مگر ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔“ چندن بیگ کی جانب اشارہ کر کے گردو یو کوور کی جانب دیکھ کر مسکرائی اور چلی گئی۔ ممکن ہے اس کی ماں کو شک ہو جائے چندن نے اس لیے وہاں زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔



”ماں! آج میں کھڑی ہو سکتی ہوں۔ میرا چلنے پھرنے کو جی چاہتا ہے۔“ گردو یو کوور نے احتیاط سے کہا۔ ”ڈاکٹر

جگت جج کے پاس گرو دیوکور کے بیان لکھوانے گیا تھا کہ وہ راضی خوشی سے اپنا گھر چھوڑ آئی ہے۔
سورج کی روپیلی کرنیں دھرتی پر پڑ رہی تھیں تو دروازے پر کاررکنے کی آواز آئی۔ چندن کو دو چار بار ایسا محسوس ہوا تھا مگر اس بار واقعی دروازہ کھلا اور کارر سے گرو دیوکور اترتی دکھائی دی۔

”ہن۔ جی!“ ہاتھ بھیل کر ہنستے چہرے سے دوڑتی ہوئی وہ اندر آ گئی۔ چندن نے اسے سینے سے لگا لیا۔ چندن کے ہونٹ کپکپائے مگر آواز نہیں نکلی۔ اس نے مسرت کے آنسوؤں سے گرو دیوکور کا استقبال کیا۔ چندن کے ہونٹ کپکپائے مگر آواز نہیں نکلی۔ اس نے مسرت کے آنسوؤں سے گرو دیوکور کا استقبال کیا۔ دونوں عورتوں کو چوکھٹ پر دوتا چھوڑ کر جگت برابر والے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے پردے میں اداسی جھلک رہی تھی۔ اس کا ہاتھ خود بخود گردن کی جانب بڑھا تعویذ سے لکرایا۔ اس کے دل میں درد اٹھا۔ آہستہ آہستہ دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے گئے۔ انگی اور انگوٹھے کے درمیان تعویذ کا ذرا پکڑا ایک جھٹکا دیا اور ذرا ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے دردناک آواز نکلی۔ تعویذ ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

”وہو! تم دل میں ہمیشہ رہو گی مگر پتہ نہیں میں کیوں تعویذ اپنی گردن سے الگ کر رہا ہوں۔“ تعویذ ذبیہ میں بند کر کے بھیلی پیکوں سے اس نے آنسو پونچھ لیے۔ اس کے دل کے ایوان میں گیت کی آواز گونجنے لگی۔

میرے گیتوں میں تم ہو خیالوں میں تم
میرے دل میں بھی تم ہو جواہوں میں تم
میری سانسوں میں تم میری آہوں میں تم
چاہے مجھ سے دور ہو تم مگر ہو نگاہوں میں تم

(ختم شد)



اس درخت پر چڑھ کر چور گھر میں گھس آیا تھا مگر کمزور درخت نے دعا کیا وہ نیچے گرے۔ بمشکل بھاگ سکا تھا بچا رہا۔ گرو دیوکور کو یاد آیا۔ باپو جی نے تب کہا تھا۔ ”یہ درخت سکون کی نشانی ہے۔ ہم اسے نہیں کاٹیں گے۔“ جب گرو دیوکور نے اس کی ڈالی پر قدم رکھا تو اسے باپو جی یاد آئے۔

”سنبھلنا۔“ ایک نرم آواز آئی۔ وہ جگت سنگھ کو صاف دیکھ رہی تھی۔ درخت کی ڈالی کچھ جھکی مگر وہ ہمت کر کے آخری سات فٹ کود گئی۔ باغ کی دیوار زیادہ بلند نہیں تھی پھر بھی ایک بار اس کا پیر پھسلے ہوئے رہ گیا۔ وہ دیوار پر آ گئی تو جگت نے کار کا دروازہ کھولا..... باہر نکل کر جگت نے ہاتھ بلایا۔ جگت کو قریب دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی۔ اس نے خود کو جگت کی بانہوں میں گرا دیا۔ کار کا انجن گر جا گرو دیوکور نے عقب اسکرین سے اپنے مکان پر دکھ بھری نظر ڈالی پھر جگت کی طرف چاہ بھری مسکراہٹ سے دیکھا۔ کار حرکت میں آئی دھول اڑی اور کار جالندھر کی حد پار کر گئی۔



چندن ساری رات سو نہیں سکی۔ شام سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ گرو دیوکور کا بھائی تیز نظروں سے گھر کو دیکھتا ہوا دو پکڑ لگا چکا تھا۔ اس کی ماں ایک بار پوچھنے لگی تھی کہ گرو دیوکور یہاں تو نہیں آئی؟ چندن انجان بن گئی۔

”کیوں..... کیا گھر میں نہیں ہے؟“
اس کی ماں نے دانت پیس لیے۔ ”جگت سنگھ کہیں ہے؟“

”وہ تو صبح سے امرتسر گئے ہیں۔“ وہ منہ پھیر کر جھوٹ بولی۔ عزت کے ڈر سے بات پھیلنے نہیں دی۔ مگر گرو دیوکور کے گھر والے دودھ دھوپ کر رہے تھے۔ انہوں نے امرتسر کی جانب کار دوڑائی۔ رات گزرنے سے پہلے ان کو گرو دیوکور کو پکڑ چکا تھا ورنہ اس کے بعد کنواری بیٹی کو گھر لانے سے فائدہ بھی کیا؟

چندن کو ہر نصف گھنٹے بعد بھگوان کی پراتھنا میں دل لگانی تھی۔ درمیان میں لدھیانہ کے خیالات آ جاتے۔

www.pdfbooksfree.pk

سیاستی حوالہ دہ

خانی

PDFBOOKSFREE.PK

aanchalpk.com aanchalnovel.com

قیمت - 50 روپے
www.pdfbooksfree.pk